انتساب

میں یہ کتاب اُن سب لڑکوں کے نام کرتا ہوں

جو محبت پانے کی کوشش میں ذلیل ہو جاتے ہیں،

اور اُن لڑکیوں کے نام

جو مجبوری میں جبراً شادی کر لیتی ہیں۔

یہ تحریر کسی ایک جنس کے حق میں دلیل نہیں، اور نہ ہی کسی دوسری جنس کے خلاف فردِ جرم۔ یہ کہانی اُس بگڑے ہوئے توازن کی ہے جو اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم دین کو سچائی کے بجائے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ آج کی دنیا میں مرد اپنی محرومیوں کو نظریہ بنا کر پیش کر رہا ہے، اور عورت اپنے حقوق کو جنگ کا عنوان دے چکی ہے۔ مگر اسلام نہ اس جنگ کا حصہ ہے، نہ کسی ایک فریق کا ترجمان۔

اسلام نے مرد اور عورت دونوں کو ایک ہی میزان پر کھڑا کیا ہے۔ دونوں کو سوالات کا سامنا ہے، دونوں کے لیے حدود ہیں، اور دونوں کے لیے جواب دہی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے جہاں عورتوں کو ناشکری سے خبر دار کیا، وہیں مردوں کو یہ یاد دہانی بھی کروائی کہ بیوی محض ایک رشتہ نہیں بلکہ ایک امانت ہے ایسی امانت جس کے بارے میں قیامت کے دن سوال ہو گا۔

یہ ناول اسی سوال سے جنم لیتا ہے:

اگر اللہ تعالیٰ ہم سے ہمارے رشتوں کے بارے میں پوچھ لے، تو کیا ہمارے پاس کوئی جواب ہو گا؟

یہ کہانی محبت کی بھی ہے، غلطیوں کی بھی، اور اُن خاموش لمحوں کی بھی جہاں گناہ صرف عمل نہیں رہتا بلکہ سوچ بن جاتا ہے۔ زِنا، بے وفائی، انا اور خود کو حق پر سمجھنے کی عادت یہ سب اس کہانی میں خوبصورت لفظوں میں نہیں، بلکہ اپنی اصل بدصورتی کے ساتھ سامنے آئیں گے، کیونکہ سچ ہمیشہ خوبصورت نہیں ہوتا۔

یہ پیش لفظ ایک اعلان ہے:

یہ ناول مرد اور عورت کو آمنے سامنے نہیں کھڑا کرے گا،

بلکہ دونوں کو آئینے کے سامنے لا کھڑا کرے گا۔

اور فیصلہ...

قاری خود کرے

حسنین بھٹی

یہ جنگ مرد اور عورت کے درمیان نہیں تھی، مگر اسے ویسا ہی بنا دیا گیا تھا۔ ہر طرف آوازیں تھیں کوئی عورت کے نام پر بول رہا تھا، کوئی مرد کے دکھ کو مذہب کا رنگ دے رہا تھا جیسے اسلام کسی ایک کا محافظ ہو اور دوسرے کا مخالف۔ حالانکہ اسلام نے کبھی ایک طرف کھڑے ہو کر فیصلہ نہیں سنایا، اس نے ہمیشہ دونوں کو ایک ہی میزان کے سامنے لا کھڑا کیا۔

ایک دن رسولِ اکرم ﷺ عورتوں کے ایک حلقے کے پاس سے گزرے اور فرمایا: "احسان کرنے والوں کی ناشکری سے بچو۔" اسماء بنت یزید انصاریؓ نے پوچھا کہ یہ ناشکری کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے وہ بات فرمائی جو صرف عورتوں کے لیے نہیں، بلکہ ہر تعلق کے لیے آئینہ ہے: "عورت ایک عرصہ اپنے والدین کے گھر رہتی ہے، پھر اللہ اسے شوہر اور اس کے ذریعے اولاد عطا کرتا ہے، پھر غصے میں کہہ دیتی ہے: میں نے تم سے کبھی کوئی بھلائی نہیں دیکھی"

(الأدب المفرد، امام بخاری، حدیث: 1048)

مگر یہی دین مرد کو بھی آزاد نہیں چھوڑ دیتا۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ شوہر سے پوچھے گا: "کیا میں نے تمہارا نکاح فلاں عورت سے نہیں کیا؟ اس کے لیے کئی لوگ آئے تھے، مگر میں نے سب کو روک کر اسے تمہارے نکاح میں دیا"

)صحیح ابن حبان، حدیث: 7368(

اس دن نہ دلیل کام آئے گی، نہ شور، نہ نظریات۔ صرف کردار بولے گا۔ اسی لیے رسول ﷺ نے فیصلہ کن اصول رکھ دیا: "تم میں سب سے کامل ایمان والا وہ ہے جس کا اخلاق سب سے بہتر ہو، اور تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ سب سے بہتر ہو"

)سنن الترمذی، حدیث: 1162(

اسلام مرد بمقابلہ عورت کی کہانی نہیں لکھتا۔ وہ دونوں کو ذمہ داری دیتا ہے، دونوں کو خبردار کرتا ہے، اور دونوں کو عزت بخشتا ہے۔ مگر جب دین کو انا، خواہش یا انتقام کے لیے استعمال کیا جائے، تو توازن بگڑ جاتا ہے اور یہی بگاڑ رشتوں کو زہر بنا دیتا ہے۔

یہ کہانی اسی بگڑے ہوئے توازن سے شروع ہوتی ہے...

جہاں کوئی خود کو مظلوم سمجھتا ہے، کوئی خود کو حق پر،

اور انجام کا فیصلہ صرف وقت نہیں،

جواب دہی کرتی ہے۔

—

ناول

"آپ اپنی آنکھیں ان چیزوں سے بند کر سکتے ہیں

جو آپ نہیں دیکھنا چاہتے،

لیکن آپ اپنا دل ان چیزوں سے بند نہیں کر سکتے

جو آپ محسوس نہیں کرنا چاہتے۔

اور کبھی کبھی، سب سے زیادہ تکلیف دہ یادیں

وہی ہوتی ہیں جنہوں نے آپ کو کبھی جینے کا احساس دلایا تھا۔"

جانی ڈیپ (Johnny Depp)

آسمان سرخ ہو چکا تھا اور تیز آندھی چل رہی تھی۔ ہر طرف گرد و غبار اُڑ رہا تھا، ہر شے بکھری ہوئی اور بے جان لگ رہی تھی۔ لوگوں کی آنکھوں میں مٹی جا رہی تھی اور وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اس بھاری دھول سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن ہوا بے رحمانہ تھی اور کسی کی پرواہ نہیں کر رہی تھی۔ جناح پارک کی ویرانی میں وہ ایک بینچ پر بیٹھا تھا، خاموش، کسی چیز کی پرواہ کیے بغیر۔ جیسے دنیا کی رونقیں، لوگ، اور وقت سب اُس کے لیے رُک گئے ہوں۔

"ارمان"!

کسی نے زور سے اسے پکارا۔ وہ آواز اُسے اندر تک جھنجھوڑ گئی۔ ارمان نے سر اُٹھایا تو سامنے اس کا دوست شاہویر کھڑا تھا، جس کی مسکراہٹ میں خوشی اور حیرت دونوں جھلک رہی تھی۔ شاہویر، جو لندن سے واپس آیا تھا، اپنے پرانے دوست سے ملنے کے لیے آج لاہور آیا تھا۔

وہ دونوں پنجاب یونیورسٹی کے دن یاد کر رہے تھے جب ایک ساتھ پڑھتے، لیکن اب تین سال کی جدائی کے بعد زندگی کی سمتیں بدل چکی تھیں۔ ان

کے ڈیپارٹمنٹس الگ تھے مگر کچھ لیکچرز اور مشترکہ پروجیکٹس نے انہیں جوڑا ہوا تھا۔

ارمان سائنسدان بننا چاہتا تھا۔ بایو ٹیکنالوجی کی پڑھائی کے بعد وہ لاہور کی ایک مشہور لیب میں کام کر رہا تھا۔ وہ علم اور تجربات کے پیچیدہ جال میں اتنا مصروف تھا کہ کبھی کبھی دنیا کی رنگینی اور لوگوں کی مصروفیت سے دوری محسوس کرتا تھا۔ شاہویر، ماس کمیونیکیشن کا طالب علم، ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا، نہ صرف تعلیم میں بلکہ ارمان کے جذباتی سکون کے لیے بھی۔ وہ انگلش اور قرآن کی تعلیم میں بھی ارمان کے ساتھ شامل رہتا۔

شاہویر نے ہنس کر کہا، "ارمان، لاہور بہت بدل گیا ہے، ویسے "!

ارمان نے اپنی پھیکی سی آواز میں جواب دیا، "ہاں... بہت "!

خود کو بھی یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کی زندگی کے اندر کیا بھاری سا احساس چھپا ہوا تھا۔ دل بوجھل، ذہن تھکا ہوا، اور روح کہیں کسی بے نام دنیا میں کھوئی ہوئی۔ دنیا سے بیزاری... لوگوں کی یہی کہانی ہوتی ہے۔ وہ زندہ تو ہیں، لیکن جینا چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔

شاہویر نے ارمان کی خاموشی میں چھپی ہوئی اداسی محسوس کی اور اسے سہارا دینے کے لیے ہاتھ تھاما، لیکن ارمان کی آنکھوں میں وہ خالی پن تھا جو شاید کبھی مکمل نہیں بھر پائے گا۔ ہوا تیز تھی، گرد و غبار ہر طرف، اور ارمان کی خاموش تنہائی، اس پارک کی ویرانی کے ساتھ مل کر ایک گہرا سا سکوت پیدا کر رہی تھی، جیسے دنیا کی ہر آواز اور روشنی محض ایک خواب ہو۔

"میں آج بھی اُسے یاد ہوں، شاہویر۔"

ارمان نے گہری اداسی کے ساتھ کہا، آواز میں بے بسی اور درد دونوں جھلک رہے تھے۔

"کیسے؟"

شاہویر نے چونک کر پوچھا، اُس کی آنکھوں میں فکر اور حیرت دونوں تھیں۔

"تُجھے پتہ ہے میں کس کی بات کر رہا ہوں۔"

ارمان نے مایوس چہرہ بناتے ہوئے کہا، جیسے ہر لفظ دل کے زخم پر نمک چھڑک رہا ہو۔

"تُو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تُو دوبارہ اُس کا نام میرے سامنے نہیں لے گا۔"

شاہویر فوراً تبدیل ہو گیا۔ اُس کا مزاج سخت اور سنجیدہ ہو گیا، کیونکہ وہ اپنے دوست کو اس اذیت میں دیکھنا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے ارمان کی طرف قدم بڑھایا اور نرم مگر پر اعتماد لہجے میں کہا،

"لیکن میں اُس سے ابھی بھی محبت کرتا ہوں۔"

ارمان نے کہا، اُس کی آنکھوں میں بے پناہ درد اور کمیابی کی جھلک تھی۔

شاہویر غصے اور فکر کے درمیان پھنس گیا، اُس کے لہجے میں تیزاب سا پن تھا:

"یار، تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟ اُس کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتا؟ تُو جانتا بھی ہے کہ وہ تجھ سے محبت نہیں کرتی، پھر بھی اُس کے پیچھے لگا ہوا ہے"!

ارمان کی سانسیں بھاری ہو گئی تھیں۔ دل کے کسی گوشے میں ابھی بھی اُمید کی ایک چھوٹی سی کرن باقی تھی، جو اُسے جکڑے ہوئے ماضی کی یاد دلا رہی تھی:

"لیکن ہم دونوں کا نکاح ہونے والا تھا، کیسے بھول جاؤں اُسے؟"

اُس نے آہ بھری، اور گرد و غبار میں گم ہوتی ہوئی آواز نے پارک کی خاموش فضاؤں کو چیر دیا۔

شاہویر نے اپنے دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھا، طاقت اور تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے، مگر ارمان کی آنکھوں میں وہ خالی پن تھا جو شاید کبھی مکمل نہ بھر پائے:

"لیکن وہ تجھ سے اب محبت نہیں کرتی، اُسے جانے دے۔"

ارمان کی آواز میں بے بسی اور سوال تھا، جو ہوا کے ساتھ منتشر ہو رہا تھا:

"مگر کیسے؟"

"کیسے"... یہ وہ لفظ تھا جو ارمان کے ذہن سے نکل ہی نہیں رہا تھا۔ اتنا کچھ حاصل کرنے کے بعد بھی، اتنی محنت، اتنی کامیابیاں، اتنی پیش رفت کے باوجود، اُس کا دل اور دماغ صرف اسی لفظ پر ٹکا ہوا تھا: کہ وہ اُسے کیسے بھولے؟

ہر کامیابی کے لمحے، ہر نئی دریافت، ہر خوشی کا لمحہ، ارمان کے لیے ادھورا لگتا۔ اُس کی آنکھیں، اُس کا دل، ہر حصہ بس اس سوال کے گرد گھوم رہا تھا کہ وہ کیسے؟ وہ کیسے جانے دے؟۔ دنیا کی ہر چیز، ہر علم، ہر تجربہ، سب بے معنی لگ رہا تھا جب تک اُس کا دل اُس کے پیچھے نہیں چھوڑ پاتا تھا۔

یہ لفظ، یہ سوال، ارمان کے دل میں ایک چھپی ہوئی دھڑکن کی طرح گونج رہا تھا، جو ہر لمحے اُسے یاد دلا رہا تھا کہ حقیقت اور دل کی خواہش میں کتنا بڑا فرق ہے۔ اور وہ فرق، وہ کشمکش، ارمان کے لیے ایک مستقل درد بن چکی تھی، جسے وہ نہ بھول سکتا تھا نہ قبول کر سکتا تھا۔

کچھ سوالوں کا جواب نہیں ہوتا، وہ صرف انسان کو آہستہ آہستہ کھا جاتے ہیں۔

"مومنہ! ویسے تم نے شادی کے بعد آگے کیا سوچا ہے؟"

زینب گل نے مومنہ سے پوچھا۔ وہ اسے اس کی شادی کے لیے تیار کر رہی تھی۔ کمرے میں ہلکی روشنی تھی، آئینے کے سامنے مومنہ دلہن کے جوڑے میں بیٹھی تھی۔ یہ مومنہ طارق کی ارینج میرج تھی، جو پورے طریقے سے اس کے والدین کی مرضی سے ہو رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی بارات آنے والی تھی، مگر مومنہ کے چہرے پر خوشی کے بجائے کئی سوال ٹھہرے ہوئے تھے ایسے سوال، جیسے وہ خود کو خود ہی دھوکا دے رہی ہو۔

"مومنہ"!

زینب نے دوبارہ اسے ہلایا۔

مومنہ اب بھی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تھی۔ دلہن کے جوڑے میں وہ بلا کی خوبصورت لگ رہی تھی۔ کوئی بھی اسے ایک نظر دیکھ لیتا تو وہیں ٹھہر جاتا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں گہرائی تھی اور لمبے بال اس کے کندھوں پر خاموشی سے بکھرے ہوئے تھے مگر ان آنکھوں میں ایک عجیب سی خالی پن بھی تھا، جو صرف وہ خود محسوس کر سکتی تھی۔

"شادی کے بعد؟"

مومنہ نے دھیرے سے کہا، جیسے یہ سوال اس سے نہیں، اس کی روح سے پوچھا گیا ہو۔

"ویسے تو پکا تمہارا محرم ہو گا نا، جہاں دل کرے اس کے ساتھ جانا۔"

زینب گل نے دھیرے سے کہا، آواز میں نرمی اور حقیقت دونوں تھیں۔

زینب مومنہ کی یونیورسٹی کی دوست تھی، سات سال سے اس کے ساتھ۔

اس کی دوستی کا بھی ایک سٹینڈرڈ تھا، وہ لڑکیوں سے بھی فری نہیں ہوتی تھی اپنے شوہر کے لیے پاگل نام تھا زینب گل۔

"گل، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں نے اُس کو دھوکا دیا ہو... کیا میں نے جو کچھ کیا، وہ صحیح تھا؟"

مومنہ نے آہستہ آہستہ کہا۔ اس کی آواز میں لرزش تھی، جیسے ہر لفظ دل سے کھینچ کر باہر آ رہا ہو۔

زینب گل نے گہری سانس لی، لمحہ بھر کو خاموش رہی، پھر مضبوط لہجے میں بولی:

"بالکل صحیح تھا۔ ویسے بھی تم دونوں کا حرام رشتہ تھا۔ اُس کو ختم ہونا ہی تھا۔ حرام رشتے کہاں چلتے ہیں؟ ان کا اختتام ہوتا ہی ہے، اور بہت تکلیف سے ہوتا ہے۔"

مومنہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے نظریں جھکا لیں، جیسے اپنے ہی لفظوں سے نظریں چرا رہی ہو۔

"نیت تو نکاح کی تھی، گل"...

وہ دھیرے سے بولی، جیسے خود کو تسلی دے رہی ہو۔

"تو کیا اب تم اُسی سے نکاح کر رہی ہو؟"

زینب گل فوراً بولی۔

یہ سوال مومنہ کے لیے کسی چابک کی طرح تھا۔ وہ بالکل خاموش ہو گئی۔ اس کے منہ میں الفاظ ختم ہو چکے تھے، جیسے سچ نے اس کی زبان کو جکڑ لیا ہو۔

"نہیں نا... اسی لیے جس سے کر رہی ہو، اُس کے ساتھ خوش رہنا۔ماں باپ جو چنتے ہیں، ٹھیک ہی ہوتا ہے۔ مجھے دیکھ لو مبین میرا کتنا دھیان رکھتے ہیں۔

تمہارے سامنے ہی مجھے کوئی اور پسند تھا، لیکن کیا شادی اُس سے ہوئی؟ نہیں نا۔ ہم لڑکیوں کی پسند کو کہاں ترجیح دی جاتی ہے اسی لیے تم بھی خوش ہو جاؤ۔"

زینب گل کہتے کہتے اس کے قریب آ گئی، اس کے لہجے میں نرمی تھی مگر حقیقت کی سختی بھی۔

مومنہ خاموش رہی۔ آئینے میں اس کی آنکھیں نم تھیں، مگر ہونٹوں پر خاموشی کی زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی، زینب گل غلط نہیں کہہ رہی... مگر دل ماننے کو تیار نہیں تھا۔

کمرے میں موجود ہر چیز زیور، کپڑے، خوشبو، روشنی سب اپنی جگہ تھی، بس مومنہ کے اندر کہیں کچھ ٹوٹ سا گیا تھا، جو شاید اب ہمیشہ کے لیے خاموش رہنے والا تھا۔

مومنہ جانتی تھی کہ گل جھوٹ بول رہی ہے۔

اُسے کوئی اور پسند تھا، اور اب وہ سب کے سامنے خوش رہنے کا لبادہ اوڑھے کھڑی تھی۔

مسکراہٹ اس کے چہرے پر تھی، مگر دل کے کسی کونے میں دفن سچ ابھی بھی سانس لے رہا تھا

وہ سچ جسے وہ خود بھی ماننے سے ڈرتی تھی۔

پھر وہ لمحہ آہی پڑا جس کا سب کو بے صبری سے انتظار تھا۔

ایک ایک کر کے سب لڑکیاں دلہن کے کمرے میں داخل ہو گئیں اور خوشی سے بولیں کہ آپ کا دلہا بارات لے کر آ گیا ہے۔

گل نے سب کی طرف دیکھا، آنکھوں میں شرارت سی چمکی، اور پنجابی لہجے میں ہنستے ہوئے بولی:

"چلو اے ناسو، ادھر و... ایتھے کوئی دلہن نہیں ہے گی"!

یہ کہتے ہوئے وہ مسکرا دی، جیسے اس لمحے کی سنجیدگی کو بھی ہنسی میں لپیٹ لینا چاہتی ہو۔

پھر اس نے آہستہ سے مومنہ کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

اسی لمحے نسیم بی بی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"ماشاءاللہ! میری بیٹی کتنی پیاری لگ رہی ہے... کیا خوب تیار کیا ہے تم نے اسے، گل"!

انہوں نے اپنی پھول جیسی بیٹی کو دیکھ کر کہا۔

وہ جانتی تھیں کہ مومنہ کس کیفیت سے گزر رہی ہے، مگر وہ اپنے شوہر طارق انور کا حکم ٹالنے کی ہمت نہیں رکھتی تھیں۔

" چلو بیٹا، نیچے سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں... اور آخرکار تمہارا ہونے والا محرم بھی۔"

یہ کہتے ہوئے وہ مسکرا دیں، حالانکہ اس مسکراہٹ کے پیچھے ماں کا دل کانپ رہا تھا۔

مومنہ طارق ایک عالمہ تھی۔

یونیورسٹی میں بھی اس نے کبھی حیا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

سب لڑکیاں اس سے جلتی تھیں

وہ کسی مرد کے قریب نہیں جاتی تھی، اور اگر کوئی حد بڑھاتا تو اس کے منہ پر صاف صاف کہہ دیتی: نامحرم۔

وہ ہمیشہ یہی کہتی تھی کہ اسے اپنے محرم کا انتظار ہے۔

وہ کسی اور مرد کی طرف دیکھے گی بھی نہیں۔

وہ ایک ہائی ویلیو وومن تھی

اور آج اسی حیا، اسی وقار، اسی صبر کے ساتھ وہ ایک ایسے رشتے کی دہلیز پر کھڑی تھی

جہاں دل خاموش تھا...

اور تقدیر بول رہی تھی۔

"سب چلی جاؤ"!

مومنہ نے لڑکیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

سب لڑکیاں گھبرا گئیں۔

"وہ مومنہ آپی ہم سے دور ہو جائے گی نا؟ اسی لیے تو یہ بول رہی ہیں"!

زینب گل نے سب کو سکون دلانے کی کوشش کی اور پھر تمام لڑکیوں کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ اس نے کمرے کی کنڈی بند کی تا کہ لمحہ مکمل طور پر مومنہ کے لیے محفوظ رہے۔

"یہ کیسے بول رہی ہو تم، مومنہ ؟"

نسیم بی بی فوراً بولیں، حیرت اور فکر کے ملا جُلا اظہار تھا۔ وہ اپنی بیٹی کے اس رویے کو دیکھ کر پریشان تھیں۔

" آپ جانتی ہیں، امی، یہ صحیح نہیں ہے"...

مومنہ کی آواز اداس تھی، اور نظریں نیچی تھیں۔

"تو بیٹا، صحیح کیا ہے؟ ویل سیٹلڈ لڑکا ہے، اپنا گھر، گاڑی، ماں باپ بھی نہیں ہیں اس کے، ساس کی لڑائی سے بھی نجات ملے گی تمہیں۔"

نسیم بی بی نے فوراً کہا، جیسے مومنہ کی اندرونی کشمکش ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

"تم خود کہتی تھیں کہ تم نیک عورت ہو، اور اب شادی والے دن اپنی والدین کا نام خراب کرو گی؟

اچھی اولاد بنو اور اپنا فرض پورا کرو، نہیں تو تمہارے باپ کا کیا پتہ... کتنے نازک دل کے ہیں! اگر اُنہیں کچھ ہو گیا تو"...

نسیم بی بی کی آواز میں محبت کے ساتھ سختی بھی تھی۔

"نہیں نہیں، امی... میں انہیں ایسا نہیں دیکھنا چاہتی۔"

مومنہ نے اداسی سے کہا۔

زینب گل انہیں دیکھ رہی تھی۔

وہ مومنہ کی گفتگو میں شامل ہونا چاہتی تھی، مگر خاموش رہی۔

شاید یہ ضروری نہیں تھا، یا شاید اس کی ہمت ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

بارات پہنچ چکی تھی، اور دلہا نیچے اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

اسی لمحے دروازے پر ہلکی دستک ہوئی۔

"چلو، جلدی کرو... سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں، بیٹا"!

یہ طارق انور تھے، اپنی بیٹی کو بتانے کے لیے آئے۔

"میں جانتا ہوں لڑکیاں دیر سے تیار ہوتی ہیں،

مگر اب اتنی دیر بھی تو نہیں ہونی چاہیے"...

وہ دروازے کے پاس لگ کر مسکرائے، اور مومنہ کا بچپن یاد کر رہے تھے۔

مومنہ کا دین سے لگاؤ بہت زیادہ تھا۔

جب سے اس نے شعور پایا، اسلام کو دل سے اپنانا شروع کیا۔

سات سال کی عمر سے ہی اُس نے حیا کا دامن تھام لیا اور برقعہ پہننا شروع کر دیا۔

تمام رشتہ دار، طارق اور نسیم سے یہی کہتے رہتے تھے کہ وہ اپنی بیٹی کو پرانے زمانے کے انداز میں پروان چڑھا رہے ہیں۔

مومنہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی، اور ان کی اُمیدیں بھی اُس سے بہت زیادہ تھیں۔

ہر چھوٹے بڑے فیصلے میں والدین کا دل لگتا، اور آج کا دن بھی اُن کے لیے خاص تھا بیٹی کی شادی، اُس کی خوشیوں کا لمحہ، اور والدین کی فکری ذمہ داری کا ملاپ۔

"اندی پی اے، اوہ تھلے چلو تسی طارق صاحب"!

نسیم بی بی نے آواز دے کر کہا۔

طارق انور خاموشی سے سیڑھیاں اُتر گئے، قدم قدم پر دل کی دھڑکن اور عاجزی جھلک رہی تھی۔

نیچے اترتے ہی سب مہمان ایک دوسرے سے ملنے لگے، خوشیوں اور مصروفیت کے شور میں گھر کا ماحول گونج اٹھا۔

اب مومنہ دھیرے دھیرے نیچے اتری۔

اس نے سرخ رنگ کا لہنگا پہنا ہوا تھا، جس پر سنہری دھاگے روشنی میں چمک رہے تھے۔ ہر قدم کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی، اور پیچھے سے سُر اور سُنگیت کی ہلکی دھنیں کمرے کے ماحول کو بھر رہی تھیں، جیسے ہر ساز اس کے احساسات کو محسوس کر رہا ہو۔

وہ جا کر اسٹیج پر بیٹھی اور سامنے نظر اپنے ہونے والے شوہر پر ڈالی۔

جب اس نے اُسے دیکھا، تو اس کے ہوش اڑ گئے۔

جس شخص کو تصویر میں دیکھا گیا تھا، وہ کافی جوان لگتا تھا، مگر حقیقت میں تقریباً 50 سال کا معلوم ہو رہا تھا۔

مومنہ کا دماغ گھوم رہا تھا، جسم کانپ رہا تھا، اور وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔

اس کی عمر صرف 24 سال تھی، اور اسے بتایا گیا تھا کہ اس کا شوہر 30 سال کا ہے مگر یہ سب اس کے ساتھ سراسر دھوکہ تھا۔

اس لمحے مومنہ کی آنکھوں میں خوف، حیرت، اور بے بسی کا امتزاج تھا۔

دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی کہ لگتا تھا پورے جسم میں گونج رہی ہے۔

ہاتھ کانپ رہے تھے، دل دباؤ میں تھا، اور ذہن ہر طرف سے اس کی سمجھ سے باہر محسوس کر رہا تھا۔

اسی وقت قاضی صاحب آئے اور نِکاح پڑھنا شروع کیا۔

انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا:

"فلک ولد شبیر کا نِکاح مومنہ ولد طارق کے ساتھ شریعت کے مطابق کیا جاتا ہے۔ کیا آپ قبول کرتی ہیں؟"

مومنہ خاموش رہی، کچھ نہ بولی، جیسے کہیں کھو گئی ہو۔

تب نسیم بی بی نے نرم لہجے میں آواز دی:

"بیٹا، سب آپ کی مرضی سے ہو رہا ہے... کہاں کھو گئی ہو آپ؟"

یہ سنتے ہی مومنہ کو ہوش آیا۔

اس نے دھیرے سے کہا:

"قبول ہے"...

اس کے سانس تیز ہو چکے تھے، دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، اور ہاتھ اتنے کانپ رہے تھے کہ قلم پکڑنا بھی مشکل تھا۔

نِکاح کے کاغذات سامنے رکھے گئے اور دستخط کرنے کو کہا گیا۔

دستخط کرتے وقت پورے جسم میں ایک عجیب سا درد اور بے بسی محسوس ہو رہی تھی، ہر لفظ جیسے دل سے ٹوٹ کر نکل رہا ہو۔

اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے، نگاہ کے سامنے سب کچھ دھندلا سا ہو گیا تھا، کاغذ پر قلم رکھے ہوئے بھی اس سے قلم چل نہیں پا رہا تھا۔ سانس بے ترتیب ہو چکی تھی، جیسے سینہ بوجھ تلے دب گیا ہو۔

تب اس کی نظر سامنے بیٹھی ہوئی ہستی پر پڑی

طارق انور۔

وہ مسکرا رہے تھے...

ایک مطمئن، پُر اُمید مسکراہٹ، جو ایک باپ کی دعا اور یقین سے بھری ہوئی تھی۔

مومنہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

اسی لمحے اس نے سمجھ لیا کہ اب یہ فیصلہ اس کا نہیں رہا۔

اس نے اپنے دل کی آواز کو خاموش کیا،

خود کو پیچھے رکھا،

اور ایک قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا۔

قلم دوبارہ کاغذ پر رکھا،

ہاتھ اب بھی کانپ رہے تھے،

مگر اس بار قلم چل گیا۔

اور یوں اس نے دستخط کر دیے۔

مگر اب فیصلہ ہو چکا تھا، اور واپس مڑنا ممکن نہیں تھا۔

24 سالہ مومنہ کی زندگی میں ایک نیا باب شروع ہو گیا تھا

مومنہ طارق کی شادی، 52 سالہ فلک شبیر سے، ہو چکی تھی۔

مومنہ کے دل میں کئی سوال گونج رہے تھے: یہ شادی، یہ فیصلہ، یہ دھوکہ سب کچھ اس کے لیے ایک بھاری بوجھ بن چکا تھا۔

آنسو چھپانے کی کوشش میں اس کے ہاتھ اور بھی کانپنے لگے، مگر باہر سے وہ خاموش اور حیادار نظر آ رہی تھی۔

وہ کبھی یہ بات نہیں سمجھ سکی کہ "اجنبیوں سے بات نہ کرو" مگر پھر شادی کر لو کسی اجنبی سے۔ کوئی ایسا شخص جو آپ کے والدین نے بس چائے کے کپ کے دوران چن لیا ہو۔ کوئی جو آپ کے بارے میں، آپ کے خوابوں کے بارے میں، یا آپ کی زندگی کے انداز کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔

صرف اس لیے کہ کوئی چیز پرانی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ درست ہے۔ وقت بدل گیا ہے، شاید سوچ بھی بدلنی چاہیے۔

لیکن اب اسے اُس بڑے شخص کو قبول کرنا تھا۔

دل بھاری تھا، سانسیں تیز، اور ہر لمحہ ایک کشمکش کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔

دل چاہتا تھا کہ وقت رک جائے، مگر حقیقت واضح تھی اب فیصلہ ہو چکا تھا، اور اس کے لیے واپس مڑنا ممکن نہیں تھا۔

"ویسے یہ محرم کیا ہوتا ہے، بابا؟"

ننھی مومنہ نے تجسس بھری آنکھوں سے طارق انور سے پوچھا۔

طارق انور نے مسکرا کر کہا،

"واہ، ماشاءاللہ، بہت اچھا سوال ہے بیٹا"...

نسیم بی بی اور طارق انور نے اسے نرمی اور محبت کے ساتھ سمجھایا۔

"بیٹا، محرم وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے ساتھ تمہارے لیے اللہ کی ہدایت کے مطابق تعلق محفوظ ہو،

ایسے لوگ جن کے سامنے تم بلا خوف اور بلا شرمندگی رہ سکو، اور جن کے ساتھ شادی یا رومانوی تعلق ہر گز جائز نہ ہو۔

تمہارے والد، والدہ، بھائی، بہن، دادا، دادی یہ سب تمہارے محرم ہیں۔

اور غیر محرم وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ تمہیں ہمیشہ حد و حیا کا خیال رکھنا ہو گا، جن کے بارے میں تمہیں مکمل معلومات نہیں ہیں۔"

طارق انور نے پھر ایک لمحے کے لیے رک کر کہا،

"لیکن شوہر بھی تمہارا محرم بن سکتا ہے،

وہ محرم جسے تم خود چنو، جو تمہاری مرضی سے تمہارا ہو

تمہارا اپنا محرم، جس کے سامنے تم اعتماد اور حیا دونوں کے ساتھ کھڑی ہو سکو۔"

ننھی مومنہ نے اندر ہی اندر دل میں سوچا: میرا اپنا محرم؟ وہ جسے میں خود چُنوں؟

اس خیال نے اس کے دل میں تجسس اور امید دونوں پیدا کر دیے۔

وہ کبھی یہ نہیں سوچ سکی تھی کہ ایک دن اسے اپنے محرم کو خود چننے کا حق ملے گا۔

یہ بات اس کے دل میں ایک چھپی ہوئی خوشی کی روشنی کی طرح جگمگا رہی تھی، مگر ساتھ ہی ایک عجیب سا خوف بھی تھا یہ خود چننے کا حق کتنا حقیقی ہو سکتا ہے، اور کیا وہ واقعی خوش رہ سکے گی؟

لیکن اس کی خوشیوں پر جیسے کسی نے ٹھنڈا پانی پھیر دیا تھا۔

وہ محرم جس کے خواب اس نے دل میں سجائے تھے، وہ محرم جس کے لیے

اس نے خود کو سنبھال کر رکھا تھا،

وہ اس کا اپنا انتخاب نہیں تھا...

وہ اس کے ماں باپ کا چُنا ہوا فیصلہ تھا۔

مومنہ نے ساری زندگی خود کو لڑکوں سے دُور رکھا۔

نہ کبھی بے حجابات، نہ نظریں، نہ مسکراہٹیں، نہ چھپے ہوئے پیغامات۔

حرام تعلقات سے اس نے ایسے منہ موڑا تھا جیسے آگ سے۔

وہ فخر سے کہتی تھی کہ

"مجھے اپنے محرم کا انتظار ہے۔"

اس نے اپنے نفس کو روکا،

دل کے شور کو دبایا،

خواہشوں کو دعامیں بدل دیا۔

یہ سوچ کر کہ ایک دن

وہ محرم آئے گا

جسے وہ خود پسند کرے گی،

جس کے ساتھ نِکاح صرف ایک رسم نہیں بلکہ سکون ہو گا۔

مگر آج...

وہ سب کچھ کرنے کے باوجود ہار گئی تھی۔

نِکاح ہو چکا تھا،

لفظ "قبول ہے" اس کی زبان سے نکل چکا تھا،

اور شرعاً وہ شخص اس کا محرم بن چکا تھا

مگر دل ماننے سے انکار کر رہا تھا۔

یہ سوال اسے اندر ہی اندر کھا رہا تھا:

کیا پاک رہنے کا صلہ یہی تھا؟

کیا خود کو بچانے کا انجام یہ تھا کہ میرا اختیار ہی مجھ سے چھین لیا جائے؟

وہ غلط نہیں تھی،

مگر خوش بھی نہیں تھی۔

اور شاید یہی سب سے بڑا المیہ تھا۔

اولاد کی مسکراہٹیں اکثر قربانی کے آنسوؤں میں چھپی ہوتی ہیں، جو والدین کی خوشیوں کے لیے دی جاتی ہیں۔

برطانیہ میں پاکستانی مرد اور عمومی طور پر جنوبی ایشیائی مرد سماجی اور ازدواجی زندگی میں کئی مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں، اور یہ صورتحال زیادہ تر غیر شرعی تعلقات یعنی زِنا کے بڑھتے ہوئے کلچر سے مزید پیچیدہ ہو گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ برطانیہ میں ایک پاکستانی مرد کے لیے زِنا میں ملوث ہونا تب ہی ممکن ہے جب وہ انتہائی خوبصورت، لمبے قد کا حامل ہو اور اپنی اصلی نسلیت چھپا کر خود کو کسی مشرقِ وسطیٰ یا ایرانی شناخت کے ساتھ پیش کرے، اور تب بھی یہ تعلقات عموماً وقتی لذت تک محدود رہتے ہیں اور دیرپا خوشی یا سکون نہیں دیتے۔ پاکستانی اور بھارتی خواتین اپنی جوانی میں زیادہ تر غیر دیسی مردوں کے ساتھ غیر شرعی تعلقات میں ملوث ہوتی ہیں اور دیسی مردوں

سے فاصلہ رکھتی ہیں، اور صرف وہی مرد اس دائرے میں داخل ہو پاتے ہیں جن کا تعلق جرائم، ٹھگ طرزِ زندگی یا منشیات اور شراب کی فراہمی سے ہو۔ تیس سال کی عمر کے بعد، جب یہ خواتین شادی کے لیے تیار ہوتی ہیں، تو عموماً ایک محنتی، مستحکم اور باعزت دیسی مرد کا انتخاب کرتی ہیں، مگر اکثر شادی کے بعد بھی زِنا کا سلسلہ جاری رہتا ہے، جو ازدواجی زندگی کے سکون اور اعتماد کو تباہ کر دیتا ہے اور خاندان کو اندر سے کمزور کر دیتا ہے۔ قدامت پسند گھریلو ماحول میں پالی جانے والی لڑکیاں شادی کے ذریعے اپنے سخت والدین سے نجات پاتی ہیں، مگر شادی کے بعد آزادی کے نام پر زِنا اور غیر اخلاقی تعلقات شروع کر دیتی ہیں، اور شوہر اکثر اپنی عزت، غیرت اور جذباتی طاقت کھو بیٹھتا ہے، صرف اس امید میں کہ مہینے میں کبھی کبھار تعلق قائم ہو سکے۔ اس پورے عمل میں مرد ذہنی دباؤ، نفسیاتی پریشانی اور بعض اوقات انتہا پسند رویّوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، اور یہ سماج کے لیے ایک خطرناک مثال بن جاتا ہے۔ کچھ تیسری نسل کے پاکستانی مرد پاکستان سے شادیاں لاتے ہیں تاکہ اس خطرناک چکر سے بچ سکیں، مگر یہ راستہ بھی اب خطرناک ہو گیا ہے کیونکہ بعض خواتین شادی کو محض بیرونِ

ملک رہائش کے حصول کا ذریعہ بنا کر زِنا، دھوکہ اور جھوٹے الزامات کے ذریعے طلاق تک لے جاتی ہیں۔ سب سے تشویشناک حقیقت یہ ہے کہ یہ زِنا کا وائرس اب پاکستان میں بھی سرایت کر رہا ہے، خاص طور پر جامعات، دفاتر اور وہ مقامات جہاں مرد اور عورت بغیر حدود کے اکٹھے کام یا تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہاں یہ خطرہ بڑھ رہا ہے اور نوجوان نسل کی تربیت، اخلاقی بنیادیں اور خاندانی نظام متاثر ہو رہا ہے۔ اسلام نے زِنا کو نہ صرف گناہ بلکہ معاشرتی اور نفسیاتی تباہی قرار دیا ہے، اور قرآن میں صاف کہا گیا ہے کہ "زِنا کے قریب بھی مت جاؤ"۔ زِنا وقتی لذت دے کر انسان کی روح، شخصیت اور خاندان کو تباہ کر دیتی ہے، اور اس سے بچنے کے لیے مرد اور عورت دونوں کو حیا، حدود، اخلاقی اصول اور نکاح کے راستے اپنانے ضروری ہیں، تاکہ فرد، خاندان اور معاشرہ محفوظ اور مضبوط رہے۔

شاہویر ریاض ارمان کی لیب کے باہر پہنچا۔ ارمان وہاں پہلے سے کھڑا تھا، اس کی آنکھوں میں معمولی تشویش اور مسکراہٹ کا عجیب سا ملا جلا رنگ تھا۔ لیب سے فارغ ہو کر آرمان نے شاہویر کے لیے برگر لے رکھا تھا۔ دونوں

آہستہ آہستہ چلتے ہوئے برگر کھانے لگے، لیکن ان کے درمیان خاموشی کی بھاری ہوا محسوس ہو رہی تھی۔

"یوکے کی زندگی اور پاکستان کی زندگی کیسی ہے؟" ارمان نے سوال کیا، لیکن اس کے لہجے میں ہلکی سی بے چینی بھی تھی۔

شاہویر نے کچھ دیر اداس نگاہوں سے زمین کی طرف دیکھا اور اپنی یوکے کی زندگی کہ بارے میں سوچنے لگا پھر دھیرے سے کہا، "اب تو دونوں ہی زندگیاں ایک جیسی ہو گئی ہیں، پاکستان بھی اب یورپ بن رہا ہے۔" اس کے لفظوں کے پیچھے ایک غیر مرئی دکھ چھپا ہوا تھا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہا، جیسے اپنے اندر کی بھاری کیفیت کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر آہستہ سے اس نے اپنا منہ کھولا۔

"ویسے، مجھے ایک چیز پتہ چلی ہے..." شاہویر نے کہا۔

"کیا؟" ارمان نے برگر کا ایک بائٹ لیتے ہوئے پوچھا۔ دونوں دوست چلتے ہوئے پارکنگ کی طرف جا رہے تھے، ہر قدم پر ایک خاموش کشمکش محسوس ہو رہی تھی۔

شاہویر نے کچھ لمحے رک کر کہا، "ویسے شاید وہ اتنی خاص بات بھی نہیں ہے..." پھر اچانک خاموش ہو گیا، جیسے اپنے دوست کو تکلیف نہ دینا چاہتا ہو۔

ارمان نے تیزی سے کہا، "جلدی بول، کیا مسئلہ ہے؟" وہ کار کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا اور دروازے کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن دل کی دھڑکنیں تیز تھیں، کچھ عجیب سا خوف اور انتظار اس کے اندر گھل رہا تھا۔

شاہویر نے سانس بھرتے ہوئے کہا، "مومنہ کی شادی ہو گئی، بھائی..." پھر دوبارہ خاموش ہو گیا۔ وہ خود بھی گھبراہٹ میں تھا، دل پر ایک عجیب بوجھ محسوس کر رہا تھا۔

ارمان کی آنکھیں فوراً بڑے ہو گئیں، دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھ نہیں پایا کہ وہ کیا سن رہا ہے۔ یہ تاریخ، 8 دسمبر، وہ دن تھا جو اس کی زندگی میں ہمیشہ کے لیے ایک نشان چھوڑ گیا۔ آج بھی وہ تاریخ یاد تھی، اور اب اسے پتہ چلا کہ اس کی محبوبہ، وہ جس سے دل جڑا ہوا تھا، اس کی شادی ہو چکی تھی۔

"اچھی بات ہے... کبھی نہ کبھی تو ہونی ہی تھی"...

ارمان نے یہ الفاظ اس طرح کہے جیسے وہ کسی اور سے نہیں، خود سے بات کر رہا ہو۔ اس کی آواز میں نہ غصہ تھا، نہ حیرت، بس ایک تھکی ہوئی قبولیت تھی۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا اور خاموشی سے اندر بیٹھ گیا، جیسے یہ خبر اس کے لیے نئی ہی نہ ہو۔

شاہویر وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس کا دل ایک لمحے کو ڈوب سا گیا۔ یہ وہ ردِ عمل بالکل نہیں تھا جس کی اس نے تیاری کی تھی۔ نہ چیخ، نہ سوال، نہ ٹوٹتا ہوا لہجہ... کچھ بھی نہیں۔

بس ایک عجیب سا سکون، جو اصل میں سکون نہیں بلکہ ٹوٹ جانے کے بعد کی خاموشی تھا۔

شاہویر کے ذہن میں سوال چیخنے لگے۔ اگر یہ خبر اتنی عام تھی تو ارمان کی آنکھیں اتنی خالی کیوں تھیں؟ اگر یہ دکھ پرانا تھا تو آواز اتنی بوجھل کیوں تھی؟

وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ کیسا درد ہے جو شور نہیں کرتا، جو بس اندر ہی اندر سب کچھ جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔

وہ آہستہ سے کار کے دوسرے دروازے کے پاس آیا، مگر ہاتھ ہینڈل تک جا کر رک گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کسی ایسے شخص کے پاس بیٹھنے جا رہا ہو جو ابھی ابھی اندر سے ٹوٹا ہو، مگر جس نے ٹوٹنے کی اجازت بھی خود کو نہ دی ہو۔

پارکنگ میں روشنی ویسی ہی تھی، لوگ ویسے ہی آ جا رہے تھے، زندگی ویسے ہی چل رہی تھی...

مگر ارمان کے لیے وقت وہیں رک گیا تھا 8 دسمبر پر۔

شاہویر کے دل میں ایک عجیب سی گھبراہٹ اتر آئی۔

یہ صرف ایک شادی کی خبر نہیں تھی۔

یہ کسی کہانی کا انجام نہیں تھا۔

یہ کسی ایسی کہانی کا زخم تھا

جس کے بارے میں وہ ابھی کچھ جانتا ہی نہیں تھا۔

اور یہی بات سب سے زیادہ ڈرا دینے والی تھی۔

"کتنی محبت کی میں نے اس سے"...

وہ گاڑی چلاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بول رہا تھا۔

شاہویر خاموشی سے اسے سنتا رہا، جیسے ہر لفظ اس کے دل پر وزن بن کر گر رہا ہو۔

"سب سے پہلے محبت کا اظہار بھی اسی نے کیا تھا"...

ارمان نے غصے سے شاہویر کی طرف دیکھا۔ شاید اس لمحے میں اسے ارمان کو مومنہ کی شادی کے بارے میں نہیں بتانا چاہیے تھا۔

شاہویر کے ذہن میں کئی سوال گردش کر رہے تھے، مگر وہ خاموش رہا۔

ادھر ارمان گاڑی کی رفتار تیز کرتا جا رہا تھا،

ہر گاڑی کو خطرناک کٹ مارتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا،

جیسے سڑک نہیں بلکہ اپنے غصے کو چیرتا جا رہا ہو۔

"بھائی، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ خود کو سنبھالیں"...

شاہویر نے گھبرا کر کہا،

"وہ بعد میں خود منع کر کے گئی تھی آپ کو"...

"تم ہمیشہ سے مجھ سے جلتے تھے شاہویر، کیونکہ وہ تم سے نہیں مجھ سے محبت کرتی تھی۔" ارمان کے یہ الفاظ غصے میں کہے گئے تھے وہ اپنا دماغی توازن کھو چکا تھا اور اس سب کا قصوروار شاہویر کو ٹھہرا رہا تھا

شاہویر کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ارمان ایسا کیوں سوچ رہا ہیں ارمان کو اپنا سچے دل سے دوست مانتا تھا۔

لیکن شاید ارمان نہیں۔

دنیا کا سب سے مشکل امتحان تب ہوتا ہے،

جب آپ جانتے ہوں کہ آپ کا دوست غلط راستہ چن رہا ہے،

آپ اُسے سمجھاتے ہیں مگر وہ سمجھنے کو تیار نہ ہو،

اور الٹا آپ کو یہ سننا پڑے

کہ آپ اُس سے جل رہے ہیں۔

گاڑی کی رفتار اور ارمان کی سانسیں

دونوں بے قابو ہو چکی تھیں۔

دوسری طرف، مومنہ شادی کے بعد اپنے شوہر کے گھر پہنچی۔

وہ بیڈ پر بیٹھی تھی، دمک دار لباس میں اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ ہر کوئی اسے دیکھ کر رشک کرتا۔

مگر اس کے ذہن میں کئی گلے شکوے اور تلخیوں کے سمندر موجزن تھے۔

وہ بیڈ پر بیٹھی، آنکھوں میں اداسی اور دل میں خوف لیے، خاموشی سے رو رہی تھی۔

تبھی فلک شبیر کمرے میں داخل ہوا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"گھر والوں کی یاد آ رہی ہے؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

52 سالہ شوہر اور 24 سالہ بیوی، دونوں کے درمیان فاصلے کے باوجود اس کے ہاتھ کو چھوا۔

مومنہ نے کوئی ردعمل نہیں دیا، جیسے وہ جسمانی طور پر تو موجود ہو مگر روح کہیں اور۔

اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے، بیڈ پر گرنے لگے، کبھی تھوڑے تھوڑے قطرے، کبھی مسلسل بہنے لگے۔

فلک نے اسے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے گلے لگا لیا۔

مومنہ کا پورا جسم کانپ اٹھا، دل کی دھڑکن تیز، اور وہ زور زور سے ہچکیاں لینے لگی۔

دل میں خوف، بے بسی اور صدمہ تھا

ایک طرف شادی کا بندھن، دوسری طرف اپنے اختیار کی کمی اور اندر کا صدمہ۔

یہ لمحہ ایک طرح کی خاموش کشمکش بن گیا،

جہاں جسم موجود تھا مگر دل اور دماغ اپنے احساسات کے طوفان میں اڑ رہے تھے۔

مومنہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اگر فلک اس کے پاس رہا تو وہ مر جائے گی۔

سانس گھٹنے لگی تھی، سینہ بوجھل ہو گیا تھا، اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اس کے لیے یہ قربت نہیں تھی، یہ خوف تھا

ایک ایسا خوف جو لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔

وہ خود کو سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی،

مگر جسم اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

ہچکیاں تھمنے کے بجائے اور تیز ہو گئیں،

جیسے اندر کہیں کچھ ٹوٹ کر بکھر رہا ہو۔

"مجھے… مجھے تھوڑی دیر اکیلا چھوڑ دیں"…

وہ بمشکل بول پائی، آواز لرزتی ہوئی، آنکھیں جھکی ہوئیں۔

فلک ایک لمحے کو ٹھٹھک گیا۔

اس نے مومنہ کی حالت دیکھی

کانپتا وجود، بے قابو آنسو، اور خوف سے بھری خاموشی۔

وہ آگے بڑھا،

جیسے پہلی بار اسے احساس ہوا ہو

کہ یہ صرف ایک نئی دلہن نہیں،

بلکہ ایک ضدی، بے خوف اور اپنے فیصلے خود کرنے والی لڑکی ہے۔

وہ اس سے بہت ڈر رہی تھی

اور بار بار اسے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

مومنہ بیڈ کے کنارے سمٹ کر بیٹھ گئی،

آنکھیں بند کر لیں،

اور دل ہی دل میں بس ایک ہی دعا کی

کہ یہ رات جلد گزر جائے۔

مگر اسے کیا خبر تھی

کہ کچھ راتیں گزرتی نہیں،

انسان کے اندر بس جاتی ہیں۔

"تم میری بیوی ہو، تم پر مجھے پورا حق ہے"!

فلک نے غصے میں کہا، آواز میں طاقت اور ملکیت کی جھلک تھی۔

وہ اپنا حق جتا رہا تھا،

بالکل ایسے

جیسے مومنہ کو خرید کر لایا ہو

جہاں انسان نہیں،

صرف ملکیت بولتی

اُسے یقین تھا کہ اگر بیوی پر پہلے ہی دن دباؤ ڈال دیا جائے،

تو وہ دباؤ ساری زندگی اس کی گردن پر قائم رہتا ہے

خاموشی میں، خوف میں، اور مجبوری میں۔

اور دوسری طرف جس کا ڈر تھا، وہی ہوا

گاڑی کے بریک فیل ہو گئے۔

"بھائی، گاڑی روکو"!

شاہویر کی آواز میں خوف اور ہچکچاہٹ تھی، ہاتھ اور پاؤں کانپ رہے تھے، دل کے دھڑکنے کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی۔

"کوشش کر رہا ہوں، لیکن رک نہیں رہی"!

ارمان نے پوری طاقت سے گاڑی کو سنبھالنے کی کوشش کی،

مگر سڑک پر ہر لمحہ موت کا سایہ بڑھتا جا رہا تھا،

اور سامنے والا کھمبہ تیز رفتاری سے قریب آ رہا تھا۔

دونوں کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے،

سانسیں بے قابو، ہاتھ پسینے سے شرابور،

اور دماغ میں ایک عجیب سا خلا، جیسے ہر لمحہ زندگی کی آخری سانس ہو۔

ارمان کے دل میں خوف، غصہ اور خود سے نفرت کا طوفان تھا،

وہ خود کو کوس رہا تھا کہ کیسے یہ سب ہوا، کیسے وہ سب کچھ قابو میں نہیں رکھ سکا۔

شاہویر کے دل میں ایک بے بسی تھی،

ایک ایسا خوف جو لفظوں میں نہیں آتا، صرف آنکھوں اور جسم کی ہر حرکت میں جھلکتا ہے۔

اور پھر، وہ لمحہ آ ہی گیا

گاڑی کھمبے سے ٹکرائی۔

ٹکر کا جھٹکا، دھات کی چیخ، شیشہ ٹوٹنے کی آواز، اور دو انسان جو لمحوں میں لحم ہو گئے۔

ارمان کی آنکھیں بند ہو گئیں، دل کی دھڑکنیں بے قابو،

شاہویر کی سانسیں بھاری اور بے ترتیب ہو گئیں۔

موت... آخر موت کیا ہے؟

کیا یہ صرف ایک لمحہ ہے، یا ایک مکمل زندگی؟

کیا یہ درد ہے، یا سکون؟

اور اس کے بعد، کیا ہوتا ہے؟

کہتے ہیں، جب انسان مرنے والا ہوتا ہے،

اس کے دماغ میں سات منٹ کے لیے اس کی زندگی کی سب سے خوبصورت یادیں چلتی ہیں

وہ لمحے، جو ہم نے دل سے محسوس کیے،

وہ خوشبو، وہ مسکراہٹیں، وہ درد، وہ محبت، وہ چھوٹی چھوٹی کامیابیاں،

سب ایک ساتھ دماغ میں رقص کرنے لگتے ہیں،

اور انسان اپنے آپ کو، اپنی پوری زندگی کو ایک لمحے میں دیکھتا ہے۔

ارمان کی آنکھوں کے سامنے گزری زندگی،

شاہویر کی بے بسی اور خوف،

ہر ہنسی، ہر غلطی، ہر لمحہ

سب ایک ایک کر کے اس کے دل میں رقص کرنے لگے۔

گاڑی کھمبے سے ٹکرانے کے بعد رک گئی،

لیکن اندرونی طوفان رکا نہیں۔

دونوں کے دل، دماغ، اور جسم ابھی بھی موت کے کنارے کھڑے تھے۔

وقت، سانس، اور ہر لمحہ ایک ہی سوال دہرا رہا تھا

ارمان اور مومنہ کا کیا تعلق تھا؟

"کبھی سیکس کیا ہے؟"

سکندر نے سامنے بیٹھے اپنے دوست سے اچانک پوچھا۔ دونوں لاہور میں واقع کوئٹہ ہوٹل کے کونے والی میز پر بیٹھے تھے۔ سردیوں کی ہلکی دھند میں چائے کے کپ سے اٹھتی بھاپ ماحول کو مزید سنجیدہ بنا رہی تھی۔

دانیال نے چونک کر سکندر کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے بولا، "نہیں... میں کیسے کر سکتا ہوں؟ ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔"

سکندر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ "اس کے لیے اب شادی کی ضرورت نہیں رہی،" اس نے بے فکری سے کہا۔ "آج کے دور میں ویسے بھی مرد کے لیے شادی آسان کہاں ہے؟ پہلے خود کو اسٹیبل کرو، گھر لو، ذمہ داریاں اٹھاؤ... اتنے نخرے کون پالے؟"

دانیال نے چائے کا گھونٹ لیا اور گہری سانس کے ساتھ کہا، "بات تو ٹھیک ہے سکندر، لیکن یہی تو المیہ ہے۔ جس نکاح کو اسلام نے آسان بنایا تھا، ہم نے اسے اتنا مشکل کر دیا ہے کہ گناہ آسان اور حلال مشکل ہو گیا ہے۔"

وہ دونوں اچھے دوست تھے۔ اکثر یہاں آ کر چائے پیتے اور کسی نہ کسی موضوع پر بحث کرتے، مگر آج کی گفتگو میں عجیب سا بوجھ تھا۔

"ویسے سکندر... تم نے کبھی کیا ہے؟"

دانیال نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔

سکندر خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی، جیسے وہ جان بوجھ کر دانیال کو الجھا رہا ہو۔ اسی لمحے اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی اور فون کو نظر انداز کر دیا۔

"دیکھو تو سہی، کون ہے؟" دانیال نے کہا۔

"ان نون نمبر ہے... کوئی اسکیمر ہی ہو گا،" سکندر نے لاپرواہی سے جواب دیا اور دوبارہ چائے کا گھونٹ لیا۔

"پھر بھی ایک بار دیکھ لینے میں کیا جاتا ہے؟"

"اچھا بابا، دیکھتا ہوں۔"

سکندر نے کال اٹینڈ کی۔ چند ہی لمحوں میں اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مسکراہٹ غائب ہو گئی، آنکھیں ساکت ہو گئیں، اور ہاتھ بے اختیار کپکپانے لگا۔

"کیا ہوا؟" دانیال گھبرا کر بولا۔

سکندر نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بمشکل کہا:

"ارمان اور شاہویر کا... ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی، مگر اس لمحے دونوں کے لیے دنیا اس سے کہیں زیادہ سرد ہو گئی تھی۔

سکندر نے فون بند کیا تو اس کا ہاتھ دیر تک کانپتا رہا۔ دانیال نے کچھ پوچھنا چاہا، مگر الفاظ زبان تک آ کر رک گئے۔ چند لمحے دونوں خاموش بیٹھے رہے، جیسے کوئٹہ ہوٹل کا شور بھی اُن تک نہیں پہنچ رہا ہو۔

سکندر نے آہستہ سے صرف اتنا کہا:

"ہمیں ابھی نکلنا ہو گا۔"

دانیال نے اس کی آنکھوں میں دیکھا وہ آنکھیں جو سب کچھ جان چکی تھیں، مگر کچھ کہنے کو تیار نہ تھیں۔

اور وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے...

بغیر یہ جانے کہ اگلا منظر کس کی زندگی بدلنے والا ہے۔

لاہور کی مال روڈ پر ایمبولینس موقع پر پہنچ چکی تھی۔ سائرن کی چیختی آواز نے سڑک کے شور کو مات دے دی تھی اور ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ ایک سیاہ رنگ کی سِوک بجلی کے کھمبے سے بری طرح ٹکرا چکی تھی، اس کا اگلا حصہ مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔

ریسکیو اہلکار لوگوں کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ کچھ موبائل اٹھائے کھڑے تھے، کچھ خوف سے ساکت، اور کچھ زیرِ لب دعائیں پڑھ رہے تھے۔ گاڑی کے اندر دو افراد پھنسے ہوئے تھے ایک ڈرائیونگ سیٹ پر، دوسرا ساتھ والی سیٹ پر۔ دونوں کے جسم بے حس و حرکت تھے، جیسے وقت وہیں رک گیا ہو۔

"ایک اور ہے… ادھر بھی دیکھو"!

ایک ریسکیو اہلکار نے آواز دی۔

دروازے کاٹے گئے۔ پہلے ڈرائیور کو باہر نکالا گیا، اس کے چہرے پر خون جما ہوا تھا اور سانسیں ٹوٹی ٹوٹی سی تھیں۔ پھر دوسرے شخص کو نکالا گیا اس کا سر ایک طرف جھکا ہوا تھا، آنکھیں بند اور جسم غیر معمولی حد تک ساکت۔

دونوں کو الگ الگ اسٹریچر پر لٹایا گیا۔ ایک لمحے کے لیے ریسکیو اہلکار ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، جیسے الفاظ کی ضرورت ہی نہ ہو۔

ایمبولینس کا دروازہ بند ہوا۔

سائرن دوبارہ گونج اٹھا۔

اور مال روڈ کی روشنیاں پیچھے رہ گئیں

دو زندگیاں، ایک حادثہ... اور انجام ابھی نامعلوم تھا۔

ایمبولینس کے اندر دونوں کے فون چیک کرنے کی کوشش کی گئی۔ ڈرائیور کی جیب سے نکالا گیا موبائل لاک تھا، اسکرین پر خون کے دھبے اور شیشے میں باریک دراڑیں تھیں۔ فنگر پرنٹ کام نہ آیا، چہرہ پہچان بھی ناکام رہی۔ فون ویسے ہی بند کر دیا گیا۔

ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے شخص کا فون نسبتاً محفوظ تھا۔ اس کی اسکرین آن ہوئی تو ایک لمحے کے لیے سب رک سا گیا۔ فون ان لاک تھا، جیسے مالک نے کبھی اسے بند ہی نہ کیا ہو۔ ریسکیو اہلکار نے نظر دوڑائی، پھر رابطے کے لیے حالیہ کالز کھولیں۔

ایک نمبر نمایاں تھا۔

اسی نمبر پر کال کی گئی۔

کچھ لمحے رنگ بجتا رہا...

پھر دوسری طرف سے آواز آئی۔

ایمبولینس کے اندر خاموشی اور گہری ہو گئی۔

کسی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، مگر کچھ کہا نہیں۔

کال جاری تھی

اور وقت، معمول سے زیادہ بھاری لگنے لگا۔

"کیا آپ شاہویر ریاض کو جانتے ہیں؟" ریسکیو والے نے بات جاری رکھی

" ہمیں ان کی جیب سے ایک آئی ڈی کارڈ ملا ہے۔ اور فون کے آخری ڈائل میں آپ کا نمبر تھا۔ ان کا مال روڈ پر ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ آپ فوراً مَیُو ہسپتال پہنچ جائیں۔"

یہ الفاظ سنتے ہی سکندر کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔

کانوں میں جیسے شور بھر گیا، سانس ایک لمحے کو رک سی گئی۔ ہاتھ میں پکڑا فون بھاری ہو گیا، انگلیاں سن ہو گئیں۔ وہ کرسی کے کنارے کو مضبوطی سے پکڑے کھڑا رہ گیا جیسے اگر چھوڑ دیا تو خود بھی گر پڑے گا۔

اس نے لب کھولنے کی کوشش کی، مگر آواز ساتھ نہ دے سکی۔

کال ختم ہو چکی تھی...

مگر وہ جملے ابھی تک اس کے اندر گونج رہے تھے۔

وہ فوراً کوئٹہ ہوٹل سے اُٹھا اور دانیال کو ساتھ لے کر مَیُو ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستہ جیسے سکڑ گیا تھا، وقت بے ترتیب ہو چکا تھا۔ سکندر کی نظریں بار بار موبائل اسکرین پر جاتیں، مگر وہاں کوئی نیا پیغام نہیں تھا۔

ہسپتال پہنچتے ہی وہ گاڑی سے اُترا اور بھاگتا ہوا اندر کی طرف لپکا۔ ایمرجنسی کے دروازے کے پاس ہجوم تھا، چیخ وپکار، اسٹریچرز کی آواز، اور دوا کی تیز بو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

"ابھی ابھی کار ایکسیڈنٹ کے مریض لائے گئے ہیں؟ کہاں ہیں وہ؟"

وہ ہر سامنے آنے والے سے پوچھ رہا تھا۔

کوئی جواب صاف نہ دیتا، کوئی ہاتھ کے اشارے سے آگے بڑھنے کو کہتا۔

سکندر کا دل سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ دانیال بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا، سانس پھولی ہوئی، آنکھوں میں خوف۔

سکندر کے قدم تیز تھے، فکر حد سے بڑھ چکی تھی

آخر یہ صرف دوست نہیں تھے...

وہ اس کی زندگی کا حصہ تھے۔

پھر ایک نرس نے آگے بڑھ کر بتایا، "وہ دونوں ایمرجنسی میں ہیں۔"

یہ سنتے ہی سکندر تقریباً دوڑتا ہوا اُس طرف لپکا۔ ایمرجنسی کے دروازے کے قریب وہی ریسکیو اہلکار کھڑا تھا جس سے فون پر بات ہوئی تھی۔ اس کے

ہاتھ میں موبائل تھا اور وہ شاہویر ریاض کے باقی نمبرز ڈائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، تاکہ کسی طرح سب کو اطلاع دی جا سکے۔

"وہ دونوں کہاں ہیں؟"

سکندر نے بلند آواز میں کہا۔

نرسوں کی نظریں اس کی طرف اٹھیں۔ سکندر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے، آواز کانپ رہی تھی۔ دانیال بھی اس کے پیچھے کھڑا تھا، چہرے پر گھبراہٹ صاف جھلک رہی تھی، جیسے کچھ بھی پوچھنے کی ہمت نہ ہو۔

ایک نرس آگے بڑھی اور نرم مگر مضبوط لہجے میں بولی،

"ان دونوں کا علاج جاری ہے۔ آپ یہاں بیٹھ جائیں... تھوڑا سکون رکھیں۔"

سکندر وہیں کھڑا رہ گیا۔

ایمرجنسی کے دروازے بند تھے

اور اندر کیا ہو رہا تھا، اس کا کوئی جواب باہر موجود کسی کے پاس نہیں تھا۔

"سکندر... شاہویر کی امی کو کال کر دے، اور ارمان کی".....

دانیال بولتے بولتے رک گیا۔

"ارمان کی کیا؟"

سکندر نے غصے سے اس کی طرف دیکھا، آنکھوں میں سرخی اور لہجے میں دھمک۔

"تو جانتا ہے میں کس کی بات کر رہا ہوں،" دانیال نے آہستہ مگر واضح انداز میں کہا۔

"اس کا نام بھی مت لینا اس وقت... ورنہ میں تیری پھاڑ دوں گا،"

سکندر نے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔ غصہ صرف الفاظ میں نہیں، پورے وجود میں تھا۔

"اچھا... ٹھیک ہے باس،"

دانیال گھبرا کر خاموش ہو گیا۔

کچھ ہی دیر میں شاہویر کے گھر والوں کو اطلاع مل چکی تھی۔ ایمرجنسی کے باہر رکھی کرسی پر سکندر بیٹھا تھا، مگر بیٹھنا بھی جیسے ایک سزا بن گیا ہو۔ وہ

اپنی ٹانگیں زور زور سے ہلا رہا تھا، انگلیاں آپس میں الجھی ہوئی تھیں، نظریں بار بار بند دروازے پر جا ٹھہرتیں۔

وقت رُک گیا تھا یا شاید بہت آہستہ چل رہا تھا۔

تبھی ایک نرس آگے بڑھی۔

"شاہویر اب خطرے سے باہر ہے۔ اسے ہوش آگیا ہے... اور وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

یہ سن کر سکندر نے سر اٹھایا۔

آنکھوں میں جمع آنسو ابھی گرے نہیں تھے

مگر دل پہلی بار سانس لینے لگا تھا۔

سکندر فوراً اندر گیا۔ شاہویر بستر پر لیٹا ہوا تھا، چاروں طرف مشینیں لگی تھیں، تاریں اور آوازیں جیسے زندگی کو زبردستی تھامے ہوئے ہوں۔ اس کا چہرہ زرد تھا مگر آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"کیسا ہے اب؟"

سکندر نے آہستہ سے پوچھا، آواز میں دبا ہوا خوف صاف جھلک رہا تھا۔

شاہویر نے ہلکی سی سانس لی۔

پھر سکندر نے وہ سوال کر دیا جو اس کے سینے پر پتھر بن کر رکھا تھا۔

"یہ سب کیسے ہوا، شاہویر؟"

شاہویر کی نظریں چھت پر جم گئیں۔

"مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی، سکندر۔"

"کیا ہوا؟"

سکندر فوراً جھکا۔

"ارمان گاڑی چلا رہا تھا... اور میں نے"—

شاہویر بولتے بولتے رک گیا۔

"کیا، شاہویر؟ پورا بولو۔"

سکندر کی آواز سخت ہو گئی۔

"میں نے... اسے مومنہ کی شادی کے بارے میں بتا دیا۔"

یہ سنتے ہی سکندر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ خاموشی سے کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ باہر اندھیرا تھا، اندر اس کے ذہن میں شور۔ جیسے کسی نے ایک ہی لمحے میں سب کچھ توڑ دیا ہو۔

"ابھی تک اسے مومنہ کی فکر ہے؟"!

دانیال غصے سے بولا۔

"ایک لڑکی جس نے اس کے ساتھ کتے والا سلوک کیا، کبھی اس کی ذرا سی عزت نہیں کی اسی کی شادی سن کر اس نے ایکسیڈنٹ کر لیا؟"

"دانیال... خاموش ہو جاؤ۔"

سکندر نے دھیمی مگر بھاری آواز میں کہا۔

وہ کھڑکی سے ہٹ کر بولا،

"مجھے لگا تھا ارمان اسے بھول چکا ہے... مگر شاید وہ اب بھی اسے یاد کرتا ہے۔ اور بہت زیادہ"

شاہویر اور دانیال دونوں اس کی طرف دیکھنے لگے۔

سکندر نے ایک تلخ سانس لی اور کہا،

"محبت میں پاگل مرد سے بڑا چوتیا کوئی نہیں ہوتا۔"

اسی لمحے ایک نرس آئی۔

"سکندر صاحب؟"

سکندر نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

وہ نرس کے ساتھ چل پڑا۔

راہداری لمبی تھی۔

اور آخر میں وہ دروازہ تھا

جہاں ارمان لیٹا ہوا تھا۔

نرس نے بات شروع کی، "کیا ارمان کے ماں باپ یا گھر والوں کے بارے میں کوئی معلومات"....

سکندر نے آہستہ مگر کڑوے لہجے میں بات کاٹ دی۔

"مرد کو ہمیشہ پیسوں پر تولا جاتا ہے۔ جب اس کے پاس کچھ نہیں تھا تو ہم دوست تھے، گھر والوں نے بھی اسے کچھ خاص نہیں سمجھا۔ اور جب اس نے پیسہ کمایا... تو سب سے دور ہو گیا۔"

نرس یہ سب سن کر چند لمحے کے لیے حیران رہ گئی۔

"آپ مجھے صاف صاف بتائیں... ہوا کیا ہے؟"

وہ گھبرا سی گئی، پھر خاموش ہو کر سکندر کی طرف دیکھنے لگی۔

اسی لمحے سامنے سے آتے ایک ڈاکٹر نے رک کر کہا،

"وہ اس وقت کوما میں ہے۔ کسی بھی وقت ان کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ ہمیں انہیں کوما سے باہر لانے کے لیے شدید جذباتی سہارا چاہیے۔ لیکن جیسا کہ آپ نے بتایا... گھر والے موجود نہیں ہیں، تو یہ مشکل ہو گا۔"

نرس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا،

"کیا بیوی... یا کوئی محبوبہ؟"

"بیوی تو نہیں ہے،"

سکندر نے مختصر جواب دیا۔

"اور محبوبہ؟"

سکندر خاموش ہو گیا۔ وہ کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا، شاید کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

نرس نے آہستہ سے کہا،

"اگر کوئی نہیں تو بھی ٹھیک ہے، لیکن انہیں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے وہ خود موت کو قبول کرنا چاہتے ہوں۔ آخر کوئی کتنا ہی بے بس ہو سکتا ہے کہ جینے کی خواہش ہی ختم ہو جائے۔"

سکندر نے نظریں جھکا لیں۔

"نرس... کچھ لوگ صرف زندہ رہتے ہیں، مگر جینا بہت پہلے چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اکثر مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

نرس خاموش ہو گئی۔

کوئی سوال باقی نہیں رہا تھا۔

سکندر مڑا اور واپس شاہویر اور دانیال کی طرف چل دیا

دل میں ایک ایسا بوجھ لیے، جس کا وزن الفاظ میں نہیں اُتارا جا سکتا تھا۔

"وہ کوما میں ہے"...

سکندر کی آواز بھاری تھی۔

"کیا؟"

یہ لفظ دانیال اور شاہویر دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلے۔ حیرت، خوف اور بے یقینی ایک ساتھ۔

"اسے ہوش میں لانے کے لیے جذباتی سہارا چاہیے،"

سکندر نے نظریں جھکائے کہا۔

"اور وہ کہاں سے آئے گا؟"

دانیال نے بے بسی سے پوچھا۔

"گھر والوں سے... یا بیوی سے،"

سکندر نے آہستہ جواب دیا۔

"اس نے تو شادی ہی نہیں کی، پھر یہ سب کیسے"

دانیال کی بات ادھوری رہ گئی۔

"یا پھر... محبوبہ؟"

شاہویر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کیا بول رہے ہو شاہویر؟"

دانیال تڑپ اٹھا۔

"تم نے خود کہا تھا کہ مومنہ کی شادی ہو چکی ہے"!

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

"پھر ہم اسے واپس کیسے لائیں گے؟"

دانیال نے ٹوٹتی آواز میں پوچھا۔

"لا سکتے ہیں"...

سکندر نے سر اٹھایا، آنکھوں میں عجیب سی ٹھہراؤ تھا۔

"اور وہ آئے گی۔"

"لیکن کیسے؟"

دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

"میں اسے پیار سے بلاؤں گا،"

سکندر نے دھیرے سے کہا۔

"اور اگر نہ مانی؟"شاہویر

سکندر کے چہرے پر ایک سخت سی لکیر ابھری۔

"پھر مجھے اپنے طریقے آتے ہیں۔"

سات سال کی دوستی میں، ایک لڑکی نے ارمان رحمان کے ساتھ ایسا کیا تھا کہ وہ اندر سے ٹوٹ گیا تھا اتنا بے بس کہ جینے کی خواہش بھی چھوڑ بیٹھا۔

اور اب، سکندر اسی لڑکی کے پاس واپس جانے کا ارادہ کر چکا تھا...

صرف اس لیے کہ اپنے دوست کی زندگی بچا سکے۔

صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔

مومنہ ڈری ہوئی، سہمی بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، ہر سانس دھیرے دھیرے اور بے ترتیب اٹھ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے جو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ دل کے اندر ایک عجیب سی خلش تھی، جیسے ہر لمحہ ایک نئی چوٹ دے رہا ہو۔

اور وہ شخص جس نے اس کے ساتھ یہ سب کیا تھا... فلک شبیر، وہ سکون سے بستر پر لیٹا تھا، بغیر کسی خوف یا پچھتاوے کے، جیسے مومنہ کے آنسو، اس کی تکلیف، اس کے دل کی دھڑکن اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ صرف اپنے غرور کو ظاہر کرنے میں مصروف تھا، اس بے حسی کی سردی مومنہ کے دل کو اور زیادہ تھپڑ مار رہی تھی۔

مومنہ کی نظر اس پر تھی، لیکن اس کا دل ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے دل چاہا کہ وہاں سے بھاگ جائے، مگر جسم نے اس کی مرضی کی مخالفت کی، کانپتا ہوا جسم، لرزتے ہاتھ، اور دل جو دھڑک دھڑک کر اس کی بے بسی کا اعلان کر رہا تھا۔

اتنے میں فلک کی آنکھ کھلی۔

اس نے مومنہ کو روتے دیکھا، اور فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

مومنہ کی آنکھوں میں خوف اور حیرت کا ملا جلا اظہار تھا۔ وہ فوراً پیچھے ہٹی، دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی کہ لگتا تھا دل چھاتی سے باہر نکل جائے گا۔

"دیکھو میری پیاری بیگم، میں 52 سال کا ہوں... اتنے سال میرا کسی لڑکی سے کوئی تعلق نہیں رہا، نہ بات ہوئی۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ پہلے دن سب کیسے ہوتا ہے۔ شاید میں زیادہ اوور ہو گیا، لیکن کوئی نہیں، یہ درد جلد ختم ہو جائے گا"...

فلک شبیر نے ہلکی سی مسکان کے ساتھ کہا، لیکن مومنہ کے دل پر اس کے الفاظ بوجھ کا سا اثر ڈال گئے۔

مومنہ کے اندر ایک ٹوٹا ہوا حصہ تھا، جو ہر لفظ کے ساتھ ہل رہا تھا۔ ہر لمحہ وہ سوچ رہی تھی: "کیسے ممکن ہے کہ ایک انسان اس طرح بے فکر رہ سکتا ہے؟ کیا میرا درد اس کے لیے کوئی معنی رکھتا ہے؟ کیا یہ سب میری زندگی کا حصہ بن گیا ہے؟"

اس کے آنسو چھپانے کے لیے وہ ہاتھ اپنے چہرے پر رکھتی، مگر جسم کانپنا بند نہیں کر رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ چیخ مارے، لیکن آواز باہر نہیں آ رہی تھی۔

آخر کار مومنہ بستر سے اٹھ کر باتھ روم کی طرف چل دی۔

فلق نے کافی دیر انتظار کیا، لیکن مومنہ باتھ روم میں دیر تک موجود رہی۔ ہر لمحہ، ہر آنسو، ہر کپکپی اس کی بے بسی کو بڑھا رہی تھی۔ فلق نے آخرکار دروازے پر دستک دی، نرم مگر پر اثر آواز میں:

"مومنہ، باہر آؤ، کچھ دیر اور نہیں"...

مومنہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی کہ وہ ہر لمحہ خوف کے سایے میں کھوئی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔ فلک نے زور زور سے دروازہ مارنا شروع کر دیا۔

اس کے گھر کے نوکر فوراً دوڑ کر وہاں آ گئے۔

مومنہ اندر بیٹھی نہیں رہی، وہ زمین پر لیٹ گئی، جسم کانپ رہا تھا، آنکھوں سے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ہر سانس کے ساتھ ایک درد کا طوفان اس کے اندر بڑھ رہا تھا۔ ہر لمحہ اس کے دل کی دنیا ٹوٹ رہی تھی، ہر یاد، ہر خوف، ہر صدمہ دوبارہ اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔

اس نے ہاتھ سے اپنا چہرہ چھپایا، مگر رونا رکتا نہیں تھا۔ ہر آنسو، ہر ہچکی، اسے اپنے فیصلوں کی سنگینی یاد دلا رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے اس نے اپنے آپ کو

زمیں پر گرا ہوا پایا، دل کی دھڑکن اور آنسوؤں کے شور کے بیچ، دنیا اس کے لیے رک سی گئی تھی۔

اس کے ہلکے سے کانپتے جسم اور لرزتے ہاتھ، اس کے اندر کے خوف اور شرمندگی کو ظاہر کر رہے تھے۔ پھر اس نے اپنی ہچکیاں دبا کر فلق سے مخاطب ہوتے ہوئے سر اٹھایا:

"ارمان... کاش... میں تم سے نکاح کر لیتی...

مجھے تمہارے ساتھ یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا...

میں نے تمہارے ساتھ بہت غلط کیا"...

آنکھوں میں پانی بھر آیا، ہونٹ کانپ رہے تھے، اور اس کے اندر ایک بے بسی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ وہ زمین پر لیٹی، روتی ہوئی، اپنے دل کی ٹوٹ پھوٹ کو محسوس کر رہی تھی، اور ہر آنسو اس کے پچھتاوے اور خوف کی کہانی سنا رہا تھا۔

اچانک ارمان کے وہ الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے:

"آپ میرے ساتھ محفوظ ہیں"...

وہ جملہ مومینہ کے دل میں کسی روشنی کی طرح پھیل گیا۔ جیسے اندھیری رات میں چھوٹا سا چراغ جل اٹھا ہو، اور وہ لمحہ لمحہ خوف اور درد کے بیچ ایک چھوٹی سی امید کی کرن لے آیا۔

مومینہ نے اپنے کانوں کو ہاتھ سے چھو کر اپنے دل کی دھڑکن سنبھالی، آنکھوں سے پانی بہ رہا تھا، مگر اس کے اندر ایک سکون کی لہر دوڑ گئی۔ وہ ارمان کے الفاظ کو بار بار دہراتی ہوئی بولی:

"محفوظ... میں واقعی محفوظ ہوں یا محفوظ تھی"...

`سات سال پہلے`

یونیورسٹی میں آج مومنہ کا پہلا دن ہونے والا تھا، اور وہ اپنے اندر بے حد خوشی اور تھوڑی گھبراہٹ محسوس کر رہی تھی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، ہاتھوں میں ہلکی سی کانپ بھی تھی، لیکن اس کی آنکھوں میں جوش صاف نظر آ رہا تھا۔

"بیٹا، دھیان سے رہنا اُدھر، اور سب لڑکوں سے دوری بنا کے رکھنا۔ اور ویسے بھی، ہمیں تم پر پورا یقین ہے، تم ہمیں مایوس نہیں کرو گی،" نَسیم بی بی نے 17 سالہ مومنہ طارق کو یونیورسٹی کے لیے تیار کرتے ہوئے کہا۔

مومنہ کی آنکھیں چمک رہی تھیں، لیکن اس کے چہرے پر چھوٹی سی شرمندگی بھی تھی۔ نَسیم بی بی نے ہنستے ہوئے آگے کہا،

"اور ہاں، چاہو تو وہاں برقع اُتار دینا۔"

مومنہ نے آنکھیں بڑی کر کے چیخا، "امی! آپ کو پتہ ہے میں مر سکتی ہوں، لیکن کوئی مجھے برقع کے بغیر نہیں دیکھ سکتا"!

نسیم بی بی نے یہ سن کر ہنستے ہوئے مومنہ کے گالوں پر ہلکا سا ہاتھ رکھا اور مسکراتے ہوئے کہا، "واہ واہ، رج کر بکواس کروالو اس لڑکی سے"!

دونوں زور زور سے ہنس پڑیں، اور وہ لمحہ ایک خوشگوار، محفوظ اور محبت بھرا لمحہ بن گیا، جہاں مومنہ کی نوجوانی اور نرسیم بی بی کی فکر دونوں کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔

تبھی طارق انور وہاں پہنچے۔ ان کے چہرے پر فخر اور خوشی صاف جھلک رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے بولے،

"واہ بھائی واہ، آج تو رونقیں لگ گئی ہیں"!

وہ اپنی بیوی اور بیٹی کی طرف بڑھے اور دونوں کو گلے لگایا۔ مومینہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، خوشی اور گھبراہٹ کا ملا جلا احساس تھا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

"چلو بیٹا، جلدی کرو!" طارق نے کہا اور بائیک کی طرف بڑھتے ہوئے کہا، "تمہیں لے جانا ہے یونیورسٹی۔"

مومنہ نے بائیک پر بیٹھتے ہوئے اپنی ماں نسیم بی بی کو سلام کیا۔ نسیم بی بی نے ہاتھ ہلایا اور مسکرا کر دعا کی، "بیٹا، اللہ تمہیں کامیاب کرے، محفوظ رکھے۔"

مومنہ نے دل میں محسوس کیا کہ ماں کی دعا اور باپ کی حفاظت کا احساس اسے مضبوط کر رہا ہے۔

طارق انور نے بائیک اسٹارٹ کی۔ ہوا میں خوشی اور تھوڑی سی گھبراہٹ کا ملا جلا احساس تھا۔ مومنہ نے یونیورسٹی کی طرف جاتے ہوئے ہر لمحے کو اپنی آنکھوں اور دل میں محفوظ کر لیا۔

راستے میں وہ خود سے کہہ رہی تھی،

"آج میرا پہلا دن ہے، نئے لوگ، نیا ماحول، لیکن میں اپنے آپ کو سنبھال سکتی ہوں۔ مجھے اپنی ماں باپ کی توقعات پر پورا اترنا ہے۔"

ہر موڑ، ہر نظر اسے یاد رہی، اور دل میں امید تھی کہ یہ دن اس کی زندگی کے نئے سفر کا آغاز ثابت ہو گا۔

یونیورسٹی کا گیٹ صبح کی دھوپ میں نہایا ہوا تھا۔ باہر کھڑی گاڑیاں، ہنستے بولتے نوجوان، اور ہر طرف ایک عجیب سی بے فکری کا شور تھا۔ لڑکے جدید لباس میں، کسی کے بال شوخ انداز میں بنے ہوئے، کسی کے کانوں میں ایئر فون، اور لڑکیاں رنگ برنگے کپڑوں میں، اونچی ہنسی اور بے ساختہ انداز کے ساتھ چلتی پھرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ جگہ علم سے زیادہ نمائش کا میدان بن چکی ہو۔

مومنہ نے جیسے ہی گیٹ کے اندر قدم رکھا، اس کا دل ایک لمحے کو زور سے دھڑکا۔ اس نے برقع پہنا ہوا تھا سادہ، باوقار، اور مکمل حیا کے ساتھ۔ وہ اس ہجوم میں بالکل الگ لگ رہی تھی، جیسے شور میں خاموشی، جیسے اندھیرے میں روشنی۔

اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ نظریں اس پر ٹک گئی ہیں۔ کچھ تجسس بھری، کچھ طنزیہ، اور کچھ ایسی جیسے وہ کسی اور ہی زمانے سے آ گئی ہو۔ مومنہ نے نظریں نیچی رکھیں اور دل ہی دل میں آیت پڑھی،

"وَ قُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ"...

اور اپنے قدم مضبوط رکھے۔

تبھی ایک لڑکا اس کے قریب سے گزرا، پھر اچانک رُک گیا۔ اس نے مومنہ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا برقع، سادہ جوتے، جھکی ہوئی نظریں اور اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر آ گیا، جیسے وہ سوچ رہا ہو:

"یہ لڑکی تو بہت پرانے زمانے کی لگتی ہے... آج کے دور میں بھی کوئی ایسا ہوتا ہے؟"

مومنہ نے یہ سب محسوس کیا، مگر اس کے چہرے پر کوئی شکن نہ آئی۔ اس نے خود کو یاد دلایا کہ حیا کمزوری نہیں، طاقت ہے۔

اسی لمحے چند لڑکیاں وہاں سے گزریں۔ سب کے کپڑے جدید، انداز بے پروا، اور باتوں میں قہقہے۔ جیسے ہی ان کی نظر مومنہ پر پڑی، ایک نے ناک سکیڑی، دوسری نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا، اور تیسری نے ہلکا سا منہ بنا لیا، جیسے کہنا چاہتی ہو:

"یہ یہاں کیسے فِٹ ہو سکتی ہے؟"

مومنہ کا دل ایک لمحے کو دکھ سے بھر گیا، مگر پھر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، یہی کافی ہے۔"

یہ سوچ اس کے دل میں ڈھال بن گئی۔

وہ آہستہ آہستہ یونیورسٹی کے اندرونی راستے پر چلتی رہی۔ ہر قدم کے ساتھ اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہ جگہ آسان نہیں، مگر وہ یہاں کسی کو خوش کرنے

نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے رب کو راضی رکھنے آئی تھی، اپنے والدین کی امانت بن کر۔

مومنہ یونیورسٹی کے اندرونی راستوں میں کھڑی تھی۔ ایک ہاتھ میں فائل، دوسرا برقع کے کنارے کو تھامے ہوئے۔ ہر طرف عمارتیں، مختلف ڈیپارٹمنٹس کے بورڈز، اور لوگوں کی بھیڑ تھی۔ اسے اپنا کلاس روم سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک دو بار آگے بڑھی، پھر رُکی، پھر کسی بورڈ کو غور سے پڑھنے لگی۔ دل میں ہلکی سی گھبراہٹ تھی نیا ماحول، نئے چہرے، اور سب کچھ اجنبی۔

تبھی اچانک اس کے سامنے ایک لڑکا آ کر رُک گیا۔

"مومنہ؟"

وہ چونک گئی۔ اس نے فوراً نظریں اٹھائیں۔

"جی؟"

آواز میں حیرت بھی تھی اور خوف بھی۔

لڑکا ذرا جلدی میں لگ رہا تھا۔ سانس ہلکی سی تیز تھی، جیسے واقعی کوئی مسئلہ ہو۔

"آپ یہاں کب سے کھڑی ہیں؟ میں تو آپ کو ہر جگہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ جلدی چلیں، ہمیں آپ کی ضرورت ہے"!

مومنہ کا دل زور سے دھڑکا۔

"آپ... آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟"

اس نے گھبرا کر پوچھا۔

لڑکے نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کہا،

"ابھی یہ سب بتانے کا وقت نہیں۔ بس میرے ساتھ چلیں، یہاں ٹھیک نہیں ہے۔"

"لیکن... کیوں؟"

مومنہ کی آواز کانپنے لگی۔

لڑکا اس کے قریب جھکا اور آہستہ مگر سنجیدہ لہجے میں بولا،

"کچھ لوگ آپ کو نقصان پہنچانے آ رہے ہیں۔ ابھی یہاں رُکنا خطرناک ہے۔"

یہ سن کر مومنہ کا رنگ اُڑ گیا۔ ہاتھ بے اختیار کانپنے لگے۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی نہ یہ کہ یہ لڑکا کون ہے، نہ یہ کہ وہ اس کا نام کیسے جانتا ہے، اور نہ ہی یہ کہ ایسی بات کیوں کہہ رہا ہے۔

"جلدی کریں"!

لڑکے نے کہا

اور آگے بڑھ گیا۔

خوف اور الجھن کے عالم میں مومنہ اس کے پیچھے چل پڑی۔ دل میں ہزار سوال تھے، مگر زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ یونیورسٹی کے مختلف راستوں سے گزرتے رہے کبھی کسی ڈیپارٹمنٹ کے سامنے سے، کبھی کسی خالی راہداری سے۔ مومنہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی، جیسے واقعی کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔

"وہ پیچھے ہی ہیں، یہاں رکیں"!

لڑکے نے سرگوشی کی۔

اس نے مومنہ کو ایک ستون کے پیچھے کھڑا کر دیا۔

"یہاں چھپ جائیں، آواز مت نکالیں۔"

مومنہ کا دل جیسے سینے سے باہر آ رہا تھا۔ اس نے برقع کو مضبوطی سے تھاما، آنکھیں بند کیں، اور دل ہی دل میں دعا کی:

"یا اللہ، میری حفاظت فرما۔"

چند لمحوں بعد لڑکا واپس آیا۔

"چلیں، اب یہاں بھی ٹھیک نہیں۔"

وہ اسے ایک بڑے ہال کی طرف لے آیا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے، منظر بدل گیا۔ ہال میں لڑکے اور لڑکیاں قطاروں میں بیٹھے تھے۔ شور، ہنسی، باتیں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔

اچانک لڑکے نے بلند آواز میں کہا:

"یہ دیکھو! میں اسے لے آیا"!

ایک لمحے کے لیے سناٹا چھا گیا، پھر زوردار قہقہے گونج اٹھے۔

مومنہ ساکت رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

لڑکے نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھا، اور پہلی بار اس کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ آئی۔

"ڈرو مت... بس ایک prank تھا۔"

مومنہ کے لیے یہ الفاظ کسی تھپڑ سے کم نہ تھے۔ خوف، شرمندگی اور بے بسی سب ایک ساتھ آنکھوں میں امڈ آئے۔ اس کا دل چاہا زمین میں گڑ جائے۔

کسی نے پیچھے سے آواز لگائی،

"واہ آرمان! کمال کر دیا"!

تب مومنہ کو پہلی بار اس لڑکے کا نام معلوم ہوا

آرمان۔

وہی آرمان، جسے اس کے دوستوں نے اسے ڈرانے اور ragging کے لیے بھیجا تھا۔

مومنہ نے بغیر کچھ کہے نظریں نیچی کر لیں۔ اس کی خاموشی میں چیخیں تھیں، اور آنکھوں میں وہ آنسو جو اس نے بڑی مشکل سے روکے ہوئے تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ پہلی ملاقات اس کی زندگی کا رخ بدل دے گی اتنا بدل دے گی کہ ایک دن یہی نام اس کے دل پر سب سے گہرا زخم بن جائے گا۔

اور آرمان؟

وہ اس لمحے یہ نہیں جانتا تھا کہ ایک مذاق، ایک ہنسی،

کسی کی پوری دنیا ہلا سکتی ہے۔

"آپ کو میرا نام کیسے پتا چلا؟"

مومنہ کے لہجے میں پہلی بار غصہ صاف سنائی دیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر ارمان کو دیکھا، آنکھوں میں الجھن بھی تھی اور ناراضی بھی۔

آرمان ایک لمحے کو رُکا، پھر ہلکا سا مسکرایا۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے مومنہ کے گلے میں لٹکتے اسٹوڈنٹ کارڈ کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ جو گلے میں اسٹوڈنٹ کارڈ لٹک رہا ہے نا،"

وہ ذرا فخر سے بولا،

"اس پر نہ صرف نام لکھا ہے بلکہ شکل بھی پوری نظر آ رہی ہے۔ تو آپ کا یہ پردہ کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں"

یہ کہہ کر وہ ہنس پڑا، جیسے یہ سب ایک معمولی سی بات ہو۔

مومنہ کا دل بیٹھ سا گیا۔

ایک لمحے کو اس نے لاشعوری طور پر ہاتھ اٹھا کر کارڈ کو تھام لیا، جیسے اب دیر ہو چکی ہو۔ اس کے چہرے پر شرمندگی پھیل گئی۔ اسے فوراً یاد آیا کہ یونیورسٹی کا یہ ایک سخت اصول تھا اسٹوڈنٹ کارڈ ہر وقت نمایاں طور پر پہن کر رکھنا۔ اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ یہی چیز اس کے لیے کمزوری بن جائے گی۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی شناخت، اس کا نام، اس کی شکل سب کچھ ایک ہی لمحے میں سب کے سامنے آ گیا ہو۔

وہ نظریں جھکا گئی۔ دل میں ایک کسک سی اٹھی۔

مومنہ نے دل ہی دل میں سوچا،

"یہ کیسا اصول ہے؟"

یونیورسٹی کا یہ rule اسٹوڈنٹ کارڈ کو ہر وقت نمایاں طور پر پہننا اسے اس لمحے ایک بوجھ محسوس ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی پرائیویسی کی دھجیاں اُڑا دی گئی ہوں۔ اس کا نام، اس کی شکل، اس کی شناخت سب کچھ بغیر اس کی اجازت کے سب کے سامنے رکھ دیا گیا ہو۔

وہ سوچنے لگی کہ حیا اور وقار کے ساتھ رہنے والی لڑکی کے لیے یہ کتنا مشکل ہے کہ وہ ہر وقت خود کو یوں ظاہر کرے، جیسے وہ کوئی چیز ہو، کوئی نمبر ہو، جسے کوئی بھی دیکھے، پہچانے، اور پھر اس پر ہنس دے۔

ارمان ابھی بھی مسکرا رہا تھا، مگر مومنہ کے لیے وہ مسکراہٹ کسی طنز سے کم نہ تھی۔ اسے اس ہنسی میں معصومیت نہیں، بے حسی محسوس ہو رہی تھی۔

مومنہ کو شدید افسوس ہوا۔

نہ صرف اس prank پر،

بلکہ اپنی سادگی پر،

اپنے بھروسے پر،

اور اس بات پر کہ وہ ایک ایسے ماحول میں آگئی تھی جہاں عزت اور حیا اکثر تماشہ بنادی جاتی ہے۔

اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا

اب وہ زیادہ محتاط رہے گی۔

یہ یونیورسٹی صرف عمارتوں کا مجموعہ نہیں،

یہاں لوگ بھی امتحان لیتے ہیں...

اور کبھی کبھی، بہت بے رحمی سے۔

یہ پہلی ملاقات تھی۔

لیکن مومنہ کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ ایک معمولی سا اسٹوڈنٹ کارڈ،

اور ایک ہنسی،

اس کی زندگی کی کہانی میں کتنی گہری لکیر کھینچ چکی ہے۔

یونیورسٹی کی کینٹین ہمیشہ کی طرح بھری ہوئی تھی۔ ہنسی، باتیں، موبائل کی آوازیں اور پلیٹوں کی کھنک سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ ایک کونے کی میز پر رمشا بیٹھی ہوئی تھی، سامنے سکندر۔ میز پر آدھا کھایا ہوا پیزا رکھا تھا، مگر رمشا کا دھیان کھانے سے زیادہ غصے پر تھا۔

"سالا کتا، بے غیرت، لعنتی"...

رمشا نے دانت پیستے ہوئے کہا،

"میرے ساتھ کتنا غلط کیا اُس نے"!

سکندر نے آرام سے پیزا کا ایک سلائس اٹھایا، منہ میں ڈالتے ہوئے بولا،

"اوہ اچھا؟ ویسے کیا کیا اُس نے؟"

"مجھے اتنا گندا ٹریٹ کیا"!

رمشا نے منہ بنایا،

"مجھے تو پرنسس ٹریٹمنٹ چاہیے تھی۔"

سکندر نے کندھے اچکائے۔

"ہاں یار، مرد ذات ایسی ہی ہوتی ہے۔"

"Exactly!"

رمشا نے فوراً تائید کی۔

"You deserve better Rimsha!"

سکندر نے اعتماد سے کہا۔

"جیسے کہ تم؟"

رمشا نے آنکھوں میں چمک کے ساتھ پوچھا۔

سکندر ہنس پڑا۔

"نہیں نہیں، میرے اتنے بھی برے دن نہیں آئے۔ میرا لیول الگ ہے۔"

"اللہ اللہ، سکندر، تمہیں تو اللہ پوچھے گا"!

رمشا نے نیم سنجیدہ، نیم مذاقی انداز میں کہا۔

سکندر نے فوراً موقع لیا۔

“تم strong independent woman ہو، تمہیں مردوں کی کیا ضرورت؟” Go girl, yeah!

یہ کہتے ہوئے اس نے مٹھی بنا کر ہوا میں ماری۔ رمشا یہ دیکھ کر بے حد خوش ہوگئی، جیسے کسی نے اس کے نظریے پر مہر لگا دی ہو۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد رمشا نے پوچھا،

“ویسے... تمہیں کبھی کوئی پسند نہیں آئی؟”

سکندر ایک لمحے کو رُکا۔

“آئی تھی۔”

“پھر؟”

رمشا نے فوراً سوال داغا۔

“بہت بڑے دل والی تھی وہ”...

سکندر کی آواز اچانک مدھم ہوگئی۔

“تو مسئلہ کیا تھا؟”

رمشا نے حیرت سے پوچھا۔

سکندر نے پیزا کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے بولا،

"وہ اتنے بڑے دل والی تھی کہ ہر کسی سے دل لگا لیتی تھی۔"

رمشا خاموش ہو گئی۔

سکندر کا دھیان پیزا کھانے میں تھا، کیوں کہ اس کا بل رمشا نے پے کرنا تھا۔

اسی لیے وہ ہر سلائس بڑے اطمینان سے اٹھا رہا تھا، جیسے آج کی ساری فلسفیانہ باتوں کا اصل مقصد یہی ہو۔

رمشا ابھی بھی اپنی کہانی میں گم تھی، مگر سکندر ہر دو جملوں کے بعد پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھا دیتا۔ کبھی پنیر کھینچتا، کبھی کرسٹ توڑتا، اور کبھی ایسے سر ہلاتا جیسے بہت غور سے سن رہا ہو حالانکہ اس کا اصل فوکس صرف ایک ہی بات پر تھا:

جب بل آئے تو اس کا نام نہ لیا جائے۔

انگریزی کلاس پورے ماحول پر حاوی تھی۔ سب ڈیپارٹمنٹس کے طلبہ ایک ہی ہال میں موجود تھے۔ سامنے پروجیکٹر چل رہا تھا، سلائیڈ پر لمبا سا ٹائٹل چمک رہا تھا، اور مام ساجدہ فائل ہاتھ میں لیے اس انداز سے کھڑی تھیں جیسے آج بھی slides ہی سب کچھ ہوں۔

آرمان، سکندر اور شاہ ویر ایک ہی بنچ پر آکر بیٹھ گئے تھے۔ پیچھے دانیال نیم دراز انداز میں ٹانگ پھیلا کر بیٹھا تھا۔ دوسری طرف مومنا اور رمشا ایک ساتھ بیٹھی تھیں، اردگرد چند اور لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ ہال میں ہلکی ہلکی سرگوشیاں، کرسیوں کی آوازیں اور موبائل وائبریشنز چل رہی تھیں۔

سکندر نے گہری سانس لی۔

"پچھلے دو ہفتوں سے میرا یہاں دماغ خراب ہو رہا ہے، قسم سے۔"

"سیم یار،" دانیال نے پیچھے سے فوراً ہاں میں ہاں ملائی، "ایسا لگتا ہے دماغ نہیں، pendrive plug کر دی ہے۔"

سکندر نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"تو سالے زندہ بھی ہے؟ پورے ہفتے میں ایک دن آتا ہے، وہ بھی attendance کے لیے۔"

پھر اس نے آگے دیکھ کر ناک سکوڑی۔

"اور یہ منحوس ٹیچر... سلائیڈز سے پڑھ کر ایسے چلی جائیں گی جیسے احسان کر دیا ہو لو جی lecture complete!"

شاہ ویر نے ہلکی آواز میں کہا،

"یار ہم لوگ بھی تو برداشت کر رہے ہیں۔"

سکندر نے آنکھیں گھما کر آہستہ سے جواب دیا،

"مسئلہ یہ ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ چار سال گزارنے ہیں۔"

دانیال نے فوراً ردِ عمل دیا۔

"تو بہت ہی حرامی ہے۔"

سکندر مسکرایا، آواز میں شرارت تھی۔

"تو باجی کا رشتہ کسی اور کو دے دینا۔"

"سالے"!

یہ کہہ کر دانیال نے پیچھے سے سکندر کو گلے سے پکڑ لیا۔ سکندر نے ہنستے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ آرمان اور شاہ ویر یہ منظر دیکھ کر ہنس پڑے اور دونوں کے بیچ آ گئے۔

"اوئے بس کرو، کلاس ہے!" آرمان نے ہنستے ہوئے کہا۔

شاہ ویر نے دانیال کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا،

"پاگل ہو گیا ہے؟ مام دیکھ رہی ہوں گی۔"

واقعی، سب لڑکیوں کی نظریں ایک لمحے کے لیے ان چاروں پر جم گئیں۔ مومنا نے فوراً نظریں جھکا لیں، اس کے چہرے پر جھجک صاف نظر آ رہی تھی۔ رمشا نے ایک سرسری سی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھا، جیسے یہ سب اس کے لیے کوئی نیا منظر نہ ہو۔

میم ساجدہ نے چشمہ ٹھیک کیا اور ان کی طرف ایک سخت مگر خاموش نظر ڈالی۔

ہال میں یکدم خاموشی چھا گئی۔

سکندر نے فوراً سیدھا ہو کر فائل کھولی، جیسے سب سے معصوم طالبعلم وہی ہو۔

آرمان نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا،

"ایک دن تمہیں یہی حرکتیں لے ڈوبیں گی۔"

سکندر نے بغیر دیکھے جواب دیا،

"ڈوبیں گے تو ساتھ ہی ڈوبیں گے، جانی۔"

مومنہ نے پہلی بار ہلکا سا سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ سلائیڈ پر انگریزی کے مشکل الفاظ تھے، مگر اس کا ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا۔ یہ نیا ماحول، یہ لوگ، یہ آوازیں سب کچھ اس کے لیے اجنبی تھا۔

رمشا نے مومنہ کی طرف غور سے دیکھا، جیسے وہ اسے ناپ تول رہی ہو۔

"ویسے مومنہ، تم بہت سادہ ہو... ایسا کیوں ہے؟" اس کی آواز میں تجسس تھا، طنز نہیں مگر برتری ضرور تھی۔

مومنہ نے ہلکا سا چونک کر نظریں اٹھائیں۔

"وہ... میں"...

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، بہت کچھ، مگر الفاظ اس کے گلے میں ہی اٹک گئے۔

بچپن سے سادگی اس کی پہچان تھی، مگر اسے کبھی یوں صفائی دینی نہیں پڑی تھی۔

اسی لمحے ساتھ بیٹھی زینب گل مسکرائی اور نرمی سے بولی،

"ویسے ان پر یہ پردہ بہت اچھا لگتا ہے۔ ایک وقار سا آجاتا ہے۔"

مومنہ کے چہرے پر پہلی بار اطمینان سا ابھرا۔

"شکریہ آپ کا،" اس نے دل سے کہا۔

"کوئی بات نہیں،" زینب نے اپنا تعارف کروایا،

"میرا نام زینب گل ہے۔ اور آپ؟"

"میں مومنہ طارق ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے مومنہ کے لبوں پر ہلکی سی خوشی آگئی، جیسے کسی نے اسے قبول کرلیا ہو۔

رمشا نے کرسی پر ٹیک لگاتے ہوئے بے تکلف انداز میں کہا،

"ویسے پردہ اچھا ہے، مانتی ہوں... لیکن کبھی ہمیں بھی شکل دکھا دینا، ہم دونوں لڑکیاں ہی تو ہیں۔"

مومنہ نے ہچکچاتے ہوئے سر ہلایا۔

"اچھا... ٹھیک ہے،" آواز اتنی دھیمی تھی کہ جیسے خود کو یقین دلا رہی ہو۔

پھر رمشا نے ذرا سا آگے جھک کر کہا،

"اور یہاں کے لڑکوں سے ذرا دور رہنا۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی نظر غیر ارادی طور پر سکندر پر جا ٹھہری۔

سکندر نے بھی فوراً اس نظر کو پکڑ لیا۔ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی، ایسی مسکراہٹ جس میں لاپرواہی بھی تھی اور اعتماد بھی۔ رمشا نے آنکھیں گھما کر منہ دوسری طرف کر لیا۔

مومنہ نے یہ سب دیکھا، مگر خاموش رہی۔ اس کا دل ذرا سا سکڑ گیا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ جگہ صرف کتابوں اور کلاسز کی نہیں، نظریں، رویے اور ناپ تول بھی یہاں کا حصہ ہیں۔

اسی مختصر سی گفتگو کے بعد تینوں لڑکیوں کے درمیان ایک نرم سی ڈور بندھ گئی۔

یہ پہلی ملاقات تھی، اور پہلی ملاقات کے ساتھ ہی ایک ابتدائی سی دوستی بھی جنم لے چکی تھی۔

مومنہ دل سے بہت مذہبی تھی نماز، پردہ، حدود سب اس کی تربیت کا حصہ تھے۔

زینب گل نرم مزاج تھی، اعتدال میں رہنے والی۔

اور رمشا... وہ اس دنیا کی نمائندہ تھی جہاں آزادی کو سب سے بڑی طاقت سمجھا جاتا ہے۔

تین مختلف سوچیں، تین مختلف راستے۔

کلاس ختم ہوتے ہی چاروں لڑکے یونیورسٹی کے لان کی طرف نکل آئے۔

دھوپ ذرا تیز تھی اور ہر طرف طلبہ کے قہقہے، آوازیں اور قدموں کی

چاپ پھیلی ہوئی تھی۔ دانیال نے بے تکلفی سے سکندر کے گلے میں بازو ڈال دیا، جیسے یہ سوال پوچھنا اس کا حق ہو۔

"ویسے سکندر، کلاس کی بچیوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیسی لگیں؟"

اس کی آواز میں شرارت صاف جھلک رہی تھی۔

سکندر نے ایک لمحے کو بھی نہیں سوچا۔

"بھاڑ میں جائیں وہ سب۔"

یہ کہہ کر وہ قدم تیز کرتے ہوئے آگے نکل گیا، جیسے اس موضوع سے ہی بیزار ہو۔

شاہویر نے حیرت سے اس کی پیٹھ کو دیکھا اور دانیال کی طرف مڑ کر بولا،

"اسے لڑکیوں سے اتنی چِڑ کیوں لگتی ہے؟"

دانیال نے کندھے اچکائے۔

"پتہ نہیں یار، شروع سے ہی ایسا ہے۔"

آرمان جو اب تک خاموش تھا، رک گیا۔

"یہ بات ٹھیک نہیں ہے،" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

اس کے لہجے میں نرمی تھی مگر اصول بھی۔

دانیال نے بات آگے بڑھائی،

"اور یہ مذہب پر بھی زیادہ یقین نہیں رکھتا۔"

یہ سن کر آرمان کے دل میں ایک عجیب سی تشویش اتر آئی۔ وہ خود کوئی فرشتہ نہیں تھا، مگر دین کے قریب رہنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ نماز، حلال حرام کا خیال، اور دل میں اللہ کا خوف یہ سب اس کی اپنی خواہش تھی، نہ کہ کسی دباؤ کا نتیجہ۔ اس کے والدین بہت اوپن مائنڈڈ تھے، مگر آرمان نے خود دین کو چُنا تھا، اس لیے سکندر کی بے نیازی اسے کھٹکنے لگی۔

وہ فوراً سکندر کے پیچھے لپکا۔

"ویسے سکندر، تمہارا اصل نام تو کچھ اور ہو گا؟"

آرمان نے احتیاط سے بات چھیڑی۔

سکندر رکا، مڑا، اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا،

"ابراہیم سکندر پورا نام ہے، لیکن میں صرف سکندر استعمال کرتا ہوں۔"

آرمان نے حیرت سے پوچھا،

"لیکن کیوں؟"

سکندر کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے سختی آئی۔

"میری مرضی۔"

بس، یہی دو لفظ۔

کوئی وضاحت نہیں، کوئی صفائی نہیں۔

آرمان خاموش ہو گیا۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے سکندر کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہو ایسی دنیا جہاں جذبات، دین، اور احساسات کی وہ قیمت نہیں جو آرمان کے نزدیک تھی۔

تبھی آرمان کی نظر سامنے کھڑی مومنہ پر پڑی۔ وہ رمشا کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی، مگر اس کی آنکھیں بار بار بے اختیار آرمان کی طرف اٹھ جاتیں۔ ایک لمحے کے لیے جیسے سب شور، سب آوازیں خاموش ہو گئیں ہوں۔ مومنہ نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی، مگر نظریں پھر بھی وہیں ٹھہر گئیں۔ آرمان کو دیکھتے ہی اس کے دل میں ایک انجانی سی گھبراہٹ اٹھی، ایسی گھبراہٹ جو نہ خوف تھی نہ خوشی بس ایک نیا احساس۔

رمشا نے یہ سب محسوس کر لیا۔ اس نے ہلکا سا مومنہ کو کہنی ماری اور آہستہ آواز میں بولی،

"یہ تم اس طرح لڑکوں کو کیوں دیکھ رہی ہو؟"

مومنہ چونک گئی، جیسے کسی نے اسے خواب سے جگا دیا ہو۔ اس نے فوراً نظریں جھکا لیں، دل تیزی سے دھڑکنے لگا، مگر اسی لمحے سکندر سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس کی بے پرواہ چال اور تیز نظروں نے رمشا کو بھی گھبرا دیا۔ ایک پل کو وہ بالکل ساکت ہو گئی، جیسے ہوش ہی کھو بیٹھی ہو۔ پھر اچانک اسے اپنے اوپر قابو آیا۔

رمشا نے مومنہ کا ہاتھ تھاما۔

"چلو... یہاں سے چلتے ہیں،" اس کی آواز دھیمی اور کانپتی ہوئی تھی۔

مومنہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا، مگر مومنہ نے کچھ کہے بغیر قدم تیز کر دیے۔ دونوں لڑکیاں تقریباً بھاگتی ہوئی وہاں سے نکل گئیں۔ مومنہ کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، سانس بے ترتیب تھی، اور ذہن میں بس

ایک ہی بات گونج رہی تھی کیا وہ سب واقعی ہوا تھا، یا وہ خود ہی کسی انجان احساس سے گھبرا گئی تھی؟

لان کے پیچھے مڑتے ہی اس نے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا، مگر اب وہاں صرف ہجوم تھا... اور اس ہجوم میں کہیں اس کی بے چینی چھپی رہ گئی تھی۔

مومنہ اور رمشا تیز قدموں سے چلتی جا رہی تھیں کہ اچانک مومنہ کسی سے ٹکرا گئی۔ ایک لمحے میں سب کچھ بکھر گیا۔ اس کے ہاتھ میں موجود فائلیں، کاپیاں اور قلم زمین پر جا گرے، اور سامنے والا شخص بھی لڑکھڑا کر نیچے بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں پر لگی عینک جھٹکے سے اتر کر کہیں فرش پر جا گری۔

وہ لڑکا گھٹنوں کے بل بیٹھا، گھبراہٹ میں ادھر اُدھر ہاتھ مارنے لگا۔

"میری عینک... میری عینک کہاں گئی؟" وہ آہستہ مگر پریشان لہجے میں کہہ رہا تھا۔

مومنہ نے فوراً جھک کر اردگرد نظر دوڑائی۔ اس کی اپنی چیزیں بکھری پڑی تھیں، مگر اس نے ان کی پرواہ نہ کی۔ چند لمحوں بعد اسے فرش پر چمکتی ہوئی عینک نظر آ گئی۔ اس نے وہ اٹھائی اور آگے بڑھا کر لڑکے کی طرف کر دی۔

"یہ لیجیے..." مومنہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

لڑکے نے عینک لے کر فوراً آنکھوں پر لگائی، جیسے دنیا پھر سے صاف نظر آنے لگی ہو۔

"مجھے بہت افسوس ہے، میں دھیان سے نہیں چل رہا تھا،" وہ شرمندگی سے بولا۔

مومنہ نے بس ہلکا سا سر ہلایا، اپنی فائلیں سمیٹیں اور بغیر کچھ کہے فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ رمشا اسے پکارنے ہی والی تھی کہ مومنہ پہلے ہی آگے بڑھ چکی تھی۔ جلدی میں وہ یہ بھی بھول گئی کہ اس کا اسٹوڈنٹ کارڈ لڑکے کے ہاتھ میں آ چکا ہے۔

وہ لڑکا ابھی وہیں بیٹھا تھا۔ اس کی نظر اپنے ہاتھ میں موجود کارڈ پر پڑی۔ اس نے کارڈ کو پلٹا، پھر آہستہ سے پڑھا،

"مومنہ طارق"...

اس کی نگاہ کارڈ پر لگی تصویر پر ٹھہر گئی۔ وہ چند لمحے خاموش رہا، جیسے کسی سوچ میں گم ہو گیا ہو۔ اردگرد کی آوازیں، لوگوں کی آمدورفت سب پس

منظر میں چلی گئیں۔ وہ بس کارڈ کو دیکھتا رہا، اور اس نام کو آہستہ آہستہ دہراتا رہا

"مومنہ طارق"...

یونیورسٹی سے چھٹی ہوئی تو ہر طرف ایک ہلچل سی مچ گئی۔ لان، راہداریاں اور گیٹ کے پاس کھڑے طلبہ آہستہ آہستہ اپنے اپنے گھروں کی طرف نکلنے لگے۔ آرمان بھی اپنی بائیک کے پاس آ کر رکا۔ اس کی نظر گیٹ کے ویٹنگ ایریا میں کھڑی مومنہ پر پڑی۔ وہ اکیلی کھڑی تھی، ہاتھ میں فون تھامے، نظریں بار بار سڑک کی طرف اٹھا رہی تھی۔

آرمان کے دل میں ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ آگے بڑھ کر کچھ کہہ دے شاید صرف یہ پوچھ لے کہ وہ ٹھیک تو ہے، یا صبح کے واقعے پر معذرت کر لے۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا، مگر اسی وقت اس کی نظر گیٹ کے پاس کھڑے سیکیورٹی گارڈز پر پڑ گئی۔ وہ رک گیا۔ دل میں ایک ہچکچاہٹ سی اتر آئی۔

"ابھی نہیں... اگلی بار،" اس نے خود سے کہا۔

وہ خاموشی سے بائیک اسٹارٹ کر کے یونیورسٹی سے باہر نکل گیا، مگر جاتے جاتے ایک بار پھر اس کی نگاہ پیچھے مڑ کر اسی سمت چلی گئی جہاں مومنہ کھڑی تھی۔

ادھر مومنہ بار بار فون ملا رہی تھی۔

"ابو... پلیز جلدی آ جائیں، میں گیٹ پر کھڑی ہوں،" اس کی آواز میں گھبراہٹ اور بے چینی صاف جھلک رہی تھی۔

رمشا اور زینب گل تو کب کی جا چکی تھیں۔ اب ویٹنگ ایریا میں چند ہی لوگ رہ گئے تھے۔ مومنہ نے فون بند کیا، دوپٹہ درست کیا اور سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔ شام کی ہوا میں ایک انجان سی تھکن اور دل میں ایک عجیب سا احساس اتر رہا تھا جیسے آج کا دن ابھی ختم نہیں ہوا، جیسے کچھ ادھورا سا رہ گیا ہو۔

اسی دوران بائیک کی آواز سنائی دی۔ مومنہ نے اوپر دیکھا اور مسکرا دی۔ فوراً آگے بڑھی اور سلام کیا۔

"اسلام علیکم ابا!" مومنہ نے خوش دلی سے کہا۔

طارق انور نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پوچھا،

"بیٹی، کیسا گزرا آج کا دن؟ یونیورسٹی کیسا لگا؟"

مومنہ پہلے تو باتیں کھولنے لگی،

"ابا! آج کلاس میں رمشا اور زینب گل سے ملی... اور ہم نے ساتھ بیٹھ کے بات کی"...

طارق انور نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا،

"اور باقی سب؟ لڑکے لڑکیاں کیسی تھیں؟ تمہیں سب کچھ بتانا چاہیے۔"

مومنہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ارمان کے پرانک کے بارے میں بتائے، جو اس کے لیے خاص تھا۔ وہ تھوڑی دیر رکی، پھر اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔

"ابا... بس... کچھ خاص نہیں ہوا، سب ٹھیک تھا"...

طارق انور نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

"بیٹی، اگر کچھ بھی ہوا ہو تو چھپانے کی ضرورت نہیں۔ تم ہمیشہ سچ بول سکتی ہو۔"

مومنہ نے دل میں سوچا، "میں بتا دوں... لیکن ابھی نہیں۔ یہ پرانک، ارمان نے جو کیا، سب کو پتا چل جائے گا تو شرمندگی ہو سکتی ہے"...

بس اتنا سوچ کر وہ خاموش ہو گئی اور صرف ہلکی سی مسکراہٹ دے دی۔

طارق انور نے بائیک اسٹارٹ کی اور کہا،

"چلو، گھر چلیں۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہو گی۔"

مومنہ پیچھے بیٹھ گئی، لیکن دل میں ایک عجیب سا احساس جا رہا تھا پرانک کی خوشی، چھپی ہوئی شرارت اور ارمان کی یادیں، جو ابھی ظاہر کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

شام کی ہلکی سنہری روشنی یونیورسٹی کے گیٹ سے گھر تک کے راستے پر پھیل رہی تھی۔ ہوا میں ہلکی ٹھنڈک تھی اور درختوں کے پتے دھیرے دھیرے سرسراہٹ کر رہے تھے۔ مومنہ بائیک پر بیٹھ کر اپنی دادی اور دوستوں کے ساتھ ہونے والے دن کے لمحات یاد کر رہی تھی، لیکن دل میں ایک چھپی ہوئی خوشی اور پرانک کا تھوڑا سا احساس بھی تھا۔

طارق انور نے بائیک پارک کی اور مومنہ کے سر پر ہاتھ رکھا، جیسے دن بھر کی تھکن اور فکر سب ختم کر دیں۔

"بیٹی، گھر پہنچ گئے۔ آج کیسا لگا؟ سب کچھ اچھا رہا؟" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

مومنہ نے اپنے ہاتھ سے چھوٹی سی ہلکی مسکان بنائی اور دھیمی آواز میں جواب دیا،

"ابّا... آج اچھا لگا... سب ٹھیک تھا... بس"...

وہ تھوڑی دیر رک گئی، اور ارمان کی کلاس میں ہونے والی پرانک کے بارے میں بتانے کا خیال آیا، لیکن پھر دل میں سوچا کہ ابھی نہیں۔

طارق انور نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور محبت بھری آواز میں کہا،

"بیٹی، مجھے خوشی ہے کہ تم خوش ہو۔ تم نے آج اپنا پہلا دن خوب گزارا۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"

مومنہ نے سر جھکایا اور نرم آواز میں کہا،

"آمین ابّا... شکریہ۔"

دھوپ کے نرم سائے، گھر کے درختوں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ، اور شام کی ٹھنڈی ہوا نے ایک پرسکون ماحول بنایا۔ مومنہ کے دل میں ایک عجیب سکون اور محبت بھرا احساس جاگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہنسی، آنکھوں میں تھوڑی سی شرارت کی چمک، اور دل میں آج کے دن کی یادیں گھوم رہی تھیں۔

طارق انور نے بیٹی کو بائیک سے اتارا اور آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا،

"چلو، گھر چلیں، اب آرام کرو۔ کل نیا دن اور نئے تجربات تمہیں انتظار کر رہے ہیں۔"

مومنہ نے گھر کی طرف قدم بڑھایا، دل میں ایک چھپی خوشی اور پرانک کے لمحات کے ساتھ، جو شاید ابھی کسی کو نہیں بتانی تھی۔ شام کی نرم روشنی میں وہ اپنے ابّا کے ساتھ چلتی ہوئی ایک پرسکون لمحے میں داخل ہوگئی، جیسے دن بھر کی تھکن، خوشی اور شرارت سب ایک ساتھ مل گئی ہو۔

وہ لڑکا اپنے گھر آیا اور مومنہ کا اسٹوڈنٹ کارڈ ہاتھ میں لیے بار بار دیکھنے لگا۔ ہر بار جب وہ اُس تصویر کی طرف دیکھتا، دل میں ایک عجیب سی خوشی اور سکون اُبھرتی۔ مومنہ واقعی تصویر میں بہت اچھی لگ رہی تھی سادہ مگر پرکشش، پاکیزہ اور دل کو چھو جانے والی۔ مومنہ کی تصویریں ہمیشہ خوبصورت آتی تھیں، لیکن یہ اسٹوڈنٹ کارڈ والی تصویر کچھ زیادہ ہی دلکش تھی، جیسے کسی نے لمحے کو ہمیشہ کے لیے قید کر دیا ہو۔ جو بھی یہ دیکھتا، بے اختیار اُس کی خوبصورتی کو محسوس کرتا۔

"واہ، لطیف بھائی! یہ کون ہے؟" اچانک چھوٹے نعیم کی آواز نے لطیف کو چونکا دیا۔

"پتہ نہیں نعیم، مجھے بھی یہ کارڈ یونیورسٹی سے ملا۔ کل جا کر واپس کر دوں گا۔" لطیف نے تھوڑی ہچکچاہٹ سے جواب دیا، لیکن اُس کی آنکھیں اب بھی تصویر پر جمے رہیں۔

"جو بھی ہو، ہے تو پیاری!" نعیم نے ہنس کر کہا۔

"بس کرو، چلو جا کر اپنی پڑھائی پر دھیان دو!" لطیف تھوڑے سے غصے میں بولا، لیکن اندر ہی اندر اُس کا دل نرم اور خوش تھا۔

نعیم نے ہنستے ہوئے کہا، "آپ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے!" اور چل دیا۔

لطیف اپنے کمرے میں بیٹھا مومنہ کے اسٹوڈنٹ کارڈ کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر سکون اور دل میں ہلکی سی بے چینی تھی۔ کل کا دن، یونیورسٹی میں مومنہ کے ساتھ پہلا دن، وہ لمحے، اُس کی شرمیلی مسکان، اور اُس کی عاجزی سب کچھ اُس کے ذہن میں گھوم رہا تھا۔

لطیف جانتا تھا کہ یہ صرف ایک تصویر نہیں، یہ ایک چھوٹی سی جھلک تھی، جو دل میں کسی پرانے خواب کی طرح اتر گئی۔ اور اُس کے دل میں ایک چھوٹی سی امید جاگ اُٹھی کہ کل کا دن بھی اسی طرح خوشیوں بھرا اور یادگار ہو گا۔

—

تینوں لڑکیاں اپنے گھروں میں بیٹھیں، فون ہاتھ میں پکڑے، واٹس ایپ گروپ پر چیٹ کر رہی تھیں۔ ہر ایک کی آنکھیں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں، اور ہر لفظ کے پیچھے چھپی چھوٹی سی تجسس بھری ہنسی محسوس کی جا سکتی تھی۔

زینب گل نے سب سے پہلے پوچھا:

"تو کیسا ہے وہ؟"

رمشا نے تھوڑا سا ہچکچاتے ہوئے جواب دیا:

"کون؟"

زینب نے فوراً ٹائپ کیا:

"سکندر"!

رمشا نے ایک طرفہ جواب دیا:

"جیسے بھی ہو، مجھے کیا"...

زینب نے مسکراتے ہوئے لکھا:

"جھوٹ مت بولو، جیسے تم اسے بار بار دیکھتی ہو اور کینٹین میں ساتھ بیٹھی کھانا کھاتی ہو، کچھ اور ہی لگتا ہے"!

رمشا نے فون تھام کر سوچا، پھر لکھی:

"وہ بس ایک اچھا دوست ہے، اور کچھ نہیں۔"

زینب نے فوری طور پر جواب بھیجا:

"لگتا نہیں"!

رمشا نے ہلکی سی غصے اور شرمندگی کے ساتھ ٹائپ کیا:

"نہ لگے، مجھے کیا"!

زینب نے پھر مذاق میں کہا:

"واہ واہ"!

رمشا ہنسی روکنے کی کوشش کرتی رہی، اور پھر مومنہ کی طرف دیکھ کر زینب نے کہا:

"مومنہ، تم بھی کچھ کہو، یا بس یہ میسجز سین کرتی رہو گی؟"

مومنہ کی انگلیاں فون کی اسکرین پر رک گئیں۔ دل کی دھڑکن تیز تھی، مگر زبان کچھ کہنے سے قاصر تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ سب کچھ بتا دے، خاص طور پر وہ پرانک جو یونیورسٹی میں ارمان نے اس کے ساتھ کیا تھا، مگر وہ جانتی تھی کہ ابھی صحیح وقت نہیں۔

اس کی آنکھیں تھوڑی سی شرم، تھوڑی سی الجھن، اور تھوڑی سی دلچسپی کے ساتھ فون کی اسکرین پر جم گئیں۔ اس نے سوچا، "کیا میں یہ سب بتاؤں؟ یا بس خاموشی ہی بہتر ہے؟"

وہ تھوڑی دیر خاموش رہی، اور آخرکار صرف اتنا لکھا:

"کچھ نہیں... ویسے میسجز سین کرنے میں زیادہ مزہ ہے۔"

ارمان اپنے گھر واپس آیا۔ دروازہ کھولتے ہی تھکن سے کندھے ڈھیلے ہوئے ہو گئے، لیکن دل کی دھڑکن کچھ اور ہی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوا اور بیڈ پر آہستہ سے لیٹ گیا۔ دماغ میں ایک ہی خیال گھوم رہا تھا—مومینا۔ اُس کے نرم لہجے، معصوم مسکان، اور خاموشی میں چھپی ہوئی طاقت ارمان کے دل کو چیر رہی تھی۔ ہر لمحہ وہ سوچتا رہا، "کاش میں اسے اور قریب سے جان پاتا... اور یہ سب خواب ہی نہ ہوتے۔"

لیکن جیسے ہی وہ اپنے خیالات میں گم ہوا، اچانک ایک تیز آواز نے کمرے میں گونج مچائی۔

"ارمان"!

دادی کھڑی تھیں، ہاتھ کمر پر، چہرے پر سختی اور آنکھوں میں انتقام کی چمک۔ ارمان کا دل جیسے ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ وہ جانتا تھا کہ دادی کبھی خوش نہیں ہوتیں، خاص طور پر اس کے والد کی محبت کی شادی کے بعد۔ دادی کی آنکھوں میں وہ پرانی رنجشیں تھیں جو اُس کی ماں کے لیے محسوس کی جاتی تھیں، اور ارمان کے ہر عمل پر ایک کڑواہٹ چھائی رہتی تھی۔

"باہر سے سودا کیوں نہیں لائے؟" دادی نے غصے سے کہا، آواز میں ٹکراؤ اور سختی دونوں۔ ارمان جانتا تھا کہ اس کے والد بھی اکثر خاموش رہتے ہیں اور دادی کے سامنے کچھ نہیں بولتے۔ دادی کی یہ کڑواہٹ اس کے لیے ہر بار ایک چھوٹا زہر تھی، جو دل اور دماغ دونوں کو جلا دیتی تھی۔

ارمان نے دل میں سانس سمیٹتے ہوئے کہا، "دادی... بس تھوڑا دیر کے لیے بیڈ پر بیٹھا تھا"...

"بس دیر کے لیے؟" دادی کے لہجے میں تلخ طنز اور سختی تھی، "تمہیں لگتا ہے کہ گھر کے کام اور تمہارے فرائض تمہارے دل کے سکون کے لیے رک گئے ہیں؟"

ارمان کے سینے میں ایک عجیب دباؤ بڑھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ دادی اس کی زندگی کی سب سے بڑی دشمن ہیں، وہ اُس سے نفرت کرتی ہیں اور اکثر ہر فیصلے کو اپنی ضد کے مطابق دیکھتی ہیں۔

اور یوں، کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ ارمان کی آنکھیں چھت کی طرف تھیں، دل میں مومنہ کے لیے ایک امید، ایک خوف، اور ایک بے چینی کا طوفان۔ دادی ہاتھ کمر پر، نظریں سخت، اور چہرے پر غصے کے سائے کے ساتھ کھڑی تھیں...

ارمان جانتا تھا کہ آج کی رات آسان نہیں ہو گی۔ دل اور دماغ کی کشمکش اس کے اندر ایک طوفان کی مانند تھی۔ ایک طرف مومنہ کی محبت اور جذبات، دوسری طرف دادی کی سختی اور نفرت...

ارمان کے والد، رحمان شیخ، وہ شخص تھے جنہوں نے اپنے دل کی سنی تھی چاہے اس کی قیمت کچھ بھی ہو۔ انہوں نے اپنے گھر والوں کی مرضی، خاندان کی روایات اور سماجی دباؤ کے خلاف جا کر ایمان نور سے شادی کی تھی۔ یہ شادی ارینج میرج ہی تھی لیکن تھی خاندان سے باہر ایمان نور نہ صرف سادہ مزاج اور باحیا عورت تھیں بلکہ ایک مضبوط کردار کی مالک بھی تھیں، مگر یہی مضبوطی اس گھر کے لیے سب سے بڑی خامی بن گئی تھی۔

جب رخسانہ بیگم نے یہ رشتہ دیکھا تو ان کو یہ پسند نہیں آیا تھا لیکن رحمان شیخ کو یہ لڑکی اچھی لگی تھی اور انہوں نے ہاں کر دی تھی اور یہ رشتہ قبول کر لیا تھا۔

جب یہ شادی ہوئی، تو رحمان شیخ کی والدہ رخسانہ بیگم، پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ ان کے لیے یہ صرف ایک شادی نہیں تھی بلکہ ان کی انا، اختیار اور عزت پر براہِ راست حملہ تھا۔ انہوں نے اسی دن دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس بہو کو کبھی دل سے قبول نہیں کریں گی۔ مسکراہٹوں کے پیچھے زہر، اور خاموشی کے پیچھے نفرت چھپی رہتی۔

رخسانہ بیگم کا رویہ شروع سے ہی ایمان نور کے لیے سرد، سخت اور طنزیہ رہا۔ بات بات پر جتانا، چھوٹی چھوٹی باتوں پر تذلیل، اور ہر موقع پر یہ احساس دلانا کہ وہ اس گھر کا حصہ نہیں ہیں یہ سب ایمان نور کی روزمرہ زندگی بن چکا تھا۔ مگر ایمان نور نے کبھی آواز بلند نہیں کی۔ وہ خاموشی سے سب سہتی رہیں، صرف اس امید پر کہ وقت کے ساتھ حالات بدل جائیں گے۔

ارمان کے دو چچا ساجد شیخ اور یاسر شیخ بھی اسی نفرت کے وارث تھے۔ وہ اپنی ماں کی سوچ کے عین مطابق تھے۔ ان کے لیے ایمان نور ایک ایسی عورت تھیں جو "خاندان میں زبردستی داخل ہو گئی" تھیں۔ وہ نہ صرف ایمان نور کو ناپسند کرتے تھے بلکہ ارمان کو بھی اکثر اسی زاویے سے دیکھتے جیسے وہ بھی اسی ناپسندیدہ فیصلے کی یاددہانی ہو۔

اس پورے گھر میں اگر کوئی سب سے زیادہ خاموش جنگ لڑ رہا تھا تو وہ ارمان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دادی اماں اس کی ماں سے نفرت کرتی ہیں، اور اسی نفرت کی پرچھائیں اکثر اس پر بھی پڑتی ہیں۔ اس کے والد، رحمان شیخ، اگرچہ دل کے نرم تھے مگر ماں کے سامنے بولنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ وہ خاموشی کو

صلح سمجھ بیٹھے تھے، جبکہ یہ خاموشی دراصل ایک زہر بن کر پورے گھر میں پھیل چکی تھی۔

رخسانہ بیگم کے لیے ایمان نور صرف ایک بہو نہیں بلکہ ایک مستقل شکست کی علامت تھیں۔ اسی لیے وہ ہر روز، ہر بات، ہر موقع پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتیں کہ اس شادی نے اس خاندان کو تباہ کر دیا ہے۔ اور ارمان... وہ اس کہانی کا سب سے خاموش کردار تھا، جو بچپن سے ہی محبت اور نفرت کے بیچ پلتا آیا تھا۔

رحمان شیخ نے کبھی بھی ایمان نور کو باقاعدہ کوئی خرچ نہیں دیا تھا۔ نہ ماہانہ خرچ، نہ جیب خرچ، نہ ہی گھریلو ضروریات کے لیے کوئی واضح رقم۔ گھر میں جو کچھ بھی تھا، وہ سب رخسانہ بیگم کے کنٹرول میں تھا ہر پیسہ، ہر خرچ، ہر ضرورت ان کی مرضی سے جڑی ہوئی تھی۔

ایمان نور کی زندگی آہستہ آہستہ ایک خاموش قید میں بدل چکی تھی۔ صحن میں رکھے مٹی کے گھڑے کی طرح موجود، مگر نظر انداز۔

ایک دن دوپہر کے وقت، جب باورچی خانے میں چولہا جل رہا تھا اور سالن میں نمک کم پڑ گیا تھا، ایمان نور نے ہمت جمع کی۔ اس نے آہستہ سے باورچی

خانے کے دروازے سے جھانک کر صحن میں بیٹھی اپنی ساس، رخسانہ بیگم کو دیکھا۔ وہ چارپائی پر بیٹھی تسبیح پھیر رہی تھیں، مگر آنکھیں ہر چیز پر گہری نظر رکھے ہوئے تھیں۔

ایمان نور نے دھیمی آواز میں کہا،

"امّاں جی... اگر اجازت ہو تو تھوڑے سے پیسے چاہیے تھے۔ گھر میں آٹا بھی ختم ہو رہا ہے، اور ارمان کے اسکول کے جوتے بھی تنگ ہو گئے ہیں"...

رخسانہ بیگم نے تسبیح روک دی۔ نظریں اٹھائیں، جیسے ایمان نور نے کوئی بہت بڑا جرم کر دیا ہو۔

"ہر وقت پیسے، پیسے!" انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "یہ سب فضول خرچیاں ہیں۔ ہمارے زمانے میں ہم ایک جوڑے میں سال گزار لیا کرتے تھے۔"

ایمان نور نے نظریں جھکا لیں۔

"امّاں، میں فضول خرچ نہیں مانگ رہی... بس ضرورت ہے"...

"ضرورت؟" رخسانہ بیگم کی آواز سخت ہو گئی۔

"ضرورت تمہیں ہوتی ہے یا تمہیں سکھایا گیا ہے مانگنا؟ میرے بیٹے نے تمہیں سر پر بٹھا رکھا ہے، پھر بھی تمہارا پیٹ نہیں بھرتا۔"

یہ سن کر ایمان نور کے ہاتھ کانپ گئے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں، مگر الفاظ حلق میں اٹک گئے۔ انہیں یاد آیا کہ رحمان شیخ سے کبھی خرچ مانگنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی تھی۔ وہ یا تو خاموش رہتے، یا کہتے،

"امّاں سے بات کر لو، وہی سب سنبھالتی ہیں۔"

اور یوں، ایمان نور ہر بار اپنی ساس کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔

اس دن بھی وہ خالی ہاتھ واپس باورچی خانے میں آ گئیں۔ چولہے پر رکھا برتن ابل رہا تھا، مگر ان کے دل میں خاموش آنچ جل رہی تھی۔ انہوں نے آنکھوں کے کونے سے آنسو پونچھے اور خود سے کہا،

"بس صبر... شاید کل بہتر ہو جائے"...

لیکن کل کبھی نہیں آتا تھا۔

شام کو رحمان شیخ دفتر سے واپس آئے۔ ایمان نور نے ان کی طرف دیکھا، جیسے کچھ کہنے والی ہوں، مگر پھر خاموش رہ گئیں۔ وہ جانتی تھیں یہ خاموشی ہی ان کی قسمت بن چکی ہے۔

ایمان نور نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہ رحمان شیخ سے بات کرے گی۔ اس دن بھی، جب رات کے سناٹے میں ارمان سو چکا تھا، اس نے ہمت جمع کی۔ رحمان بستر پر لیٹے موبائل دیکھ رہے تھے۔ ایمان نور نے آہستہ سے کہا،

"رحمان... گھر کے خرچ کے بارے میں بات کرنی تھی"...

رحمان شیخ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا،

"ابھی نہیں، صبح دفتر جانا ہے۔ امّاں سب سنبھال لیتی ہیں، تم کیوں پریشان ہوتی ہو؟"

یہ کہہ کر انہوں نے کروٹ بدل لی۔

ایمان نور وہیں بیٹھے بیٹھے خاموش ہو گئیں۔ ایک بار پھر بات ادھوری رہ گئی، اور ان کے دل میں ایک اور بوجھ جمع ہو گیا۔

اگلے دن دوپہر کا وقت تھا۔ باورچی خانے میں ایمان نور نے قیما پکایا تھا۔ گوشت کم تھا، مگر گھر کے سب افراد کے لیے پورا ہونا ضروری تھا۔ انہوں نے چپ چاپ کیمے میں پانی ڈال دیا، بالکل ویسے ہی جیسے وہ برسوں سے سیکھتی آرہی تھیں۔ کیونکہ رخسانہ بیگم بھی یہی کیا کرتی تھیں تینوں بیٹوں کی تنخواہیں اپنے پاس رکھ کر بھی کھانے میں ہمیشہ کمی ہی رکھتی تھیں۔

دستر خوان بچھا۔

جیسے ہی پہلا نوالہ یاسر شیخ کے منہ میں گیا، اس کا چہرہ بگڑ گیا۔

"یہ کیا گھٹیا چیز بنادی ہے؟" اس نے اونچی آواز میں کہا۔

"کیمے کے اندر اتنا پانی؟ اس سے بہتر تھا شوربہ ہی بنا لیتیں، یا بنانے کی کیا ضرورت تھی بھابھی؟"

کمرے میں ایک لمحے کے لیے خاموشی چھاگئی۔

ایمان نور کے ہاتھ رک گئے۔

ان کے کانوں میں الفاظ گونج رہے تھے گھٹیا، فضول، بے کار۔

انہوں نے نظریں جھکا لیں اور دھیمی آواز میں بولیں،

"قیمہ کم تھا... سب کے لیے پورا کرنے کے لیے"

"تو نہ بناتیں!" یاسر شیخ نے بات کاٹ دی۔

"ہر روز یہی کہانی ہے۔ نہ ذائقہ، نہ مقدار۔"

ساجد شیخ خاموش بیٹھا رہا، مگر اس کی خاموشی بھی کسی حمایت سے کم نہ تھی۔

رخسانہ بیگم نے ایک نظر ایمان نور پر ڈالی ایسی نظر جس میں ترس نہیں، صرف حساب تھا۔

"عورت کو کھانا بنانا نہیں آتا تو گھر کیسے چلتا ہے؟" انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔

"میرے زمانے میں ہم کم میں بھی بہتر کھانا بنا لیتے تھے مصالوں کا کمال ہوتا تھا بس صحیح سے بھننے آتے ہو۔"

ایمان نور کے گلے میں آنسو اٹک گئے۔

کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ کیا کم کیوں تھا۔

یہ بھی کسی نے نہیں پوچھا کہ گھر کے پیسے کہاں جاتے ہیں۔

یہ بھی نہیں دیکھا گیا کہ وہ عورت کس نیت سے پانی ڈال رہی تھی تاکہ سب کا پیٹ بھر سکے۔

ارمان ایک کونے میں بیٹھا سب دیکھ رہا تھا۔

اس کے ننھے ہاتھ پلیٹ میں جمے ہوئے تھے۔

اسے کیمے کا ذائقہ برا نہیں لگا تھا، مگر ماں کی خاموشی نے اس کے دل میں کڑواہٹ بھر دی تھی۔

ایمان نور نے کھانا نہیں کھایا۔

وہ خاموشی سے برتن سمیٹتی رہیں، جیسے یہ بے عزتی بھی روزمرہ کے کاموں میں شامل ہو۔

اور اس دن، پہلی بار، ارمان نے محسوس کیا

اس گھر میں کمی صرف کیمے کی نہیں تھی،

بلکہ انصاف کی تھی۔

یہ وہ دن تھا جب ایمان نور کے صبر میں ایک دراڑ پڑی...

اور ارمان کے دل میں بغاوت نے آہستہ آہستہ سر اٹھانا شروع کیا۔

ارمان چھوٹا سا کمرے میں بکھری کھلونوں کے درمیان بیٹھا تھا، لیکن اس کے دل پر بوجھ اتنا تھا کہ کھیلنے کا دل نہیں کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں، اور وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا رہا تھا۔

کمرے کے ایک کونے میں دادی رخسانہ بیگم اپنی مخصوص سختی کے ساتھ بیٹھیں تھیں، چہرے پر تلخی اور آنکھوں میں قہر کی چمک تھی۔ ان کا ہر قدم اور ہر الفاظ کا انداز ارمان کے لیے ڈراؤنا تھا۔

"ارمان! منحوس بچہ کالی شکل کا، ماں بیٹا دونوں نے میرے رحمان کو جکڑ لیا ہے۔" دادی کی آواز سخت تھی اور ان کے لہجے میں اتنا غصہ تھا کہ چھوٹا بچہ لرز اٹھا۔ "تھپڑ"!

ارمان فوراً اپنے چھوٹے ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ چھوٹے قدموں سے کونے کی طرف بڑھا اور سر جھکایا۔ دل کی دھڑکن تیز تھی اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کی معصوم حرکتوں پر دادی اتنا ناراض کیوں ہیں۔

ایمان نور، ارمان کی ماں، خاموشی سے کھڑکی کے پاس کھڑی برتن دھو رہی تھیں۔ دل میں وہ جانتی تھیں کہ اس لمحے میں کوئی بھی الفاظ دادی کے غصے

کو کم نہیں کر سکتے۔ بس وہ چھوٹے سے بیٹے کو دیکھ کر خاموش رہیں اور دل ہی دل میں سوچیں: "یااللہ میری مدد فرما میں بہت بے بس ہو چکی ہوں۔"

ارمان رونے لگ گیا، چھوٹے قدموں سے ایک طرف جھک گیا، اور سر ہاتھوں میں چھپائے بیٹھ گیا۔ ہر تھپڑ، ہر کڑی بات اس کے دل پر لگ رہی تھی۔

دادی رخسانہ بیگم نے دوبارہ اپنی آواز بلند کی، اس بار ایمان نور کی طرف دیکھتے ہوئے:

"ایمان! دیکھو کتنا شور کر رہا ہے یہ مجھے تسبیح بھی نہیں پڑھنے دے رہا، چھوٹے بچے کی تربیت بھی تمہارے بس کی نہیں"!

ایمان نور خاموش رہیں، سر جھکائے اور دل ہی دل میں سوچیں: "کاش میں کچھ کر پاتی، مگر یہ عورت کبھی راضی نہیں ہو گی۔ ارمان، بس صبر کر لو، یہ بھی گزر جائے گا۔"

ارمان نے چھوٹے ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر اپنی دادی کی سخت نگاہوں سے بچنے کی کوشش کی۔ تین سال کا معصوم بچہ، جو صرف محبت اور توجہ چاہتا تھا، اس لمحے دنیا کے سب سے بڑے بوجھ تلے دب گیا۔

اس کمرے کی دیواریں اور فرش بھی گواہ لگ رہے تھے کہ کس طرح ایک چھوٹے بچے کا معصوم دل، صرف ایک تھپڑ اور کڑی بات سے ٹوٹ سکتا ہے۔

اور اسی لمحے ارمان کے دل میں پہلی بار یہ سوال پیدا ہوا: "دادی مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہیں؟"

اگلے دن

"السلام علیکم، بھابھی!" یاسر شیخ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے خوش دلی سے کہا، اور اپنے ہاتھ میں تازہ چکن کی ٹوکری اٹھائے ہوئے تھے۔

ایمان نور نے جھک کر سر ہلایا اور ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، "وعلیکم السلام، یاسر بھائی، کیسے ہیں؟" اس کے اندر ایک چھوٹی خوشی کی لہر دوڑ گئی، جیسے دن کی تھکن کچھ لمحوں کے لیے کم ہو گئی ہو۔

"اللہ کا شکر! بھابھی، آج میں چکن لایا ہوں، آپ آج بریانی بنا دیں۔" یاسر نے ٹوکری زمین پر رکھ دی اور مسکراتے ہوئے کہا، "کل تک خشک سبزی کے دن تھے، آج کچھ خاص ہونا چاہیے۔"

ایمان نور نے ہلکا سا سر ہلایا، دل میں چھپی مسکراہٹ کے ساتھ۔ آج وہ واقعی چاہتی تھی کہ کچھ اچھا کھائے، اتنے دنوں کی سختی کے بعد۔ اس کے ہاتھوں میں تھوڑی سا خوشی اور ولولہ تھا، جیسے اب وہ اپنے گھر کے چھوٹے کچن میں بھی اپنی دنیا بنا سکتی ہو۔ "ٹھیک ہے، یاسر بھائی، آج بریانی بنے گی۔" اس نے اندر جاتے ہوئے کہا، اور چولہے کے پاس کھڑی ہو کر چکن کی تیاری شروع کر دی۔

اس نے چکن دھو کر صاف پانی میں رکھا، پیاز اور ٹماٹر باریک کاٹے، اور خوشبودار مصالحے آہستہ آہستہ چکن میں ملانے لگی۔ چمچ سے ہلانے پر خوشبو کچن میں پھیل گئی، اور ایمان نور کے چہرے پر سکون کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے

چاول اُبالنے کے لیے پانی میں ڈالے، اور دھیمی آگ پر بریانی کو دم پر رکھ دیا۔ ہر لمحہ میں اس کی امیدیں اور محبت شامل تھیں، جیسے وہ اس چھوٹی سی بریانی کے ساتھ اپنا دل بھی پکار رہی ہو۔

لیکن جیسے ہی بریانی دم پر رکھی گئی، اچانک رخسانہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے قدموں کی آواز سن کر کچن کا ماحول بدل گیا۔ انہوں نے ارمان کو اُٹھایا، جو ابھی تھوڑا سا سو رہا تھا۔ "ارمان اٹھو! بس اب بس!" رخسانہ بیگم کا لہجہ سخت اور کڑوا تھا، اور ہر لفظ میں سردی اور کنٹرول جھلک رہا تھا۔

ارمان چونک کر آنکھیں کھول بیٹھا اور فوراً رونے لگا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں حیرت اور ڈر جھلک رہا تھا، وہ ابھی بھی نیند کی دنیا سے باہر نہیں آیا تھا۔

ایمان نور فوراً دوڑی، "ارمان! ارمان، کیا ہوا میرے بچے کو؟" اس نے آہستہ سے اپنے بیٹے کو سہلانے کی کوشش کی، اس کی انگلیاں اس کے نرم گالوں پر پھیرتیں، لیکن رخسانہ بیگم کے چپکے سے کچن میں گھسی۔

وہ بریانی والی ہانڈی کی طرف بڑھیں، اور تقریباً تمام چکن کی بوٹیاں نکال دیں۔ صرف چند بوٹیاں باقی رہ گئیں۔

شام کا وقت تھا، سورج اپنے آخری شعاعوں کے ساتھ دھیرے دھیرے افق کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ گھر کے کھانے کی میز پر تینوں بھائی ساجد، یاسر اور رحمان شیخ اپنے اپنے سیٹ پر بیٹھے تھے، جبکہ رحمان کا بیٹا ارمان بھی ساتھ تھا۔ رخسانہ بیگم بھی میز کے سرے پر بیٹھیں، ان کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح سختی اور کنٹرول جھلک رہا تھا۔

ایمان نور کچن میں تھی۔ اس نے بریانی کے بھاری پتیلے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بڑی مشکل سے اُٹھایا اور آہستہ آہستہ میز تک لائی۔ پتیلا اتنا بھاری تھا کہ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں ہلکی سی سرخی لیے ہوئے تھیں، لیکن ایمان نور نے ہمت نہیں ہاری۔ جیسے ہی اس نے پتیلا میز پر رکھا، سانس لینے کے لیے ایک لمحہ کے لیے رک گئی۔

اس نے ڈھکن کھولا، لیکن جیسے ہی بریانی دیکھی، اس کے چہرے پر حیرت اور الجھن کا اظہار آگیا۔ "یہ کیا ہوا؟" اس کے لب ہلکے لرز رہے تھے۔ بریانی میں سے تقریباً تمام چکن کی بوٹیاں غائب تھیں، صرف چند چھوٹی

چھوٹی ٹکیاں بچی تھیں۔ ایمان نور کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں، دل میں ایک عجیب سا ڈر اور حیرت ایک ساتھ دوڑ گئی۔

یاسر نے جیسے ہی بریانی دیکھی، فوراً پوچھا، "بھابھی، آخر یہ کیا ہوا؟" اس کی آواز میں حیرت اور تھوڑی نرمی بھی تھی، لیکن بات میں سوال کی شدت چھپی ہوئی تھی۔

ایمان نور خاموش رہی، صرف باقی بچی ہوئی بوٹیاں سب کے پلیٹ میں ڈال دی اور خود بغیر چکن کے بریانی کھانے لگی۔ اس کے دل میں سوال اُبھرا کہ آخر یہ سب کیسے ہو گیا، لیکن اس نے ایک لمحے کے لیے سوچ کر کچھ نہ کہا۔

اسی وقت رخسانہ بیگم نے سخت لہجے میں کہا، "اور بوٹیاں کہاں کی گئی؟ یہ کھانے کے لیے کافی نہیں ہے، اور تم سب کو کیا کھلاؤ گی؟"

یاسر نے فوراً پتیلا کھولا اور حیرت سے کہا، "بابھی، یہ بوٹیاں کہاں گئی؟ میں نے دو کلو چکن لایا تھا، اور یہاں تو ایک پاؤ کی بھی نہیں بچی! سارا چکن کہاں گیا؟"

رحمان اور ساجد بھی حیران ہو کر دیکھنے لگے، جبکہ ارمان چھوٹے سے صدمے کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا، آنکھیں بڑی بڑی اور خاموش۔

ایمان نور نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ سب کچھ کیسے ممکن ہوا۔

ساجد نے پلیٹ ایک طرف رکھتے ہوئے طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا،

"لگتا ہے بھابھی نے حساب کتاب میں کچھ گڑبڑ کر دی ہے۔"

ایمان نور کے ہاتھ کانپ گئے۔ اس نے نظریں جھکا لیں، آواز بہت دھیمی تھی،

"میں نے جتنا تھا، سب پکا دیا تھا... مجھے خود سمجھ نہیں آ رہی۔۔۔۔"

رخسانہ بیگم نے فوراً بات کاٹی، آواز میں زہر گھولتے ہوئے بولیں،

"سمجھ نہیں آ رہی؟ یا جان بوجھ کر ہمیں بے وقوف بنایا جا رہا ہے؟ گھر کا اناج، گوشت، سب یہی ہڑپ کر جاتی ہے، اور پھر کہتی ہے پتہ نہیں"!

یاسر نے ناگواری سے کہا،

"امی، اتنا بھی کیا کہنا... لیکن واقعی بات عجیب ہے۔"

یہ جملہ سن کر رخسانہ بیگم کو اور موقع مل گیا۔

"عجیب؟ میں تو پہلے دن سے کہہ رہی ہوں، یہ لڑکی گھر سنبھالنے کے قابل ہی نہیں۔ باہر سے آئی ہے، رسم، طریقہ کچھ نہیں آتا"!

ساجد نے بھی تیور بدل لیے،

"بھابھی، اگر کھانا بنانا نہیں آتا تو صاف بتا دیا کریں۔ ہمیں روز یہ تماشہ نہیں دیکھنا۔"

ایمان نور کی آنکھیں بھر آئیں۔ برسوں کا صبر، خاموشی، ذلت ایک دم لبوں تک آ گئی۔

وہ پہلی بار سیدھی کھڑی ہوئی، آواز لرزی مگر صاف تھی،

"میں نے کبھی کسی کا حق نہیں مارا۔ چکن کہاں گیا مجھے نہیں پتا جس نے چکن غائب کیا ہے اللہ کرے وہ برباد ہو، یوں سب کے سامنے الزام لگانے کی کیا ضرورت تھی؟"

رخسانہ بیگم نے میز پر ہاتھ مارا،

"اوئے زبان سنبھال کر! بڑی آئی حق کی بات کرنے والی! میرے گھر میں رہ کر مجھے ہی جواب دے رہی ہے؟"

ایمان نور کی آواز اب بھیگی ہوئی تھی مگر درد صاف جھلک رہا تھا،

"امی، میں نے کبھی آپ سے بدتمیزی نہیں کی، لیکن ہر بات میں مجھے ہی کیوں گھسیٹا جاتا ہے؟ میں بھی انسان ہوں۔۔۔۔"

"چپ"!

یہ آواز رحمان شیخ کی تھی۔

وہ اب تک خاموش بیٹھا سب دیکھ رہا تھا۔ اچانک اٹھا، غصے میں لال آنکھوں کے ساتھ ایمان نور کی طرف بڑھا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری ماں کے سامنے زبان چلانے کی؟"

"میں نے بدتمیزی نہیں کی" ایمان نے وضاحت کرنا چاہی۔

لیکن اگلے ہی لمحے

چھپاک!

رحمان شیخ کا تھپڑ پورے کمرے میں گونج گیا۔

ایمان نور لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹی۔ اس کے کان سن ہو گئے، آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔

ارمان زور سے رونے لگا۔

رخسانہ بیگم نے سرد لہجے میں کہا،

"بالکل ٹھیک کیا، ایسے ہی عورتوں کو سیدھا کیا جاتا ہے۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

ایمان نور نے کوئی لفظ نہیں کہا۔ بس اپنے روتے ہوئے بچے کو دیکھا، پھر سر جھکا لیا۔

اور اس لمحے، اس نے جان لیا

یہ گھر اس کا کبھی نہیں ہو سکتا۔

ارمان یہ منظر دیکھ کر ساکت رہ گیا۔

اس کی ننھی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں کھڑی تھی، آنسو اس کے گالوں پر خاموشی سے بہہ رہے تھے، مگر وہ کچھ کہہ نہیں رہی تھی۔ وہ رونا جس میں آواز نہ ہو، وہ درد جو لفظوں کا محتاج نہ ہو ارمان نے پہلی بار وہ درد دیکھا۔

وہ چھوٹا سا بچہ اپنی ماں کی طرف بڑھا، اس کے کپڑے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کی معصوم آنکھوں میں سوال تھا، خوف تھا، اور بے بسی تھی۔ وہ

سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کی ماں کو کیوں مارا گیا، کیوں سب خاموش ہیں، اور کیوں اس کا باپ بھی خاموش کھڑا ہے۔

ایمان نور نے جھک کر ارمان کو سینے سے لگا لیا۔ اس کے آنسو اب ارمان کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ اسے مضبوطی سے تھامے ہوئے تھی، جیسے اگر چھوڑ دیا تو سب کچھ بکھر جائے گا۔

ارمان نے کانپتی ہوئی آواز میں بس اتنا کہا،

"ماما"...

یہ ایک لفظ تھا، مگر اس میں پوری فریاد چھپی ہوئی تھی۔

ارمان نے اس دن کچھ سیکھ لیا

کہ آپ کئی دفعہ صحیح ہو کر بھی سب کے لیے صحیح نہیں ہوتے۔

—

اگلے دن صبح کا سورج بھی جیسے بوجھل دل کے ساتھ طلوع ہوا تھا۔

ایمان نور خاموشی سے کمرے میں بیٹھی اپنا اور ارمان کا سامان سمیٹ رہی تھی۔ کپڑوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنی پوری زندگی تہہ کر رہی تھی۔ ہر چیز اٹھاتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ جاتے، اور آنسو بار بار آنکھوں سے چھلک کر گود میں گر جاتے۔

ارمان بستر کے ایک کونے میں بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، مگر ماں کے آنسو اسے بے چین کر رہے تھے۔

"ماما..." اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا، "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

ایمان نور نے ایک لمحے کے لیے خود کو سنبھالا، آنسو پونچھے، اور ارمان کو اپنے قریب بلا کر سینے سے لگا لیا۔

"ماموں کے گھر جا رہے ہیں، بیٹا..." اس کی آواز بھرا گئی، "ماما اب یہاں نہیں رہ سکتی۔"

وہ مزید اس اذیت کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ روز کی تذلیل، خاموش ظلم، اور وہ تھپڑ سب کچھ اس کے اندر کہیں ٹوٹ چکا تھا۔

اسی لمحے رحمان شیخ دروازے کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر نہ ندامت تھی، نہ افسوس۔

"یاد رکھنا،" اس نے سخت لہجے میں کہا،

"تم اپنی مرضی سے جا رہی ہو۔ میں تمہیں لینے کبھی نہیں آؤں گا۔"

یہ الفاظ ایمان نور کے دل میں خنجر کی طرح اتر گئے۔

اس نے کچھ نہیں کہا۔ شاید کہنے کو اب کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

وہ خاموشی سے ارمان کا ہاتھ تھامے، آخری بار اس گھر کی دہلیز کو دیکھا وہ دہلیز جس پر اس نے کبھی خواب رکھے تھے۔

پھر بغیر پیچھے دیکھے، ارمان کو ساتھ لیے وہاں سے نکل گئی۔

یونیورسٹی کی کینٹین میں دوپہر کا شور تھا۔ پلیٹوں کی کھنک، قہقہوں کی آوازیں، اور چائے کی بھاپ میں لپٹی ہوئی باتیں۔ ارمان سامنے رکھی میز کو گھورے جا رہا تھا، جیسے اس کی نظر لکڑی کے پار کسی اور دنیا میں اٹکی ہو۔

"کیا ہوا چُوتیئے؟ کیا سوچ رہا ہے؟"

سکندر نے اس کے خالی چہرے کو دیکھ کر بے تکلفی سے پوچھا۔

ارمان نے آہستہ سے سانس کھینچی، نظریں اٹھائے بغیر بولا،

"کچھ نہیں یار... بس سوچ رہا تھا، زندگی کتنی بے بس ہوتی ہے نا۔"

سکندر نے کرسی پر پہلو بدلا، لمبی انگڑائی لی،

"اہو یار، بے بس تو ہے۔" پھر فوراً لہجہ بدل گیا،

"ویسے یہ خان کہاں مر گیا؟ آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے چائے کا آرڈر دیے۔"

اسی لمحے سکندر کی نظر کینٹین کے ویٹر پر پڑی جو ان کی میز کی طرف آنے کے بجائے لڑکیوں کے گروپ کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔ وہ جھک جھک کر باتیں کر رہا تھا، مسکرا رہا تھا، جیسے اسی میز پر اس کی ذمہ داری ختم ہو گئی ہو۔

سکندر کی جبڑیاں بھنچ گئیں۔

"واہ بھئی واہ... ادھر ہم خالی کپوں سے باتیں کریں، اور جناب ادھر مصروف ہیں۔"

وہ ایک جھٹکے سے کرسی پیچھے کر کے کھڑا ہوا۔ ارمان نے چونک کر اسے دیکھا، مگر سکندر کے چہرے پر اب طنز نہیں، غصہ تھا۔ وہ تیز قدموں سے ویٹر کی طرف بڑھا

اور کینٹین کی ہلچل ایک لمحے کو جیسے ساکت ہو گئی۔

"کیسی ہو، فیمیل جینڈر؟"

سکندر نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ لڑکیوں کے گروپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ آواز میں وہی لاپرواہ شوخی تھی جس کے پیچھے صاف غصہ چھپا ہوا تھا۔

لڑکیاں ایک دوسرے کو دیکھ کر چونک گئیں۔ کسی نے ناگواری سے منہ موڑا، کسی نے نظریں چرا لیں۔ اسی لمحے سکندر کی نظر خان پر پڑی جو اب بھی وہیں کھڑا بنا ضرورت کے باتیں بڑھا رہا تھا۔

"اوئے خان"!

سکندر نے آواز بلند کی،

"بھائی، ہم بھی زندہ ہیں۔ ان سے پہلے ادھر آئے تھے۔ آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے، ذرا چائے تو دے دو۔"

خان ہڑبڑا گیا۔

"اچھا جی، بس ابھی لاتا ہوں سر"...

وہ فوراً پلٹا، جیسے اب اسے اپنی ذمہ داری یاد آ گئی ہو۔

سکندر نے مڑ کر ارمان کی طرف دیکھا، کندھے اچکائے اور زیرِ لب بولا،

"یہی حال ہے یار... مردوں کی بات سنی نہیں جاتی ہر شخص عورتوں کی مدد کرتا رہتا ہے"

ارمان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیا، مگر اس کی آنکھوں میں چمک لوٹ ائی اور وہ منہ نیچے کر کے ہنسنے لگا۔ سکندر ایک نمبر کا حرامی تھا اور ارمان یہ بات جانتا تھا۔

ایک لڑکی نے طنزیہ انداز میں خان سے کہا،

"بڑی عورتوں کی عزت کرتے ہو ماشاءاللہ... اللہ تمہیں نیک بیوی دے۔"

خان نے ذرا اکڑ کر جواب دیا،

"میری شادی ہو چکی ہے۔"

"اوہ"!

سکندر نے آنکھیں پھیلا کر حیرت ظاہر کی،

"شادی ہو گئی؟ پھر بھی لڑکیوں سے اتنی گپ شپ؟ بیچاری بیوی پر کیا گزرتی ہو گی"...

یہ سنتے ہی سب لڑکیاں ایک دم خاموش ہو گئیں۔

کسی نے چونک کر سکندر کو دیکھا، کسی نے نظریں جھکا لیں، اور کسی کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری ابھر آئی۔

خان کا رنگ بدل گیا، وہ بغیر کچھ کہے مڑ گیا۔

کینٹین کا شور اپنی جگہ تھا، مگر اس لمحے میز کے گرد ایک عجیب سی خاموشی پھیل چکی تھی۔

ارمان یہ سن کر زور زور سے ہنسنے لگا۔

اچانک قہقہے کی آواز کینٹین کے شور میں گونج گئی۔ وہ اتنا ہنس رہا تھا کہ آنکھوں سے پانی نکل آیا، اور پیٹ پکڑ کر کرسی پر ذرا سا آگے کو جھک گیا۔

سکندر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"اوئے! کیا ہو گیا ہے تجھے؟" اس نے ہنستے ہوئے ہی کہا۔

ارمان نے ہنسی کے درمیان بمشکل سانس لیتے ہوئے جواب دیا،

"یار... تو نے خان کو جو آئینہ دکھایا ہے نا... بس وہی یاد آ گیا"!

وہ پھر سے ہنس پڑا۔

کینٹین میں بیٹھے چند لڑکے ادھر متوجہ ہو گئے، کچھ مسکرانے لگے، اور خان نے خفگی سے ایک نظر ارمان پر ڈالی، مگر کچھ کہے بغیر چپ چاپ کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

ارمان کی ہنسی آہستہ آہستہ تھمی، مگر اس کے چہرے پر اب بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ باقی تھی جو سکندر کی وجہ سے تھی۔

اگلے دن:

مومنہ یونیورسٹی کے لیے تیار ہوئی تو حسبِ معمول اُس کے انداز میں ٹھہراؤ اور سنجیدگی تھی۔ اس نے آئینے کے سامنے آخری بار دوپٹہ درست کیا، بیگ کندھے پر ڈالا اور کچن کی طرف بڑھی۔

"السلام علیکم امّی،" اس نے نرم آواز میں کہا۔

نصیم بی بی نے چولہے کے پاس سے پلٹ کر بیٹی کو دیکھا،

"وعلیکم السلام، اللہ حفاظت میں رکھے،" انہوں نے دعائیہ انداز میں کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد طارق انور حسبِ معمول موٹر سائیکل لے کر آ گئے۔ مومنہ خاموشی سے پیچھے بیٹھی، ہیلمٹ سنبھالا اور دونوں روز کی طرح یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گئے۔ سڑک پر اُس کی نظریں کبھی سامنے ہوتیں، کبھی گزرتے درختوں پر، وہ کم بولتی تھی، مگر اس کی خاموشی میں ایک سنجیدگی اور وقار تھا۔

دوسری طرف منظر بالکل مختلف تھا۔

سکندر، دانیال، شاہویر اور ارمان ایک ہی موٹر سائیکل پر کسی طرح ایڈجسٹ ہو کر یونیورسٹی جا رہے تھے۔ سکندر نے سب سے کرایہ لے لیا تھا

اور کہا تھا کہ میں تم لوگوں کی بس کی ٹکٹ بچا دیتا ہوں ہم لوگ جلدی پہنچیں گے وہ سب کو اپنی بائیک پر بٹھا کے لے کے جا رہا تھا۔ سکندر آگے بیٹھا موٹر سائیکل چلا رہا تھا، دانیال اس کے پیچھے، شاہویر آدھا لٹکا ہوا اور ارمان سب سے پیچھے بمشکل توازن قائم کیے ہوئے۔

سکندر نے اچانک قہقہہ لگایا،

"اگر آج ہمارا چالان ہو گیا نا، تو مزہ آ جائے گا"!

دانیال نے فوراً چونک کر پوچھا،

"وہ کیوں بھائی؟"

سکندر نے انگلیوں پر گنتی شروع کی،

"سرجنٹ کس کس بات پر چالان کرے گا؟ نہ ہیلمٹ ہے، نہ بائیک کے کاغذات، چار بندے ایک بائیک پر... اور اوپر سے ون وے میں الٹی سمت جا رہے ہیں"!

یہ کہتے ہی وہ خود ہی ہنسنے لگا۔

شاہویر نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا،

"یار بس دعا کرو کوئی روک نہ لے، میری امی نے تو کہا تھا سید ھا یونیورسٹی جانا ہے، اور تم لوگ مجھے جنت بھیج دو گے"

ارمان، جو سب سے پیچھے بیٹھا ہوا تھا اور ہر جھٹکے پر توازن کھو رہا تھا، فوراً بولا،

"اوئے خاموش رہو، آگے سگنل آرہا ہے"!

جیسے ہی سامنے ٹریفک سگنل نظر آیا، شاہویر اور ارمان پھرتی سے بائیک سے اتر گئے اور بالکل معصوم شہریوں کی طرح پیدل سگنل کراس کرنے لگے۔ سکندر اور دانیال بائیک پر ہی آگے بڑھ گئے۔ چند سیکنڈ بعد جیسے ہی سگنل پار ہوا، شاہویر اور ارمان دوڑ کر آئے اور دوبارہ بائیک پر سوار ہو گئے۔

یہ پورا منظر ارد گرد کھڑے لوگوں کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکا۔ کچھ لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے، کچھ مسکرا رہے تھے۔

اتنے میں ایک موٹر سائیکل پر بیٹھے ایک انکل نے ہنستے ہوئے آواز لگائی،

"بیٹا، مجھے بھی اپنی بائیک پر بٹھالو"!

سکندر نے فوراً پلٹ کر جواب دیا،

"آجائیں انکل، دل بڑا ہونا چاہیے، جگہ تو بہت ہے"!

چاروں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے

ایک موٹر سائیکل سوار بولا،

"بھائی، اتنے بندے کہاں جا رہے ہو؟"

سکندر مسکرا کر بولا،

"انکل، یونیورسٹی جا رہے ہیں... علم بانٹنے"!

انکل نے سر ہلا کر کہا،

"اللہ تمہیں بھی عقل دے۔"

چاروں زور زور سے ہنسنے لگے۔

سکندر نے کہا،

"دیکھو، قوم ہم سے سیکھ رہی ہے۔"

اسی ہنسی مذاق، شرارتوں اور خطرناک توازن کے ساتھ آخر کار یونیورسٹی پہنچ گئے۔

ایک طرف مومنہ تھی خاموش، سنجیدہ، اپنے خیالوں میں گم۔

اور دوسری طرف یہ چاروں جو ہر دن کو ایک نیا تماشہ بنا دینے کا ہنر رکھتے تھے۔

دانیال بائیک سے اترتے ہی ایک طرف جھکا اور زور زور سے الٹیاں کرنے لگا۔

سکندر نے منظر دیکھا تو فوراً ہاتھ باندھ کر سنجیدگی اوڑھ لی، پھر اگلے ہی لمحے بولا،

"اوہو! لگتا ہے بہت جلد خوش خبری سننے کو ملے گی۔"

شاہویر ہنسی ضبط نہ کر سکا،

"بھائی، مٹھائی میں لاؤں یا ابھی وقت ہے؟"

دانیال نے کمزور سی آواز میں پلٹ کر دیکھا،

"تم سب بہت برے لوگ ہو... مجھے واقعی چکر آ رہے تھے۔"

سکندر نے کندھے اچکائے،

"چکر نہیں تھے، احساسات جاگ گئے تھے اور وہ بھی گندے۔"

ارمان سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا،

"یار نہ تنگ کیا کرو اس کو! کیوں ستا رہے ہو اس کو؟ یار سکندر باز آجا پلیز"

سکندر منہ بناتے ہوئے بولا،

"اچھا ٹھیک ہے جانی اگے سے دھیان رکھوں گا۔"

کچھ دیر بعد دانیال نے پانی پیا، سانس سیدھی کی اور چاروں یونیورسٹی گیٹ کی طرف بڑھے۔ گیٹ پر لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔

سکندر نے کارڈ لہرا کر کہا،

"حضرات، لائن میں رہیں، ہم کوئی وی آئی پی نہیں ہیں... بس ذہنی مریض ہیں۔"

گارڈ نے ایک ایک کر کے کارڈ چیک کیا۔ دانیال کا کارڈ دیکھ کر سکندر نے سرگوشی کی،

"دیکھو، تصویر میں بھی تم ایسے لگ رہے ہو جیسے ابھی رونے والے ہو۔"

دانیال نے خفگی سے کہا،

"سکندر، خدا کا خوف کرو۔"

"خوف؟" سکندر نے ہنستے ہوئے کہا،

"وہ تو تمہاری شکل دیکھ کر ہی آجاتا ہے۔"

یونیورسٹی کے اندر داخل ہوتے ہی دانیال آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ وہ جسمانی طور پر واقعی کمزور تھا، کندھے جھکے ہوئے، آواز نرم، اور چہرے پر اب تک داڑھی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ وہ مردانہ سے زیادہ زنانہ لگتا تھا۔

سکندر کو یہی سب سے زیادہ مزہ دیتا تھا۔

"یار دانیال،" سکندر نے معصوم بن کر کہا،

"تمہارے چہرے پر آج بھی فیس واش لگانے کی ضرورت نہیں، بےبی اسکن ہے۔"

شاہویر نے بات بڑھائی،

"سچ میں، اگر یہ لڑکی ہوتا تو ابھی تک کم از کم تین پروپوزل آ چکے ہوتے۔"

دانیال نے منہ بنا کر کہا،

"میں لڑکا ہی ہوں، ٹھیک ہے؟"

ارمان نے نرمی سے کہا،

"ہاں یار، چھوڑو بھی، ہر کسی کی طاقت الگ ہوتی ہے۔"

مگر سکندر کہاں رکنے والا تھا۔

"طاقت؟ اس کو چاہیے ہم دوستوں کو خوش کر دے"

پھر وہ سنجیدہ منہ بناتے ہوئے ڈرامے کرتے ہوئے بولا،

"کسی غریب کا بھلا نہیں کر سکتا۔"

چاروں ایک بار پھر ہنس پڑے۔

دانیال نے گہری سانس لی اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولا،

"یا اللہ، مجھے صبر دے... یا کم از کم نئی کلاس دے۔"

سکندر نے قہقہہ لگایا،

"صبر رکھو، یونیورسٹی کے چار سال ہیں... ہم کہیں نہیں جا رہے۔"

اور دانیال یہ جانتا تھا کہ یہ سچ تھا سکندر اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔

مومنہ یونیورسٹی پہنچی تو ہمیشہ کی طرح اس کے والد، طارق انور، نے گیٹ کے قریب ہی بائیک روک دی۔

"شام کو وقت پر آجانا، میں یہیں لینے آجاؤں گا،" انہوں نے نرمی سے کہا۔

مومنہ نے سر ہلایا، جھک کر سلام کیا اور بائیک کے ہٹتے ہی اندر کی طرف بڑھ گئی۔

گیٹ پر پہنچتے ہی سیکیورٹی گارڈ نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"اسٹوڈنٹ کارڈ دکھائیں۔"

مومنہ ایک لمحے کو رُک گئی۔ اس کے دل میں ہلکی سی گھبراہٹ اٹھی۔ اس نے بیگ کھولا، ایک ایک جیب ٹٹولی، نوٹس، رومال، قلم... مگر کارڈ کہیں نہیں تھا۔

"شاید دوسری جیب میں ہو،" اس نے خود کو تسلی دی اور دوبارہ تلاش کیا، مگر نتیجہ وہی رہا۔۔۔ خالی۔

گارڈ نے بے تاثر لہجے میں کہا،

"کارڈ کے بغیر انٹری نہیں ہے، بی بی۔"

مومنہ کے ہاتھ کانپنے لگے۔ وہ تیزی سے گیٹ سے باہر نکلی، نظریں سڑک پر دوڑائیں۔ شاید ابھی ابا نظر آجائیں۔ مگر بائیک کب کی اوجھل ہو چکی

تھی۔ اس نے فوراً فون نکالا، طارق انور کو کال ملائی ایک بار، دو بار مگر کال نہیں لگی۔

اس کے سینے میں عجیب سا بوجھ اُتر آیا۔

نہ اندر جا سکتی تھی، نہ واپس گھر... اور نہ کسی سے مدد مانگنے کی ہمت تھی۔

آخر کار وہ آہستہ آہستہ گیٹ کے ساتھ بنی دیوار کے پاس بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھ بے اختیار جُڑ گئے اور وہ گھٹنوں کے بل سمٹ گئی۔ نظریں زمین پر جمی تھیں، جیسے وہ خود سے پوچھ رہی ہو:

اب کیا کروں؟

اردگرد طالب علم آجا رہے تھے، کوئی ہنستا ہوا، کوئی باتوں میں مگن مگر مومنہ کے لیے وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔

آج پہلی بار یونیورسٹی کا گیٹ اس کے لیے بند تھا، اور وہ خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی۔

مومنہ گیٹ کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ نظریں زمین پر جمی تھیں اور دل کسی انجانی گھبراہٹ میں ڈوبا ہوا تھا۔ آنسو بار بار پلکوں کی باڑ توڑ کر باہر آجاتے

اور وہ جلدی سے انہیں دوپٹے کے کونے سے صاف کر لیتی، جیسے کوئی دیکھ نہ لے۔ اس لمحے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پورا یونیورسٹی کیمپس شور سے بھرا ہوا ہے، مگر اس کے اندر سب کچھ خاموش ہو چکا ہے۔

تبھی اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے قریب آ کر رُک گیا ہے۔

مومنہ نے آہستہ سے سر اُٹھایا۔

سامنے وہی لڑکا کھڑا تھا جس سے کل اس کی ٹکر ہوئی تھی۔

لطیف۔

ایک لمحے کو مومنہ ساکت رہ گئی۔ اس کے چہرے پر حیرت صاف لکھی تھی، جیسے وہ خود سے پوچھ رہی ہو کہ یہ یہاں کیوں کھڑا ہے؟

"السلام علیکم... ایک بات سنیں گی؟"

لطیف کی آواز میں ہلکی سی جھجک تھی، مگر لہجہ مہذب۔

"وعلیکم السلام... بولیں،"

مومنہ نے نظریں جھکائے رکھتے ہوئے جواب دیا۔

لطیف نے جیب سے اسٹوڈنٹ کارڈ نکالا اور تھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے کہا،

"کل آپ کا اسٹوڈنٹ کارڈ میرے پاس آ گیا تھا۔ شاید آپ کو یاد نہ رہا ہو۔ یہ لیجئے۔"

کارڈ دیکھتے ہی مومنہ کی آنکھوں میں ایک دم نمی اُتر آئی۔ اس نے فوراً اپنا چہرہ دوسری طرف کیا، آنسو صاف کیے اور آہستہ آہستہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے پردہ کیا ہوا تھا، مگر آنکھوں میں لگا کاجل رو رو کر پھیل چکا تھا، جسے وہ بار بار پلکوں سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ب... بہت شکریہ،"

اس کی آواز ہلکی سی کانپ گئی، مگر شکر گزاری سچی تھی۔

لطیف نے بس سر ہلایا، کچھ کہنے کو لب کھولے، مگر الفاظ شاید مناسب نہ لگے۔

مومنہ نے فوراً کارڈ گارڈ کی طرف بڑھایا۔

گارڈ نے کارڈ دیکھا، پھر اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھ کر بولا،

"بیٹا، ہمیں افسوس ہے، مگر ہم مجبور ہیں۔ یونیورسٹی کا رول ہے۔ اگر ہم عمل نہ کریں تو ہماری نوکری جا سکتی ہے۔"

مومنہ نے فوراً جواب دیا،

"کوئی بات نہیں، انکل۔ میں سمجھتی ہوں۔"

اس کے لہجے میں نہ شکوہ تھا، نہ شکایت بس ایک تھکی ہوئی قبولیت۔

وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔

لطیف نے لاشعوری طور پر اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کی، شاید کچھ اور کہنا چاہتا تھا، مگر مومنہ نے رفتار تیز کرلی۔ نہ پیچھے مڑ کر دیکھا، نہ کوئی اشارہ دیا۔

چند لمحوں بعد وہ کلاس روم کے دروازے سے اندر داخل ہو چکی تھی، اور لطیف وہیں رُک گیا اور دھیرے سے اندر آیا اور لڑکوں والی جگھوں پہ جا کر بیٹھ گیا۔

مومنہ اپنی نشست پر آکر بیٹھ گئی، دل ابھی تک تیز دھڑک رہا تھا۔

آج پہلی بار کسی اجنبی نے اس کی مشکل آسان کی تھا اور وہ شکر کے ساتھ ساتھ ایک انجانی الجھن بھی محسوس کر رہی تھی۔

کلاس کے عین درمیان سر عادل بورڈ کے سامنے کھڑے تھے۔ ہاتھ میں مارکر تھا اور لہجہ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ، جیسے وہ جانتے ہوں کہ آج کا موضوع طلبہ کے لیے غیر معمولی ہے۔

"فطرت میں ہر جاندار وہ نہیں ہوتا جو ہمیں سادہ سی درجہ بندی میں نظر آتا ہے،" سر عادل نے کہا اور بورڈ پر ایک دائرہ بناتے ہوئے اسپنج کی ساخت سمجھانے لگے۔

"کچھ جاندار نہ مکمل نر ہوتے ہیں اور نہ مادہ۔ اسپنج اس کی ایک مثال ہیں۔"

کلاس میں خاموشی چھا گئی۔ زیادہ تر طلبہ پوری توجہ سے سن رہے تھے، کچھ کے چہرے پر حیرت صاف جھلک رہی تھی۔

سر عادل نے بات آگے بڑھائی،

"اسپنج پانی میں اپنے تولیدی خلیے چھوڑتا ہے، دوسرا اسپنج انہیں جذب کر لیتا ہے۔ پھر وہ خلیے اندر موجود باریک راستوں سے گزرتے ہوئے فرٹیلائزیشن کا عمل مکمل کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ قدرتی نظام کے تحت ہوتا ہے۔"

یہ سب سننا بہتوں کے لیے نیا تھا۔ کسی نے کرسی بدل کر بیٹھنے کی کوشش کی، کسی نے خاموشی سے نوٹس بنانے شروع کر دیے۔

سر عادل نے پھر موضوع بدلا،

"اسی طرح بہت سے جاندار ایسے بھی ہیں جو اپنی فطرت میں دُو رُخی ہوتے ہیں، جیسے کلاؤن فِش۔"

یہ نام سنتے ہی چند طلبہ چونکے۔

"کلاؤن فِش ایک گروہ کی صورت میں رہتی ہیں،" سر عادل نے بتایا،

"اُن کے گروہ میں ایک مادہ سب سے طاقتور ہوتی ہے، جو ملکہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن جیسے ہی وہ مر جاتی ہے، گروہ کا سب سے کمزور نر اپنی جنس تبدیل کر کے نئی مادہ بن جاتا ہے۔"

کلاس میں ہلکی سی سرگوشیاں ہونے لگیں، مگر سر عادل کے چہرے پر سنجیدگی برقرار رہی۔

"اور جو نر طاقت کے اعتبار سے سب سے آگے ہوتا ہے، وہ آگے جا کر نسل بڑھانے کا کردار ادا کرتا ہے۔"

یہ سب سائنسی حقائق تھے، مگر ماحول عجیب سا ہو چکا تھا۔

ادھر آخری بینچ پر ارمان اور سکندر بیٹھے تھے۔ ارمان کبھی بورڈ کی طرف دیکھتا، کبھی سر عادل کی باتوں میں کھو جاتا۔

سکندر مگر بالکل مختلف موڈ میں تھا۔ وہ بار بار دانیل کی طرف دیکھ کر آنکھیں دبا رہا تھا، کبھی بھنویں اچکاتا، کبھی ہونٹ دبا کر ہنسی روکنے کی کوشش کرتا۔

ارمان نے اسے گھورا، جیسے کہنا چاہتا ہو باز آ جاؤ، مگر سکندر کی حرکتیں مزید بڑھتی جا رہی تھیں۔

ایک لمحے کے لیے ارمان نے نظریں جھکا لیں، لیکن کندھے ہلنے لگے ہنسی ضبط کرنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

سر عادل لیکچر میں محو تھے،

"یہ سب فطرت کا توازن ہے، اس میں حیرت ضرور ہے مگر کوئی عجیب بات نہیں۔"

سکندر نے یہ جملہ سنا تو فوراً میز پر کہنی رکھ کر سنجیدہ طالبعلم بننے کی اداکاری کرنے لگا، مگر جیسے ہی سر عادل نے رخ موڑا، وہ دوبارہ دانیل کی طرف دیکھ کر گندے سے اشارے کرنے لگا۔

پورا لیکچر اسی کشمکش میں گزرا

سامنے سائنس کے راز کھل رہے تھے،

اور پیچھے سب دوست اپنی شرارتوں میں الجھے ہوئے تھے۔

سر عادل نے لیکچر مکمل کرتے ہوئے مارکر میز پر رکھا اور کلاس پر ایک نظر ڈالی۔

"کسی کا کوئی سوال ہے؟" اُن کی آواز پُر سکون مگر باوقار تھی۔

چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔ کچھ طلبہ نظریں جھکائے بیٹھے تھے، کچھ ابھی تک نوٹس سمیٹ رہے تھے۔

اچانک پچھلی طرف سے ایک آواز ابھری۔

"Yes sir..." سکندر نے ہاتھ آہستہ سے اٹھایا، آنکھوں میں شرارت صاف جھلک رہی تھی۔

سر عادل نے عینک کے اوپر سے دیکھتے ہوئے کہا،

"ہاں، بولو سکندر۔"

سکندر نے ذرا گلا صاف کیا اور پوری معصومیت کے ساتھ بولا،

"سر، آپ نے بتایا کہ یہ جاندار نہ نر ہوتے ہیں نہ مادہ... تو کیا یہ خود کو بھی پریگننٹ کر سکتے سکتے ہیں؟"

اگلے ہی لمحے کلاس میں قہقہوں کا طوفان آ گیا۔

کوئی بینچ پر جھک کر ہنس رہا تھا، کوئی کتاب سے منہ چھپا رہا تھا۔

ارمان نے فوراً سکندر کی کہنی میں زور سے کہنی ماری،

"پاگل ہے کیا؟" اس نے دانت پیستے ہوئے سرگوشی کی۔

رِمشہ نے جلدی سے اپنا ہاتھ منہ پر رکھ لیا، مگر اُس کی آنکھیں ہنس ہنس کر بھر آئیں۔

مومِنہ کی ہنسی تو بالکل نہ رکی، وہ سیدھی ہو کر بیٹھنے کی کوشش کرتی رہی مگر ہر بار دوبارہ ہنس پڑتی۔

زینب گل حیرت سے کبھی سکندر کو دیکھتی، کبھی سر عادل کو جیسے سمجھ ہی نہ پا رہی ہو کہ یہ سوال حقیقت تھا یا مذاق۔

لطیف مومنہ کو دیکھ کر حیران ہوا اور اس کو وہ بہت اچھی لگی ہنستے ہوئے مومنہ نے مڑ کر دیکھا تو لطیف نے اپنی شکل دوسری طرف کر لی۔

دانیال اور شاہویز ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے ہوئے زور زور سے ہنس رہے تھے۔

پورا کمرہ شور سے گونج رہا تھا۔

لیکن اس سب کے بیچ سر عادل بالکل سنجیدہ کھڑے تھے۔ نہ مسکراہٹ، نہ ناگواری۔

انہوں نے ایک بار ہلکی سی کھانسی کی۔

آہستہ آہستہ ہنسی دبنے لگی، کلاس خاموش ہونے لگی۔

سر عادل نے گہری آواز میں کہا،

"سکندر کا سوال سننے میں مذاق لگ سکتا ہے، مگر حقیقت میں یہ ایک سائنسی سوال ہے۔"

سب چونک گئے۔

انہوں نے بات آگے بڑھائی،

"ایسے جاندار ایک ہی وقت میں نر اور مادہ نہیں ہوتے۔ وہ مخصوص حالات میں یا تو نر ہوتے ہیں یا مادہ۔ اس لیے خود کو خود ہی حاملہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔"

پھر انہوں نے سکندر کی طرف دیکھا اور کہا،

"ویسے سکندر، سوال بہت اچھا تھا۔ شاباش۔"

یہ سنتے ہی کلاس میں ایک اور حیرت کی لہر دوڑ گئی۔

جو طلبہ ابھی ہنس رہے تھے، وہ اب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

ارمان نے آنکھیں پھیلا کر سکندر کو دیکھا، جیسے پوچھ رہا ہو یہ کیا ہو گیا؟

سکندر خود بھی لمحہ بھر کو سنجیدہ ہو گیا، پھر ہونٹ دبا کر مسکرایا، جیسے اندر ہی اندر اپنی کامیابی پر خوش ہو رہا ہو۔

سر عادل نے دوبارہ بورڈ کی طرف رخ کیا اور کہا،

"سائنس میں کوئی سوال چھوٹا یا شرمناک نہیں ہوتا۔ جو پوچھتا ہے، وہی سیکھتا ہے۔"

کلاس میں خاموشی تھی،

مگر کئی ذہنوں میں اب بھی سکندر کا سوال گونج رہا تھا

اور ارمان کے دل میں یہ خیال کہ یہ لیکچر وہ شاید کبھی نہ بھول پائے گا۔

جیسے ہی کلاس ختم ہونے کی گھنٹی بجی، پورا کمرہ ایک دم شور سے بھر گیا۔ کرسیاں سرکنے لگیں، بیگز کندھوں پر ڈالے گئے اور طلبہ جھنڈ کی صورت باہر کی طرف نکل پڑے۔

دانیال نے فوراً شاہویر کی کہنی پکڑی۔

"چل یار، لان چلتے ہیں، آج کافی رش ہو گا،" اس نے آنکھ مار کر کہا۔

شاہویر نے گردن موڑ کر لان کی طرف دیکھا جہاں لڑکیوں کے گروپ ہنستے بولتے بیٹھ رہے تھے۔

"بالکل، ویسے بھی یہاں دماغ پہلے ہی خراب ہو چکا ہے،" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

دونوں لان کی طرف بڑھ گئے اور لڑکیوں کے ایک گروپ کے قریب جا کر ایسے بیٹھ گئے جیسے یہ جگہ خاص انہی کے لیے بنی ہو۔ دانیال نے بال سنوارے، شاہویر نے دھوپ سے آنکھیں سکیڑ کر ارد گرد نظر دوڑائی۔

ادھر سکندر نے پیچھے سے آواز دی،

"اوئے، میں نہیں آ رہا ہوں۔"

دانیال نے مڑ کر دیکھا۔

"کیوں بھئی؟ آج اچھی محفل لگنے والی ہے،" اس نے شرارتی انداز میں کہا۔

سکندر نے بیگ کندھے پر ٹھیک کیا اور بے دلی سے بولا،

"فضول حرکتوں کا موڈ نہیں ہے۔ مجھے لائبریری جانا ہے۔"

شاہویر ہنس پڑا۔

"واہ بھئی، آج سے لائبریری؟ کوئی نیا باب کھل رہا ہے کیا؟"

سکندر نے اسے گھورا۔

"ہنس لو، کم از کم وقت ضائع تو نہیں کروں گا۔"

دانیال نے کندھے اچکائے۔

"مرضی ہے، ہمیں تو لان زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

ارمان کچھ دیر خاموش کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کی نظر کبھی لان کی طرف جاتی، کبھی سکندر کی سنجیدہ شکل پر۔ آخر اس نے آہستہ سے کہا،

"میں سکندر کے ساتھ چلتا ہوں۔"

دانیال اور شاہویر دونوں چونک گئے۔

"اوئے، تم بھی؟" شاہویر نے حیرانی سے پوچھا۔

ارمان نے بس ہلکا سا مسکرا کر کہا،

"ہاں، مجھے بھی کچھ پڑھنا ہے۔"

سکندر نے ایک لمحے کو ارمان کی طرف دیکھا، پھر سر ہلا دیا۔

"چل،" اس نے مختصر سا کہا۔

دونوں آہستہ آہستہ لائبریری کی طرف چل پڑے۔ لان کا شور پیچھے رہ گیا، قہقہوں کی آوازیں مدھم ہو گئیں، اور ان کے قدم ایک ایسی جگہ کی طرف بڑھنے لگے جہاں خاموشی بولتی تھی۔

سکندر عورتوں سے دور رہتا تھا یہ اُس کی سوچ تھی۔

کتابیں اُس کی خاموش محبت تھیں، اور وہ مانتا تھا کہ جب مرد میں سے ہوس مر جائے تو عورت کے پاس اسے دینے کو کچھ نہیں رہتا۔

لائبریری کے دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی سکندر سیدھا لائبریرین کے پاس گیا۔

"بھائی، کیا آپ کے پاس کوئی کتاب ہے ہٹلر پر؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا، "جو بتائے کہ وہ یہودی لوگوں کے خاتمے کی کوشش میں کیسے رہا۔"

لائبریرین نے تھوڑا سا حیران ہو کر سر ہلایا اور رف کے پاس اشارہ کیا۔

سکندر کتاب تلاش کرنے لگا، جبکہ ارمان خاموشی سے لائبریری کے کونے میں لگے کتابوں کے شیلفز کی طرف بڑھ گیا۔

سکندر ہمیشہ سے یہ سوچتا رہا تھا کہ پوری دنیا پر یہودیوں کا کنٹرول ہے، لیکن خاص طور پر یہودی لوگ ہر نظام پر قبضہ کیے ہوئے ہیں بینکنگ، کاروبار، سیاست، ہر جگہ۔ اس کے خیال میں یہی لوگ دنیا کے فیصلوں کو اپنے فائدے کے لیے چلاتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا کو اپنے انداز سے بدلنے کا خواب دیکھتا ہے۔

تبھی اچانک، ارمان اور ایک لڑکی جو بعد میں معلوم ہوئی کہ مومنہ ہے ایک ہی کتاب کو ہاتھ لگانے کی کوشش کرنے لگے۔ کتاب شاعری کی تھی۔

ارمان فوراً اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا گیا۔

مومنہ نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا،

"کیا آپ کو بھی شاعری کا شوق ہے؟"

ارمان نے تھوڑا سا جھک کر کہا،

"جی، تھوڑا بہت کر لیتا ہوں، لیکن پڑھنے کا زیادہ شوق ہے۔"

مومنہ نے خوش دلی سے جواب دیا،

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ہم سائنس کے طلبہ ہیں، لیکن تھوڑا بہت تو شاعری کا شوق ہونا چاہیے۔"

ارمان نے ہلکا سا مسکرا کر کہا،

"جی، جی، کیوں نہیں۔"

مومنہ کی آنکھوں میں چمک آگئی،

"میرے والد بھی شاعر ہیں اور کتابیں بھی لکھتے ہیں۔"

ارمان نے قدر دانی سے سر ہلایا،

"ماشاء اللہ، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

مومنہ نے عاجزی سے کہا،

"الحمد للہ، ان کی کتابیں اردو بازار میں دستیاب ہیں۔"

اتنے میں، دونوں کے کانوں میں سکندر اور لائبریرین کی بحث کی آواز پہنچی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے ہنسی روکنے کی کوشش کی۔

مومنہ نے ہنس کر پوچھا،

"یہ آپ کا دوست ہے؟"

ارمان نے تھوڑا سا شرمندگی کے ساتھ جواب دیا،

"جی، جی"...

مومنہ نے شرارت سے کہا،

"بہت بدماش ہے یہ۔ میری ایک دوست، اس کا ذکر ہمیشہ کرتی رہتی ہے۔"

ارمان نے دلچسپی سے پوچھا،

"بدماش تو ہے، لیکن کون سی دوست ہے؟"

اور اچانک دونوں نے ایک ساتھ کہا،

"رِمشا"!

مومنہ فوراً شرم سے سر جھکا لیا، اور کتاب کے صفحات کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی، جبکہ ارمان اندرونی طور پر مسکرا رہا تھا۔

ارمان اپنی نظریں مومنہ کی بھوری آنکھوں پر جمائے بیٹھا تھا۔ پردے میں چھپی ہوئی مومنہ، بس اپنی آنکھوں سے ارمان کو دیکھ رہی تھی۔ ہر لمحہ جیسے وقت رک گیا ہو۔ آس پاس کے شور شرابے، کتابوں کی خوشبو، اور ارد گرد کی ہلچل سب دھندلا گیا تھا۔ ارمان کو لگا جیسے وہ صرف اسی لمحے میں جی رہا ہے۔

مومنہ بھی کچھ لمحے کے لیے ارمان کی طرف دیکھتی رہی اور سب کچھ بھول گئی اپنے ارد گرد کی دنیا، اپنی فکر، اور سب کچھ۔ دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی کہ اس نے اپنے ہاتھوں کو تھام لیا۔ اتنے میں سکندر کی اونچی آواز نے ماحول کو توڑ دیا۔

"اوہ ہیلّو! لوو برڈز مل گئی! مجھے میری کتاب اگر تو نے کوئی لے لی ہے تو آجا دونوں ساتھ میں ایشو کرواتے ہیں۔"

مومنہ فوراً ہوش میں آئی اور پیچھے ہٹ گئی، جیسے کسی نے اسے نیند سے جگا دیا ہو۔

"اچھا، آتا ہوں..." ارمان نے مسکرا کر کہا اور کتاب ہاتھ میں پکڑ کر سکندر کی طرف بڑھ گیا۔

کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد ارمان نے نرمی سے مومنہ سے پوچھا،

"ویسے، بعد میں کوئی پلان ہے؟"

مومنہ نے آہستہ سر ہلایا اور جواب دیا،

"جی، چار بجے میرے والد مجھے لینے آئیں گے"...

ارمان نے مسکرا کر کہا،

"ابھی تو تین بجے ہیں، ایک پورا گھنٹہ فری ہے۔ چلو، آج لان میں چلتے ہیں"!

مومنہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ رضا مندی ظاہر کی اور ارمان کے ساتھ قدم بڑھانے لگی۔

اتنے میں، لائبریری کے کونے میں کھڑا لطیف، جو مومنہ کو کسی اور کے ساتھ دیکھ رہا تھا، دل میں حسد محسوس کرنے لگا۔ اس کی نظریں مومنہ اور ارمان پر جم گئی تھیں اور اس کے چہرے پر ہلکی سختی اور الجھن جھلک رہی تھی۔

لطیف نے اپنی نظریں مومنہ پر جماتے ہوئے سرکشی سے کہا:

"یہ... یہ صرف میری ہونی چاہیے تھی"...

اس کے الفاظ میں حسد اور حقارت کی ملی جلی شدت تھی، اور وہ لمحے بھر کے لیے خاموش ہو گیا، جیسے دنیا کا سارا وزن اس کے سینے پر ہو۔

ارمان اور مومنہ لان میں آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور گھاس کی خوشبو ارد گرد پھیلی ہوئی تھی۔

شاہویر اور دانیال گرو میں موجود لڑکیوں سے باتیں کر رہے تھے سب مل کر لگے ہوئے تھے۔

سکندر سب سے علیحدہ بیٹھا ہوا تھا اس کو ان سب سے کوئی غرض نہیں تھی اس کی طرف سے یہ سب بھاڑ میں جائیں۔

ارمان نے اچانک نظم کے الفاظ بول دیے:

"نہ جانے کس لیے امیدوار بیٹھا ہوں

اک ایسی راہ پہ جو تیری رہ گزر بھی نہیں"

مومنہ نے فوراً پہچان لیا اور مسکرا کر کہا، "واہ! آپ بھی فیض احمد فیض پڑھتے ہیں؟"

ارمان نے ہلکی سی شرمندگی کے ساتھ جواب دیا، "جی تھوڑا بہت، زیادہ نہیں۔"

مومنہ نے خوش دلی سے کہا، "لیکن آپ کا اندازِ بیاں بہت اچھا ہے، واقعی دل کو چھو گیا۔"

ارمان نے مسکرا کر کہا، "شکریہ، مومنہ جی۔"

کچھ لمحے کی خاموشی کے بعد مومنہ نے اپنی پسندیدہ شاعری کے الفاظ ادا کیے:

"اور کیا دیکھنے کو باقی ہے

آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا"

ارمان نے فوراً سر ہلایا اور مسکرا کر بولا، "واقعی! بہت خوب، مومنہ جی۔ آپ کا اندازِ بیاں بھی لاجواب ہے"...

وہ دونوں قریب قریب چلتے چلتے ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ ارمان کی نظریں مومنہ کی بھوری آنکھوں پر جمی ہوئی تھیں، جو پردے کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں مگر ارمان کی طرف جھک کر دیکھ رہی تھیں۔ ارمان کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور وہ لمحے لمحے میں مومنہ کی موجودگی کا لطف لے رہا تھا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد مومنہ نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا، "ویسے، آپ کے والد کیا کرتے ہیں؟"

ارمان نے تھوڑا سا چہرہ موڑا،

"میرے والد؟"

الفاظ گلے میں اٹک گئے۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر کچھ نہ کہہ سکا۔

"والد"...

یہ لفظ سنتے ہی ارمان کے سینے میں جیسے کسی نے آہستہ سے کیل گاڑ دی ہو۔

"بتاؤ بیٹا، تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟"

پہلی جماعت کی استانی نے مسکراتے ہوئے پوچھا، جیسے یہ کوئی عام سا سوال ہو۔

مگر ارمان کے لیے یہ سوال عام نہیں تھا۔

وہ اپنی بینچ پر ساکت بیٹھ گیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں زمین کو چھو بھی نہیں پا رہی تھیں۔ اس نے گردن جھکا لی، نظریں اپنی کتاب پر جم گئیں، جیسے الفاظ میں کہیں جواب چھپا ہو۔

ذہن میں ایک تصویر بنانے کی کوشش کی...

ایک چہرہ، ایک آواز، ایک لمس...

مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

اسے اپنے والد کی شکل یاد نہیں آرہی تھی۔

اصل میں، اسے یاد آنے کے لیے کبھی کچھ بتایا ہی نہیں گیا تھا۔

ایمان نور نے اس موضوع پر ہمیشہ خاموشی اختیار کی تھی۔

جب کبھی ارمان نے معصومیت سے پوچھا،

"امّی، میرے بابا کیا کرتے ہیں؟"

تو وہ ہلکا سا مسکرا دیتی، اس کے بال سہلاتی اور کہتی،

"ابھی تم چھوٹے ہو، بڑے ہو جاؤ گے تو سب سمجھ آ جائے گا۔"

اور بات وہیں ختم ہو جاتی۔

کلاس میں خاموشی تھی۔

سب بچے ارمان کو دیکھ رہے تھے۔

"بیٹا؟"

استانی نے دوبارہ پوچھا۔

ارمان کے ہونٹ کانپے۔ اس نے بمشکل آواز نکالی۔

"ٹیچر جی... مجھے نہیں پتا۔"

یہ کہتے ہوئے اسے خود پر حیرت ہوئی۔

کیسے کوئی اپنے والد کے بارے میں "نہیں پتا" کہہ سکتا ہے؟

استانی ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئیں۔ پھر انہوں نے بات آگے بڑھا دی، مگر وہ لمحہ ارمان کے دل میں کہیں ٹھہر گیا۔

یہ سوال صرف کلاس تک محدود نہیں تھا۔

اسکول کے صحن میں، محلے کی گلیوں میں، کرکٹ کھیلتے بچوں کے بیچ...

ہر جگہ وہی سوال۔

"اوئے ارمان، تیرے بابا کیوں نہیں نظر آتے؟"

"کالے! تیرے ابّا کہاں ہیں؟"

"تیری امّی اکیلی کیوں رہتی ہیں؟"

کبھی سوال بنتے، کبھی مذاق۔

اور کبھی صرف ہنسی۔

اس کی رنگت بھی نشانہ بنتی۔ کوئی اس کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتا، کوئی اس کے بالوں پر ہنستا۔ ارمان سب سنتا تھا، مگر جواب نہیں دیتا تھا۔ نہ لڑتا، نہ روتا۔

بس خاموش ہو جاتا تھا۔

رات کو وہ اپنی ماں کے پاس لیٹتا، اس کے دوپٹے کا کنارہ مضبوطی سے پکڑ لیتا، جیسے وہ واحد چیز ہو جو اسے دنیا سے جوڑے ہوئے ہے۔ کئی بار اس نے ہمت کر کے پوچھنا چاہا، مگر ایمان نور کی آنکھوں میں ایسی تھکن ہوتی کہ وہ چپ ہو جاتا۔

وہ چھ سال کا تھا،

مگر اس کے دل میں سوال بہت بڑے تھے۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس خلا کا نام کیا ہے،

مگر اسے اتنا ضرور محسوس ہوتا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی چیز ادھوری ہے۔

اور یہی ادھوراپن،

آہستہ آہستہ

اس کی پوری شخصیت میں سرایت کرنے لگا تھا۔

ارمان کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا...

نعمان۔

جو چار سال کا ہو چکا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں باپ کا تصور تک نہیں تھا۔ وہ کسی چہرے کو پہچانتا ہی نہیں تھا، کسی آواز سے مانوس ہی نہیں تھا جسے ابّا کہا جا سکے۔ اس کے لیے باپ صرف ایک لفظ تھا، ایک ایسا لفظ جو وہ دوسروں کے منہ سے سنتا تھا مگر اپنے دل میں محسوس نہیں کر پاتا تھا۔

جب ایمان نور نے رحمان شیخ کا گھر چھوڑا تھا، وہ حاملہ تھی۔

یہ خبر رحمان شیخ تک پہنچا دی گئی تھی۔

سب جانتے تھے کہ اس کا دوسرا بیٹا دنیا میں آنے والا ہے۔

مگر جب ہسپتال کی روشنیاں جلیں،

جب درد کی چیخیں خاموش دعاؤں میں بدلیں،

جب ایک اور جان اس دنیا میں آئی

رحمان شیخ وہاں نہیں تھا۔

نہ ہسپتال آیا،

نہ ایک فون کیا،

نہ پوچھا کہ بچہ زندہ ہے یا نہیں۔

نعمان کی پیدائش کا سارا خرچ ایمان نور کے بھائی وقاص نے اٹھایا تھا۔ وہی دوڑا تھا، وہی فارم بھرتا رہا، وہی دوائیں لاتا رہا۔ وہی رات بھر ہسپتال کے باہر بینچ پر بیٹھا رہا، آنکھوں میں فکر اور دل میں غصہ لیے۔

ارمان اور نعمان اسے "وِکی ماموں" کہتے تھے۔

یہ لفظ انہوں نے خود سیکھا تھا،

کسی نے سکھایا نہیں تھا۔

وِکی ماموں ہی انہیں اسکول چھوڑنے آتے،

وہی عید پر کپڑے لے کر آتے،

وہی بخار میں رات بھر جاگتے۔

آہستہ آہستہ وہی ان کے لیے باپ کی جگہ لینے لگے تھے۔

مگر ایمان نور جانتی تھی...

یہ جگہ ہمیشہ کسی اور کی ہوتی ہے۔

وِکی ماموں جتنا بھی کر لیں،

وہ والد نہیں بن سکتے تھے۔

نعمان جب کسی اور بچے کو اس کے ابّا کے کندھوں پر بیٹھے دیکھتا، تو وہ خاموشی سے ارمان کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ وہ سوال نہیں کرتا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں سوال تیرنے لگتے تھے۔

اور ارمان...

وہ یہ سب دیکھتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ جس خلا نے اسے وقت سے پہلے بڑا کر دیا ہے، وہی خلا ایک دن نعمان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

ایمان نور اکثر رات کو دونوں بچوں کو سوتا دیکھتی تو اس کا دل بیٹھ جاتا۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے انہیں ایک محفوظ دائرے میں رکھا ہے، مگر دنیا کے سوال اس دائرے کو دیر تک مانتے نہیں۔

وہ خود سے ہی پوچھتی،

"کب تک؟"

کب تک وِکی ماموں یہ بوجھ اٹھاتے رہیں گے؟

کب تک یہ بچے سوالوں سے بچتے رہیں گے؟

کب تک وہ ایک نام کے بغیر بڑے ہوتے رہیں گے؟

یہ سوال ہوا میں معلق تھا۔

بے جواب۔

اور یہی بے جوابی

آنے والے وقت کی کسی بڑی آزمائش کا پیش خیمہ لگتی تھی۔

مومنہ نے دوبارہ نرمی سے سوال دہرایا،

"ہاں جی... آپ کے والد... کیا کرتے ہیں وہ؟"

ارمان کے ہونٹ ذرا سے کپکپائے۔ ایک لمحے کو یوں لگا جیسے اس کے اندر کوئی پرانا زخم ہل گیا ہو، مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"میرے والد..." اس نے ایک وقفہ لے کر کہا، "ان کی موٹر سائیکل سروس کی دکان ہے۔"

"واہ، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" مومنہ کے لہجے میں خلوص تھا، کوئی بناوٹ نہیں۔

"جی، شکریہ۔" ارمان نے دھیرے سے جواب دیا۔

"میں اپنے بابا کی بہت عزت کرتی ہوں،" مومنہ بولی، اس کی آنکھوں میں فخر کی چمک تھی،

"وہ دنیا کے سب سے بہترین بابا ہیں۔"

ارمان اسے دیکھتا رہ گیا۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا... بہت کچھ۔

وہ کہنا چاہتا تھا کہ کچھ بابا صرف نام ہوتے ہیں،

وہ کہنا چاہتا تھا کہ ہر بچے کو وہ سہارا نہیں ملتا جس کا ذکر لوگ فخر سے کرتے ہیں،

مگر اس کے ہونٹ خاموش رہے۔

کچھ سچ لفظوں کا بوجھ برداشت نہیں کر پاتے۔

چھٹی ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ لان میں ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی، درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ چند اور طلبہ بھی آس پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک لان کے اندر چند لڑکوں کا ایک گروپ داخل ہوا۔

ان کے انداز میں بدتمیزی صاف جھلک رہی تھی۔

"اٹھو، اٹھو یہاں سے"!

"یہ جگہ خالی کرو"!

وہ زبردستی لوگوں کو دھکے دے کر اٹھانے لگے۔ کوئی مزاحمت کرتا تو ہنسی اڑا دی جاتی، کوئی خاموش رہتا تو اور زور سے دھکا دیا جاتا۔ لان کا سکون چند لمحوں میں بکھرنے لگا۔

مومنہ باتوں میں گم تھی، اسے فوراً اندازہ نہ ہوا۔

تبھی ارمان کی نظر ان لڑکوں پر پڑی جو آہستہ آہستہ ان کے قریب آرہے تھے۔

اس کے کندھے تن گئے۔

اس نے بے اختیار مومنہ کی طرف دیکھا۔

وہ لمحہ فیصلہ مانگ رہا تھا۔

یہ یونیورسٹی کی یونین کے لوگ تھے۔

نام تو ان کا طلبہ کی نمائندگی اور مدد کے لیے لیا جاتا تھا، مگر حقیقت میں انہوں نے کبھی کسی طالبِ علم کی مدد نہیں کی تھی۔ ان کی پہچان صرف زبردستی، دھکے، اور بے جا رعب جمانا بن چکی تھی۔ جو کمزور نظر آتا، اسے ہدف بنا لیا جاتا، اور جو خاموش رہتا، اس کی خاموشی کو کمزوری سمجھا جاتا۔

سکندر کی ان لوگوں سے پرانی دشمنی تھی۔

اصولی نہیں، بلکہ کھلی دشمنی۔

وہ ان کی نام نہاد طاقت، ان کے جعلی نعرے، اور ان کے غنڈہ انداز سے نفرت کرتا تھا۔ اسی لیے یونین والے بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ کئی بار تکرار ہو چکی تھی، بات ہاتھا پائی تک پہنچی، مگر کبھی کھل کر سامنے نہیں آئی۔

ارمان کا معاملہ مختلف تھا۔

اس کا ان لوگوں سے کبھی براہِ راست سامنا نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ خود کو الگ رکھتا تھا، خاموش، اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ لوگ کس قماش کے ہیں، مگر آج تک قسمت نے اسے ان کے سامنے نہیں لا کھڑا کیا تھا۔

آج وہ دن تھا۔

وہ گروپ آہستہ آہستہ لان کے اندر بڑھ رہا تھا۔ ان کی نظریں لوگوں پر گھوم رہی تھیں، جیسے شکار ڈھونڈ رہے ہوں۔ ایک لڑکے نے کرسی کو ٹھوکر ماری، دوسرے نے قہقہہ لگایا۔ماحول میں ایک انجانی سی گھٹن پھیلنے لگی۔

ارمان نے بے اختیار مومنہ کی طرف دیکھا۔

وہ ابھی تک باتوں میں کھوئی ہوئی تھی، اسے اندازہ نہیں تھا کہ چند قدم کے فاصلے پر کیا آ رہا ہے۔

ارمان کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

یہ اس کی زندگی کا وہ لمحہ تھا جس سے وہ ہمیشہ بچتا آیا تھا۔

مگر آج...

آج بچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

تبھی گروہ میں سے ایک لڑکا، ثاقب، آگے بڑھا۔ اس کے چلنے میں اعتماد کم اور غرور زیادہ تھا۔ اس نے مومنہ کو سر سے پاؤں تک ایک سرسری مگر ناپسندیدہ نظر سے دیکھا، پھر طنزیہ لہجے میں بولا:

"آپ کے گھر والے آپ کو یہاں لڑکوں کے ساتھ بیٹھنے بھیجتے ہیں... یا پڑھنے؟"

یہ جملہ لان میں ہلکی سی سرگوشی کی طرح پھیل گیا۔

مومنہ چونک گئی۔

یہ سوال نہیں تھا، الزام تھا۔

پھر ثاقب نے فوراً بات آگے بڑھاتے ہوئے ارمان کی طرف اشارہ کیا:

"کہیں یہ لڑکا آپ کو تنگ تو نہیں کر رہا؟ اگر ایسا کچھ ہو تو ہمیں بتا دیجیے گا۔"

ارمان نے فوراً منہ کھولا، اس کے لہجے میں گھبراہٹ نہیں بلکہ صفائی تھی:

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے، ہم تو بس کلاس فیلوز۔۔۔۔"

لیکن اس سے پہلے کہ وہ جملہ پورا کرتا، ثاقب نے تیز آواز میں اسے کاٹ دیا:

"تجھ سے بات نہیں کی"!

اس کی آواز میں غصہ اور تحقیر دونوں شامل تھے۔

"جس سے پوچھا ہے، صرف وہی جواب دے۔"

ارمان خاموش ہو گیا۔

وہ خاموشی جو بزدلی کی نہیں تھی، مجبوری کی تھی۔

اس کی نظریں بے اختیار لان میں گھوم گئیں سکندر، شاہویر اور دانیال پر مگر اپنے دوستوں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔

وہ لمحہ اچانک بہت اکیلا ہو گیا۔

تب مومنہ نے ایک قدم آگے بڑھ کر پورے وقار کے ساتھ کہا:

"جی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اور اگر کوئی مسئلہ ہو بھی، تو میں خود سنبھال لوں گی۔"

اس کی آواز میں نہ لرزش تھی، نہ خوف۔

صرف خودداری تھی۔

ثاقب نے اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے ارمان کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا:

"اچھا، ٹھیک ہے باجی... لیکن اس سے ذرا فاصلے میں رہا کرے۔"

مومنہ نے فوراً جواب دیا:

"آپ میری فکر نہ کریں، بھائی۔"

ثاقب نے ایک لمحے کو اسے دیکھا، پھر مصنوعی نرمی سے بولا:

"ٹھیک ہے، باجی۔"

وہ مڑ کر جانے لگا، مگر تبھی اس کی نظر اپنے ساتھ کھڑے زیشان پر پڑی، جو وہیں ساکت کھڑا مومنہ کو گھورے جا رہا تھا۔

"کیا ہوا، کھڑا کیا دیکھ رہا ہے؟"

ثاقب نے جھنجھلا کر پوچھا۔

زیشان چونکا، فوراً نظریں ہٹا کر بولا:

"کچھ نہیں بھائی، بس ایسے ہی۔"

ثاقب نے سخت نگاہ سے اسے دیکھا، پھر حکم کے انداز میں کہا:

"چلو، یہاں سے۔"

اور جاتے جاتے پلٹ کر بولا:

"اور تم دونوں بھی کلاس میں جاؤ۔"

مومنہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مگر ارمان وہیں کھڑا رہا۔

اس کی آنکھیں اب بھی ثاقب کی آنکھوں میں جمی تھیں۔

یہ نظر محض ضد نہیں تھی

یہ ایک خاموش اعلان تھا کہ

یہ کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی۔

جیسے ہی ثاقب نے دوبارہ مڑ کر جانے کی کوشش کی، اس کی نظر اچانک پھر سے زیشان پر ٹھہر گئی۔

زیشان وہیں کھڑا تھا بے حرکت۔

اس کی آنکھیں مومنہ پر جمی ہوئی تھیں، جیسے وہ لان میں نہیں، کسی اور ہی دنیا میں کھو گیا ہو۔

اس کے چہرے پر حیرت، الجھن اور ایک انجان سی کشش اکٹھی ہو رہی تھیں۔

نہ وہ مسکرا رہا تھا، نہ بات کر رہا تھا

بس دیکھ رہا تھا۔

ایسے جیسے پہلی بار کسی احساس نے اس کے اندر دستک دی ہو اور وہ سمجھ نہ پا رہا ہو کہ اس کا نام کیا ہے۔

"کیا ہوا تجھے چوتیے؟"

ثاقب نے دوبارہ سے اسے جھنجھلا کر پوچھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہا ہے، پاگل ہو گیا ہے کیا؟"

زیشان چونک گیا، جیسے کسی نے اسے خواب سے جھنجھوڑ دیا ہو۔

اس نے فوراً نظریں جھکا لیں، مگر دل ابھی تک وہیں اٹکا ہوا تھا۔

"کچھ نہیں بھائی"...

اس کی آواز غیر معمولی طور پر دھیمی تھی۔

"بس... میرا ذہن کہیں اور تھا ایسے ہی۔"

لیکن وہ "ایسے ہی" نہیں تھا۔

اس کے لیے بھی یہ لمحہ غیر معمولی تھا

اور وہ مومنہ کو ہی دیکھی جا رہا تھا جیسے پہلے کبھی کوئی لڑکی نہ دیکھی ہو۔

ثاقب نے اسے گھورتے ہوئے کہا:

"چلو، یہاں سے۔"

وہ سب آگے بڑھ گئے، مگر زیشان ایک لمحے کے لیے پیچھے رہ گیا۔

اس نے آخری بار پلٹ کر مومنہ کو دیکھا

اور اس نظر میں کچھ ایسا تھا جو صرف دیکھنے کی حد تک نہیں تھا۔

ادھر مومنہ اور ارمان دونوں کھڑے تھے،

اور ارمان نے وہ سب دیکھ لیا تھا۔

یہ صرف بے ادبی نہیں تھی...

یہ اب ایک اور آنکھ کا حساب بھی تھا۔

"بے غیرت، لعنتی لوگ... پتا نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں"!

ارمان نے دانت بھینچتے ہوئے کہا، اس کی آواز میں غصہ دبا ہوا تھا۔

"سکندر ہوتا تو اِن کی ایسی کلاس لیتا کہ دوبارہ کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوتی۔"

مومنہ نے ایک گہری سانس لی، جیسے سینے پر رکھا بوجھ ذرا سا ہلکا ہوا ہو۔

"کوئی بات نہیں،" وہ آہستہ بولی،

"بلکہ اچھا ہی ہوا کہ زیادہ لڑائی نہیں ہوئی... مجھے لڑائیاں، شور، چیخنا چِلّانا بالکل برداشت نہیں۔"

اس کی آواز کانپنے لگی۔

"مجھے بہت ڈر لگتا ہے، ارمان... ایسا خوف آتا ہے کہ سانس رکنے لگتی ہے۔"

ارمان رُک گیا۔

اس نے پہلی بار مومنہ کو اس نظر سے دیکھا کمزور نہیں، بلکہ سچ بولتی ہوئی۔

"جب تک میں ہوں،" اس نے پورے یقین سے کہا،

"آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ کسی کی جرات نہیں کہ آپ کو آنچ بھی آئے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ خود بھی نہیں جان پایا کہ اس کے لہجے میں اتنی مضبوطی کہاں سے آگئی تھی۔

مومنہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔

چند لمحوں کے لیے لان، لوگ، شور سب غائب ہو گیا۔

اسی لمحے بے خبری میں اس کا ہاتھ ارمان کے ہاتھ سے جا لگا... اور تھام بھی لیا۔

ارمان چونکا۔

اس نے نیچے دیکھا تو مومنہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔

مومنہ کو بھی فوراً احساس ہوا

وہ شرما گئی، جلدی سے ہاتھ چھڑا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"میں... مجھے... سوری"...

وہ نظریں جھکا کر بولی۔

ارمان بھی گھبرا گیا۔

"نہیں، نہیں... کوئی بات نہیں"...

وہ خود بھی شرماتے ہوئے ایک قدم پیچھے ہٹا۔

"میں دیکھتا ہوں یہ سکندر کہاں مر گیا ہے، بتائے بغیر غائب ہو جاتا ہے۔"

"اچھا... ٹھیک ہے،"

مومنہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، مگر اس کے گال اب بھی سرخ تھے۔

ارمان مڑا ہی تھا کہ اچانک کسی سے ٹکرا گیا۔

"بھائی، اندھے ہو؟"

ارمان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"ہاں یار... لگتا ہے اب ہو ہی جاؤں گا،"

لطیف نے آہستہ کہا

مگر اس کی نظریں مومنہ پر تھیں۔

ایک نظر۔

بس ایک نظر۔

مگر اس میں عجیب سا ٹھہراؤ تھا، جیسے کچھ اندر ہی اندر سلگ گیا ہو۔

ارمان نے اس پر زیادہ دھیان نہ دیا،

"یار سیدھا چلا کر،" کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

لطیف وہیں کھڑا رہ گیا۔

مومنہ نے بھی اس کی طرف ایک رسمی سی نظر ڈالی اور فوراً نظریں ہٹا لیں۔

مگر لطیف کے لیے یہ بس ایک نظر نہیں تھی۔

اس کے اندر کچھ ہل چکا تھا

اور وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ حسد تھا، الجھن... یا کوئی نیا احساس۔

لان میں شور پھر سے پھیلنے لگا،

مگر تین دلوں کے اندر

خاموشیاں جنم لے چکی تھیں۔

دوسری طرف، سکندر، شاہویر اور دانیال یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں موجود تھے، جہاں طلبہ اور طالبات کا ایک گروہ جمع تھا۔ سب ایک دوسرے کو گھیرے میں لے کر ہنس رہے تھے اور بات چیت کر رہے تھے۔ سکندر گروپ کے بیچ میں کھڑا تھا، اپنے اعصاب پر مکمل قابو رکھتے ہوئے، جیسے وہ ہر ممکنہ چیلنج کا سامنا کرنے کو تیار ہو۔

اچانک شاہویر نے زور سے کہا،

"آؤ! جس میں دم ہے، سکندر سے زیادہ پش اپس لگائے! آج کا کھانا اس کا ہو گا، اور اگر ہار گئے تو ہمیں کھانا کھلانا ہو گا۔"

سکندر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی چھاتی پھلائی۔

وہ ہمیشہ اس طرح کی حرکتوں میں آگے رہتا تھا، اکثر جیتتا اور اپنی پختہ حوصلے سے سب کو حیران کر دیتا تھا۔

طیب، جو سامنے کھڑا تھا، حیرت سے بولا،

"بھائی! یہ تو بہت شو خا لگ رہا ہے"!

شاہویر نے چیلنج قبول کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا،

"اگر تمہیں ایسا لگتا ہے تو آؤ، اس سے مقابلہ کرو۔"

طیب نے مسکرا کر کہا،

"اچھا، ٹھیک ہے، پھر آ رہا ہوں"!

اور وہ بیچ میں آ کر کھڑا ہو گیا، سب کی نظریں اس کی طرف مرکوز ہو گئیں۔

اس دوران، رمشا کی نظریں سکندر پر جم گئی تھیں۔

وہ کسی اور کی طرف دیکھنے کی کوشش بھی نہ کر رہی تھی۔

اس کی ہر نگاہ سکندر پر مرکوز تھی، جیسے وہ صرف اسی کو دیکھ رہی ہو، اور دنیا کے تمام شور و غل کے باوجود، اس کے لیے لمحہ ایک خاص سکون بن گیا۔

دانیال اور شاہویر ہنستے ہوئے اپنے ہونٹوں کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ سکندر اور طیب کے بیچ مقابلے کی شدت اور زیادہ محسوس ہو۔ ہر کوئی سانس روک کر دیکھ رہا تھا، اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پوری یونیورسٹی اس لمحے کی گواہ بنی ہو۔

پھر اچانک شور تھم سا گیا، اور طیب اور سکندر دونوں زمین پر آ گئے۔

ہجوم سانس روکے دیکھنے لگا۔

"شروع!" شاہویر نے بلند آواز میں کہا۔

طیب نے جیسے ہی ہاتھ زمین پر رکھے، بجلی کی سی تیزی سے پُش اپس مارنا شروع کر دیے۔

ایک... دو... تین...

اس کے بازو بجلی کی طرح حرکت کر رہے تھے۔

دوسری طرف سکندر بالکل مختلف انداز میں تھا۔

وہ آہستہ، ناپ تول کر پُش اپس لگا رہا تھا، جیسے اسے کسی جلدی کی ضرورت ہی نہ ہو۔

طیب کے دوست یہ منظر دیکھ کر ہنسنے لگے۔

"اوئے دیکھو! سکندر تو سلو موشن میں ہے"!

"ایسے تو ہار جائے گا"!

رمشا اور زینب گل نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

رمشا کے ماتھے پر ہلکی سی شکن آ گئی،

"یہ سکندر اتنا آہستہ کیوں ہے؟"

لیکن دانیال خاموشی سے مسکرا رہا تھا۔

اور سکندر کے چہرے پر بھی ایک پُراعتماد، خاموش مسکراہٹ تھی، جیسے وہ سب کچھ جانتا ہو۔

دس… پندرہ… بیس…

طیب تیزی سے آگے نکل چکا تھا۔

مگر پھر

طیب کی سانس بھاری ہونے لگی۔

اس کا سینہ اوپر نیچے ہونے لگا۔

بازو کانپنے لگے۔

اب اس کی رفتار وہ نہیں رہی تھی۔

ہر پُش اپ کے ساتھ اس کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

ادھر سکندر...

وہی رفتار، وہی ٹھہراؤ، وہی کنٹرول۔

جیسے ہی طیب کے لیے ایک ایک پُش اپ مشکل ہونے لگا،

سکندر نے آہستہ سے اپنی رفتار بڑھا دی۔

"اوئے! یہ کیا؟" کسی نے حیرت سے کہا۔

شاہویر زور زور سے گنتی شروع کر چکا تھا۔

"پچیس... چھبیس... ستائیس"...

طیب اڑتی سانسوں کے ساتھ پینتیس پر آ کر رک گیا۔

اس کے بازو جواب دے چکے تھے۔

"اڑتیس..." شاہویر نے آواز لگائی۔

طیب نے کوشش کی... مگر جسم ساتھ نہ دے سکا۔

اب سب کی نظریں صرف سکندر پر تھیں۔

"چالیس"...

"اکتالیس"...

"بیالیس"...

رمشا بے اختیار سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"چھیالیس"!

شاہویر کی آواز گراؤنڈ میں گونج اٹھی۔

اسی لمحے طیب زمین پر گر پڑا۔

پسینے سے شرابور، ہانپتا ہوا۔

پورا ہجوم دم بخود تھا،

اور اگلے ہی لمحے تالیاں اور شور بلند ہو گیا۔

"واہ سکندر"!

"کمال کر دیا"!

سکندر سکون سے اٹھا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

وہ سامنے رکھی بینچ پر جا کر بیٹھ گیا اور گہری سانس لی۔

شاہویر اور دانیال ہنستے ہوئے تایب کے پاس گیے،

اس کی جیب سے پیسے نکالے اور آکر سکندر کے سامنے لہرائے۔

"جناب! آج کا کھانا آپ کا"!

سکندر نے پیسوں کو دیکھا،

اور ہونٹوں پر وہی پُرسکون مسکراہٹ آگئی

جیسے یہ جیت اس کے لیے کوئی نئی بات ہی نہ ہو۔

اسی لمحے رمشا، زینب گل کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سکندر کے قریب آگئی۔

ہجوم اب بھی سکندر کے گرد تھا، مگر رمشا کی موجودگی نے جیسے فضا کو الگ ہی رنگ دے دیا۔

رمشا نے بغیر کچھ کہے اپنی پانی کی بوتل آگے بڑھادی۔

"پانی پی لو، تھک گئے ہوگے۔"

سکندر نے ایک لمحہ اس کی طرف دیکھا، پھر بوتل لے لی۔

اس نے خاموشی سے پانی پیا۔

اس کے گلے سے اترتے گھونٹوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

شاہویر فوراً بول پڑا،

"بھائی ماننا پڑے گا، آج تو تُو نے سب کی کلاس لے لی۔ یہ کوئی عام بات نہیں تھی"!

سکندر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا دیا،

جیسے تعریف سن کر خوش تو ہوا ہو، مگر ظاہر نہ کرنا چاہتا ہو۔

رمشا نے بھی نرمی سے کہا،

"واقعی سکندر، تم بہت مضبوط ہو... اور پش اپس لگاتے ہوئے بہت اچھے لگتے ہو۔"

لیکن سکندر نے اس جملے پر کوئی خاص ردِ عمل نہ دیا۔

نہ نظر اٹھائی، نہ جواب دیا۔

بس بوتل کا آخری گھونٹ لیا اور اسے واپس رمشا کی طرف بڑھا دیا۔

"شکریہ۔"

بس ایک لفظ... اور بس۔

رمشا نے بوتل تھامی،

اور اگلے ہی لمحے اس نے چہرہ ذرا سا دوسری طرف موڑ لیا۔

پھر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے،

اسی جگہ سے پانی پی لیا جہاں سے سکندر نے پیا تھا۔

یہ منظر زینب گل کی آنکھوں سے اوجھل نہ رہ سکا۔

وہ چونک گئی،

اس کی نظریں کبھی رمشا پر، کبھی بوتل پر جا ٹھہرتیں۔

"یہ...؟"

زینب گل نے دل ہی دل میں سوچا،

لیکن کچھ کہا نہیں۔

رمشا کے چہرے پر ایک عجیب سا سکون تھا،

جیسے اس کے لیے یہ لمحہ بہت معنی رکھتا ہو۔

دانیال نے کہا: "میں ابھی تھوڑی دیر تک آتا ہوں باتھ روم جا رہا ہوں۔ "

"لڑکوں والے میں جائیں، اور اپنی عزت کی حفاظت کری!" سکندر نے چلا کر کہا رمشا، زینب گل اور شاہویر یہ سن کر ہنسنے لگے۔

دانیال منہ بنا کر وہاں سے چل دیا۔

رمشا ابھی بھی سکندر کو دیکھ رہی تھی۔

تبھی ارمان آہستہ آہستہ گراؤنڈ میں داخل ہوا۔

اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور چہرے پر وہ مایوسی صاف لکھی تھی جو الفاظ کے بغیر بھی سب کچھ کہہ دیتی ہے۔

سکندر کی نظر فوراً اس پر پڑی۔

وہ بینچ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، مگر ارمان کا چہرہ دیکھتے ہی سیدھا ہو گیا۔

"اوئے... تیرے منہ پر بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں؟"

سکندر نے گھور کر پوچھا۔

ارمان نے بغیر رکے جواب دیا،

"تم لوگ مجھے بتائے بغیر کہاں غائب ہو جاتے ہو؟"

شاہویر نے بیچ میں مداخلت کی،

"کیوں، کیا ہوا ہے؟"

ارمان کا لہجہ سخت ہو گیا،

"پہلے یہ بتاؤ، تم لوگ گئے کیوں تھے؟"

"بہن کے۔۔۔۔" سکندر منہ کھولتے ہی رک گیا،

لفظ زبان پر آکر واپس چلے گئے۔

وہ اردگرد کھڑی لڑکیوں کو دیکھ چکا تھا۔

اس نے دانت بھینچ کر کہا،

"تجھے پرسنل اسپیس دے رہے تھے۔"

ارمان چونکا،

"کس لیے؟"

سکندر نے اس کی طرف تیز نظر ڈالی،

"تو خود جانتا ہے کس لیے۔

اب سیدھی طرح بتا، ہوا کیا ہے؟"

ارمان نے ایک گہری سانس لی۔

"وہی... یونین والا ثاقب آیا تھا۔

مجھے اور مومنہ کو بول رہا تھا۔"

یہ سنتے ہی سکندر کا چہرہ بدل گیا۔

آنکھوں میں وہی پرانی آگ لوٹ آئی۔

وہ فوراً سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"کیا کہا اُس نے بھڑ۔۔؟"

الفاظ دوبارہ سے گالی بننے ہی والے تھے کہ

سکندر کی نظر اچانک رمشا اور زینب گل پر پڑ گئی۔

وہ دونوں چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھیں۔

سکندر نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا،

جبڑے سختی سے بھینچ لیے۔

رمشا نے زینب گل کی طرف دیکھا،

اور خاموشی سے دونوں وہاں سے ہٹ گئیں۔

ان کے جاتے ہی سکندر نے مٹھی بند کرلی۔

"کیا بکواس کی اُس گانڈو نے؟"

اس بار آواز دبی ہوئی تھی، مگر غصہ کہیں زیادہ تھا۔

ارمان نے نظریں جھکا لیں۔

"کہہ رہا تھا کہ گھر والے ہمیں ایسے بیٹھنے بھیجتے ہیں یا پڑھنے...

اور پھر مجھے گھور کے کہنے لگا کہ اس سے دور رہا کرو۔"

سکندر نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

"اور تُو خاموش رہا؟"

ارمان نے اس کی آنکھوں میں دیکھا،

"وہ مومنہ سامنے تھی۔

میں کوئی تماشہ نہیں بنانا چاہتا تھا۔"

سکندر چند لمحے خاموش رہا۔

پھر اس نے ہونٹوں کے کونے سے سرد مسکراہٹ نکالی۔

"اب بول! ان کو مسئلہ کیا تھا؟"

سکندر نے بازو سینے پر باندھتے ہوئے کہا، آنکھیں ارمان پر جمی ہوئی تھیں۔

ارمان نے ہلکی سی سانس لی۔

"بس یہی کہ میں مومنہ کے ساتھ کیوں بیٹھا ہوں؟"

سکندر کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آئی۔

"واہ! یعنی تُو اُن کی بہن کے ساتھ بیٹھا تھا جو آکر تُجھے لیکچر دے گئے؟"

ارمان نے نظریں چرا لیں۔

سکندر اچانک ایک قدم آگے بڑھا۔

"اور تُو نے مجھے کیوں نہیں بلایا وہاں؟"

"تم لوگ نظر ہی نہیں آئے"...

ارمان کی آواز میں صفائی کم اور الجھن زیادہ تھی۔

یہ سنتے ہی سکندر کا غصہ پھر بھڑک اٹھا۔

اس نے بغیر اجازت ارمان کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جھٹ سے فون نکال لیا۔

"یہ کیا ہے؟"

فون ارمان کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔

"اس سے کال بھی ہوتی ہے اور میسج بھی جاتا ہے صرف ٹک ٹاک پر مجرے دیکھنے کے لیے نہیں رکھا ہوا اسے

میرا، شاہویر کا اور اُس... دانیال کا نمبر بھی اسی میں سیو ہے۔

ہم میں سے کسی ایک کو بھی کال کرلیتا"!

ارمان نے دھیمی آواز میں کہا،

"اُس وقت میرے ذہن میں کچھ نہیں آرہا تھا"...

چند لمحے کے لیے سکندر خاموش ہو گیا۔

غصہ جیسے آہستہ آہستہ دبنے لگا۔

"مومنہ کیسی ہے؟"

اس بار لہجہ بدلا ہوا تھا۔

"اُس نے میرا ساتھ دیا...

وہاں سب کے سامنے اُنہیں منہ پر جواب دیا۔"

ارمان نے کہا۔

سکندر نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ سر ہلایا۔

"تُجھ سے بہتر تو وہ نکلی، سالے۔

کم از کم اپنے لیے کھڑی تو ہو سکتی ہے۔"

ارمان نے کوئی جواب نہیں دیا،

بس نظریں جھکا لیں۔

شاہویر نے موقع دیکھ کر بات سمیٹنے کی کوشش کی۔

"چل چھوڑ یار، جو ہونا تھا ہو گیا۔"

سکندر نے ہاتھ کے اشارے سے بات ختم کی۔

"چل، صحیح ہے۔

سب روٹی کھانے چلتے ہیں۔"

ارمان نے چونک کر پوچھا،

"مگر پیسے؟"

سکندر کے چہرے پر پرانی شوخی لوٹ آئی۔

"اُس کا انتظام ہو چکا ہے۔"

وہ چلنے لگے تو جاتے جاتے

رمشا نے ایک لمحے کو سکندر کی طرف دیکھا۔

سکندر رک گیا۔

نظروں ہی نظروں میں بات سمجھ لی۔

"مومنہ کے پاس جاؤ۔"

اس نے مختصر سا کہا۔

رمشا نے سر ہلایا،

اور زینب گل کو ساتھ لے کر اُس سمت بڑھ گئی۔

رمشا اور زینب گل مومنہ کے قریب آ گئیں۔

رمشا نے نرمی سے پوچھا، "سب ٹھیک ہے نا؟ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟"

مومنہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا دیا۔

"نہیں، سب ٹھیک ہے۔ بس تھوڑا سا عجیب ماحول ہو گیا تھا۔"

زینب گل نے تسلی دیتے ہوئے کہا، "بس خیال رکھا کرو، ویسے ہم تمہارے ساتھ ہیں۔"

مومنہ نے شکریہ ادا کیا اور کہا، "بابا بس آنے ہی والے ہوں گے، میں گیٹ پر انتظار کر لوں گی۔"

رمشا نے فوراً کہا، "ہم بھی چلتے ہیں تمہارے ساتھ۔"

تینوں آہستہ آہستہ لان سے نکل کر یونیورسٹی کے گیٹ کی طرف بڑھ گئیں۔

شام کی ہوا میں ہلکی سی ٹھنڈک تھی، اور مومنہ کی نظریں بار بار باہر سڑک کی طرف اٹھ رہی تھیں، جہاں وہ اپنے بابا طارق انور کی آمد کی منتظر تھی۔

یونین کے کلب میں دھواں سا پھیلا ہوا تھا۔ کرسیوں پر نیم دراز لڑکے، آدھی بجھی سگریٹیں، اور دیوار پر لگے پوسٹر سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا روز ہوتا تھا، مگر زیشان آج غیر معمولی حد تک خاموش تھا۔ وہ ایک کونے میں بیٹھا خالی نظروں سے سامنے دیکھ رہا تھا، جیسے ذہن کہیں اور اٹکا ہو۔

ثاقب نے اسے یوں گم سم دیکھا تو کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے آ بیٹھا۔

"کیا ہو گیا ہے تجھے؟ اتنا کھویا ہوا کیوں بیٹھا ہے؟"

زیشان نے پلک جھپکی، جیسے کسی خیال سے واپس آیا ہو۔ پھر آہستہ سے بولا،

"یار... وہ لڑکی کتنی پیاری تھی نا۔"

ثاقب نے آنکھیں سکیڑ لیں۔

"کون سی لڑکی؟"

"وہی... جو آج لان میں اُس کالے کے ساتھ بیٹھی تھی۔"

زیشان کے لہجے میں نہ ضد تھی، نہ شوخی بس ایک عجیب سی کشش تھی۔

ثاقب کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی، مگر آنکھوں میں کچھ اور ہی چمکا۔

"اوہ، تو تجھے پسند آگئی ہے؟"

زیشان نے کندھے اچکائے، جیسے خود بھی یقین میں نہ ہو۔

"پسند کہنا شاید جلدی ہو، مگر... لگ تو اچھی رہی تھی۔"

یہ سن کر ساقب سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے کرسی کی پشت پر ہاتھ مارا اور قدرے بلند آواز میں بولا،

"بس پھر سن لے۔ میرا تجھ سے وعدہ ہے۔۔۔"

وہ لمحہ بھر رکا، جیسے الفاظ تول رہا ہو، پھر فخر اور غصے کے ملے جلے لہجے میں بولا،

"وہ لڑکی تیری ہو گی۔"

زیشان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ثاقب، ایسی باتیں آسان نہیں ہوتیں۔۔۔"

"آسان یا مشکل کی فکر مت کر۔"

ثاقب نے بات کاٹ دی، آنکھوں میں وہی پرانا غرور لوٹ آیا۔

"یونین یونہی نہیں بنی۔ جو ہمیں چاہیے، وہ ہمیں ملتا ہے۔"

زیشان خاموش ہو گیا۔ اس کے دل میں خوشی کی ایک لہر اٹھی، مگر کہیں نہ کہیں ایک انجانا سا خوف بھی سر اٹھا رہا تھا۔ باہر لان کی طرف جاتی کھڑکی سے شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا، اور اسی اندھیرے میں ایک نئی ضد جنم لے چکی تھی ایسی ضد، جو آگے چل کر بہت کچھ بدلنے والی تھی۔

دسمبر کی سَردی اپنے عروج پر تھی۔ گلیوں میں دھند کی ہلکی تہہ بچھی رہتی، سانس لیتے ہی سینے میں ٹھنڈ اتر جاتی۔ لوگ جیکٹس، مفلرز اور سویٹر اوڑھے پھر رہے تھے۔ ہر چہرے پر سردی کی شکایت لکھی تھی سوائے اُس کے۔

وہ چھت پر کھڑا تھا۔

ہوا تیز تھی، مگر اسے جیسے چھو بھی نہیں رہی تھی۔ ایک معمولی سا پاجامہ، ایک پتلی سی قمیص نہ جیکٹ، نہ شال۔ ہونٹوں کے بیچ دبی سگریٹ کی لال چنگاری اندھیرے میں کبھی روشن ہو جاتی، کبھی بجھ سی جاتی۔ دھوئیں کے

مرغولے سرد فضا میں تحلیل ہو جاتے، جیسے اس کے اندر کا شور باہر نکل کر خاموش ہو رہا ہو۔

اس کے لیے نہ سردی مسئلہ تھی، نہ خوف، نہ کسی انجام کا ڈر۔

بس ایک خالی پن تھا گہرا، بے نام جسے وہ ہر کش میں تھوڑا بھرنے کی کوشش کرتا تھا۔

نیچے، سامنے والے گھر کی کھڑکی میں ایک لڑکی رہتی تھی۔

وہ روز اسے دیکھتی۔

روز شام یا رات کے وقت، جب بھی وہ چھت پر آتا، وہ پردے کے پیچھے سے ایک نظر ڈال لیتی۔ اس کی عادتیں اسے یاد تھیں: خاموشی سے آنا، سگریٹ جلانا، کچھ دیر آسمان کو دیکھنا، پھر نیچے اتر جانا۔

مگر اس نے کبھی اس کی لڑکی کی طرف دیکھا ہی نہیں۔

جیسے وہ موجود ہی نہ ہو۔

آج بھی وہی ہوا۔

وہ چھت کی منڈیر کے قریب کھڑا تھا، آسمان پر بکھرے بادلوں کے پیچھے چھپے چاند کو دیکھتے ہوئے۔ سردی میں بھی اس کے ہاتھ نہیں کانپ رہے تھے۔ سگریٹ ختم ہونے کو تھی کہ اچانک نیچے سے ایک بھاری، رعب دار آواز ابھری ایسی آواز جس میں حکم بھی تھا اور اپنا پن بھی۔

"بیٹے... ابراہیم"!

"کیا ہوا، بابا؟"

ابراہیم سکندر نے سگریٹ آہستہ سے نیچے پھینکتے ہوئے کہا، جیسے واقعی کچھ بھی خاص نہ ہو۔

یعقوب جٹ نے چھت پر قدم رکھا تو سرد ہوا نے ان کے شانے ہلا دیے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو اوپر سے نیچے تک دیکھا باریک سی قمیص، ہلکا سا پاجامہ، اور وہی بے پرواانداز۔

"بیٹا، اس کڑاکے کی سردی میں اوپر کیا کرتے رہتے ہو؟" ان کی آواز میں باپ کی فکر بھی تھی اور سختی بھی۔

"کچھ نہیں، بس... ایسے ہی اچھا لگتا ہے،" سکندر نے شانے اچکائے، نظریں آسمان پر جمائے رکھیں۔

یعقوب جٹ اس کے قریب آئے۔ ایک لمحے کو رکے۔ ہوا میں پھیلی ہوئی وہ مانوس سی بو دھوئیں کی بو ان کے نتھنوں سے ٹکرا گئی۔ وہ سمجھ گئے تھے۔ وہ بہت پہلے سمجھ گئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کا بیٹا سگریٹ پیتا ہے، مگر آج تک وہ اسے رنگے ہاتھوں نہیں پکڑ پائے تھے۔ اور شاید اسی دن کے انتظار میں وہ خاموش تھے۔

"تمہارے پاس سے دھواں کیوں اٹھ رہا تھا؟" یعقوب جٹ نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

سکندر فوراً پلٹا، جیسے یہ سوال پہلے ہی اس کے ذہن میں تیار پڑا ہو۔

"بابا، اتنی سردی ہے... منہ کھولو تو بھی دھواں نکلتا ہے،" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

ایک لمحے کو خاموشی رہی، پھر یعقوب جٹ ہنس پڑے۔

"ہر چیز کا جواب تیار ہوتا ہے اس لڑکے کے پاس،" انہوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "کبھی نہ کبھی تو تمہیں سگریٹ پیتے پکڑ ہی لوں گا۔"

سکندر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"جب میں پیتا ہی نہیں تو آپ کیسے پکڑیں گے؟" یہ کہہ کر اس نے منہ دوسری طرف کر لیا، اور آہستہ آہستہ ہنستے ہوئے چھت کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

یعقوب جٹ نے اس کی پیٹھ کو دیکھا اور دھیرے سے بڑبڑائے،

"باپ کو بھی بیوقوف بناتا ہے"...

ان کی نظر بے اختیار سامنے والے گھر کی کھڑکی پر جا ٹھہری۔ پردے کے پیچھے وہی لڑکی کھڑی تھی، بڑی غور سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ یعقوب جٹ نے آنکھیں سکیڑیں، دل میں ایک خیال ابھرا۔

"پکا اس کے ساتھ بھی اس لڑکے کا کچھ نہ کچھ چل رہا ہے"...

چھت پر سردی ویسی ہی تھی، مگر ہوا میں اب ایک انجانی سی کھنچاؤ بھی شامل ہو چکی تھی۔

وہ نیچے آیا تو صحن میں ہلکی سی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی ماں، سلمٰی جٹ، چولہے کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے سکندر کو دیکھتے ہی جیب سے الائچی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

سکندر چونک گیا۔

"ماما، یہ کس لیے؟" ابراہیم سکندر نے حیرانی سے پوچھا۔

سلمٰی جٹ نے ایسے کہا جیسے کوئی بہت معمولی بات ہو،

"یہ کھالیا کرو، سگریٹ کی سمیل ختم ہو جاتی ہے۔ پاس رکھا کرو اسے۔"

سکندر کے چہرے پر ایک لمحے کو حیرت جم گئی، پھر فوراً ہی اس نے انکار کا لبادہ اوڑھ لیا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں ماما، اب آپ بھی بابا کی طرح بیٹے کو کوسنے لگیں؟" وہ رونے کا ڈرامہ کرتے ہوئے بولا، آواز میں مصنوعی دکھ گھول دیا۔

سلمٰی جٹ نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی اور اس کے سامنے ایک چیز لہرا دی۔

"میرے لادلے، روز تمہاری جیب سے یہی نکلتی ہے، اور میں چپکے سے غائب کر دیتی ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے سگریٹ کی ایک ڈبّی دکھا دی۔

سکندر نے فوراً آنکھیں پھیلا دیں، جیسے اس پر بہت بڑا الزام لگا ہو۔

"اوہو یہ پھر اُن بدماشوں کا کام ہے!" اس نے فوراً کہا۔

"کون سے بدماش؟" سلمٰی جٹ نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی یونیورسٹی کے لڑکے،" سکندر نے پورے اعتماد کے ساتھ ڈرامائی انداز میں کہا۔

سلمٰی جٹ اور بھی چونک گئیں۔

"یونیورسٹی میں بدماش ہیں؟"

"جی ماما، بہت کچھ کرتے ہیں وہ... آتے جاتے سب کو تنگ کرتے ہیں، شرطیں لگاتے ہیں، تاش کھیلتے ہیں، ایک دوسرے سے لڑائیاں کرتے ہیں...

بہت گندے لوگ ہیں وہاں،" سکندر نے ایسے نقشہ کھینچا جیسے کسی خطرناک دنیا کا ذکر ہو۔

"یا اللہ!" سلمیٰ جٹ کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ "میرا بیٹا کن لوگوں میں جا پڑا ہے"...

انہوں نے فوراً سکندر کو گلے لگا لیا، جیسے اسے کسی بڑے فتنے سے بچا لیا ہو۔

اسی لمحے سیڑھیوں پر قدموں کی آواز آئی۔ یعقوب جٹ نیچے اتر رہے تھے۔ سکندر نے انہیں دیکھتے ہی چہرے پر معصومیت کا ڈرامہ اور گہرا کر لیا، جیسے ابھی ابھی مظلوم ثابت ہوا ہو۔

یعقوب جٹ نے ماں بیٹے کو اس حال میں دیکھا تو ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

وہ سب سمجھ رہے تھے...

اور سکندر بھی۔

"مجھے پتہ چلا ہے تمہاری گرل فرینڈ ہے!" یعقوب جٹ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

یعقوب کے لہجے میں سنجیدگی اور تھوڑی الجھن تھی۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا سکندر واقعی ایسا کر رہا ہے یا نہیں۔

"ایڈا وڈا الزام!" سکندر ایک دم سے بولا، مایوسی کا ڈرامہ کرتے ہوئے۔

سکندر نے آنکھیں گڑھا کر مایوسی کا ڈرامہ کیا۔ اس کی آواز میں تھوڑی شیطنت بھی چھپی تھی۔

سلمہ جٹ حیران رہ گئیں۔

وہ بیٹے کی شرارتوں کی عادی تھیں، لیکن یہ منظر ان کے لیے نیا اور حیران کن تھا۔

"اے تُسی کی کہہ رہے ہو اپنے پُتر نُوں؟" سلمہ جٹ نے سخت لہجے میں پوچھا۔

ان کے لہجے میں سختی اور تھوڑی فکر تھی، جیسے وہ چاہتے ہوں کہ سکندر حقیقت بتائے۔

"نی سلمہ، اے سچ ہے... ساڈا مُنڈا ہاتھوں نکل ریا ہے، مان لا میری گَل!" یعقوب جٹ نے جواب دیا۔

یعقوب کی آواز میں حیرانی اور تھوڑی الجھن تھی۔ وہ سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے کہ سکندر نے یہ کیسے کر لیا۔

"کیا ثبوت ہے بابا کہ میری گرل فرینڈ ہے؟" سکندر نے پھر سے ڈرامہ کرتے ہوئے پوچھا۔

اس کی آواز میں مزاح اور چالاکی تھی، جیسے وہ والدین کو الجھا رہا ہو۔

"ایلو ویکھو فیر!" یعقوب جٹ نے فون دکھایا، جس میں سکندر کسی برقع والی لڑکی کے ساتھ بائیک پر بیٹھا تھا۔

یعقوب کے چہرے پر حیرانی اور تھوڑی الجھن تھی۔ سلمہ جٹ کی آنکھیں سکندر پر مرکوز ہو گئیں۔ سکندر خود بھی تصویر دیکھ کر حیران تھا۔

"ہُن دسو دونوں اے وگر گیانا؟" یعقوب جٹ خوشی اور تھوڑی الجھن کے مکس انداز میں بولے۔

وہ چاہتے تھے کہ سب کچھ واضح ہو جائے، لیکن ان کے دل میں اب بھی شک تھا۔

"یہ تو بوڑھی مائی ہے!" سکندر فوراً بولا۔

اس کی آواز میں ہلکا سا مزاح اور چالاکی تھی۔ وہ جان بوجھ کر ماحول کو ہلکا کر رہا تھا۔

"ہیں... " یعقوب جٹ نے فوراً تصویر دیکھی، لیکن چونکہ لڑکی نے برقع پہنا ہوا تھا، وہ تصدیق نہیں کر سکے۔

یعقوب کے چہرے پر حیرت اور تھوڑی بے یقینی تھی۔

"ہاں جی بابا، ایسے ہی انہوں نے مجھ سے لفٹ مانگی تھی، میں نے دے دی!" سکندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بوڑھی تے نہیں لگدی... " یعقوب جٹ نے کہا۔

یعقوب کی آواز میں حیرانی اور تھوڑی الجھن، وہ سمجھ نہ پا رہے تھے کہ سکندر سچ کہہ رہا ہے یا صرف ڈرامہ۔

"تُسی ایڈا غور کر دے ہو کڑیاں تے!" سلمہ جٹ نے کہا۔

سلمہ جٹ کے لہجے میں تھوڑی تنبیہ اور حیرانی تھی۔

"دیکھا ماما، کتنا دھیان سے دیکھتے یہ لڑکیوں کو!" سکندر نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

سکندر کی آواز میں شیطنت اور مذاق، جیسے وہ جان بوجھ کر والدین کو الجھا رہا ہو۔

"اوئے لعنتی، باپ کو ایسے بول رہا!" یعقوب جٹ نے آہستہ سے کہا۔

یعقوب کی آواز میں حیرانی اور تھوڑا سا غصہ تھا، وہ سکندر کی حرکتوں کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

سکندر سلمہ کے پیچھے چھپ گیا اور مسکرا کر انہیں دیکھنے لگا۔

اس کی مسکراہٹ میں شیطنت اور چالاکی، جیسے وہ ہر ایک جذبات کو کھیل میں بدل رہا ہو۔

"ساری گلاں چھڈو، اوہ جس مرزی کُڑی نال بیٹھے، تُسی ایڈا غور کیوں کر دے ہو؟" سلمہ جٹ نے کہا۔

سلمہ جٹ کے لہجے میں سختی اور حیرانی تھی۔ وہ چاہتی تھی یعقوب جٹ سکندر کو کچھ نہ کہیں۔

سکندر نے بھی ہاں میں سر ہلا دیا۔

اس کی حرکت میں خوش مزاجی اور شیطنت، جیسے وہ سب کچھ جان بوجھ کر کھیل رہا ہو۔

یعقوب جٹ حیران تھے۔

وہ سوچ رہے تھے کہ یہ کیسی ڈرامہ باز اولاد انہیں ملی ہے۔ حیرت، الجھن اور تھوڑی بے یقینی ان کے چہرے پر واضح تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے یار، بوڑھی مائی تھی وہ... میں ہی اندھا ہوں..." یعقوب جٹ نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

سکندر کے چہرے پر خوشی اور سکون کی لہر دوڑ گئی۔ اسے لگا کہ والدین کا شک دور ہو گیا ہے۔

"لیکن آگے سے کسی کو بھی لفٹ نہیں دینی، کسی انکل کو بھی نہیں، کسی آنٹی کو بھی نہیں..." یعقوب نے سنجیدہ انداز میں کہا۔

سکندر نے سر ہلایا اور ہلکی ہچکچاہٹ کے ساتھ جواب دیا، "اوکے بابا"...

"ٹوپی باز لڑکا..." یعقوب نے آہستہ سے کہا، جیسے ہلکی تنبیہ کے ساتھ مزاح بھی شامل ہو۔

سکندر کے چہرے پر شیطنت بھری مسکراہٹ ابھر آئی۔

"اچھا، کھانا تو لا وادو حسینوں..." یعقوب نے مسکراتے ہوئے سلمہ کی طرف دیکھتے کہا۔

سلمہ جٹ نے سر ہلا کر ہلکا سا قہقہہ لگایا، جیسے سب کچھ قابو میں ہو اور ماحول ہلکا ہوا۔

"جاؤ بیٹھو، ٹیبل پر، آرہا تھوڑی دیر تک..." سلمہ جٹ نے کہا۔

سکندر نے خوشی اور اطمینان کے ساتھ میز کی طرف قدم بڑھائے۔

میز پر سب بیٹھے تھے، ہاتھ میں چمچ اور بریانی کی خوشبو ہوا میں گھل رہی تھی۔
یعقوب جٹ نے ایک لمحے کے لیے سسکی خوشبو محسوس کی، پھر سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا،

"بیٹا، اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو ہمیں بتاؤ، میں خود تمہارا نکاح کروادوں گا..." وہ سلمہ کی طرف دیکھ کر ہلکی مسکراہٹ بھی دے گئے،

"مجھے پتہ ہے تم کسی لڑکی کے ساتھ نہیں تھے، لیکن پھر بھی"...

سکندر نے چمچ رکاتے ہوئے آہستہ سے کہا،

"ایک ساتھ دس پندرہ سے کیسے کروائیں گے"...

"کیا؟" یعقوب جٹ کی آنکھوں میں حیرت چھا گئی، وہ بریانی کی خوشبو کے بیچ تھوڑی دیر کے لیے رک گئے۔

سکندر نے ہاتھ میں چمچ تھامے، ہلکا سا مسکراتے ہوئے جواب دیا،

"بابا، مجھے ابھی کوئی پسند نہیں ہے، اگر کوئی ہو گی تو آپ کو ضرور بتاؤں گا"...

بات ٹل گئی، مگر یعقوب جٹ کی نظر اب بھی سکندر پر تھی، ان کے ذہن میں اب بھی بیٹے کی شرارتیں اور اداکاری چل رہی تھی۔ وہ جان چکے تھے کہ سکندر نے بات تو ٹال دی، لیکن وہ اندر ہی اندر کسی طرح کی خوشی محسوس کر رہا تھا۔

"ڈُوڈُو نہیں آیا بریانی کھانے؟" یعقوب جٹ نے ٹیبل پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تو سو رہا ہے۔" سلمہ نے ہاتھ میں چمچ رکھتے ہوئے جواب دیا۔

داؤد، جسے سب ڈُوڈُو کہہ کر پکارتے تھے، دراصل ابراہیم کا چھوٹا بھائی تھا۔ دن بھر وہ گہری نیند میں رہتا اور رات کو جاگتا، یہی اس کی عادت تھی۔ آج

بھی اسی معمول کے مطابق، وہ اپنے کمرے میں گہری نیند میں تھا، نہ کسی کی بات سن رہا تھا اور نہ کسی کی موجودگی کا ادراک کر رہا تھا۔

رات کے نو بجے کا وقت تھا۔ کمرے میں اداس خاموشی چھائی ہوئی تھی، بس ہلکی روشنی موبائل کی اسکرین سے آ رہی تھی، جو سکندر کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹا تھا، ایک ہاتھ موبائل میں، دوسرا سر کے نیچے، اور دل کی دھڑکن کچھ تیز محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک اس کی اسکرین پر مومینا کا پیغام آیا:

"بہت ضروری بات ہے سکندر"

سکندر نے تھوڑی سی جلدی سے ٹائپ کیا، دل میں تجسس اور تھوڑی فکر کے ساتھ:

"کیا ہوا مومنہ ؟"

پیغام فوراً آیا،

"میرے بابا بیمار ہیں اور ایک لڑکا مجھے میسجز کر کے تنگ کر رہا ہے۔ آپ کو اسی لیے میسج کیا کہ آپ اسے صحیح سے دیکھ لیں کہ یہ کون ہے؟"

سکندر کی آنکھیں تھوڑی پھیل گئیں، دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے جلدی سے جواب دیا،

"نمبر فورورڈ کرو، میں چیک کرتا ہوں"

مومنہ نے فوراً نمبر بھیجا۔ سکندر نے موبائل ہلکا سا جھکا کر داؤد، یعنی دودو کو دیا اور کہا کہ وہ فوراً دیکھ لے۔ چند لمحوں کے بعد دودو نے جواب دیا،

"یہ نمبر لطف کے نام پر ہے"

سکندر کی دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ لڑکا واقعی ایسے حرکتیں کر رہا ہے اور مومنہ کو تنگ کر رہا ہے۔ دل میں اضطراب اور غصہ ساتھ ساتھ اُٹھنے لگے۔ اس نے خود سے کہا، "یہ کام کل صبح ختم کرنا پڑے گا۔ مومنہ اور ارمان کو فکر نہیں ہونے دوں گا۔"

سکندر نے موبائل کو تھامے بستر پر لیٹے کچھ دیر خاموشی اختیار کی۔ اس نے پہلے سوچا کہ ارمان کو اس بارے میں بتائے کہ نہ بتائے پھر آنکھیں آدھی

بند، دل میں پلان بنا رہا تھا کہ صبح کیسے لطیف سے بات کرے گا۔ سرد ہوا کی ہلکی آواز کھڑکی سے آ رہی تھی، لیکن سکندر کی توجہ صرف مومنہ اور اس مسئلے پر تھی۔ دل میں اضطراب اور ایک طرح کا سنسنی خیز انتظار چھا گیا تھا، جیسے رات کے یہ کچھ لمحے کسی فیصلہ کن موڑ کی تیاری کر رہے ہوں۔

سکندر نے اس بار کسی دوست سے اس معاملے پر بات نہیں کی تھی اور مومنہ کو بھی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ کسی کو کچھ نہ بتائے۔ یونیورسٹی میں جیسے ہی فری لیکچر ہوا، سکندر فوراً لطیف کے پاس گیا۔ لطیف ایک بینچ پر بیٹھا تھا، کھانے میں مشغول، لیکن اس کے چہرے پر بے تفاوتی صاف نظر آ رہی تھی۔

"السلام علیکم جناب، کیا حال ہے لطیف صاحب؟" سکندر نے پوچھا، آواز میں ہلکی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کے ساتھ۔

لطیف نے اسے ایک نظر بھی نہیں دیکھا، بس خاموشی سے کھانے میں مصروف رہا، جیسے سکندر کی موجودگی سے اسے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ سکندر

کے دل میں ہلکی سی بے چینی پیدا ہوئی، مگر اس نے اپنے اندرونی اضطراب کو چھپاتے ہوئے، آہستہ سے بیٹھ کر سانس لی۔

اس نے موبائل نکالا اور فون اس کے ہاتھ میں ہلکا سا کانپ رہا تھا۔

"03216787194، یہ کس کا نمبر ہے؟" سکندر نے پرسکون آواز میں پوچھا، لیکن اندر سے دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"پتہ نہیں" لطیف نے مختصر جواب دیا اور پھر دوبارہ کھانے میں مصروف ہو گیا، بالکل ویسا ہی جیسے سکندر وہاں موجود ہی نہ ہو۔

سکندر نے ایک لمبی سانس لی، دل میں سوچتے ہوئے کہ یہ معاملہ واقعی سنجیدہ ہے۔ پھر ہمت کر کے وہ نمبر خود ہی ڈائل کر دیا۔ جیسے ہی ڈائل ہوا، لطیف کی بیل بجنے لگی اور سکندر کی آنکھوں میں ایک چھوٹی سی چمک جاگ اُٹھی، دل میں بے چینی اور تھوڑی امید کے ساتھ کہ شاید اب اسے سچ کا پتا لگ جائے۔

لطیف نے اپنا فون نکالا۔ سکندر نے اوپر اپنا نمبر دیکھا۔

"یہ تو میرا نمبر ہے!" سکندر ہنستا ہوا بولا۔

"لطیف صاحب، کیوں لڑکیوں کو تنگ کر رہے ہو؟ گھر میں ماں بہن نہیں ہے کیا؟" سکندر نے تھوڑا ناراض ہو کر کہا۔

"میری مرضی، آپ کو مسئلہ ہے کیا؟ جس کو تنگ کیا، جب اسے تکلیف نہیں تو آپ کو کیوں؟" لطیف نے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔

سکندر نے مومنہ کو قریب بلایا۔ وہ آہستہ آکر کھڑی ہو گئی۔

"سوری بولو انہیں اور بات ختم کرو" سکندر نے زور سے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

لطیف بیٹھا رہا، محتاط اور اکڑ کے ساتھ۔

"ویسے اس نے کیا کہا تھا؟" سکندر نے مومنہ سے پوچھا۔

مومنہ نے اپنا فون سکندر کو تھمایا۔ سکندر نے میسجز پڑھنا شروع کیے اور ہنسنے لگا۔

"ہیلو، سویٹ ہارٹ، یو آر مائی لو، آئی لو یو بیبی... مجھے آپ بہت اچھے لگتی ہو، جب سے آپ کا اسٹوڈنٹ کارڈ مجھے ملا، میں آپ کے پیار میں پاگل ہوں"...

سکندر زور سے ہنسا اور بولا:

"ابے یہ کیا بکچودی کرتے رہتے ہیں، پہلے میسجز میں سب کچھ کلیر"!

پھر سکندر نے فون واپس مومنہ کو تھمایا۔

"یہ لو"

پھر اس نے کہا "لطیف صاحب سوری کر دو، ورنہ انجام برا ہو گا" سکندر نے کہا۔

تبھی لطیف نے سکندر کے سینے پر زور سے ہاتھ مارا اور دھکا دے دیا۔ سکندر پیچھے ہوا اور ہنسنے لگا۔

" ادھر ہم تمیز سکھا رہے ہیں اور آپ قمیض اتارنے والی حرکتیں کر رہے ہیں!" سکندر نے غصے سے کہا۔

" ایک باپ کا ہے تو لڑ!" لطیف نے چلا کر جواب دیا۔

سکندر نے مومنہ کی طرف دیکھا۔ مومنہ کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہ ہچکچاتے ہوئے اسے روکنا چاہ رہی تھی، لیکن لڑائی روکنے کی ہمت نہ کر پائی۔ سکندر نے اس کی بات مانی اور تھوڑا پیچھے ہٹا۔

" تم دونوں کا آپس میں چکر ہے، اسی لیے یہ سالا سکندر لڑنے آیا ہے!" لطیف نے تیز آواز میں کہا۔

سکندر کا غصہ عروج پر تھا۔ اس نے فوراً قدم بڑھایا اور لطیف کے چہرے پر تھپڑ رسید کیا۔ لطیف کے آنکھوں میں غصہ بھڑک اٹھا، اور وہ فوراً لپکا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دھکیلنا اور مارنا شروع کر دیا۔ ہر تھپڑ اور دھکا کے ساتھ سکندر اور لطیف کے چہرے سرخ ہو گئے۔ مومنہ کنارے کھڑی تڑپ رہی تھی، روتی ہوئی اپنی ہمت جمع کرنے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

لطیف نے غصے میں مومنہ کی طرف اشارہ کیا اور برا بھلا کہا، "اوئے تمہاری وجہ سے سب کچھ ہو رہا ہے"!

مومنہ خوفزدہ ہوئی اور دونوں کو روکنے کی کوشش کرنے لگی، لیکن اس کی آواز لڑائی کے شور میں دبا گئی۔ وہ چیخنے لگی، "رکو! رک جاؤ!" لیکن کسی نے اس کی نہیں سنی۔

لڑائی اتنی شدید ہو گئی کہ دونوں تھک گئے، لیکن کوئی واضح فاتح نہ ہوا۔ سکندر اور لطیف ایک دوسرے سے دور کھڑے ہو گئے، سانس پھولے، چہرے سرخ اور غصے سے بھرا ہوا۔

اب باقی طلبہ بھی وہاں جمع ہو گئے، شور اور ہنگامہ دیکھ کر حیران تھے۔ تبھی ایک استاد دور سے آتا نظر آیا۔ سکندر نے استاد کو دیکھتے ہی فوراً پیچھے ہٹ کر موقع کا فائدہ اٹھایا۔ وہ وہاں سے بھاگ نکلا، مومنہ کی طرف جھک کر کہا، "تم ٹھیک ہو؟" لیکن وہ بھی خوفزدہ اور رنجیدہ تھی۔

لطیف نے غصے میں کچھ بدتمیزی مومنہ کے لیے بھی کہی، لیکن سکندر کی موجودگی ختم ہونے پر وہ خاموش ہو گیا۔ لڑائی بے نتیجہ رہ گئی، دونوں لڑکے تھکے ہارے اور ناراض رہ گئے۔

وقت کے ساتھ ساتھ یہ بات یونیورسٹی میں آہستہ آہستہ پھیلنے لگی کہ سکندر نے کسی لڑکی کے پیچھے اپنے کلاس فیلو لطیف سے لڑائی کی تھی۔ دانیال، ارمان اور شاہویر کو اس معاملے کی کوئی خبر نہیں تھی، اور سکندر بھی کبھی کسی کو پوری بات نہیں بتاتا تھا۔

اب کلاس میں سکندر خاموش رہنے لگا تھا۔ اس کا رویہ سب کے لیے عجیب محسوس ہونے لگا۔ لوگ حیران تھے کہ آخر ایسا کیا ہوا ہے کہ سکندر اتنا

مختلف لگ رہا ہے۔ وہ عام باتوں میں کم بات کرتا، اکثر سوچ میں ڈوبا رہتا، اور کبھی کبھار مسکراتے ہوئے بھی کسی سے بات کرنے سے گریز کرتا۔

دوسری طرف، لطیف اب کلاس میں زیادہ فعال ہو گیا تھا۔ وہ سامنے آ کر حصہ لیتا، ہنس مکھ رہتا، اور کبھی کبھار سکندر کی طرف نظریں ڈال کر خاموشی سے چیلنج بھری نگاہیں بھیجتا۔ اس کا یہ رویہ مومنہ کے لیے مزید پریشانی کا باعث بن گیا۔ وہ ہر وقت بے چینی میں تھی، دل کی دھڑکن تیز تھی، اور کلاس کے دوران بھی وہ سکندر اور لطیف کی حرکتوں پر بار بار نظر رکھتی۔

سکندر اور لطیف ایک دوسرے کو روز دور سے دیکھتے، نظریں ملتی، لیکن کوئی قدم آگے بڑھانے کی ہمت نہ کر پاتے۔ یہ خاموش جنگ کلاس کے ماحول میں ایک دباؤ پیدا کر رہی تھی، اور ہر کوئی تھوڑا سا اس صورتحال سے پریشان تھا۔

مومنہ کے لیے یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت لگ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ سب ختم ہو جائے، لیکن وہ بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی نظریں بار بار سکندر پر جا کر ٹھہرتیں، اور دل میں اضطراب اور خوف بڑھتا جا رہا تھا۔

کلاس کے باقی طلبہ بھی اس خاموش کشمکش کو دیکھ رہے تھے، لیکن سب کے لیے یہ ایک راز ہی تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ ہر کوئی بس اندازہ لگا رہا تھا، اور ماحول میں ایک سنسنی پھیل گئی تھی۔

پھر ایک دن کلاس کے اندر سکندر بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ سر عادل کے لیے بھی یہ سب نیا تھا۔ سکندر وہی لڑکا تھا جو سوال اس انداز سے کرتا کہ پوری کلاس زندہ ہو جاتی، لیکچر میں جان آ جاتی۔ مگر آج نہ کوئی شرارت تھی، نہ کوئی سوال، نہ کوئی مسکراہٹ۔

سر عادل کی نظر کئی بار سکندر پر جا کر ٹھہری، مگر وہ نظریں جھکا کر اپنی کاپی دیکھتا رہا۔

"یہ سکندر کو ہوا کیا ہے؟" رمشا نے مومنہ کے کان کے قریب جھک کر کہا۔

مومنہ چونک گئی۔ "پتہ نہیں... میں نے غور نہیں کیا،" اس نے گھبرا کر جواب دیا۔

"مجھے اچھا نہیں لگ رہا، یہ خاموشی میں۔" رمشا نے تشویش سے کہا۔

اسی لمحے پیچھے سے زینب گل کی آواز آئی، "سنا ہے اس نے کسی لڑکی کے پیچھے لڑائی کی ہے... اب پتہ نہیں وہ لڑکی کون ہے۔"

مومنہ کی سانس تیز ہو گئی، دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے بے اختیار اپنی انگلیاں مٹھی میں بند کر لیں۔

"کُتّی لڑکی... میرے سکندر کو اس نے لڑوا دیا، پتہ تو چلے ہے کون وہ!" رمشا نے غصے سے کہا۔

مومنہ نے سر جھکا لیا۔ وہ کچھ کہہ نہیں سکی۔

دوسری طرف سکندر اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھا تھا، مگر جیسے ان سب سے کٹا ہوا ہو۔ ارمان نے اسے غور سے دیکھا۔

"بھائی تجھے ہوا کیا ہے؟" ارمان نے پوچھا۔

"کچھ نہیں... کیا ہونا ہے،" سکندر نے بے دلی سے جواب دیا۔

"نہیں یار، تو کبھی سکون سے بیٹھ ہی نہیں سکتا،" شاہویر نے حیرت سے کہا۔

"یار میں ڈیپریشن میں ہوں،" سکندر نے آہستہ سے کہا۔

دانیال ہنس پڑا، "جھوٹ نہ بول، یہ کبھی ڈیپریشن میں جا ہی نہیں سکتا۔"

سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"بھائی تجھے آج میں نے کچھ کہا بھی نہیں، پھر بھی سکون نہیں؟" سکندر نے بات بڑھائی۔

پھر دانیال نے جان بوجھ کر چھیڑتے ہوئے کہا، "لگتا ہے تُو کھسروں والی حرکتیں کرنے لگا ہے۔"

سکندر نے سر مزید جھکا لیا۔ اس کی نظریں فرش پر جم گئیں۔ اس بار بھی کوئی جواب نہیں آیا۔

ارمان، شاہویر اور دانیال ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ یہ خاموشی انہیں پریشان کر رہی تھی۔ سکندر کا یوں چپ ہو جانا، سب کے لیے اجنبی تھا۔

کلاس میں لیکچر جاری تھا، مگر کئی دلوں میں ایک انجانی بے چینی پل رہی تھی۔

سر عادل نے اچانک بورڈ کی طرف رخ کیا اور لیکچر شروع کر دیا۔

"آج ہم ممالیہ جانوروں کے بارے میں بات کریں گے،" ان کی آواز پورے کلاس روم میں گونجی۔

"ممالیہ وہ جانور ہوتے ہیں جو اپنے بچوں کو دودھ پلاتے ہیں، مگر ان کی فطرت ایک جیسی نہیں ہوتی۔"

سکندر اب بھی خاموش تھا، مگر اس کے کان پوری طرح کھلے ہوئے تھے۔

سر عادل بولتے گئے،

"کچھ جانور ایسے ہوتے ہیں جیسے شیر یا چیتا۔ انہیں ہر وقت شکار کی فکر نہیں ہوتی، وہ خاموشی سے بیٹھے رہتے ہیں، طاقت جمع کرتے ہیں، اور جب وقت آتا ہے تو ایک ہی وار میں شکار کر لیتے ہیں۔"

سکندر کی نظریں بے اختیار اٹھیں، جیسے وہ بات کو خود پر لے رہا ہو۔

"اور کچھ جانور ایسے ہوتے ہیں،" سر عادل نے لہجہ بدلا،

"جیسے لکڑبگھا یا گیدڑ۔ یہ خود شکار نہیں کرتے، بلکہ طاقتور جانوروں پر نظر رکھتے ہیں۔ جہاں موقع ملے، وہیں فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔"

کلاس میں ہلکی سی سرگوشیاں ہونے لگیں۔

اسی وقت لطیف نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔

سر عادل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، کیونکہ یہ کام پہلے عموماً سکندر کیا کرتا تھا۔

"یس، لطیف؟" سر عادل نے کہا۔

لیٹف ذرا اکڑ کر بولا،

"سر، ایک سوال ہے... کیا ہم سب ممالیہ جانوروں کا دودھ پی سکتے ہیں؟"

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی، پھر پوری کلاس ہنس پڑی۔

کوئی میز پر ہاتھ مار کر ہنسا، کوئی دوست کے کان میں کچھ کہہ کر۔

سکندر کے کانوں میں وہ ہنسی چبھنے لگی۔

اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اس کی جگہ لے رہا ہو... وہ جگہ جہاں سوال کر کے کلاس کو زندہ کرنا اس کی پہچان تھی۔

سر عادل نے مسکراتے ہوئے کہا،

"نہیں لطیف، ہر ممالیہ کا دودھ انسان کے لیے نہیں ہوتا۔ جیسے ہر جانور کی فطرت الگ ہوتی ہے، ویسے ہی اس کی حدود بھی ہوتی ہیں۔"

لطیف نے گردن ہلا دی، جیسے اس نے بہت بڑی بات پوچھ لی ہو۔

سر عادل نے دوبارہ لیکچر جوڑا،

"بس یہی فرق ہے۔ کچھ جانور خاموش رہ کر طاقت بناتے ہیں، اور کچھ شور مچا کر موقع ڈھونڈتے ہیں۔ فطرت خود فیصلہ کر لیتی ہے کہ کون کب آگے آئے گا کبھی کبھار شیر بھی گروپ کے اندر شکار کرتے ہیں اس لیے نہیں کہ وہ کمزور ہیں بلکہ اسی لیے کہ ان کو اپنی طاقت کو اچھے سے استعمال کرنا ہے۔"

سکندر نے اپنی مٹھی آہستہ سے بند کر لی۔

اسے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ لطیف صرف سوال نہیں کر رہا تھا...

وہ آہستہ آہستہ وہ جگہ گھیر رہا تھا جو کبھی سکندر کی تھی۔

اور یہ احساس، خاموشی سے، اس کے اندر کہیں گہرا اتر گیا۔

لطیف نے اچانک گردن موڑ کر سکندر کی طرف دیکھا،

آنکھوں میں وہی مانوس سی چمک تھی، جیسے جان بوجھ کر چھیڑ رہا ہو۔

اس نے ہونٹوں کے کونے کو ذرا سا اوپر اٹھایا، ایک ہلکی سی چڑانے والی مسکراہٹ دی

نہ مکمل ہنسی، نہ صاف دشمنی، بس اتنا کہ سامنے والا سمجھ جائے۔

سکندر نے وہ مسکراہٹ دیکھ لی۔

اس کے چہرے پر کوئی ردِ عمل نہ آیا، مگر اندر کہیں کچھ ٹوٹ سا گیا۔

اسے لگا جیسے لطیف صرف دیکھ نہیں رہا تھا،

بلکہ یہ کہہ رہا ہو:

"یہ جگہ اب میری ہے۔"

کلاس کی ہنسی ختم ہو چکی تھی، لیکچر آگے بڑھ گیا تھا،

مگر سکندر کے لیے وہ لمحہ وہیں رک گیا۔

سکندر نے آہستہ سے سر گھما کر ارمان کی طرف دیکھا اور بہت دھیمی مگر معنی خیز آواز میں کہا،

"تیرے لیے ایک ساتھ سب جانوروں کا شکار ہو گا"...

ارمان چونک گیا۔

شاہویر اور دانیال نے بھی ایک دوسرے کی طرف دیکھا، مگر کسی کو سمجھ نہ آئی کہ سکندر کیا کہنا چاہ رہا ہے، نہ یہ کہ اس کی آواز میں اچانک یہ سنجیدگی کہاں سے آ گئی تھی۔ یہ وہ سکندر نہیں تھا جو ہنسی مذاق میں بات گھما دیتا تھا۔

سکندر نے اس کے بعد دوبارہ نظریں اٹھائیں۔

ایک نظر لطیف پر ڈالی جو اب بھی کرسی پر ٹیک لگائے، خود کو فاتح سمجھنے کی ادا میں بیٹھا تھا

اور پھر ایک لمحے کو مومنہ پر۔

وہ نظر مختصر تھی، مگر بھاری۔

جیسے بہت کچھ کہہ گئی ہو، بغیر کچھ کہے۔

" اب میں انتظار کروں گا اور موقع کی تلاش میں رہوں گا اور موقع ہی ایسا حملہ کروں گا جس کی گونج بہت دور تک جائے گی"

شام ڈھلنے لگی تھی۔ یونین کلب میں ہلکی سی بھیڑ تھی، میزوں پر چائے کے کپ رکھے تھے اور سگریٹ کے دھوئیں میں گفتگو گھلی ہوئی تھی۔

ثاقب کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا، نظریں سامنے جمائے ہوئے۔ اس نے آہستہ مگر معنی خیز انداز میں کہا،

"ویسے وہ لڑکی باقی سب سے بہت مختلف ہے"...

زیشان نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

"بالکل ایسا ہی ہے... اور اچھی بھی بہت ہے۔"

دونوں کی نظریں سامنے کی طرف تھیں، جیسے کسی ایک ہی چہرے پر ٹھہری ہوں۔

ثاقب نے کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا،

"گر کوئی بھی لڑکا اس کے قریب آئے تو مجھے بتانا۔"

سامنے بیٹھے شخص نے فوراً کہا،

"ٹھیک ہے بھائی، آپ کو بتا دوں گا... کوئی بھی لڑکا مومنہ کے قریب نہیں آئے گا۔"

زیشان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ، مگر آنکھوں میں ضد لیے کہا،

"مجھے بہت پسند ہے وہ۔"

وہ شخص اٹھنے لگا تو کرسی پیچھے سرکنے کی آواز آئی۔

اسی لمحے ساقب کی نظر اس کی طرف گئی۔

ساقب نے آواز دی،

"سکندر... ذرا دھیان سے، دشمن ہو تم ہمارے کوئی ہوشیاری نہیں کرنا۔"

سکندر نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک لمحے کو نظریں ملیں، پھر اس نے کوئی تاثر دیے بغیر سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔

اس ایک لمحے میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔

ان دیکھے سمجھوتے ہو چکے تھے، خاموش محاذ بن چکے تھے۔

سکندر نے اپنے دشمنوں سے ہاتھ ملا لیا تھا

اور یہ ہاتھ ملانا، آنے والے طوفان کی پہلی علامت تھا۔

قسط نمبر 8

آج سکندر یونیورسٹی کے لیے خاصا دیر کر چکا تھا۔

گھڑی پر نظر پڑی تو اس نے بے اختیار رفتار تیز کر دی۔ کندھے پر لٹکا بیگ، پیشانی پر پسینہ اور دماغ میں مسلسل شور۔ وہ پچھلے کچھ عرصے سے مذہب، لوگوں اور دعوؤں سب سے الجھا ہوا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ ہر کوئی دوسروں کو نصیحتیں دینے میں ماہر ہے، مگر کسی کو یہ نہیں پتا کہ سامنے والا کس جنگ سے گزر رہا ہے۔

فٹافٹ سے بائک نکالی اور بہت تیز روانہ ہوا پل کے قریب پہنچ کر وہ اچانک رک گیا۔

ریلنگ کے پاس ایک لڑکی کھڑی تھی۔

خاموش، ساکت، نظریں نیچے بہتے دریا میں جمی ہوئی تھیں، جیسے ارد گرد کی دنیا اس کے لیے وجود ہی نہ رکھتی ہو۔

سکندر نے ایک لمحہ اسے دیکھا، پھر آہستہ آواز میں بولا،

"کیا آپ یہاں سے چھلانگ لگانے کی کوشش کر رہی ہیں؟"

لڑکی نے چونک کر سر اٹھایا۔

آنکھوں میں حیرت، تھکن اور ایک گہرا اندھیرا تھا۔

"تمھیں کچھ نظر نہیں آتا؟" وہ بولی،

"میں اندھے میں مر رہی ہوں۔"

سکندر کے ہونٹوں پر ہلکی سی، عجیب سی مسکراہٹ آگئی۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

وہ جیسے ٹھٹک گئی۔

"اچھی بات؟خودکشی تو حرام ہے"!

سکندر نے اسے غور سے دیکھا۔

"یہ آپ کہہ رہی ہیں؟"

وہ تلخی سے ہنسا۔

"آپ کو نہیں پتا میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔"

سکندر نے بغیر کچھ کہے جیب سے سگریٹ نکالا، لائٹر جلایا اور ایک کش لیا۔

"اوہ... تو پھر کر لو خودکشی۔"

وہ چونک کر بولی،

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" وہ اس کو سگریٹ پیتا ہوا دیکھ کر بولی۔

"جب مجھے ٹینشن ہوتی ہے تو میں یہ پی لیتا ہوں،" سکندر نے دھواں باہر نکالتے ہوئے کہا۔

"تو کیا آپ کو مجھے دیکھ کر ٹینشن ہو رہی ہے؟"

"نہیں،" وہ بولا،

"آپ کو دیکھ کر تو سکون مل رہا ہے۔"

وہ الجھ گئی۔

"خود تو کہا ٹینشن میں پیتے ہو"!

"خوشی میں بھی پیتا ہوں،" سکندر نے کندھے اچکائے۔

ہوا تیز ہو گئی۔

"میرے مرنے پر آپ کو خوشی ہو رہی ہے؟" اس نے غصے سے کہا۔

"ہاں،" سکندر نے بے حسی سے دھواں خارج کیا۔

"آپ بہت عجیب آدمی ہیں!" اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اتنے دنوں بعد کوئی حادثہ لائیو دیکھوں گا، سب دوستوں کو بتاؤں گا، مزہ آ جائے گا،" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ غصے میں کانپنے لگی۔

"آپ کے لیے میں بس ایک حادثہ ہوں؟"

"ایک پاگل لڑکی بہکی بہکی باتیں کر کے مر گئی، افسوس!" وہ بولا۔

"آپ بے غیرت انسان ہیں!"

"ظاہر ہے،" سکندر نے فوراً جواب دیا۔

اچانک وہ آگے بڑھی۔

"یہ سگریٹ مجھے دو!"

اس نے سگریٹ اس کے ہاتھ سے چھین لیا، ہونٹوں کے قریب لے جا کر رک گئی۔

آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"مرنے سے پہلے یہ کرلیا تو کیا ہو گیا"...

سکندر گھبرا گیا۔

"آپ کیا کر رہی ہیں؟"

"اوہ، مت روئیں، مرد روتے نہیں ہیں،" وہ بے ساختہ بول پڑا۔

وہ تلخی سے مسکرائی۔

"میں عورت ہوں، مجھے رونے کا حق ہے۔ اور آپ مجھے کیسے چپ کروا رہے ہیں؟"

سکندر اچانک خاموش ہو گیا۔

"ہم مردوں کو تو ایسے ہی چپ کروایا جاتا ہے۔"

یہ سن کر وہ اور زیادہ رونے لگی۔

"اوہ... انسان بھی نہیں روتے،" سکندر نے آہستہ کہا، جیسے خود کو سمجھا رہا ہو۔

اچانک اس نے سگریٹ نیچے پھینک دیا۔

سلگتا ہوا سگریٹ گھومتا ہوا دریا میں جا گرا۔

سکندر نے مایوسی سے کہا،

"میری سگریٹ ضائع کر دی... اگر پینی نہیں تھی تو واپس دے دیتیں۔"

وہ نیچے دیکھ کر چونک گئی، جیسے اچانک حقیقت نے اسے چھو لیا ہو۔

"اب کیا ہوا؟" سکندر نے پوچھا۔

وہ گہری سانس لے کر بولی،

"میں خودکشی نہیں کر رہی۔"

"کیوں؟" وہ حیران ہوا۔

"بس... میری مرضی"!

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"ابھی نہیں کر رہی، بعد میں کروں گی،" وہ بولی۔

سکندر نے طنزیہ انداز میں کہا،

"پکا وعدہ کریں۔"

"جی، پکا وعدہ،" وہ بولی۔

"جب کرنا ہو مجھے بلا لینا، لائیو دیکھوں گا،" اس نے کہا۔

وہ ہلکی آواز میں بولی،

"جی، ٹھیک ہے۔"

سکندر نے پل سے نیچے اترتے ہوئے کہا،

"مرنے سے پہلے میری ایک خواہش پوری کر سکتی ہو؟"

"وہ کیا؟"

"فی الحال میرا نمبر لکھ لو، خواہش بعد میں بتاؤں گا۔"

وہ ہچکچائی۔

"میں کبھی کال نہیں کروں گی۔"

"بس مرنے سے پہلے کر دینا،" وہ مسکرایا۔

خواہش کیا ہے؟" وہ پوچھتی ہے۔

"تو آپ کی عمر کیا ہے؟" وہ سوال کرتا ہے۔

"25 سال، کیوں؟" وہ جواب دیتی ہے۔

"پہلی بار کسی عورت نے سچ بولا،" وہ کہتا ہے۔

"تمہاری عمر کیا ہے، یہ بھی بتاؤ،" وہ غصے سے پوچھتی ہے۔

"پیار سے پوچھے گی تو بتاؤں گا، ویسے میں 18 سال کا ہوں،" وہ جواب دیتا ہے۔

"تم تو بالکل بچے ہو،" وہ کہتی ہے۔

"میرا آئی ڈی بن گیا ہے، محترمہ، میں پورا مرد ہوں،" وہ کہتا ہے۔

"ابھی سے ان کاموں میں پار گئے ہو؟ سگریٹ وغیرہ! تمہیں کس چیز کا غم ہے؟" وہ سوال کرتی ہے۔

"میں غم میں نہیں پیتا،" وہ کہتا ہے۔

"مہربانی سے دوبارہ سے شروع نہ ہو جانا،" وہ کہتی ہے۔

"اگر آپ مرنے والی ہیں تو مجھ سے نکاح کر لیں!" وہ خاموشی سے کہتا ہے۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" وہ حیران ہوتی ہے۔

"نکاح، شادی،" وہ کہتا ہے۔

"چپ کرو، اتنا ڈائریکٹ کون پوچھتا ہے؟،" وہ حیران ہوتی ہے۔

"تھوڑی سی کر لینا،" وہ کہتا ہے۔

"بھلا تھوڑی سی شادی کون کرتا ہے؟" وہ سوال کرتی ہے۔

"ہم کر لیں گے،" وہ جواب دیتا ہے۔

"اب میں کیا کہوں؟" وہ پوچھتی ہے۔

"بارات کے اگلے دن، ہی آپ چاہو تو خودکشی کر لینا، مجھے کوئی پرواہ نہیں،" وہ کہتا ہے۔

"میری پرواہ کیوں نہیں! تمہاری بیوی بنوں گی پرواہ تو تمھیں کرنی پڑے گی." وہ کافی غصے میں کہتی ہے .

وہ گھبرا کر پیچھے ہو جاتا ہے. اور مایوس ہو کر خاموش ہو جاتا ہے .

"ویسے بھی، میں مر ہی جاؤں گی،" وہ کافی دھیمی آواز میں کہتی ہے۔

"ہاں، یہی وجہ ہے کہ میں کہہ رہا ہوں۔ تم بھی خوش، میں بھی خوش،" وہ کہتا ہے۔

اس کے بعد، دونوں اس کی بائیک کے پاس چلتے ہیں۔

"ویسے آپ کرتی کیا ہیں؟" سکندر نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"میں۔۔۔" وہ بولتے بولتے رکی۔

پھر سکندر نے اس کو غور سے دیکھا۔

"خودکشی کے علاوہ کچھ تو کرتی ہوں گی" وہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا۔

"میں یونیورسٹی میں ایک سٹوڈنٹ ہوں اور ساتھ ساتھ ایک ٹیچر بھی ہوں!" اس بار اس کی آواز میں فخر تھا۔

سکندر زور سے ہنس پڑا۔

"ٹیچر ہو کر خودکشی کر رہی تھیں!" وہ زور سے ہنسنے لگا۔

اس لڑکی نے ہلکا سا تھپڑ اس کے سر پر مارا۔ اور اب وہ بھی مسکرا رہی تھی۔

جیسے ہی سکندر موٹر سائیکل کے قریب پہنچا، اس کے ذہن میں اچانک بابا یعقوب جٹ کی آواز گونج اٹھی

"کسی کو بھی لفٹ نہیں دینی... نہ انکل، نہ آنٹی، نہ کوئی اور۔"

اس نے لمحہ بھر کے لیے ہینڈل پر ہاتھ روکے رکھا۔

پھر ہلکی سی بے زاری سے دل ہی دل میں بولا،

"ایسی کی تیسی... جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

وہ لڑکی آہستہ سے بولی،

"مجھے اورنج لائن ٹرین کے سبزہ زار والے اسٹیشن پر اتار دیں۔"

سکندر نے بغیر کوئی سوال کیے سر ہلا دیا۔

موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوئی، سڑک پیچھے رہنے لگی، اور ہوا میں ایک عجیب سی خاموشی پھیل گئی۔

اسٹیشن کے قریب پہنچ کر لڑکی اتری، ایک مختصر سا شکریہ کہا، اور بھیڑ میں گم ہو گئی۔

سکندر نے ایک لمحہ پیچھے مڑ کر دیکھا

پھر نظریں سیدھی کیں، رفتار بڑھائی، اور اپنی یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گیا...

جیسے یہ سب کچھ بس ایک معمولی سا واقعہ ہو۔

سکندر کسی بھی لڑکی کے ساتھ اس طرح فری نہیں ہوتا تھا، کیونکہ اس دن اس کا مقصد صرف اس لڑکی کو بچانا تھا، کچھ اور نہیں۔

اس نے اس سے بات چیت ضرور کی تھی، اسے اُس لمحے سے نکال لیا تھا، مگر نہ اس کا نمبر لیا، نہ کوئی اور رابطہ رکھا۔

جب وہ لڑکی اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی تو اسے پہلی بار احساس ہوا کہ یہ شہر کتنا بڑا ہے۔

اتنا بڑا کہ ایک انسان کو ڈھونڈنا، جس کا نہ نام معلوم ہو، نہ کوئی نشان ناممکن سا لگنے لگا۔

وہ موٹرسائیکل چلاتے ہوئے سوچتا رہا کہ

شاید دوبارہ کبھی ملاقات ہو،

اور شاید کبھی نہ ہو۔

سکندر نے خود کو سمجھایا کہ اس نے جو کرنا تھا، کر دیا۔

مگر دل کے کسی کونے میں ایک سوال رہ گیا تھا

اگر وہ پھر کبھی اُس پل پر آئی تو؟

سکندر سوچنے لگا

اس نے واقعی خودکشی کیوں سوچ لی تھی؟

کوئی انسان یوں ہی تو ہار نہیں مان لیتا۔ ضرور کوئی ایسی تکلیف ہوگی جو لفظوں میں نہیں سماتی۔ شاید وہ بھیڑ میں اکیلی تھی، یا ہر ایک کے سامنے مضبوط بننے کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے ٹوٹ گئی تھی۔

سکندر کو خیال آیا کہ بعض لوگ ہنستے ہوئے بھی اندر سے مر رہے ہوتے ہیں۔

شاید اس لڑکی نے بھی بہت کچھ سہا ہوگا، اور جب کوئی سننے والا نہ ملا تو خاموشی نے اسے پل تک پہنچا دیا۔

اسے یہ بات چبھنے لگی کہ

مسئلہ مرنے کا نہیں ہوتا، مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ جینے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

سکندر میم ساجدہ کی انگلش کلاس میں پچھلی قطار میں بیٹھا تھا۔ کاپی کھلی تھی، قلم انگلیوں کے بیچ دبا ہوا، مگر اس کا ذہن لفظوں میں نہیں، خیالوں میں اٹکا ہوا تھا۔ میم کی آواز کانوں سے ٹکرا کر واپس لوٹ جاتی، سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کبھی اس کی نظر کھڑکی سے باہر چلی جاتی، کبھی سامنے بورڈ پر، اور کبھی انجانے میں مومنہ کی طرف۔

اسی دوران لطیف نے ہاتھ کھڑا کیا۔

"یس لطیف؟" میم ساجدہ نے اجازت دی۔

"میم، یہ جو آپ نے سنٹینس اسٹرکچر بتایا ہے، یہ ہر جگہ ایسے ہی یوز ہوتا ہے؟" لطیف نے سوال کم اور انداز زیادہ نمایاں رکھا۔

میم نے تحمل سے جواب دیا، "جی ہاں لطیف، زیادہ تر کیسز میں یہی رول فالو ہوتا ہے، لیکن کانٹیکسٹ بھی دیکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں پر کہا گیا ہے کہ "وہ بہت اکڑ والا تھا" تو اس کو انگلش میں ہم بہت سے طریقے سے کہہ سکتے ہیں جیسے،

He was extremely arrogant."

لطیف مسکرایا، جیسے یہی جواب سننا چاہتا ہو۔ مومنہ نے اس کی طرف دیکھا، پھر فوراً نظریں جھکا لیں۔ اسے وہ مسکراہٹ اچھی نہیں لگی۔ لطیف کی نظر پھر بھی اس تک پہنچی، اور وہ جان بوجھ کر کرسی پر ذرا آگے جھک گیا۔

دانیال نے سکندر کی طرف جھک کر سرگوشی کی،

"یار، یہ لطیف کچھ زیادہ ہی اوور نہیں ہو گیا آج کل؟"

سکندر نے ہلکی سی گردن ہلائی، مگر کچھ بولا نہیں۔

شاہویر نے بھی بات میں حصہ لیا،

"سچ میں یہ بھڑوا پہلے تو اتنا بولتا بھی نہیں تھا، اب تو ہر کلاس میں شو خا ہوتا ہے۔"

ارمان نے سکندر کی طرف غور سے دیکھا۔

"اوئے، تو خاموش کیوں ہے؟ تجھے کیا ہوا ہے؟"

سکندر نے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا،

"کچھ نہیں یار، بس نیند پوری نہیں ہوئی۔"

"نیند؟" دانیال نے ہنستے ہوئے کہا،

"تو اور نیند؟ تو جتنا سوتا ہے نا یہ بات ہضم نہیں ہو رہی۔"

سکندر نے جواب نہیں دیا، بس نظر دوبارہ اپنی کاپی پر جما لی۔

اسی لمحے لطیف نے پھر آواز لگائی،

"میم، سچ بتاؤں، آپ بہت اچھے طریقے سے سمجھاتی ہیں۔ کچھ لوگ تو بس رعب ڈالنا جانتے ہیں، سمجھانا نہیں۔"

کلاس میں ہلکی ہنسی پھیل گئی۔ میم ساجدہ نے ایک نظر لطیف پر ڈالی،

"لطیف، بات کو موضوع تک رکھو، پلیز۔"

مومنہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کی انگلیاں اب کتاب کے صفحے مروڑ رہی تھیں۔ سکندر نے یہ منظر دیکھا تو اس کا دل اندر سے کڑھ سا گیا۔

ارمان نے آہستہ سے سکندر سے کہا،

"یار، ویسے مجھے تجھ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔"

"کیا؟" سکندر نے نظریں اٹھائے بغیر پوچھا۔

"وہ مومنہ کے بارے میں۔۔۔۔" ارمان بولتے بولتے رک گیا، جیسے الفاظ سوچ رہا ہو۔

اسی وقت لطیف کی آواز پھر گونجی، اس بار پہلے سے زیادہ اونچی،

"میم، آپ واقعی سمجھدار ہیں، اسی لیے آپ سے بات کرنے میں مزہ آتا ہے… ورنہ کچھ لڑکیوں میں تو اتنا اٹیٹیوڈ ہوتا ہے کہ بندہ بات ہی نہ کرے"!

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ چند لڑکوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، کوئی مسکرایا، کوئی نظریں چرا گیا۔ مومنہ کا چہرہ سرخ ہو گیا، اس نے سر جھکا لیا۔ سکندر کی گرفت قلم پر سخت ہو گئی۔

وہ دل ہی دل میں بولا،

یہ حد سے آگے جا رہا ہے…

جیسے ہی لیکچر ختم ہوا، سب طلبہ لان کی طرف نکل گئے۔ دھوپ ہلکی ہلکی تھی اور ہوا میں خوشگوار ٹھنڈک تھی۔ سکندر، ارمان، دانیال اور شاہویر ساتھ چل رہے تھے، لیکن سکندر کا مزاج کچھ عجیب سا تھا۔ وہ سب کے

ساتھ بات چیت بھی نہیں کر رہا تھا، بس آگے آگے چل رہا تھا، جیسے کسی چیز میں کھویا ہوا ہو۔

رِمشا اس کے قریب آئی، اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا، "سکندر، تم ٹھیک ہو؟ آج تم کچھ الگ لگ رہے ہو۔"

سکندر نے اسے دیکھا، لیکن صرف ایک خالی نظر سے، اور پھر کہا، "مجھے ابھی اکیلے رہنے دو۔"

رِمشا کے چہرے پر مایوسی کے اثرات آ گئے۔ وہ خاموشی سے پیچھے ہٹی اور آہستہ آہستہ لان کی طرف چل دی۔

ارمان نے سکندر کے کندھے کو ہلایا اور پوچھا، "یار، واقعی کیا بات ہے؟ آج کل تو بالکل الگ لگ رہا ہے۔ کچھ ہوا ہے کیا؟"

سکندر نے اس کی طرف دیکھا، ایک لمحے کے لیے خاموش رہا، پھر سر ہلا کر جواب دیا، "کچھ نہیں... بس، میں کچھ سوچ رہا ہوں۔"

تبھی سکندر کی نظر ایک لڑکی پر پڑی جو لان کے کنارے سے گزرتی ہوئی جا رہی تھی۔ وہ لڑکی بالکل صبح والی لڑکی جیسی تھی، جسے وہ پل پر ملا تھا۔ دل میں عجیب سی دھڑکن ہوئی اور سکندر کے قدم خود بخود اس طرف بڑھ گئے۔

ارمان نے اسے دیکھا اور کہا، "اوئے! کہاں جا رہا ہے؟"

سکندر نے بغیر جواب دیے ارمان کو پیچھے دھکیل دیا اور لڑکی کے پیچھے دوڑنے لگا، لیکن جیسے ہی وہاں پہنچا، لڑکی کہیں نظر نہیں آئی۔

سکندر رک کر کھڑا ہوا، دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے، اور دل میں سوچنے لگا، "آخر وہ صبح والی لڑکی مجھے یہاں کیسے نظر آئی؟ اور اب یہ کہاں گئی؟ کیا یہ واقعی اتفاق تھا یا کچھ اور؟ کہیں میں پاگل تو نہیں ہو گیا؟"

اس کی آنکھوں میں تجسس اور پریشانی کا امتزاج تھا۔ وہ آگے بڑھا اور لان کے مختلف کناروں پر نظر دوڑانے لگا، ہر طرف دیکھتے ہوئے لیکن لڑکی کا پتہ نہ چلا۔

دانیال اور شاہویر بھی پیچھے آ گئے۔ دانیال نے پوچھا، "یار، تمہیں کچھ دکھائی دے رہا ہے کیا؟ یہ سکندر آج زیادہ عجیب برتاؤ کر رہا ہے؟"

ارمان نے پھر پوچھا کہ "سکندر کیا تو ٹھیک تو ہے؟"

سکندر نے خاموشی سے سر ہلایا اور کچھ نہیں کہا۔ اس کے دل میں ایک عجیب سا احساس تھا، جیسے کہ کسی نے اس کی زندگی میں اچانک ایک سوال پھینک دیا ہو جس کا جواب وہ نہیں جانتا تھا۔

شاہویر نے ہنستے ہوئے کہا، "یار، کچھ تو بات ہے، بتاؤ۔ یہ کیسی ڈرامہ بازی ہے؟"

لیکن سکندر نے صرف سر ہلایا اور آگے کی طرف چل دیا، دل میں ایک ہی سوچ گھوم رہی تھی وہ لڑکی، جو خودکشی کرنے والی تھی، اس کے سامنے دوبارہ کیوں نظر آئی؟ کیا وہ محفوظ ہے؟ اور اگر وہ دوبارہ خطرے میں ہوئی تو اس کی ذمہ داری کس کی ہوگی؟

یہ سوچتے سوچتے سکندر نے اپنی رفتار بڑھا دی، لیکن دل میں ایک عجیب سا خوف اور فکری پن بھی تھا۔ جیسے ہی وہ لان کے آخر تک پہنچا، وہ لڑکی کہیں نہیں تھی، لیکن اس کی موجودگی کا احساس ابھی بھی اس کے دل میں برقرار تھا۔

وہ کھڑا ہوا، ہوا میں گہرائی سے سانس لی، اور خود سے کہا، "وہ لڑکی تھی کون اور کیوں مرنا چاہتی تھی؟"

یہ لمحہ سکندر کے لیے ایک نئے مرحلے کا آغاز تھا ایک ایسا مرحلہ جہاں اس کا معمولی سا دن اچانک ایک غیر متوقع مقصد میں بدل گیا تھا۔

وہ دونوں ارمان اور سکندر ساتھ میں کینٹین میں آئے اور ایک میز پر بیٹھ گئے۔ سکندر نے آہستہ آہستہ چائے کا کپ اٹھایا اور چمچ سے ہلانے لگا۔ کینٹین میں ہلکی ہلکی ہلچل تھی، طلبہ ہنس رہے تھے، ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے، لیکن سکندر بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

خان، جو کینٹین کے ایک کونے میں بیٹھا تھا، اس کی ہر حرکت دیکھ رہا تھا۔ آج سکندر کا یہ سکون اور خاموشی اسے حیران کر رہی تھی۔ وہ آہستہ سے ارمان کے قریب گیا اور پوچھا، "یار، آج سکندر کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ بالکل خاموش ہے، کوئی شور نہیں، کوئی ڈرامہ نہیں۔"

ارمان نے بھی سکندر کی طرف دیکھا، پھر کندھے اچکائے اور کہا، "پتا نہیں بھائی... آج کچھ الگ لگ رہا ہے۔ میں بھی سمجھ نہیں پایا کہ یہ سب کیوں ہے۔"

خان کی نظریں سکندر پر جمی رہیں، سکندر کے ہلکے ہلکے چائے پینے کے انداز پر بھی توجہ دے رہا تھا۔ سکندر نے کبھی کسی سے بات نہیں کی، نہ ہنسا، نہ کوئی چھیڑ چھاڑ کی۔ یہ سکون اور خاموشی اتنی غیر معمولی تھی کہ خان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہی سکندر ہے جسے وہ روز دیکھتے تھے۔

ارمان نے آہستہ سے کہا، "لالا جی، شاید وہ کچھ سوچ رہا ہے... کچھ ذاتی معاملہ ہو گا۔"

خان نے سر ہلا کر کہا، "ہاں مارا، لیکن یارا، ایسا خاموش اور ساکت سکندر... میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

سکندر نے بس چائے کا کپ اٹھایا، دھیرے دھیرے پی لیا اور اپنی سوچوں میں کھو گیا، جیسے باہر کی دنیا اس کے لیے بالکل غیر اہم ہو۔

پھر ارمان نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا، "یار، مجھے مومنہ کی بات کرنی ہے۔"

سکندر فوراً ہوش میں آیا اور آہستہ سے بولا، "ہاں، بتاؤ۔"

ارمان نے تھوڑا جھک کر کہا، "مومنہ سے بات ہوئی ہے... اس کے والد کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

سکندر نے اسے غور سے دیکھا، ہر لفظ کو دل پر اتارتے ہوئے۔ پھر آہستہ سے بولا، "ارمان، کیا تو مومنہ کو پسند کرتا ہے؟"

ارمان اچانک چونک گیا اور چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش رہ گیا۔ پھر ہلکی سی ہنسی نکالتے ہوئے بولا، "ایسا بھی نہیں ہے، بس وہ ایک اچھی لڑکی ہے، اس کے ساتھ کبھی پریکٹیس کیا تھا... اسی لیے یاد رہتی ہے اور کلاس فیلو ہونے کی وجہ سے۔"

سکندر نے اپنے منہ پر ہلکی سی مسکراہٹ رکھی۔ آرمان نے کہا، "چلو، تمہارے چہرے پر تو مسکراہٹ آ گئی۔"

سکندر نے تھوڑا تیز لہجے میں کہا، "بہت حرامی ہے تو، آرمان"!

سکندر جانتا تھا کہ آرمان اور مومنہ کے درمیان کیا ہے، لیکن ارمان نے کبھی بھی اس بات کو قبول نہیں کیا تھا۔ مومنہ کے جذبات بھی واضح نہیں تھے، وہ بھی شاید ارمان کو پسند کرتی تھی یا نہیں، یہ سکندر کے لیے ایک الجھا ہوا راز تھا۔ وہ اس صورتحال کو غور سے دیکھ رہا تھا، ہر بات، ہر انداز اور ہر چھوٹی سی مسکراہٹ سے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن سب کچھ دھندلا سا لگ رہا تھا۔

سکندر کے ذہن میں یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ شاید ارمان کو مومنہ کے لیے اپنے جذبات کا اعتراف کرنے میں دیر ہو رہی ہے، اور مومنہ خود بھی کچھ چھپا رہی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ دونوں کے درمیان کچھ خاص ہے، لیکن حقیقت کیا ہے، یہ ابھی بھی ایک راز بن کر رہ گیا تھا۔

تبھی مومنہ، رمشا اور زینب گل سامنے والی میز پر آ کر بیٹھ گئیں۔ ارمان نے ہنستے ہوئے سکندر کا کندھا تھپتھپایا اور کہا، "دیکھ، مومنہ آ گئی"!

سکندر نے منہ بنا کر وہاں دیکھا اور جیسے ہی اس کی نظر اس پر پڑی، اس کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ وہی پل والی لڑکی تھی، جو صبح اس پل پر ملی تھی، اور اب مومنہ کے ساتھ بیٹھ کر بہت ہنسی مذاق کر رہی تھی۔ ہر ایک لفظ اور ہر

حرکت میں وہ خوشی اور معصومیت جھلک رہی تھی، جو سکندر نے صبح دیکھی تھی۔

سکندر حیرت اور الجھن میں رہ گیا۔ دل دھڑک رہا تھا اور اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ لمحہ کیسے ہوا۔ اس کی نظریں پل والی لڑکی کی طرف جم گئیں، اور جیسے ہی اس نے سکندر کو دیکھا، وہ بھی رک گئی، حیران اور ساکت۔ اس کی آنکھوں میں خوف، حیرت اور ایک عجیب سا شگفتگی تھی۔

سکندر نے دل ہی دل میں سوچا، "یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ وہی ہے... وہی جو میں نے صبح دیکھی تھی"!

پل والی لڑکی کے ساکت ہونے پر مومنہ نے تھوڑی دیر کے لیے اسے ہلکا سا دیکھتے ہوئے مسکرا دیا، اور پھر واپس اپنے دوستوں کی باتوں میں مشغول ہو گئی۔ لیکن سکندر کی نظریں ابھی تک اس پر لگی ہوئی تھیں، اس کا دماغ تیزی سے ہر لمحے کو یاد کر رہا تھا۔

تبھی سکندر نے محسوس کیا کہ پل والی لڑکی نے اپنی نظریں اس سے ہٹا کر کسی اور کی طرف دیکھیں، اور اس کے ہاتھ میں فون تھا۔ سکندر نے جیسے ہی قریب آنے کی کوشش کی، وہ اچانک کھڑا ہوا اور چھپ کر کچھ سوچنے لگا۔

سکینڈر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ "یہ کیا کر رہی ہے؟" اس نے دل ہی دل میں سوچا، لیکن کچھ کہنے سے پہلے ہی لڑکی نے پلٹ کر ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا... اور پھر وہ اچانک اپنا فون بند کر کے وہاں سے چل دی۔

سکندر کے ہاتھ میں ابھی بھی حیرت، الجھن اور تجسس کی لہر دوڑ رہی تھی۔ اس کی نظریں اس جگہ پر جم گئیں جہاں وہ ابھی کچھ لمحے پہلے بیٹھی تھی... لیکن اب وہاں صرف خالی صندلی اور خاموشی تھی۔

دل ہی دل میں سکینڈر نے سوچا، "یہ لڑکی کون ہے... اور وہ صبح پل پر کیا کرنے آئی تھی؟"

اور جیسے ہی وہ قدم بڑھانے لگا، کسی نے پیچھے سے زور سے اس کا نام پکارا...

"سکندر کتے"

آدھا گھنٹہ پہلے

"اچھا شاہویر، میں باتھ روم جا رہا ہوں، بہت زور کی لگی ہے،" دانیال نے بے زاری سے کہا۔

"اکیلے اکیلے؟ میں بھی آجاؤں،" شاہویر ہنستے ہوئے بولا۔

"یار مذاق مت کر،" دانیال نے گھورتے ہوئے کہا اور تیز قدموں سے چل پڑا۔

ادھر سکندر اب بھی سامنے بیٹھی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں وہیں جمی تھیں، جیسے ارد گرد کی آوازیں، ہنسی، شور سب کہیں دور چلے گئے ہوں۔

دانیال باتھ روم پہنچا۔ اندر جاتے ہی وہ بے خیالی میں گانا گنگنانے لگا۔ کچھ دیر بعد فارغ ہو کر جیسے ہی باہر نکلا، اچانک اس کے قدم رک گئے۔

اوپر والی منزل سے مدھم سی آواز آئی۔

"یار، ایسے نہیں... کوئی دیکھ لے گا،" ایک لڑکی کی گھبرائی ہوئی آواز تھی۔

"جو دیکھے گا نا جانُو، میں اسے دیکھ لوں گا،" لڑکے کی آواز میں بے پروائی تھی۔

دانیال کا دل زور سے دھک کر رہ گیا۔

وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ہر قدم کے ساتھ اس کی سانس تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اوپر پہنچ کر اس نے منظر دیکھا ایک لڑکا ایک لڑکی کو اپنی گود میں بٹھائے ہوئے تھا، دونوں کسی کام میں اس قدر مگن تھے کہ ارد گرد کا ہوش ہی نہ رہا تھا۔

وہ لڑکا اس لڑکی کے بہت قریب تھا، اتنا قریب کہ دونوں کی سانسیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

ان کے چہرے ایک دوسرے کے سامنے جھکے ہوئے تھے، پیشانیاں قریب، ہاتھ ایک دوسرے کی گردن اور کندھوں پر جمے ہوئے۔

وہ کوئی بات نہیں کر رہے تھے،

بس ایک خاموش قربت تھی...

ایسی قربت جو لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی۔

دانیال کی آنکھیں پھیل گئیں۔

اس نے بے اختیار فون مضبوطی سے پکڑ لیا۔

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، جیسے سینہ پھاڑ کر باہر آ جائے گا۔

"یہ... یہ کیا دیکھ رہا ہوں میں"...

دانیال کے ہاتھ کانپنے لگے۔

اس نے جیب سے فون نکالا۔ اسکرین جل اٹھی۔

ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا واپس پلٹ جائے...

مگر پھر اس نے کیمرہ آن کیا۔

ریکارڈنگ شروع ہو چکی تھی۔

دانیال کا دل اس قدر تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ اسے لگا آواز سنائی دے جائے گی۔

اور تب

اوپر سے اچانک سیڑھی چرچرانے کی آواز آئی...

اچانک اس لڑکی کی چیخ فضا میں گونج اٹھی۔

"کوئی... کوئی ہماری ویڈیو بنا رہا ہے"!

لڑکا ایک لمحے کو ساکت رہ گیا، پھر بجلی کی طرح چونکا۔

اس نے فوراً لڑکی کو اپنے پیچھے دھکیلا، سیڑھیوں کی طرف لپکا اور نظر دوڑائی۔

دانیال۔

اس کی آنکھیں ایک سیکنڈ کے لیے ملیں

اتنا وقت کافی تھا پہچاننے کے لیے۔

"اوئے"!

وہ لڑکا غصے سے چیخا اور دانیال کے پیچھے بھاگا۔

دانیال کی سانسیں بے ترتیب ہو چکی تھیں۔

دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ کانوں میں شور گونج رہا تھا۔

وہ دوڑتا ہوا نیچے آیا، لوگوں کے بیچ سے گزرا، کرسیاں ٹکراتی رہیں، کپ الٹتے رہے۔

کینٹین میں داخل ہوتے ہی اس نے اِدھر اُدھر دیکھا،

اور فوراً ایک میز کے نیچے گھس گیا۔

اس نے سانس روک لی۔

فون ہاتھ میں پسینے سے پھسل رہا تھا۔

اوپر قدموں کی آوازیں رکیں۔

کسی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

خاموشی...

ایک خوفناک خاموشی۔

ادھر، سکندر ابھی بھی صبح پل والی لڑکی کے خیال میں گم تھا۔

وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھا ہی رہا تھا کہ پیچھے سے ایک کڑوی، زہریلی آواز آئی

"سکندر کُتے"!

سکندر وہیں رک گیا۔

چہرے کی مسکراہٹ پل بھر میں غائب ہو گئی۔

وہ مڑا

"بہن چود"!

شانی غصّے سے چیخا، آنکھیں سرخ تھیں۔

"سالوں اب تم لوگ لوگوں کی پرائیویسی چھیڑنے لگے ہو؟"

سکندر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

اب اسے پہچاننے میں دیر نہ لگی

وہ تیسرے سمسٹر کا سینئر تھا، شان عرف شانی،

بی بی اے ڈیپارٹمنٹ کا مشہور نام،

وہی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ حد سے زیادہ بے خوف ہے۔

سکندر نے ایک نظر اس کے ساتھ کھڑی فرسٹ سمسٹر کی لڑکی پر ڈالی،

جو نظریں چرا رہی تھی،

جیسے خود بھی اس جگہ پر ہونے پر شرمندہ ہو۔

"کیا بکواس کر رہا ہے شانی؟"

سکندر کی آواز میں سختی تھی،

"ذرا سوچ سمجھ کر بول۔"

شانی ایک لمحے کو رکا،

پھر دانت پیستے ہوئے بولا،

"تیرا وہ کھسرا دوست۔۔۔"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ گیا،

جیسے اگلا لفظ خود اس کے لیے خطرہ بن جائے گا۔

"بول"!

سکندر نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔

"بس... بس میری غلط ویڈیو بنا کر بھاگ گیا ہے"!

شانی نے ہکلاتے ہوئے بات مکمل کی۔

سکندر کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آئی

غصے اور طنز کی ملی جلی۔

"سالے"!

وہ ہنسا، مگر اس ہنسی میں خوشی نہیں تھی۔

"میری بات سن۔

وہ تیری غلط ویڈیو کیوں بنائے گا؟

تو کون سا کوئی شہزادہ ہے جس کی ویڈیو بنائی جائے؟"

اس نے ارد گرد نظر دوڑائی۔

"دانیال کہاں ہے؟"

لیکن دانیال کہیں دکھائی نہ دیا۔

کینٹین کی آوازیں، کپوں کی کھنک، لوگوں کی سرگوشیاں

سب کچھ موجود تھا،

سوائے دانیال کے۔

اسی لمحے ارمان کرسی پیچھے کرتا ہوا کھڑا ہوا اور تیزی سے پاس آ گیا۔

"کیا ہوا ہے بھائی؟

تم دونوں کیوں الجھ رہے ہو؟"

سکندر نے فوراً خود کو سنبھالا۔

چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لائی اور بولا،

"کچھ نہیں ارمان،

سب ٹھیک ہے۔

ہم دونوں کے درمیان کوئی مسئلہ نہیں۔"

پھر اس نے شانی کی طرف دیکھا،

مسکراہٹ اب خطرناک لگ رہی تھی۔

"ہے نا شانی؟

سب ٹھیک ہے؟"

شانی ایک لمحے کو خاموش رہا۔

اس کے ماتھے پر پسینہ ابھر آیا۔

وہ جانتا تھا

اگر اس نے اس لڑکی کا نام لیا،

یا بات آگے بڑھائی،

تو معاملہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

"ہاں"...

وہ گھبرا کر بولا،

"سب ٹھیک ہے۔"

پھر دبی آواز میں،

"میں بعد میں تجھ سے بات کروں گا۔"

سکندر نے ایک قدم اور قریب ہو کر کہا،

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

"بعد میں کیوں؟

میں یہی ہوں۔

ابھی کر لے بات۔"

شانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بس ایک تیز نظر سکندر پر ڈالی،

پھر مڑ کر تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔

سکندر وہیں کھڑا رہا۔

اس کے ذہن میں صرف ایک سوال گونج رہا تھا

دانیال کہاں ہے؟

اور اس فون میں آخر کیا قید ہو چکا ہے؟

شانی کے جاتے ہی فضا میں ایک عجیب سا سکوت چھا گیا۔

کینٹین کی آوازیں واپس آتو گئیں، مگر سکندر کے کانوں میں اب بھی شانی کی آواز گونج رہی تھی۔

چند ہی لمحے گزرے تھے کہ

اچانک دانیال باہر کی طرف سے آتا ہوا دکھائی دیا۔

پسینہ اس کے ماتھے پر تھا،

سانس ذرا تیز،

اور چہرے پر وہی زبردستی کی نارمل مسکراہٹ

جو صرف اس وقت آتی ہے جب آدمی کچھ چھپا رہا ہو۔

شاہویر، ارمان اور سکندر تینوں ایک ساتھ چونکے۔

"اوئے"!...

ارمان نے آہستہ سے کہا،

"تو باتھ روم گیا تھا یا پھڈے لینے ؟"

شاہویر نے دانیال کو سر سے پاؤں تک دیکھا،

"یار... یہ ٹھیک تو نہیں لگ رہا۔"

سکندر کچھ نہ بولا۔

وہ سیدھا آگے بڑھا،

دانیال کا بازو مضبوطی سے پکڑا

اور بغیر وقت ضائع کیے کہا:

"دانیال،

مجھے تجھ سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔

ابھی۔"

دانیال چونکا۔

"کیا ہوا یار؟

ابھی تو"…..

"ابھی"!

سکندر کی آواز میں نرمی نہیں تھی،

بس حکم تھا۔

ارمان نے مداخلت کرنی چاہی،

"بھائی سب ٹھیک تو"….

"ارمان، چھوڑ دے،"

سکندر نے نظریں ہٹائے بغیر کہا،

"میں سنبھال لوں گا۔"

دانیال نے ایک لمحہ ادھر اُدھر دیکھا،

جیسے بھاگنے کا راستہ ڈھونڈ رہا ہو،

پھر خاموشی سے سکندر کے ساتھ چل پڑا۔

دونوں یونیورسٹی کے گیٹ سے باہر نکلے۔

شام کی ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی،

مگر سکندر کے اندر آگ جل رہی تھی۔

وہ بغیر رکے چلتا رہا،

دانیال اس کے ساتھ ساتھ

خاموش،

سر جھکائے۔

آخرکار وہ ایک چھوٹے سے کیفے کے سامنے رُکے۔

سادہ سا بورڈ،

دھیمی روشنی،

اور اندر ہلکی موسیقی۔

سکندر نے دروازہ کھولا،

اندر داخل ہوا

اور ایک کونے والی میز کی طرف اشارہ کیا۔

"بیٹھ۔"

دانیال بیٹھ گیا۔

سکندر اس کے سامنے آ کر کھڑا رہا۔

چند لمحے کی خاموشی

پھر سکندر نے آہستہ مگر خطرناک لہجے میں کہا:

"اب بول۔

اوپر کیا کر رہا تھا؟

اور شانی میرا نام کیوں لے رہا تھا؟"

دانیال نے نظریں اٹھائیں،

پھر فوراً جھکا لیں۔

خاموشی بھاری ہوتی جا رہی تھی...

اور سکندر جانتا تھا

دانیال نے گہری سانس لی، جیسے اندر کا بوجھ نکال رہا ہو، پھر آہستہ آہستہ ساری بات سکندر کو بتا دی۔

اوپر کیا دیکھا، ویڈیو کیسے بنی، شانی کا غصہ، اس کی دھمکیاں ایک ایک لفظ۔

سکندر یہ سب سنتا رہا۔

پہلے حیرانی، پھر اس کے چہرے پر ایک عجیب سی سنجیدگی آ گئی۔

"تو یہ بات ہے"...

سکندر نے زیرِ لب کہا۔

دانیال نے بات آگے بڑھائی،

"یار، شانی عام بندہ نہیں ہے۔

وہ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کا بیٹا ہے۔

اپنے باپ کی طاقت کا غلط فائدہ اٹھاتا ہے۔

اسی لیے اتنا بے خوف ہے۔"

یہ سن کر سکندر کی آنکھوں میں ایک چمک سی آگئی۔

وہ کرسی سے ذرا پیچھے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"ویڈیو دکھا،"

اس نے سیدھا کہا۔

دانیال نے ہچکچاتے ہوئے فون نکالا،

اسکرین کھولی

اور ویڈیو سکندر کی طرف بڑھا دی۔

سکندر نے ویڈیو چلائی۔

چند سیکنڈ دیکھتے ہی

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی،

پھر وہ ہنس پڑا

ہلکا نہیں،

صاف اور مطمئن قہقہہ۔

"واہ دانیال"...

وہ ہنستے ہوئے بولا،

"آج تو تُو نے کھیل ہی پلٹ دیا ہے۔"

دانیال گھبرا گیا۔

"یار، کہیں یہ الٹا نہ پڑ جائے"...

سکندر نے فون بند کیا

اور میز پر رکھ دیا۔

"اب تو مزہ آئے گا،"

اس کی آواز میں اعتماد تھا،

"شانی جیسے لوگ طاقت صرف تب تک دکھاتے ہیں

جب تک ان کے راز محفوظ ہوں۔"

وہ ذرا آگے جھکا،

آنکھوں میں خطرناک سی چمک تھی۔

"اب ہم شانی سے بہت سے کام لے سکتے ہیں۔

اور اگر اُس نے ذرا سا بھی نخرہ دکھایا نا"...

وہ رکا، مسکرایا

..."تو یہ ویڈیو

ہر جگہ وائرل ہو گی۔"

دانیال نے سکندر کو دیکھا

پہلی بار اسے لگا

کہ کھیل اب ہاتھ سے نکل چکا ہے،

اور شانی اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔

کیفے کی خاموش فضا میں

سکندر کی ہنسی ابھی تک گونج رہی تھی۔

"چل، یہ مجھے بھیج دے،"

سکندر نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

دانیال ایک دم چونک گیا۔

"نہیں یار... یہ ٹھیک نہیں ہے،"

اس نے گھبرا کر کہا،

"اگر یہ غلط ہاتھوں میں چلی گئی تو مسئلہ ہو جائے گا۔"

سکندر نے اسے غور سے دیکھا۔

اس کی آواز اب نرم نہیں تھی۔

"دانیال، مسئلہ تو پہلے ہی بن چکا ہے،"

وہ آہستہ مگر سخت لہجے میں بولا،

"اب ہمارے پاس یا تو بچاؤ کا راستہ ہے

یا پھر سیدھا نقصان۔"

دانیال پھر بھی ہچکچایا۔

"یار، مجھے اچھا نہیں لگ رہا"...

سکندر نے کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب آتے ہوئے کہا،

"میں تجھے بچا رہا ہوں،

اور شانی کو بھی اس کی حد یاد دلوا رہا ہوں۔

اگر کل اس نے الٹا کوئی حرکت کی

تو سب سے پہلے تیرے ہی پیچھے آئے گا۔"

یہ سن کر دانیال خاموش ہو گیا۔

چند لمحے گزرے،

پھر اس نے فون اٹھایا

اور ویڈیو سکندر کو فارورڈ کر دی۔

سکندر کے فون پر نوٹیفکیشن آیا۔

اس نے اسکرین دیکھی،

ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آ گئی۔

"ٹھیک ہے،"

وہ مطمئن لہجے میں بولا،

"اب یہ میرے پاس محفوظ ہے۔"

اس نے فوراً ویڈیو سیو کی،

فولڈر کا نام بدلا

اور فون لاک کر دیا۔

دل ہی دل میں اس نے سوچا:

کل کو یہ ویڈیو

ضرور کام آئے گی۔

"یار مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے... مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا،"

دانیال کی آواز کانپ رہی تھی، وہ بار بار ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا جیسے ابھی کوئی آ جائے گا۔

سکندر نے گہری نظر سے اسے دیکھا اور پر سکون لہجے میں بولا،

"کچھ نہیں کرے گا وہ، تُو بے فکر رہ۔"

پھر ذرا قریب ہو کر بولا،

"اگر ذرا سا بھی مسئلہ ہوا نا، تو مجھے فوراً یاد کرنا۔ میں ایک منٹ میں تیرے پاس ہوں گا۔"

دانیال نے بے بسی سے سر ہلایا۔

"یار، یونین والے بھی اس کے دوست ہیں... وہ سب مجھے مار دیں گے۔"

اس کے چہرے پر صاف خوف لکھا تھا۔

سکندر نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے پر رکھا۔

"میں سب سنبھال لوں گا،"

اس نے پُر اعتماد انداز میں کہا،

"اب پیچھے ہٹنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

دانیال نے گہرا سانس لیا،

لیکن دل کا بوجھ کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

سکندر نے اسے دلاسا دیا اور وہاں سے نکل گیا۔

سکندر گھر پہنچتے ہی جوتے اتارے بغیر بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ چھت کو گھورتے ہوئے اس کا ذہن کسی ایک جگہ ٹھہر ہی نہیں رہا تھا۔

لطیف... مومنہ... وہ صبح پل والی لڑکی... اور اب شانی کی وہ ویڈیو سب کچھ ایک ساتھ دماغ میں گردش کر رہا تھا۔

وہ ہلکا سا ہنسا، مگر اس ہنسی میں خوشی نہیں تھی، ایک عجیب سی تھکن اور کڑواہٹ تھی۔

اسے خود پر ہنسی آ رہی تھی کہ اس کی زندگی میں سکون نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔ جہاں دیکھو، کوئی نیا جھنجھٹ، کوئی نیا راز، کوئی نیا بوجھ۔

وہ کروٹ بدل کر موبائل اٹھاتا ہے، اسکرین آن کرتا ہے، پھر بند کر دیتا ہے۔

دل چاہتا ہے کسی سے بات کرے، مگر سمجھ نہیں آتا کس سے۔

مومنہ کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو سینہ بھاری ہو جاتا ہے،

پل والی لڑکی یاد آتی ہے تو دل میں سوال اٹھتا ہے کہ وہ آخر کون تھی اور کیوں ٹوٹ چکی تھی،

اور شانی کی ویڈیو سوچ کر ایک خطرناک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آجاتی ہے۔

"بہن چود یہ سکون نام کی چیز شاید میرے نصیب میں ہی نہیں"...

وہ آہستہ سے بڑبڑاتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے،

مگر نیند اس سے کوسوں دور تھی۔

سکندر اب رات کے کھانے کے لیے اپنے خاندان کے ساتھ میز پر بیٹھا۔ یعقوب جٹ، اس کے والد، اپنے کھانے کی پلیٹ کی طرف دیکھ رہے تھے، لیکن ان کی نظریں اکثر سکندر پر پڑتی رہتی تھیں۔ سلمہ جٹ، ماں، پلیٹیں سب کے لیے برابر کر رہی تھی اور کھانے میں سالن، بریانی اور نان رکھ رہی تھی۔ چھوٹا بھائی داؤد جٹ چمچ سے سالن کی خوشبو سونگھ رہا تھا اور کبھی کبھار سکندر کی طرف دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ دے دیتا۔

سکینڈر ہنس رہا تھا اور مزے میں بولا،

"اب سب کی بند بجادوں گا"!

یقوب جٹ حیرت سے بولے،

"کیا ہوا تمھیں، بیٹا؟"

سکینڈر نے ہلکے سے کندھے اُٹھاتے ہوئے جواب دیا،

"کچھ نہیں بابا"!

یقوب جٹ نے سلما جٹ کی طرف دیکھ کر سر ہلایا،

"یہ تو واقعی پاگل ہو گیا ہے، سلما"!

سلما جٹ نے تھوڑی پریشانی کے ساتھ کہا،

"پتہ نہیں، جب سے یونیورسٹی جانا شروع ہوا ہے، ایسا ہی ہے... کبھی ہنستا ہے، کبھی عجیب حرکتیں کرتا ہے"...

یقوب جٹ نے تھوڑی فکری جھلک کے ساتھ کہا،

"مجھے اس کی فکر رہتی ہے، پتہ نہیں وہاں کیا کرتا ہے... بہت ٹیڑھی اولاد ہے میری"!

سلما جٹ نے نرم لہجے میں کہا،

"مجھے تو اپنی بہو پر بھی ترس آتا ہے"...

یقوب جٹ حیرت سے بولے،

"کیا مطلب؟"

سلما جٹ نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا،

"کون جھیلے گی اس کو؟ بیچاری کی آخرت اچھی ہو جائے گی، اگر اس کے ساتھ شادی ہوئی تو دنیا میں بھی سارا حساب ہو جائے گا"...

یقوب جٹ نے تھوڑا مذاق ملانے کی نیت سے کہا،

"اب ایسا بھی نہیں ہے میرا بیٹا... تم زیادہ ہی مخالفت کر رہی ہو"!

سلما جٹ نے ہنستے ہوئے کہا،

"آج آپ کو کیا ہوا؟ آپ کیسے اس کی طرف ہونے لگے؟"

یقوب جٹ نے ڈرامے میں آہ بھرتے ہوئے کہا،

"میں اس کے خلاف ہی کب ہوتا تھا"!

سلما جٹ نے مسکراتے ہوئے کہا،

"بیٹا، ڈرامہ باز تو باپ... ڈبل ڈرامہ باز"!

یقوب اور سلما ایک دوسرے کو ہلکے سے ہاتھ لگاتے ہوئے مزاح کرنے لگے، مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو چھیڑنے لگے۔

سکندر کونے سے بول پڑا،

"یہ سب کمرے میں کیا کرو، اوپن میں اچھا نہیں لگتا"!

سلما جٹ ہنس کر شرما گئی،

یقوب جٹ ہنسنے کے ساتھ بولا،

"لعنتی، انہی چیزوں میں اس کا دھیان جاتا ہے"!

داؤد بھی ہنس پڑا، اور سکندر بھی ان کے ساتھ ہنستے ہوئے سر ہلا رہا تھا۔

اگلے دن یونیورسٹی میں،

مومنہ کو صبح سے ہی ایک عجیب سا غم تھا۔ جیسے ہی اسے پتہ چلا کہ اس کے والد، طارق انور کی طبیعت بہت خراب ہے، اس کا دل بوجھل ہو گیا۔ وہ

کلاس ختم ہونے کے بعد لان میں اکیلی بیٹھی تھی، ہاتھوں میں کتاب تھامی ہوئی تھی مگر دھیان کہیں اور تھا۔ بس اپنے والد کی فکر اور زندگی کے مسائل اس کے ذہن میں گھوم رہے تھے۔ وہ اپنی پریشانی کو کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی، اسی لیے پوری طرح خاموش تھی۔

اتنی دیر تک وہ سوچ میں غرق رہی کہ اچانک لطیف اس کے پاس آیا۔ ہنستے ہوئے بولا،

"کیا کر رہی ہو، جانو؟"

مومنہ نے سر جھکاتے ہوئے کہا،

"مجھے اکیلا چھوڑ دو... آج بات کرنے کا موڈ نہیں ہے۔ میں آگے ہی کافی پریشان ہوں"...

لطیف نے نزدیک آکر تھوڑا طنز بھری آواز میں کہا،

"ارے ارے، پریشان؟ تم تو ہر وقت پرفیکٹ نظر آتی ہو، آج کیوں اداس لگ رہی ہو؟"

مومنہ نے تیز آواز میں جواب دیا،

"میر امذاق کا موڈ نہیں ہے، بس اکیلا رہنے دو۔"

لطیف نے ہنستے ہوئے قدم بڑھایا اور آہستہ سے اس کے قریب بیٹھنے کی کوشش کی،

"چلو یار، تھوڑی باتیں کر لو، تم اتنی اداس کیوں ہو؟ کچھ بتاؤ، کہیں میں مدد کر سکوں تو"...

مومنہ نے سر ہلا کر کہا،

"نہیں... سب ٹھیک ہے، میں خود سنبھال لوں گی"...

لطیف نے ذرا جھک کر اس کے سر کے قریب کہا،

"بس، جانو، اکیلا رہنے کا مطلب یہ نہیں کہ تمہیں سب سے دور ہو جانا چاہیے۔ تمہیں لگتا ہے کہ تم اکیلی سب کچھ سنبھال سکتی ہو؟ حقیقت میں تو کوئی بھی مکمل طور پر اکیلا نہیں ہوتا"...

مومنہ نے اس کی بات پر تھوڑا سا سر ہلایا، لیکن پھر فوراً آنکھیں جھکا لیں۔

لطیف نے مزاح بھری آواز میں کہا،

"ارے، میں تمہیں ڈرانے نہیں آیا، بس تمہیں ہنسنے پر مجبور کرنا چاہ رہا ہوں۔ آج تمہارے موڈ کو ٹھیک کرنے کے لیے کچھ کر سکتا ہوں۔"

مومنہ نے نرم انداز میں کہا،

"آپ کا مزاق آج میرے لیے ٹھیک نہیں"...

لطیف نے ہنس کر کہا،

"اچھا ٹھیک ہے، تمہارا موڈ بہتر ہو جائے تو پھر بات کریں گے، آج تم بس میرے پاس بیٹھو، یہ کافی ہے۔"

مومنہ نے آہستہ سے آنکھوں سے آنسو صاف کیے اور سخت لہجے میں کہا،

"مجھے آپ کے پاس نہیں بیٹھنا"...

لطیف تھوڑا حیران ہوا، پھر نرم لہجے میں پوچھا،

"کیا ہوا، جانو؟ کچھ بتاؤ نا"...

مومنہ نے سر جھکایا، خاموشی اختیار کی، پھر اپنی کرسی سے اٹھ کر چلنے لگی۔

لطیف نے قدم بڑھایا اور ہلکی سی آواز میں کہا،

"جانو، ارے... رک جاؤ، تم اکیلی کیوں جا رہی ہو؟ کم از کم آج مجھے بتا دو کہ کیا ہوا"...

مومنہ نے تھوڑا اور تیز قدم بڑھایا، جیسے کسی دباؤ سے بچنا چاہ رہی ہو۔

اتنی دیر میں سکندر وہاں سے گزرتا ہوا آیا۔ وہ یونیورسٹی کے لان میں چل رہا تھا، لیکن اس کی آنکھیں فوراً مومنہ پر ٹک گئیں۔ وہ اس کو دور چلتی ہوئی دکھی، آنکھوں میں اداسی اور پریشانی واضح تھی۔

اسی وقت یونین کا لیڈر ثاقب بھی وہاں موجود تھا، لیکن وہ ابھی تک سکندر کی توجہ نہیں پکڑ سکا۔ سکندر کے ذہن میں ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ مومنہ کی حالت کچھ زیادہ ہی غیر معمولی لگ رہی ہے۔

لطیف نے اچانک مومنہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ مومنہ کی آنکھوں میں خوف اور حیرت جھلک رہی تھی، اور اس کے ہونٹوں سے مدد کی خاموش یا زور سے پکار نکل رہی تھی۔

"کوئی میری مدد کرو!" وہ لرزتی ہوئی چیخی۔

سکندر فوراً حرکت میں آیا۔ اس کی آنکھیں تیز ہو گئیں، اور اس نے ثاقب کی طرف اشارہ کیا، بالکل خاموش مگر واضح کہانی کے اشارے کے ساتھ۔ ثاقب نے فوراً صورتحال سمجھ لی۔

"چھوڑا سے مادر چود!" ثاقب نے زور سے چلایا اور دوڑ لگا دی۔

لطیف نے غصے سے پیچھے مڑ کر دیکھا، لیکن ثاقب کا قدم تیز تھا۔ ایک لمحے کے لیے دونوں ایک دوسرے کے سامنے رکے، پھر ثاقب نے زور سے لطیف کو دھکا دیا۔ وہ زمین پر ہلکا سا لڑکھڑا گیا، مگر فوراً سنبھل گیا اور لڑائی دوبارہ شروع ہو گئی۔

مومنہ خوفزدہ ہو کر زمین پر بیٹھی، پیچھے جھکی اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی سانسیں تیز تھیں اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔

ثاقب کا قد بڑا تھا اور وہ اپنی طاقت کا بھرپور استعمال کر رہا تھا۔ اس نے لطیف کو دبانے کے لیے اپنی پوری طاقت لگائی، اور اسے لان کے کنارے کی طرف دھکیل دیا۔ ہر قدم کے ساتھ لڑائی کی شدت بڑھ رہی تھی۔

سکندر خاموش کھڑا تھا، ہر لمحہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر مومنہ پر تھی، اس کی حفاظت کے لیے تیار، اور ساتھ ہی اس کے ذہن میں سارے حالات کے حل کے خیالات گردش کر رہے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

لطیف اور ثاقب ایک دوسرے کے بالوں اور بازو پکڑ کر لڑ رہے تھے، زور زور سے دھکیل رہے تھے۔ طلبہ اور اساتذہ سب حیران ہو کر کھڑے تھے، کچھ نے فون نکال کر ویڈیو بنانے کی کوشش کی، کچھ صرف گھور رہے تھے۔

مومنہ اپنی جگہ زمین پر بیٹھی رہ گئی، خوفزدہ مگر محفوظ، کیونکہ ثاقب نے لطیف پر قابو پا لیا تھا۔ سکندر کے چہرے پر بھی ایک عجیب سا سکون اور اضطراب دونوں دکھائی دے رہے تھے۔

لطیف کی سانسیں بھاری ہو رہی تھیں، مگر وہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ثاقب نے اس کی پشت پر ایک آخری دھکا دیا اور اسے تقریباً زمین پر گرا دیا، پھر اپنی گرفت مضبوط کر کے اسے لان کے بڑے حصے کی طرف لے جا رہا تھا تاکہ کسی اور کو مزید نقصان نہ ہو۔

ثاقب نے غصے میں لطیف کو گھسیٹتے ہوئے گراؤنڈ کی طرف لے جانا شروع کیا۔ ہر قدم کے ساتھ لطیف کی ہمت ٹوٹ رہی تھی، مگر وہ مزاحمت کر رہا تھا۔

مومنہ ابھی بھی اندر لان میں زمین پر بیٹھی ہوئی تھی، سہمی اور کانپتی، اس کی آنکھوں میں خوف اور حیرت کا ملا جلا تاثر تھا۔

انگلش کی میم ساجدہ نے یہ پورا منظر دیکھا، آنکھیں پھیل گئیں، اور وہ کچھ بولے بغیر کھڑی رہ گئیں۔ سکندر بھی دور سے سب کچھ دیکھ رہا تھا، دل تیز دھڑک رہا تھا، سانسیں رکتی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ یہ سب کہاں پہنچ گیا، یہ سب کیسے ہو گیا؟

گراؤنڈ میں یونیورسٹی کے تمام طلبہ اور اساتذہ جمع ہو گئے تھے، ہر کوئی حیرت اور خوف کے ملا جلا احساس لیے ہوا تھا۔

ثاقب نے لطیف کو زوردار تھپڑ مارا۔ "سالے لڑکی چھیڑتا ہے، ایک لڑکی کو ہاتھ لگانے کی ہمت کیسے ہوئی!" اس نے غصے سے کہا۔

لطیف کا چہرہ سرخ ہو گیا، وہ کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا.

"ماروں اس گانڈو کو!" ثاقب نے اسے دھکا دے کر کہا۔

اب یونیورسٹی کے کئی لڑکوں نے بھی شامل ہو کر اسے مارنا شروع کر دیا۔ گراؤنڈ میں شور اور ہجوم کا منظر پیدا ہو گیا۔

سکندر بالکل خاموش کھڑا تھا، آنکھوں میں حیرت، دل میں غصہ اور خوف کا ملا جلا احساس۔ اس نے سوچا: سچ میں اس کی زندگی میں سکون نہیں ہے اور اب آگے کیا ہو گا؟

تکلیف، درد، اذیت اور بدنامی

ایک عورت کے پاس مرد کو دینے کے لیے کیا ہوتا ہے مرد اس سے شادی کیوں کرتا ہے؟

وہ عورت کے پاس آتا ہی کیوں ہے؟

نکاح کی دہلیز تک قدم کیوں بڑھاتا ہے؟

کیا اسے عورت سے صرف جسم چاہیے ہوتا ہے؟

جب یہ سب کچھ تو اسے بازارو عورت سے بھی مل سکتا ہے بغیر وعدے، بغیر ذمہ داری، بغیر حساب کے۔

پھر سوال یہ ہے کہ

وہ نکاح کیوں کرتا ہے؟

شاید اس لیے کہ مرد کو بھی صرف جسم نہیں چاہیے ہوتا۔

اسے گواہ چاہیے ہوتے ہیں،

اپنائیت چاہیے ہوتی ہے،

ایسا رشتہ جو اسے انسان بنائے، صرف خواہش نہ چھوڑ دے۔

نکاح خواہش کا نہیں، ذمہ داری کا اعلان ہے

اور جو مرد اس اعلان کے قابل نہ ہو،

وہ عورت کے قریب آنے کا بھی حق نہیں رکھتا۔

ح۔س۔ن۔ی۔ن ب۔ھ۔ٹ۔ی

یونیورسٹی میں جو کچھ ہوا، اس کے بعد حالات واقعی پہلے جیسے نہ رہے۔

ایسا لگتا تھا جیسے ایک ہی لمحے میں پورا ماحول بدل گیا ہو۔ وہی یونیورسٹی، وہی لان، وہی راہداریاں مگر فضا میں اب ایک انجانا سا بوجھ تھا، ایک ایسی خاموش کشیدگی جو ہر قدم پر محسوس ہوتی تھی۔

مومنہ کے لیے سب کچھ یکدم اجنبی ہو گیا تھا۔

جہاں کل تک وہ ایک عام سی طالبہ تھی، آج وہ ہر بات کا مرکز بن چکی تھی۔ وہ جب لان سے گزرتی، تو نظریں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتیں۔ کچھ آنکھوں میں تجسس تھا، کچھ میں طنز، اور کچھ میں وہ فیصلہ جو بغیر سنے سنا دیا جاتا ہے۔ سرگوشیاں اس کے کانوں سے ٹکراتیں، کبھی آہستہ، کبھی بے دھڑک مگر ہر بار دل پر ایک نیا زخم چھوڑ جاتیں۔

کلاس روم میں اس کا بیٹھنا مشکل ہو گیا تھا۔

کوئی سامنے سے دیکھتا تو نظریں چرا لیتا،

کوئی مسکرا کر ایسے دیکھتا جیسے سب کچھ جانتا ہو،

اور کوئی جان بوجھ کر اس کا نام لے کر بات شروع کر دیتا، تا کہ باقی لوگ بھی متوجہ ہو جائیں۔

اساتذہ بھی مختلف نہ تھے۔

کوئی حد سے زیادہ سخت ہو گیا تھا،

کوئی غیر ضروری نصیحتیں کرنے لگا تھا،

اور کوئی خاموش رہ کر سب کچھ دیکھنے کا بہانہ بنا رہا تھا۔

کوئی یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ ایک واقعے نے ایک لڑکی کی پوری شناخت بدل دی ہے۔

کہانیاں خود سے بنتی جا رہی تھیں۔

کسی نے کہا، "وہی ہے نا جس کے پیچھے لڑکے آپس میں لڑ پڑے تھے؟"

کسی نے اضافہ کیا، "ایسی لڑکیاں ہی یونیورسٹی کا ماحول خراب کرتی ہیں۔"

اور کسی نے فیصلہ سنا دیا، "یہ سب جان بوجھ کر کرتی ہے، ورنہ کوئی کیوں لڑے؟"

مومنہ سنتی تھی، مگر بولتی نہیں تھی۔

وہ جانتی تھی کہ اس کی آواز اس شور میں دب جائے گی۔

وہ جانتی تھی کہ یہاں سچ سے زیادہ مزے دار باتیں بکتی ہیں،

اور الزام سچ سے زیادہ تیزی سے پھیلتا ہے۔

اکیلی بیٹھ کر وہ اکثر اپنے والد کو یاد کرتی۔

سوچتی کہ اگر وہ ٹھیک ہوتے، تو شاید وہ اتنی کمزور محسوس نہ کرتی۔

مگر یہاں تو وہ اکیلی تھی نہ کوئی محافظ، نہ کوئی گواہ۔

سب سے زیادہ تکلیف اسے اس بات کی تھی کہ کسی نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ ڈری کیوں تھی،

کسی نے یہ نہیں سوچا کہ وہ چیخی کیوں تھی،

بس سب نے یہی دیکھا کہ دو لڑکے لڑے تھے اور قصوروار وہ ٹھہری۔

مومنہ کی خاموشی کو اس کی رضامندی سمجھ لیا گیا،

اس کی نظریں جھکانے کو اس کا جرم بنا دیا گیا،

اور اس کی کمزوری کو اس کی پہچان۔

مگر اس خاموشی کے پیچھے ٹوٹا ہوا حوصلہ نہیں تھا،

بلکہ ایک ایسا درد تھا جو لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔

یہ وہ درد تھا جو تب جنم لیتا ہے جب ایک معاشرہ سچ تلاش کرنے کے بجائے،

ایک لڑکی کو قربانی بنا کر خود کو محفوظ سمجھ لیتا ہے۔

یونیورسٹی میں سب کچھ چل رہا تھا کلاسز، لیکچرز، ہنسی مذاق

مگر مومنہ کے لیے وقت وہیں رک گیا تھا،

اسی لمحے پر،

جہاں ایک واقعے نے اس کی پوری دنیا بدل دی تھی۔

سکندر بھی اب مومنہ کے ساتھ اپنا نام جڑتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

یونیورسٹی میں پھیلتی باتوں نے اس کے اندر ایک ضد سی پیدا کر دی تھی ایک سخت، بے لچک ضد۔ وہ مومنہ سے بات نہیں کر رہا تھا، نہ سامنے سے دیکھتا، نہ فون کے پیغامات کا جواب دیتا۔ جیسے اس نے جان بوجھ کر اسے اپنی دنیا سے کاٹ دیا ہو۔

اس کے ذہن میں ایک ہی بات گونجتی رہتی تھی:

اگر کسی مرد کا نام کسی لڑکی کے ساتھ بدنام ہو جائے، تو اس سے بڑا لعنتی کوئی نہیں۔

وہ لڑ سکتا تھا، مار پیٹ کر سکتا تھا، یہاں تک کہ جان لینے کا خیال بھی اسے کم گناہ لگتا تھا مگر "لڑکی بازی" میں اس کا نام آنا، یہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

اسے لگتا تھا کہ یہ کمزوری کی نشانی ہے، اور وہ خود کو کمزور ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

مومنہ نے کئی بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی۔

کبھی کلاس کے بعد رک کر،

کبھی لان میں نظر ملتے ہی،

اور کبھی ہمت کر کے میسج بھیجا

مگر ہر بار اسے خاموشی کے سوا کچھ نہ ملا۔

وہ ایک آدھ بار رک گئی تھی، جیسے سوچ رہی ہو کہ شاید وہ خود ہی پلٹ آئے گا،

مگر سکندر کا رویہ دن بہ دن اور سخت ہوتا چلا گیا۔

نہ غصہ، نہ نفرت بس ایک سرد بے نیازی۔

ارمان، دانیال اور شاہویر سب یہ سب دیکھ کر حیران تھے۔

انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ سکندر کو اچانک کیا ہو گیا ہے۔

وہی سکندر جو ہر بات پر بول پڑتا تھا،

جو کسی بات کو دل میں نہیں رکھتا تھا،

اب اتنا خاموش، اتنا الگ کیوں ہو گیا تھا؟

ارمان کئی بار کہنا چاہتا تھا، مگر سکندر کی آنکھوں میں وہ سختی دیکھ کر رک جاتا۔

دانیال کو اندر ہی اندر خوف سا محسوس ہوتا تھا کہ کہیں یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ نہ ہو۔

شہاویر بس دور کھڑا سب دیکھتا رہتا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس وقت سکندر کو سمجھانا آسان نہیں۔

مومنہ کے لیے یہ سب اور بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔

یونیورسٹی پہلے ہی اس کے خلاف تھی،

اور اب سکندر جس سے وہ کم از کم وضاحت کی امید رکھتی تھی

وہ بھی اس سے منہ موڑ چکا تھا۔

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کا جرم کیا ہے۔

اس نے نہ کسی کو بلایا تھا،

نہ کسی کو اکسایا تھا،

نہ کسی کا نام لیا تھا

پھر بھی سزا صرف اسی کو کیوں مل رہی تھی؟

اور سکندر...

وہ سب جانتے ہوئے بھی خاموش تھا۔

کیونکہ اس کے نزدیک خاموش رہنا، خود کو بچانا تھا۔

مگر یہ خاموشی،

کسی اور کے لیے آہستہ آہستہ زہر بنتی جا رہی تھی۔

زینب گُل اور رمشا سے بھی مومنہ نے بات کرنے کی کوشش کی، مگر دونوں نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔

ایک دن انگلش کا لیکچر کے بعد

مومنہ نے ہمت کر کے آہستہ سے کہا،

"زینب... ایک منٹ سن لو، پلیز۔"

زینب گُل نے قدم روکے بغیر جواب دیا،

"مجھے دیر ہو رہی ہے، بعد میں۔"

مگر وہ بعد کبھی آیا ہی نہیں۔

مومنہ نے رمشہ کی طرف دیکھا،

"رمشا، تم تو کم از کم بات کر سکتی ہو نا؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

رمشا نے موبائل اسکرین سے نظریں اٹھائے بغیر کہا،

"مجھے ان فضول باتوں میں نہیں پڑنا۔"

"فضول باتیں؟" مومنہ کی آواز کانپ گئی،

"تم مجھے جانتی ہو، میں ایسی نہیں ہوں۔"

زینب گُل نے تلخی سے کہا،

"ہم سب کچھ جانتے ہیں مومنہ... اب مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔"

"کیا جانتے ہو؟ سنی سنائی باتیں؟" مومنہ نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

رمشا نے سرد لہجے میں کہا،

"بس کرو، پلیز۔ ہمیں کسی مسئلے میں مت گھسیٹو، تم ہمیں بھی بدنام کرو گی۔"

یہ کہہ کر دونوں وہاں سے چلی گئیں۔

مومنہ وہیں کھڑی رہ گئی الفاظ اس کے ہونٹوں پر جم گئے،

اور آنکھوں میں وہ سوال، جن کا جواب اب شاید کوئی دینے کو تیار نہیں تھا۔

ثاقب اور لطیف کو وائس پرنسپل کے دفتر میں طلب کیا گیا تھا۔

دفتر کا ماحول غیر معمولی حد تک سنجیدہ تھا۔ لکڑی کی بھاری میز کے پیچھے وائس پرنسپل نادر علی بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر سختی صاف نظر آ رہی تھی۔ سامنے رکھی فائلیں جیسے پورے واقعے کی گواہ تھیں۔ کمرے میں خاموشی اس قدر گہری تھی کہ دیوار پر لگی گھڑی کی ٹِک ٹِک بھی کانوں میں چبھ رہی تھی۔

ثاقب سیدھا بیٹھا تھا، نظریں جھکی ہوئی مگر انداز میں ایک عجب سا اعتماد تھا۔ دوسری طرف لطیف بار بار اپنی جگہ بدل رہا تھا، اس کے چہرے پر گھبراہٹ صاف دکھائی دے رہی تھی۔

نادر علی نے گہری سانس لی، پھر بھاری آواز میں بولے:

"آپ نے پوری یونیورسٹی کا ڈسپلن خراب کیا ہے، سب طلبہ اور اساتذہ نے یہ دیکھا ہے، سب لوگ آپ دونوں سے مایوس ہیں۔"

یہ سنتے ہی لطیف جیسے موقع کی تلاش میں تھا، فوراً بول اٹھا:

"سر جی، مارا اس نے مجھے"!

ثاقب نے آہستہ سے سر اٹھایا، ایک لمحے کے لیے لطیف کو دیکھا، پھر نادر علی کی طرف رخ کر کے مضبوط لہجے میں کہا:

"اور مارا کس وجہ سے، یہ بھی بول۔"

ابھی لطیف کچھ کہتا کہ نادر علی اچانک میز پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے:

"خاموش"!

کمرے میں جیسے ہوا رک گئی ہو۔

نادر علی نے اپنی کرسی سے تھوڑا سا آگے جھکتے ہوئے ثاقب کی طرف دیکھا اور سخت لہجے میں کہا:

"ثاقب، آپ تو شرم کریں۔ یونین لیڈر ہو آپ۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے یہ دن دیکھنا پڑے گا۔ آپ کو لیڈر اس لیے بنایا تھا کہ آپ

طلبہ کی ویلفیئر دیکھیں، ان کے مسائل سنیں، ان کے ساتھ اچھا رویہ رکھیں، لیکن آپ یہاں طلبہ کے ساتھ ہی لڑائی کر رہے ہو۔"

ثاقب نے آہستگی سے سر جھکایا اور کہا:

"سوری سر، آئندہ نہیں ہو گا"...

نادر علی کے لہجے میں ذرا نرمی آئی:

"گڈ بوائے"...

مگر اسی لمحے ثاقب نے نظریں اٹھائیں، اس کی آواز میں اب نرمی نہیں بلکہ غیر معمولی سنجیدگی تھی:

"لیکن اگر کوئی بھی ہماری بہن بیٹیوں کو ہاتھ لگائے گا، تو میں اس کا ہاتھ توڑ دوں گا۔"

یہ سنتے ہی نادر علی چونک گئے۔

"کیا مطلب؟" انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔

ثاقب نے بغیر نظریں چرائے، صاف اور دوٹوک انداز میں کہا:

"مطلب صاف ہے سر جی... اس نے لڑکی کو ہاتھ لگایا، لڑکی نے مدد کے لیے پکارا، اور میں وہیں تھا۔ میں نے اس کی مدد کر دی۔"

کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

لطیف کی نظریں فرش پر جم گئیں، جبکہ نادر علی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

یہ صرف ایک لڑائی نہیں تھی...

یہ بات اب یونیورسٹی کے دالانوں سے کہیں آگے جا چکی تھی۔

نادر علی نے کرسی سے ٹیک لگائی، ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی، مگر آنکھوں میں اب بھی سختی تھی۔

انہوں نے ثاقب کی طرف دیکھا اور کہا:

"واہ! کیا بات ہے تمہاری ثاقب، ایک لڑکی کی عزت بچائی تم نے۔"

یہ سن کر ثاقب کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی، جیسے اس کے ضمیر نے اس بات پر مہر لگا دی ہو۔

مگر اگلے ہی لمحے نادر علی کا لہجہ بدل گیا، آواز میں تلخی آ گئی:

"بھوسڑیکے وہ لڑکی ہی ایسی ہے۔"

یہ جملہ سن کر ایک لمحے کو فضا جم سی گئی۔

ثاقب نے فوراً لطیف کی طرف دیکھا، جیسے اس کی آنکھوں میں جواب تلاش کر رہا ہو۔

نادر علی نے بات جاری رکھی:

"مجھے پتا چلا ہے، اس کے پیچھے پہلے بھی ایک لڑکا لڑا تھا۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

ثاقب اور لطیف دونوں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ نہ کوئی صفائی، نہ کوئی جواب۔

نادر علی نے اچانک لطیف کی طرف جھک کر تیز نظروں سے دیکھا اور بولے:

"اوئے چشمش! تمہارا کیا رشتہ ہے اُس لڑکی سے ؟"

لطیف کا گلا خشک ہو گیا۔

"جی... وہ میں..." وہ بولتے بولتے رک گیا، پھر ہمت جمع کر کے بولا،

"مجھے وہ اچھی لگتی ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں، جیسے اگلے جملے کے وار کے لیے خود کو تیار کر رہا ہو۔

نادر علی کی آواز ایک دم بھاری ہو گئی:

"بے غیرت اگر اس نے تجھ پر کیس کر دیا نا، تو سیدھا اندر ہو گا۔ تین چار سال کہیں نہیں جاتے۔ اور کیمرے بھی وہاں لگے ہیں۔"

وہ ذرا رکے، پھر سوال داغ دیا:

"کرتا کیا ہے تو؟"

لطیف نے دھیمی آواز میں جواب دیا:

"میں ٹیچر ہوں۔"

یہ سن کر نادر علی کا چہرہ سرخ ہو گیا:

"سالے کیریئر ختم ہو جاتا تیرا، کوئی نوکری نہ ملتی۔ یہ عورتیں فتنہ ہیں میرے بیٹو، ان سے بچو۔ آج کی عورت تم دونوں کے لوڑے لگوا سکتی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھا، جیسے نصیحت کر رہے ہوں مگر لہجے میں ایک عجیب سی تلخی تھی۔

آخر میں انہوں نے خاص طور پر لطیف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"اب اُس لڑکی کے پاس بھی مت جانا۔ مجھے پتا ہے وہ تمہاری کلاس فیلو ہے، لیکن پھر بھی اُس سے دور رہو۔"

کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

یہ خاموشی صرف الفاظ کی نہیں تھی...

یہ انجام کی خاموشی تھی۔

دونوں کو سخت وارننگ دے کر آخرکار معاف کر دیا گیا، اور دفتر کا دروازہ بند ہوتے ہی وہ خاموشی سے باہر نکل گئے۔

راہداری میں قدموں کی آوازیں تھیں، مگر کسی کے دل کا شور سنائی نہیں دے رہا تھا۔

—

اسی وقت یونیورسٹی کی لائبریری کے ایک کونے میں مومنہ اکیلی بیٹھی تھی۔

سامنے کھلی کتاب تھی، مگر صفحوں پر لکھے لفظ اس کی نظروں سے پھسل رہے تھے۔

آنکھیں بار بار دھندلا جاتیں، اور وہ چپکے سے دوپٹے کے کونے سے آنسو پونچھ لیتی۔

وہ خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی عادی تھی، مگر آج دل بہت بھاری تھا۔

ہر آواز اسے چونکا دیتی، ہر قدم اسے ڈرا دیتا۔

یونیورسٹی کی وہی جگہ، جو کبھی اسے سکون دیتی تھی، آج اجنبی لگ رہی تھی۔

وہ دھیمی آواز میں خود سے بولی:

"آخر میری ہی زندگی تماشہ کیوں بن گئی؟"

اس نے گہری سانس لی، مگر آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

لائبریری میں موجود خاموشی بھی آج اس کے دکھ کی گواہ بن چکی تھی۔

اسے سب سے زیادہ تکلیف اس بات نے دی کہ لڑکیوں نے ہی اس کا ساتھ نہیں دیا۔

وہ جن سے ہمدردی کی امید رکھتی تھی، وہی خاموش تماشائی بن گئیں۔

مومنہ کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر اس سے زیادہ اس کے دل میں سوال تھے۔

وہ سوچتی رہی کہ جب ایک لڑکی پر وقت پڑتا ہے تو سب سے پہلے دوسری لڑکیاں ہی کیوں منہ موڑ لیتی ہیں؟

کیا بدنامی اتنی آسان ہوتی ہے کہ سچ بولنے سے زیادہ طاقتور بن جاتی ہے؟

وہ خود سے دھیمی آواز میں بولی:

"میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا... پھر سزا مجھے ہی کیوں مل رہی ہے؟"

اسے مردوں کے الزام سے اتنا دکھ نہیں ہوا جتنا عورتوں کی بے رخی نے توڑ دیا تھا۔

ارمان اکیلا ہی لائبریری میں داخل ہوا۔

ہاتھ میں وہی پرانی سی شاعری کی کتاب تھی جس کے کنارے مڑے ہوئے تھے، جیسے اسے بار بار پڑھا گیا ہو۔ لائبریری میں خاموشی تھی، صرف پنکھے کی ہلکی سی آواز اور صفحات پلٹنے کی مدھم سرسراہٹ۔

اس کی نظر دور ایک کونے میں جا ٹھہری۔

مومنہ۔

وہ کرسی پر بیٹھی تھی، سر جھکائے، دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے۔ اس کے کندھے ہلکے ہلکے لرز رہے تھے۔

ارمان کے قدم وہیں رک گئے۔

اس کے دل میں ایک کشمکش شروع ہو گئی۔

"جاؤں یا نہیں؟"

"اگر گیا تو کہیں وہ غلط نہ سمجھ لے"...

"اور اگر نہ گیا تو؟"

وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا، پھر جیسے کسی ان دیکھے زور نے اسے آگے دھکیل دیا۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھا، جیسے لائبریری کی خاموشی بھی اس کے قدموں کی آواز برداشت نہ کر پائے۔

جونہی وہ قریب پہنچا، مومنہ نے سر اٹھایا۔

اس لمحے ارمان بالکل جم سا گیا۔

آنکھیں سرخ تھیں، پلکیں بھیگی ہوئی، رخسار آنسوؤں سے تر۔

رونے کے باعث اس کا چہرہ اور زیادہ نکھر آیا تھا۔

وہ اس حالت میں بھی عجیب سی خوبصورت لگ رہی تھی، اتنی کہ ارمان ایک لمحے کو سانس لینا بھول گیا۔

مومنہ نے اسے دیکھا اور فوراً تلخی سے بولی، آواز کانپ رہی تھی:

"تم بھی مجھ پر الزام لگانے آئے ہو؟ باقی سب کی طرح؟

میں گندی ہوں، بری ہوں، بدکردار ہوں؟

میری وجہ سے لڑکے لڑائی کرتے ہیں؟"

ہر جملہ جیسے اس کے دل سے نکل کر فضا میں بکھر رہا تھا۔

آنکھوں سے آنسو رکے نہیں، بہتے ہی گئے۔

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے مومنہ جی۔"

ارمان کی آواز میں عجیب سا سکون تھا، جیسے وہ جان بوجھ کر لہجہ نرم رکھ رہا ہو کہ کہیں وہ اور نہ ٹوٹ جائے۔

اس نے جیب سے ٹشو نکالا اور آہستگی سے اس کی طرف بڑھا دیا۔

مومنہ نے کچھ لمحے ہچکچاہٹ کے بعد ٹشو لیا۔

اس نے آنسو پونچھے، پھر بے اختیار منہ بھی صاف کر لیا۔

اس حرکت سے اس کے رخسار مزید سرخ ہو گئے۔

ارمان اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

وہ اس لمحے اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ ارمان کا دل زور سے دھڑکا۔

اسے محسوس ہوا جیسے اس کے سینے میں سانس کم پڑ گئی ہو۔

ارمان سانس نہ لے سکا۔

وہ نظریں جھکا کر کھڑا رہا، تاکہ مومنہ اس کی آنکھوں میں وہ سب نہ پڑھ لے جو وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

لائبریری کی خاموشی میں دونوں کے درمیان ایک عجیب سا سکون پیدا ہو گیا۔

مومنہ نے آنسو پونچھتے ہوئے ارمان کی طرف دیکھا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

"میں گندی نہیں ہوں، سب لوگ ایسے کیوں کہتے ہیں مجھے، ارمان؟"

ارمان نے فوراً جواب دیا، نظریں اس کے چہرے پر مرکوز:

"آپ گندی نہیں ہیں، لوگوں کی سوچ گندی ہے۔"

مومنہ نے سانس بھرتے ہوئے کہا، کچھ شکوہ، کچھ اداسی کے ساتھ:

"لڑکیاں تک میرا ساتھ نہیں دے رہی ہیں، جنہیں میں اپنا دوست کہتی تھی"...

ارمان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے آہستگی سے کہا:

"بھاڑ میں جائے وہ سب..." اور تھوڑا قریب آکر ہلکی آواز میں کہا:

"دیکھیں مومنہ جی، جو کچھ ہو گیا اسے نہیں ٹالا جا سکتا۔ اگر آپ پریشان ہوں گی یا روئیں گی تو آپ کو ہی مسئلہ ہو گا۔"

مومنہ نے سر جھکاتے ہوئے کہا، آنکھوں میں خوف اور بے بسی کے آثار کے ساتھ:

"انہوں نے میرے بابا کو بلا لیا ہے... میں بابا کی اچھی بیٹی ہوں۔ جب انہیں اس سب کا پتا چلے گا، وہ کیا سوچیں گے؟"

ارمان نے اس کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا، نرمی سے:

"جو بھی ہو، وہ آپ کے بابا سمجھ ہی جائیں گے۔ آپ انہیں سمجھا کر تو دیکھیں۔"

مومنہ کی آواز دھیمی ہو گئی:

"ارمان، میں بہت اکیلی ہوں، اس وقت میرا کوئی نہیں ہے"...

ارمان آہستہ آہستہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مومنہ نے سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

ہچکیاں اب بھی مسلسل آ رہی تھیں، لیکن اس کے آنسو کچھ کم ہو گئے تھے۔

ارمان نے سر جھکاتے ہوئے دھیرے سے کہا، آواز میں وہ سکون جو مومنہ برسوں سے تلاش کر رہی تھی:

"آپ میرے ساتھ محفوظ ہیں"...

مومنہ نے آہستہ سانس بھرتے ہوئے اپنے سر کو اور قریب کر لیا، اور پہلی بار اس نے محسوس کیا کہ کوئی واقعی اس کا درد سمجھ رہا ہے، کوئی اسے بچا رہا ہے۔

لائبریری کی خاموشی، کتابوں کی خوشبو، اور باہر کے ہلکے ہوا کا جھونکا یہ سب لمحہ کو اتنا جادوئی بنا رہے تھے کہ ارمان اور مومنہ دونوں کو محسوس ہوا، جیسے وقت رک گیا ہو۔

کوئی اگر آنکھ بند کر کے آپ پر بھروسہ کرے، تو اُسے یہ احساس مت دِلانا کہ وہ اندھا ہے۔۔۔

دوسری طرف، سکندر یونیورسٹی کی چھت پر اکیلا بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں سگریٹ، دھواں آہستہ آہستہ فضا میں گھل رہا تھا، لیکن دل کہیں اور ہی کھویا ہوا تھا۔ ہر طرف مومنہ کا ذکر سنائی دے رہا تھا، ہر کوئی اس کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ لیکن سکندر جانتا تھا کہ یہ سب محض باتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود کتنا تنہا ہے۔ سب کے سامنے ہنسنا، سب کو خوش رکھنا، یہ سب محض ایک پردہ تھا۔ اندر سے وہ خالی تھا، اکیلا۔ زندگی نے اسے اکیلا ہونا سکھا دیا تھا، اور اب وہ سمجھ چکا تھا کہ کسی پر مکمل بھروسہ کرنا خطرناک ہوتا ہے۔

اچانک اس کی نظر سامنے والی عمارت کی کھڑکی پر پڑی۔ وہ پل والی لڑکی تھی۔ دل میں ایک عجیب سا اضطراب چھا گیا۔ دل چاہ رہا تھا کہ وہ فوراً وہاں جائے، اس سے بات کرے، لیکن دماغ کہہ رہا تھا کہ رک، سوچ۔ "کیا میں اس کے پاس جاؤں؟ یا دور ہی رہوں؟ کیا یہ صحیح ہو گا؟" سکندر خود سے لڑ رہا تھا۔ دل کی خواہش اور عقل کی ہچکچاہٹ میں وہ الجھا ہوا تھا۔

کچھ لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے فیصلہ کیا۔ سگریٹ کو زور سے بجھایا، جیب میں ڈال دیا تاکہ ضائع نہ ہو، اور دل کی دھڑکن کو قابو میں رکھتے ہوئے چھت سے نیچے اترنا شروع کیا۔ وہ دوڑتا ہوا لان کراس کر رہا تھا، ہر طرف دیکھتا رہا، لڑکی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ لیکن جیسے ہی وہ عمارت کے قریب پہنچا، وہ لڑکی دوبارہ غائب ہو گئی۔

سکندر کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ "کیا مومنہ کو اس کا پتہ ہے؟ کیا مجھے مومنہ سے پوچھنا چاہیے؟ یا پھر خاموشی بہتر ہے؟" وہ اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ وہ سچ پوچھ لے، مگر اکسانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ہر قدم کے ساتھ اس کے اندر کشمکش بڑھ رہی تھی، اور ہر لمحہ وہ خود کو الجھا ہوا پا رہا تھا کہ کیا جو کچھ اس نے مومنہ کے ساتھ کیا، وہ درست تھا یا غلط۔

تبھی اچانک کسی نے زور سے آواز دی:

"اوئے پل والے لڑکے"!

"اوئے پل والے لڑکے"!

آواز سنتے ہی سکندر کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کو رک سی گئی۔

اس نے آہستہ سے پیچھے مڑ کر دیکھا تو حیرت اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

وہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے وہ سب کچھ بھول گیا یونیورسٹی، شور، خود کو۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر زبان ساتھ نہ دے سکی۔

"اَ... آپ یہاں؟"

وہ ہکلاتے ہوئے بولا، جیسے خود ہی اپنے سوال پر شرمندہ ہو۔

"تو مجھے کہیں اور ہونا چاہیے تھا؟"

اس کی آواز میں ہلکی سی تلخی تھی، جیسے وہ پہلے ہی دفاع میں ہو۔

"میرا مطلب کچھ اور تھا،"

سکندر نے فوراً وضاحت دی، مگر گھبراہٹ اس کے لہجے سے صاف جھلک رہی تھی۔

"یعنی کہ میں پڑھ نہیں سکتی؟"

"میں نے کب ایسا کہا"!

وہ چونک کر بولا، دل ہی دل میں خود پر غصہ آ رہا تھا کہ بات کہاں جا رہی ہے۔

"لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔"

"اصل میں"...

اس نے ایک لمحہ توقف کیا،

"میں نے آپ کو اُس دن دوبارہ کینٹین میں دیکھا تھا، تو حیران ہو گیا تھا۔"

"حیران کس وجہ سے؟"

اس کی نظریں سکندر کے چہرے پر جمی تھیں۔

"وجہ آپ پوچھ رہی ہیں؟"

سکندر نے بے اختیار کہا، جیسے سوال نے اس کے اندر کچھ چھیڑ دیا ہو۔

"نہیں، پوچھ نہیں سکتی کیا؟"

"جی، پوچھ تو سکتی ہیں،"

اس نے سانس لیتے ہوئے کہا،

"لیکن جو کچھ اُس دن پل پر ہوا تھا، اُس کے بعد حیران ہونا تو ظاہر تھا۔"

"اچھا۔"

وہ خاموش ہو گئی۔

اس خاموشی میں ایک انجانی سختی تھی۔

"ویسے مجھے یہ جان کر واقعی حیرت ہوئی کہ آپ میری ہی یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں،"

سکندر نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

وہ فوراً بول پڑی،

"تم سے زیادہ مجھے حیرت ہوئی کہ ہماری یونیورسٹی ایک ہے۔ اُس دن کینٹین میں دیکھا تو سمجھ نہیں آیا کیا بولوں۔"

"ویسے"...

اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا،

"آپ مومنہ کو جانتی ہیں؟"

"ہاں، ہمارے فیمینسٹ کلب میں وہ بھی ہے۔"

یہ سنتے ہی سکندر کے چہرے پر ایک لمحے کو مایوسی تیر گئی

وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کیوں۔

"تمہیں عورتوں سے مسئلہ ہے؟"

اس نے تیکھے لہجے میں کہا،

"تبھی ایسی شکل بنا رہے ہو۔"

"نہیں، نہیں"!

سکندر فوراً بول اٹھا،

"میں نے کب ایسا کہا"!

پھر جیسے خود کو ثابت کرنا ضروری ہو، وہ قدرے جذباتی ہو گیا۔

"I am a feminist, I support women"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے مٹھی ہوا میں ماری۔

"پورے ڈرامے ہو تم"!

یہ کہتے ہی وہ ہنس پڑی۔

اس کی ہنسی میں شوخی بھی تھی اور ایک انجانی سی تھکن بھی، جیسے وہ سب کچھ مذاق میں اُڑا دینا چاہتی ہو۔

"ویسے میں خودکشی کا تو نہیں سوچتا نا؟"

اس نے طنزیہ لہجے میں کہا، مگر آنکھوں میں ایک لمحے کو سنجیدگی جھلک گئی۔

"تمہاری تو"...

وہ بات ادھوری چھوڑ کر اس کے قریب آگئی۔

سکندر کا قد اس سے خاصا اونچا تھا۔

وہ بس اس کے سینے تک ہی آسکتی تھی۔

اس نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا

نظروں میں چیلنج بھی تھا، غرور بھی۔

"بڑی ہوں میں تم سے، عزت کرو میری۔"

"ٹھیک ہے آنٹی جی".

سکندر نے بے ساختہ کہا، جیسے جان بوجھ کر چھیڑنا چاہتا ہو۔

"کس کو آنٹی بولا؟"

اس کی آواز میں اب ہنسی نہیں تھی۔

"کسی کو نہیں۔۔"

سکندر نے فوراً منہ دوسری طرف کر لیا، مگر ہونٹوں پر دبی مسکراہٹ صاف نظر آرہی تھی۔

"ایک تو تم لڑکوں کا قد اتنا بڑا ہوتا ہے،

ساری عقل گھٹنوں میں ہی رہ جاتی ہے"!

"At least مجھے اپنی زندگی سے پیار تو ہے،"

سکندر نے پھر اسے تپایا،

مگر اس بار لہجہ ہلکا نہیں تھا۔

"اس کی ایک وجہ تھی،"

وہ منہ پھلاتے ہوئے بولی،

آواز میں ضد بھی تھی اور کوئی چھپا ہوا درد بھی۔

"زندگی ختم کرنے کی بھی کوئی وجہ؟"

سکندر کا یہ جملہ سنتے ہی

وہ بالکل خاموش ہو گئی۔

"وہ میں".....

وہ بولنے ہی والی تھی کہ اچانک پیچھے سے آواز آئی۔

"نادیہ جی! کہاں رہ گئی ہیں؟"

نادیہ نے چونکے بغیر پلٹ کر جواب دیا،

"بس آ ہی رہی تھی۔"

یہ مومنہ تھی، جو اسے لینے آئی تھی۔

مومنہ کی نظر جیسے ہی سکندر پر پڑی،

وہ ایک لمحے کو رک گئی

حیرت اس کے چہرے سے صاف جھلک رہی تھی۔

"یہ آپ کس کے ساتھ کھڑی ہیں؟"

مومنہ نے سوال کیا، مگر لہجہ ایسا تھا جس میں جواب کی گنجائش کم تھی۔

اس نے نادیہ کا ہاتھ پکڑا

اور بغیر کچھ کہے

اسے اپنے ساتھ لے کر چل دی۔

نادیہ نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بھی زحمت نہ کی۔

سکندر وہیں کھڑا رہ گیا۔

اسے یوں لگا جیسے

سب کے سامنے

اس کی غیر ضروری موجودگی پر

ایک خاموش مہر لگا دی گئی ہو۔

دل میں ہلکی سی چبھن تھی،

مگر وہ ایک اچھا مرد بھی تھا

اسی لیے خاموش رہا،

کوئی شکوہ، کوئی آواز نہیں۔

نادیہ مومنہ کے ساتھ آگے بڑھ چکی تھی۔

اور سکندر؟

وہ ان دونوں کو جاتے دیکھ کر

آہستہ سے ہنس پڑا۔

"نادیہ... یعنی میری بگو۔"

لطیف کی زندگی یونیورسٹی میں اب کسی عذاب سے کم نہ رہی تھی۔

جو راہداریاں کبھی اس کے قہقہوں سے گونجتی تھیں، اب وہی جگہیں اس کے لیے اجنبی ہو چکی تھیں۔ ہر نظر میں سوال تھا، ہر سرگوشی میں اس کا نام۔

گھر والوں کو یونیورسٹی بلانے کی بات جیسے ہی اس تک پہنچی، اس کے اندر ایک خوف سا بیٹھ گیا۔ وہ اس بات کو ٹالنا چاہتا تھا، وقت خریدنا چاہتا تھا، شاید کوئی معجزہ ہو جائے اور یہ معاملہ خود ہی دب جائے۔ مگر اندر ہی اندر اسے اس بات کا شدید افسوس بھی تھا کہ اس نے انجانے میں کیا حرکت کر دی تھی ایک لمحے کی نادانی نے اس کی ساری پہچان بدل دی تھی۔

اب حالت یہ تھی کہ جس کسی کو وہ اپنا سمجھتا تھا، وہ سب اس سے کترانے لگے تھے۔ نہ کوئی آواز دیتا، نہ کوئی پاس آکر بیٹھتا۔ ہنسی مذاق تو بہت دور کی بات تھی، لوگ اس کی طرف دیکھ کر نظریں چرا لیتے تھے۔ وہ تنہا ہو چکا تھا، بالکل اکیلا۔

اسی خاموشی کے بوجھ کے ساتھ وہ مام ساجدہ کی انگلش کلاس میں بیٹھا تھا۔ کلاس روم بھرا ہوا تھا، مگر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اکیلا کسی خالی کمرے میں بیٹھا ہو۔ سامنے بورڈ پر لکھے الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے دھندلا رہے تھے۔ مام ساجدہ پڑھا رہی تھیں، مگر اس کے کانوں تک الفاظ نہیں پہنچ رہے تھے۔

ہر گزرتا لمحہ اس کے دل پر بوجھ بن رہا تھا۔

اسے بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ

کاش وقت پیچھے لوٹ جاتا...

کاش وہ لمحہ دوبارہ آتا ہی نہ۔

عورت کو اُس کی مرضی کے بغیر چھونا صرف ایک گناہ نہیں،

یہ انسان ہونے سے گر جانے کا اعلان ہوتا ہے۔

سکندر اُسے بڑی غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ لطیف کی حالت نے اُس کے دل میں ہلکی سی تشویش کیوں پیدا کر دی ہے۔ وہی لطیف، جس سے اُسے کبھی نفرت تھی، آج کسی عجیب سی کمزوری کی

علامت لگ رہا تھا۔ سکندر نے نظریں ہٹا لیں، جیسے اپنے ہی خیال سے شرمندہ ہو گیا ہو۔

اسی لمحے مام ساجدہ کی آواز کلاس میں گونجی۔

"مجھے ثاقب پر بہت غصہ آ رہا ہے۔ وہ لطیف کو اس طرح گھسیٹ کر لے جا رہا تھا، کوئی اس طرح کرتا ہے؟ یہ بھی کوئی طریقہ ہے؟ کتنی غلط حرکت ہے یہ"!

میم ساجدہ کے لہجے میں سختی تھی، مگر ساتھ ہی ایک الجھن بھی۔ کلاس میں ہلکی سی سرگوشیاں پھیل گئیں۔

مومنہ لڑکیوں کے درمیان بیٹھی تھی۔ یہ بات سنتے ہی اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اُس نے بے اختیار اپنے ہاتھ آپس میں بھینچ لیے۔ وہ اس واقعے کو بھول جانا چاہتی تھی، دل و دماغ سے مٹا دینا چاہتی تھی، مگر یہ حادثہ بار بار کسی زخم کی طرح اُس کی زندگی میں واپس آ جاتا تھا۔

تبھی شاہویر نے ہمت کر کے بات کی۔

"میم، اس نے بھی تو غلط حرکت کی تھی۔ ایک عورت پر ہاتھ اٹھایا تھا اُس نے۔"

یہ سنتے ہی کلاس کے کئی لڑکوں نے تائید میں سر ہلائے، کچھ نے دبے لفظوں میں "بالکل" کہا۔ سکندر نے بھی آگے بڑھ کر شاہویر کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دی، جیسے خاموش حمایت ہو۔

مام ساجدہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئیں۔ شاید اُن کے پاس فوراً کوئی جواب نہ تھا، یا شاید حقیقت کا بوجھ اُن کے الفاظ روک رہا تھا۔ پھر انہوں نے رخ لطیف کی طرف کیا۔

"لطیف، آئندہ اپنا خیال رکھو۔ خود کو کنٹرول کرنا سیکھو۔ یہ چیزیں بہت بڑے مسئلے پیدا کرتی ہیں۔"

کلاس پر ایک گہری خاموشی چھا گئی۔

مام ساجدہ نے بات کو سمیٹتے ہوئے قدرے نرم مگر واعظانہ لہجے میں کہا:

"آپ لوگ ابھی میچور ہوئے ہو، جسم اس عمر میں بہت سی چیزیں ڈیمانڈ کرتا ہے۔ صبر سے کام لو، سب کی شادیاں ہو جائیں گی اِن شاء اللہ۔ میری بھی ابھی ریسنٹلی ہوئی ہے، دیکھو میں نے کتنا صبر کیا ہو گا۔"

یہ کہتے ہوئے اُن کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی، جیسے اپنی مثال دے کر بات کو ہلکا کرنا چاہ رہی ہوں۔

سکندر یہ سن کر چونک گیا۔ اُس نے کرسی پر ذرا سا پہلو بدلا، ایک پل کے لیے سوچا اور پھر بے ساختہ منہ سے نکل گیا:

"یہی تو افسوس ہے کہ... آپ کی شادی ہو گئی۔"

ایک لمحے کو کلاس میں سناٹا چھا گیا، اور اگلے ہی لمحے قہقہوں کا طوفان آ گیا۔

لڑکے بھی ہنس پڑے، لڑکیاں بھی۔

مومنہ نے بے اختیار ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا، مگر آنکھوں میں ہنسی تیر گئی۔

رمشا نے زینب گل کی طرف دیکھ کر کہنی ماری، دونوں ہنسنے لگیں۔

شاہویر نے میز پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا۔

لطیف بھی، جو کافی دیر سے بجھا بجھا سا بیٹھا تھا، پہلی بار ہلکا سا مسکرا دیا۔

میم ساجدہ نے چشمہ ٹھیک کرتے ہوئے سکندر کو گھورا، مگر ہنسی وہ خود بھی نہ روک سکیں۔

"بہت بدتمیز لڑکا ہے یہ!" انہوں نے کہا، مگر لہجے میں خفگی کم اور مزاح زیادہ تھا۔

سکندر نے معصوم سا چہرہ بنالیا، جیسے کہنا چاہ رہا ہو:

کہہ تو بس دل کی بات دی تھی۔

کلاس کا ماحول چند لمحوں کے لیے ہلکا ہو گیا۔

سکندر نے ذرا گردن موڑ کر شاہویر کی طرف دیکھا۔

"ارمان اور دانیال کدھر ہیں؟" اُس کی آواز میں ہلکی سی بے چینی تھی۔

شاہویر نے کندھے اچکائے۔

"پتا نہیں... ارمان کو تو صبح میں نے لائبریری میں دیکھا تھا۔"

"اچھا..." سکندر نے بس اتنا ہی کہا، مگر اُس کی نظر کہیں اور اٹک گئی تھی۔

"اچھا کیا؟" شاہویر نے چونک کر پوچھا، "مومنہ تو اُس کے بالکل ساتھ لگی ہوئی تھی۔"

سکندر ایک دم چونکا۔

"کیا کہہ رہا ہے تُو؟ سچی؟"

شاہویر نے ہنستے ہوئے آنکھ ماری۔

"مجی جانی، اُس کالے کی تو موج لگ گئی ہے۔ اتنی خوبصورت لڑکی اُس کو مل گئی"!

"خوبصورت لڑکی..." سکندر نے آہستہ سے دہرایا۔

اُس کے ذہن میں بے اختیار نادیہ کا چہرہ ابھرا، پل والی لڑکی، تیز لہجہ، شوخ آنکھیں۔

"کون؟" شاہویر نے فوراً پوچھا۔

"مومنہ کی ایک دوست ہے،" سکندر نے سنبھل کر کہا،

"ہم سب سے عمر میں کافی بڑی ہے، لیکن... ہے بہت اچھی۔"

شاہویر نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

"اوہ! تو جناب کو کوئی لڑکی اچھی لگی ہے؟"

سکندر ذرا سا گھبرا گیا۔

"نہیں نہیں... میرا مطلب ہے کہ اُس کا نیچر اچھا ہے، بات کرنے میں ٹھیک ہے۔"

اُس نے جلدی سے خود کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں، پھر ٹھیک ہے بھائی،" شاہویر نے ہنستے ہوئے کہا،

"ویسے وہ کون سے ڈیپارٹمنٹ کی ہے اور کون سے سمیسٹر کی؟"

سکندر نے صاف جواب دیا۔

"پتا نہیں۔"

شاہویر نے آنکھیں پھیلا دیں۔

"ہیں؟ کیا مطلب پتا نہیں؟"

"نہیں پتا مجھے... کچھ بھی نہیں،" سکندر نے کندھے جھکا دیے۔

شاہویر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"تو پتا کریں نا بھائی"!

سکندر خاموش ہو گیا۔

دل کے کسی کونے میں ایک عجیب سی کھنچاؤ نے جنم لیا

جس کا نام وہ خود بھی ابھی نہیں رکھ پا رہا تھا۔

"ویسے اگر وہ مومنہ کی دوست ہے تو آپ کو اُسی سے ہی پتا کرنا ہو گا،"

شاہویر نے سادہ سی بات کہی۔

سکندر نے ہلکی سی کڑوی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

"یہی تو مسئلہ ہے۔"

شاہویر نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

"کیسا مسئلہ ؟ مومنہ تو آپ کی بہت عزت کرتی ہے۔"

سکندر کے چہرے پر ایک لمحے کو سختی آگئی۔

"خاک عزت کرتی ہے... ہم دونوں تو ایک دوسرے کے جانی دشمن بنے ہوئے ہیں۔"

"کیا مطلب ؟" شاہویر کی بھنویں اُٹھ گئیں۔

سکندر نے بات کو وہیں روک دیا۔

"کچھ نہیں... جانے دو۔"

پھر ذرا توقف کے بعد، جیسے خود کو سمجھا رہا ہو، بولا:

"کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔"

شاہویر نے اُسے غور سے دیکھا، جیسے کہنا چاہتا ہو کہ

کچھ راستے خود نہیں نکلتے،

انہیں چُنا جاتا ہے

اور اُس انتخاب کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔

یونیئن کلب کے کمرے میں ہلکی روشنی میں دھواں گھل رہا تھا۔ میز کے کونے میں ثاقب اور ذیشان بیٹھے تھے، ہاتھ میں سگریٹ لیے، دھیرے دھیرے دھواں اُڑاتے ہوئے، ماحول میں ایک عجیب سا سکون اور پرجوش سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرف ہلکی ہلکی سرسراہٹ تھی، مگر ان دونوں کے درمیان ایک نوع کی خاموش طاقت محسوس ہو رہی تھی۔

ثاقب نے دھیرے سے لیکن پختہ اور سنجیدہ لہجے میں کہا،

"اب وہ لڑکی تیری ہے، کوئی اُس کے قریب نہیں۔"

اس کے الفاظ میں نہ صرف حکم تھا بلکہ ایک طرح کی ذمہ داری کی گونج بھی تھی۔ ذیشان کی آنکھوں میں ایک چمک اور ہلکی سی ہنسی تھی، اُس نے ہاتھ کی انگلیوں سے دھواں پھینکتا ہوا کہا،

"واہ بھائی، کمال کر دیا۔"

یہ کہنا اور کہنا، ایک کھیل سا محسوس ہو رہا تھا لیکن یہ کھیل دل کی گہرائیوں میں ایک سنجیدہ حقیقت کو چھپا رہا تھا۔

ثاقب نے ایک لمحے کے لیے غور کیا، پھر دھیرے سے کہا،

"جا کر بات کر اُس سے۔"

ذیشان نے اُٹھتے ہوئے، اپنی پٹی ہوئی شرٹ کے بازو سیدھے کیے، اور کہا،

"جی بھائی، ٹھیک ہے۔"

لیکن جیسے ہی وہ قدم اٹھانے لگا، ثاقب نے حیرانی کے ساتھ اسے پکڑ کر اپنے قریب کر لیا،

"اوئے، کتھے چلاں اے؟"

ذیشان نے مسکرا کر، لیکن اپنے اندر موجود سنجیدگی کو چھپاتے ہوئے کہا،

"مومنہ نوملن۔"

ثاقب نے دھیرے سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، جیسے کہ اُسے یہ باور کروا رہا ہو کہ یہ لمحہ صرف جذبے اور سمجھ بوجھ کا ہے،

"بوسڑیکے، صبر کر لے، کل مل لی، شام ہو گئی ہے۔"

ذیشان نے سنا تو اُس کے لبوں پر ایک ہلکی مسکان آئی، مگر دل کی دھڑکن تیز تھی۔ ثاقب کی نظریں اُس پر مرکوز تھیں، ہر لفظ پر اُس کا دماغ گھوم رہا تھا۔ پھر ثاقب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا،

"صبر سے کام لے، جلد بازی میں کام خراب ہو گا، ابھی دیکھتے ہیں وہ لڑکی کیسی ہے، اُس کا نیچر پڑھتے ہیں، اُس کے مسائل دیکھتے ہیں، پھر اُسے محسوس کرائیں گے کہ ہم ہی اُسے بچا سکتے ہیں، میں خود اُس سے بات کروں گا، بڑا بھائی بن کر سمجھاؤں۔"

ذیشان نے ثاقب کی بات پر سر ہلا کر یقین دلایا،

"جی، صحیح ہے۔"

ثاقب نے پھر ایک لمحے کے لیے باہر کی کھڑکی کی طرف دیکھا، جہاں شام کی ہلکی روشنی کمرے میں دھندلا سا آ رہی تھی۔ دھواں اور روشنی کے بیچ ایک کشمکش چھپی ہوئی تھی جیسے وہ لمحے بھی مستقبل کے فیصلوں کی گواہی دے رہے ہوں۔ آخر میں ثاقب نے مسکراتے ہوئے کہا،

"چل، ایزی ہو جا، سُٹّا لاتے آرام کر۔"

یہ لمحہ صرف باتوں کا نہیں تھا۔ یہ اُن کی سوچ، اُن کے منصوبے، اور اُن کے جذبات کا ملاپ تھا۔ اندر ہی اندر، ذیشان محسوس کر رہا تھا کہ یہ لمحہ شاید ان کی زندگی کے سب سے اہم فیصلوں میں سے ایک کی ابتدا ہے۔ اور ثاقب، اپنے اندر ایک ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے، جان رہا تھا کہ یہ صرف کھیل نہیں، بلکہ ایک سنجیدہ راستہ ہے جہاں وہ نہ صرف لڑکی کی حفاظت کرے گا بلکہ اپنے بھائی کی طرح اُس کی رہنمائی بھی کرے گا۔

ہوا میں دھواں اور رات کی ہلکی سردی کے بیچ، یہ دونوں دوست ایک عجیب سا سکون اور پرجوش کشمکش میں گھلے ہوئے تھے، جیسے آنے والا ہر لمحہ کسی کہانی کی چپ چاپ سرگوشی کر رہا ہو۔

رات کے دس بج چکے تھے، کمرے کی ہلکی روشنی میں ٹائمر کی مدھم گھڑیاں سنائی دے رہی تھیں۔ مومنہ اپنے کمرے میں بے چینی سے چلتی رہی۔ دل دھڑک رہا تھا اور ہاتھ پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔ آخر کار اس نے ہمت جمع کی اور اپنے والد کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ آہستہ کھولا اور دھیرے سے بولی،

"بابا، مجھے آپ سے بات کرنی ہے"...

طارق انور اپنے صوفے پر بیٹھے تھے، اخبار تھامے ہوئے، مگر مومنہ کو دیکھتے ہی اُن کی نظر نرم ہو گئی۔

"بولو بیٹا، کیا ہوا؟"

مومنہ نے ایک لمحے کے لیے سانس لیا، دل کی دھڑکنیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

"بابا، وہ..." وہ بولتے بولتے رک گئی، اور خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

طارق انور نے آہستہ سے کہا،

"کوئی مسئلہ نہیں بیٹا، بولو۔"

مومنہ نے آنکھیں بند کیے دھیرے سے کہا،

"ایک لڑکے نے مجھے یونیورسٹی میں... چھیڑا تھا"...

طارق انور کا لہجہ سخت ہو گیا، آنکھوں میں تشویش اور غصے کی آمیزش تھی۔

"پھر...؟"

مومنہ نے ایک لمحے کے لیے سانس روکا اور پھر دھیرے سے بتایا،

"اس کو سامنے مارا اور آپ کو بلایا ہے... ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ نے ملنے کے لیے"...

طارق انور کچھ دیر خاموش رہے، اُن کی سوچوں کی گہرائی میں مومنہ کھڑی تھی، گھبراہٹ سے لرز رہی تھی۔ اُن کے چہرے پر اضطراب تھا مگر اندر ہی اندر وہ اپنی بیٹی کی حفاظت کے لیے پلان بنا رہے تھے۔

مومنہ نے ان کی طرف دیکھا، دل کی دھڑکن تیز، ہاتھ جوڑ لیے۔ ہر لمحہ جیسے وقت رک گیا ہو۔ وہ جان رہی تھی کہ اب سب کچھ والد کی سمجھ بوجھ پر منحصر ہے۔

مومنہ کے آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، وہ اپنے والد کے سامنے کھڑی تھی، دل میں خوف اور شرمندگی کے احساسات کے بوجھ سے دب رہی تھی۔ اُس نے زور سے سانس لیا اور دھیرے سے بولی،

"اپنے تو کچھ نہیں کیا نا؟ اگر آپ بھی اس میں انوالو ہیں تو مجھے بتا دیں"...

طارق انور نے سخت مگر محبت بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا، دل میں سوچ رہا تھا کہ اپنی بیٹی کی حفاظت کے لیے کیا بہتر قدم اٹھایا جائے۔

"نہیں بابا، میں نے ایسے کچھ نہیں کیا، وہ ہی میرے پیچھے پڑا ہوا ہے"...

یہ کہتے ہوئے مومنہ کے آنکھوں سے چند آنسو جھڑ پڑے، گالوں پر نم نشان بن گئے۔ دل کی دھڑکنیں تیز تھیں، اور وہ اپنے والد کے سامنے بے بس سی محسوس کر رہی تھی۔

طارق انور نے اُس کے شانہ سے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا،

"پھر ٹھیک ہے، اُس لڑکے سے بھی بات کروں گا میں، اور کل آجاؤں گا یونیورسٹی کے اندر آپ کے ساتھ"...

مومنہ نے سر ہلایا اور دھیرے سے کہا،

"ٹھیک ہے بابا"...

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف روانہ ہو گئی، قدم آہستہ آہستہ، دل میں خوف اور امید کے ملی جلی کیفیت کے ساتھ۔

طارق انور کے ذہن میں خود سے باتیں جاری تھیں۔

"پتہ نہیں، میں نے اسے یونیورسٹی بھیج کر صحیح کیا یا نہیں... سب لوگوں نے مجھے منع کیا تھا کہ جوان لڑکی ہے، بگڑ جائے گی، یونیورسٹی نہ بھیجو"...

وہ اپنے فیصلے پر سوچ رہے تھے، اندر ہی اندر خوف اور ندامت کے احساسات اُبھرتے رہے، مگر ساتھ ہی دل میں یہ امید بھی تھی کہ ان کی بیٹی کوئی غلط حرکت نہیں کر سکتی اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

مومنہ اپنے کمرے میں خاموش بیٹھی تھی، دل اور دماغ میں ہر بات گھوم رہی تھی جو یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ سکندر سے بات کرنا ضروری ہے۔ فون اٹھایا، اور اسے میسج لکھا۔

سکندر اپنے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا، تھکن اور الجھن کے عالم میں۔ اس نے فون کی سکرین پر مومینا کا نام دیکھا۔ میسج کھولا اور پڑھا۔ چند لمحوں کے لیے وہ فون کو کنارے پر رکھ کر سوچنے لگا۔

مومنہ نے دوبارہ میسج کیا:

"پلیز... میری بات سنو"...

کچھ دیر کے بعد اس نے مزید لکھا:

"بہت ضروری ہے۔ کل بابا کے ساتھ یونیورسٹی جانا ہے۔ تم جیسے بھی ہو، لیکن سمجھدار ہو۔ بابا سے ملنا اور انہیں صورتحال سمجھا دینا۔"

سکندر نے مختصر سا جواب بھیجا: "اوکے"۔ پھر وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش بیٹھا، سوچ رہا تھا کہ کل کا دن کیسے گزرے گا اور اسے کس طرح ہر

چیز سنبھالنی ہو گی۔ دل میں ایک ہلکی سی فکر اور تجسس دونوں اٹھی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر بعد سکندر نے دوبارہ میسج کیا:

"مجھے بھی تم سے ایک کام ہے۔"

مومنہ نے فوراً جواب دیا:

"کیا؟"

سکندر نے آرام سے لکھا:

"وہ... میں کل بتاؤں گا۔"

فون دوبارہ خاموش ہو گیا، مگر سکندر کے دل میں ایک غیر محسوس کشمکش جاگی ہوئی تھی سوچ، تجسس اور بے چینی کے بیچ وہ کھڑا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کل کا دن صرف ملاقات نہیں، بلکہ ایک موقع ہو گا، جس سے بہت کچھ بدل سکتا ہے۔

آج ارمان کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹا، اپنی سوچوں میں گم تھا۔ دل اور دماغ دونوں میں ایک عجیب سی بے چینی تھی، ایک سوال بار بار اس کے ذہن میں گھوم رہا تھا.

اسی لمحے ایمان نور اس کے پاس آئیں۔

"بیٹا، آج آپ کو نیند نہیں آ رہی؟"

ارمان حیران ہوا اور تھوڑا جھجک کر بولا،

"پتہ نہیں ماما، بس سویا نہیں جا رہا۔"

ایمان نور کی آنکھوں میں فکر جھلک رہی تھی، وہ قریب آ کر بولیں،

"کیا ہوا بچّے؟ کیوں پریشان ہو؟"

ارمان نے سنجیدہ انداز میں کہا،

"ایک بات سوچ رہا ہوں... کہ کیا میں ایک اچھا ہسبینڈ بھی بن پاؤں گا یا نہیں۔"

یہ سن کر ایمان نور زور زور سے ہنسنے لگیں۔

ارمان نے تھوڑا ناراض اور شرمندہ سا لہجہ اپنایا،

"کیا ہوا اماں؟ آپ ہنس کیوں رہی ہیں؟"

ایمان نور نے مسکرا کر کہا،

"یعنی کوئی لڑکی ہے، ہے نا؟"

ارمان کا چہرہ فوراً لال ہو گیا۔ وہ جھجک رہا تھا، اور اپنی بات کو ٹالتے ہوئے بولا،

"ایسا کچھ نہیں ماما، میں صرف سوچ رہا تھا"...

چند لمحے خاموشی کے بعد دونوں ہنس پڑے، ہنسی میں ارمان کی پریشانی اور ماں کی محبت دونوں کا امتزاج تھا۔ وہ لمحہ کچھ خاص تھا ایک چھوٹی سی ہنسی، ایک ہلکی سی فکر، اور دل کے اندر چھپی محبت کا احساس۔

ارمان نے مسکرا کر کہا،

"ایک لڑکی ہے، ویسے.... ۔"

وہ لمحہ ہلکا سا خوشی سے بھر گیا، جیسے دل میں کوئی امید جاگ گئی ہو۔

"واہ... ادھر میں نومان کو بولتی تھی کہ وہ بدماش ہے، لیکن میرا شریف بیٹا اُس سے آگے نکل گیا۔"

*_اس قدر بوجھ ہے آنکھوں پہ میرے خوابوں کا_*

*_میں نے تھک ہار کے سونا نہیں مر جانا ہے_*

ارمان نے مسکرا کر کہا،

"ایک لڑکی ہے، ویسے... ۔"

وہ لمحہ ہلکا سا خوشی سے بھر گیا، جیسے دل میں کوئی امید جاگ گئی ہو۔

"واہ... ادھر میں نومان کو بولتی تھی کہ وہ بدماش ہے، لیکن میرا شریف بیٹا اُس سے آگے نکل گیا۔"

ایمان نور اپنے بیٹے کی باتیں سن کر حیران بھی تھیں اور دل ہی دل میں خوش بھی ہو رہی تھیں۔ اُن کے چہرے پر ایک نرم سی مسکراہٹ تھی، جیسے وہ ارمان کے اندر آنے والی اس تبدیلی کو محسوس کر رہی ہوں۔

"میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں ماما،" ارمان نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیسا وعدہ میرے بیٹے؟" ایمان نور نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

ارمان نے بغیر جھجک کے کہا،

"میں آپ سے کبھی دور نہیں ہوں گا، ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گا۔ کوئی بھی لڑکی مجھے آپ سے دور نہیں کر سکتی۔"

ایمان نور نے اُسے غور سے دیکھا، اُن کی آنکھوں میں پیار کے ساتھ ساتھ ایک گہری سمجھ بھی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرائیں اور بولیں،

"نہیں بیٹا، میں چاہتی ہوں آپ اپنی بیوی کو اپنی پہلی ترجیح دینا، اُس کی کیئر کرنا... میں اسی میں خوش ہوں گی۔ جو چیز مجھے نہیں مل سکی، میں چاہتی ہوں وہ میری بہو کو ملے۔ مجھے امید ہے تم ایک اچھے شوہر بنو گے۔"

ارمان یہ سن کر چونک گیا، جیسے اُس نے یہ جواب سوچا ہی نہ ہو۔

"کیا آپ کو واقعی ایسا لگتا ہے؟" اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔

ایمان نور نے ایک لمحے کے لیے سنجیدہ چہرہ بنایا، پھر اچانک ہنس پڑیں،

"نہیں"!

کمرے میں اُن کی ہنسی گونج اٹھی، اور ارمان اُنہیں دیکھ کر مسکرا دیا

جیسے اُس نے پہلی بار محبت کو ایک نئے زاویے سے سمجھا ہو۔

سات سال بعد...

صبح کے آٹھ بجے...

گھر میں ہلکی سی خاموشی تھی، بس موبائل فون کی مسلسل بجتی ہوئی گھنٹی اس سکون کو توڑ رہی تھی۔

"کب سے فون بج رہا ہے نومان، تم اٹھا کیوں نہیں رہے؟" ایمان نور نے اپنے چھوٹے بیٹے سے کہا۔

نومان نے کروٹ بدلتے ہوئے لاپرواہی سے جواب دیا،

"ماما، رَونگ نمبر ہے، کیوں اٹھاؤں؟"

ایمان نور نے ہلکی سی ڈانٹ کے انداز میں کہا،

"ایک تو تم آج کل کی جنریشن، نیا نمبر دیکھ کر ایسے گھبراتے ہو جیسے اٹھاتے ہی دھماکہ ہو جائے گا۔"

نومان نے بے دلی سے فون اٹھایا،

"اچھا ماما، یہ لیں اٹھالیا"...

اس نے کال رسیو کی،

"ہیلو... کون؟... جی وعلیکم السلام... جی جی، میں اُن کا چھوٹا بھائی ہوں... آپ کون؟"...

اس کی آواز آہستہ آہستہ بدلنے لگی، چہرے کا رنگ اڑ گیا، آنکھوں میں گھبراہٹ صاف نظر آنے لگی۔

"کیا ہوا نومان؟ کون ہے فون پر؟" ایمان نور فوراً اس کے قریب آئیں۔

نومان نے بمشکل الفاظ نکالے،

"ماما... میو ہسپتال سے فون ہے"...

ایمان نور کا دل ایک لمحے کو رک سا گیا،

"کس کا فون؟ کیا ہوا ادھر؟"

نومان کے ہونٹ کانپ رہے تھے،

"ارمان بھائی کا... ایکسیڈنٹ ہو گیا... وہ کوما میں ہیں"...

یہ سنتے ہی ایمان نور کے ہاتھ سے دوپٹہ ڈھلک گیا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور وہ بے اختیار چیخ اٹھیں،

"ہائے اللہ... میرا ارمان"!...

گھر کی فضا ایک لمحے میں بدل گئی

خاموشی، خوف اور ٹوٹتے دلوں کی آوازیں ہر طرف پھیل گئیں...

"میرے بیٹے کی زندگی کیا ہے... پہلے بھی اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور اب پھر سے..." ایمان نور روئے جا رہی تھیں۔ اُن کی آواز ٹوٹ رہی تھی، آنکھوں سے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ نومان نے فوراً آگے بڑھ کر انہیں سنبھالا، کندھے پر ہاتھ رکھا جیسے اُن کے بکھرتے حوصلے کو تھام رہا ہو۔

"ماما، رونے کا وقت نہیں ہے، فوراً ہسپتال چلیں... بھائی کو ہماری ضرورت ہے۔"

نومان کی آواز میں عجلت بھی تھی اور مضبوطی بھی۔ ایمان نور نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کیں، جیسے خود کو سنبھال رہی ہوں، پھر گہری سانس لے کر اپنے آنسو پونچھے۔

نومان تیزی سے باہر نکلا، گیراج سے بائیک نکالی، انجن کی آواز صبح کی خاموشی کو چیرتی ہوئی گونج اُٹھی۔ ایمان نور جلدی سے پیچھے بیٹھ گئیں۔

اسی دوران رحمان شیخ نے دروازے سے آواز دی،

"نومان، کدھر جا رہے ہو؟"

نومان رکنے ہی لگا تھا کہ ایمان نور نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ اُن کی آنکھوں میں ایک عجیب سا خوف تھا جیسے وہ ابھی کچھ بھی بتانے کی حالت میں نہ ہوں۔

نومان نے کچھ کہے بغیر بائیک اسٹارٹ کی اور اگلے ہی لمحے دونوں تیزی سے نکل پڑے۔

رحمان شیخ وہیں کھڑے رہ گئے، حیران...

یہ ماں بیٹا آخر اتنی جلدی میں کہاں جا رہے تھے؟

اور رات کی سڑک پر دور جاتی بائیک کے ساتھ، ایک انجانا خوف بھی ان کے دل میں اترتا چلا گیا...

ہسپتال کی فلور پر ہلکی سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ سفید دیواریں، مشینوں کی بیپ... اور لوگوں کے چہروں پر پھیلی پریشانی۔ شاہویر کے گھر والے پہنچ چکے تھے، سب کی نظریں ایک ہی دروازے پر جمی تھیں۔

سکندر تھوڑا دور، باہر ریلنگ کے ساتھ کھڑا تھا۔ ہاتھ میں سگریٹ، اور دھواں آہستہ آہستہ ہوا میں چھوڑ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر تھکن بھی تھی اور الجھن بھی۔

دانیال باہر آیا اور اُس کے پاس آ کر رکا۔

"میں نے ارمان کے گھر کال کی ہے، اُس کے بھائی نے اٹھائی... وہ آ رہا ہے ملنے۔"

"اچھا..." سکندر نے مختصر جواب دیا، نظریں کہیں دور جمائے ہوئے، اور ایک اور کش لے کر دھواں چھوڑ دیا۔

دانیال نے اسے غور سے دیکھا، پھر آہستہ سے پوچھا،

"کیا تم جاؤ گے؟"

"کدھر؟" سکندر نے بے دلی سے کہا۔

"مومنہ کو لانے"...

سکندر نے ایک گہری آہ بھری، جیسے اندر بہت کچھ دبا ہوا ہو۔

"میری زندگی میں جس سے بھی زیادہ قریب ہوتا ہوں، وہ مجھ سے دور ہی ہو جاتا ہے... اسی لیے کوشش کی تھی کہ سب سے دور چلا جاؤں۔ غصے کا تیز بھی ہوں... لیکن دور جا کر بھی فائدہ نہیں ہوا۔ اب سمجھ نہیں آتی، آخر غلطی کہاں ہوئی؟ کیا مومنہ کو لانے کا فائدہ بھی ہے؟ ایک ایسی لڑکی جس نے میرے دوست کو اتنا ذلیل کیا... کیا وہی اُس کی زندگی کا ذریعہ ہو گی؟ اب کہاں ہے وہ؟ مجھے لگتا ہے مومینہ ارمان کو برباد کر کے بہت خوش ہے... امیر شوہر ملا ہے، پورے گھر میں راج کرے گی۔"

دانیال نے سر ہلاتے ہوئے کہا،

"یہ تو ہے یار... فلک شبیر لاہور کا سب سے امیر بندہ ہے اس وقت۔"

سکندر نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا، نظریں زمین پر گاڑتے ہوئے بولا،

"وہی تو... مومینہ تک کیسے جاؤں گا میں؟"

دانیال نے فوراً کہا،

"اُس کی دوستوں کے پاس تو اُس کا نمبر ہو گا نا، آپ کا ہے کسی سے کانٹیکٹ؟"

سکندر نے تھوڑا سوچ کر کہا،

"زینب گل کی شادی ہو گئی، وہ اپنے شوہر سے بہت loyal ہے، فون بھی نہیں اٹھائے گی... رمشا ابھی تک کنواری ہے، لیکن اُس سے میری نہیں بنتی"...

اتنے میں نومان نے اچانک کہا،

"اور نادیہ...؟"

سکندر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔

"پتا نہیں"...

دانیال نے فوراً بات پکڑی،

"پتا نہیں کیا؟ آپ کی اُن سے تو بہت بات ہوتی تھی، اور اُس دن جو ہوا... وہ سب کیسے بھول سکتے؟"

سکندر نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا،

"کس دن؟"

دانیال نے سیدھا جواب دیا،

"کلچر ڈے پر"...

یہ سنتے ہی سکندر کے ہاتھ میں پکڑی سگریٹ ہلکی سی لرز گئی...

اور اُس کے ذہن میں وہ دن ایک دم سے زندہ ہو اٹھا۔

"جب سے کلچر ڈے کی اناؤنسمنٹ ہوئی ہے، سب بہت خوش نظر آرہے ہیں" زینب گل نے رمشا سے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے، ہم لڑکیوں کے زیادہ مزے ہوں گے، میں تو فل پنجابی لک کروں گی زینب" رمشا نے جوش سے کہا۔

"واہ رمشا، میں بھی اپنا بلوچی لک کر کے آؤں گی، بہت مزہ آئے گا" زینب گل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ دونوں گرلز سائیڈ بینچ پر بیٹھی تھیں۔ کلاس میں ایک الگ ہی رونق تھی، ہر کوئی آنے والے کلچر ڈے کے بارے میں بات کر رہا تھا، جیسے چند دن بعد کوئی تہوار آنے والا ہو۔

اسی ہنگامے کے بیچ مومینہ بھی وہیں بیٹھی تھی، مگر وہ خاموش تھی۔ زینب اور رمشا کی باتیں سن رہی تھی، لیکن وہ اب بھی اسے نظر انداز کر رہی تھیں۔ مومینا نے کچھ نہ کہا، بس نظریں جھکا کر بیٹھی رہی۔

" دیکھ رہے ہو بچیوں کو کیسے خوش ہیں" شاہویر نے اپنے دوستوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تو رہنے دو خوش، اپنے کو کیا لینا دینا ان سے" سکندر نے بے پروائی سے جواب دیا۔

سب دوستوں نے ایک ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

"بھائی، تو کبھی تو خوش ہو جا" دانیال نے کہا۔

سکندر نے اسے ایک عجیب سی نظر سے دیکھا، جیسے خوشی اس کے لیے کوئی معمولی چیز نہ ہو۔

"ہاں سکندر، خوش ہو یار، ہم سب تیار ہو کر آئیں گے، بہت مزہ آئے گا" ارمان نے مسکرا کر کہا اور ایک نظر مومینا کی طرف ڈالی۔

مومینہ نے یہ محسوس کیا تو ہلکا سا شرما کر اپنی نظریں دوسری طرف کر لیں۔

سکندر سب سمجھ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی سختی آ گئی۔

"فضول دن سارے پونڈل ایک ہی جگہ آئیں گے..." اس نے آہستہ سے کہا اور سر بینچ پر رکھ کر لیٹ گیا۔

دوست ایک لمحے کو چپ ہو گئے، پھر ایک ساتھ بول اٹھے،

"اوئے یار"!

وہ سب اس پر تھوڑا سا غصہ ہوئے، مگر اگلے ہی لمحے سکندر خود ہنسنے لگا

جیسے ہر بات کو مذاق میں اڑا دینا ہی اس کا طریقہ ہو۔

مومینہ اپنے بابا طارق انور کے ساتھ گھر جا رہی تھی۔ شام کا وقت تھا، سڑک پر ہلکی ہلکی روشنی پھیل رہی تھی اور ہوا میں ایک خاموشی سی تھی۔ وہ بائیک پر بیٹھی تھی، دونوں کچھ دیر سے چپ تھے۔

جیسے ہی طارق انور نے بائیک کا موڑ کاٹا، مومینا نے ہمت جمع کی اور دھیرے سے بولی،

"بابا تھوڑے دن میں یونی میں کلچر ڈے ہونے والا ہے، کیا میں اُس دن یونی جا سکتی ہوں اچھے کپڑے پہن کر؟"

طارق انور نے ایک لمحے کو خاموشی اختیار کی، جیسے اُس کی بات کو تول رہے ہوں۔ پھر آہستہ سے بولے،

"بیٹا گھر جا کر بات کرتے ہیں۔"

اُن کا لہجہ نہ سخت تھا نہ نرم... بس ایک سوچ میں ڈوبا ہوا۔

اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے۔

پورا راستہ جیسے لفظوں سے خالی ہو گیا تھا۔

مومینا اپنے ہی خیالوں میں گم تھی دل میں ہلکی سی امید بھی تھی اور انجانا سا ڈر بھی...

اور طارق انور... وہ شاید اب بھی سوچ رہے تھے کہ ایک باپ ہونے کے ناطے صحیح فیصلہ کیا ہو گا۔

گھر آکر مومینا سیدھی اپنی ماں کے پاس گئی۔ دل پہلے ہی بھاری تھا، اوپر سے آنے والے کلچر ڈے کا خیال اسے اور الجھا رہا تھا۔

نصیم بی بی نے اُسے غور سے دیکھا اور پوچھا،

"کلچر ڈے ہے؟"

"جی..." مومینا نے آہستہ سے جواب دیا۔

"کیا ہوتا ہے اس دن؟"

"سب ثقافتی کپڑے پہن کر آتے ہیں"...

"اور کیا کرتے ہیں؟"

مومینہ لب کھول کر بھی خاموش رہ گئی۔ جیسے الفاظ اس کے پاس تھے ہی نہیں۔

"بتاؤ مومینہ، کیا کرتے ہیں سب اس دن؟"

مومینہ کے پاس واقعی کوئی جواب نہ تھا... کیونکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ کلچر ڈے آخر منایا ہی کیوں جاتا ہے۔ نہ کبھی کسی نے سمجھایا، نہ کسی استاد نے اس کی اصل روح بتائی۔

شاید پہلے کے وقتوں میں یونیورسٹیاں اس دن کو سنجیدگی سے مناتی ہوں... ثقافت کو سمجھا جاتا ہو، اسے محسوس کیا جاتا ہو۔

لیکن اب... سب کچھ بس نئے کپڑوں، ہلہ گلہ اور ٹک ٹاک ویڈیوز تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

"مجھے نہیں پتا ماما... اگر آپ اجازت دیں گی تو چلی جاؤں گی، نہیں تو رہنے دوں گی۔"

نصیم بی بی نے اسے ایک معنی خیز نظر سے دیکھا اور کہا،

"ویسے تو تم بہت پردے والی بنتی ہو"...

یہ سن کر مومینا چونک گئی، جیسے کسی نے اس کے دل پر سیدھا وار کیا ہو۔

"اور تیار ہو کر اس دن جاؤ گی سب نامحرموں میں"...

یہ الفاظ مومینا کے لیے کسی جھٹکے سے کم نہ تھے۔ اُس کے ہونٹ بند ہو گئے، نظریں جھک گئیں... اور وہ مکمل خاموش ہو گئی۔

کمرے میں ایک عجیب سی خاموشی پھیل گئی

جیسے سوال بھی وہیں رہ گئے ہوں... اور جواب بھی۔

ارمان گھر والوں سے چھپ کر فون پر مومینہ سے بات کر رہا تھا۔ کمرے کی لائٹ مدھم تھی اور وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا، جیسے کوئی سن نہ لے۔ دوسری طرف مومینا بھی اپنے گھر میں سب سے دور، کھڑکی کے پاس کھڑی تھی، آواز میں ہلکی سی سنجیدگی اور تھکن تھی۔

"مومینہ نے اسے کہا کہ ہمارا کوئی ریلیشن نہیں ہے۔"

ارمان ایک لمحے کو خاموش ہوا، پھر دھیرے سے بولا،

"میں وعدہ کرتا ہوں آپ سے نکاح کروں گا، نہیں تو"...

مومینہ نے فوراً پوچھا،

"نہیں تو کیا؟"

ارمان نے بغیر سوچے کہہ دیا،

"مر جاؤں گا۔"

مومینہ ہلکا سا مسکرائی،

"لو ڈرامے شروع۔"

ارمان تھوڑا سنبھل کر بولا،

"کیا مطلب آپ کا؟"

مومینہ نے سنجیدگی سے کہا،

"ارمان، آپ ایک sensible person ہو، میں آپ سے ایسی باتیں expect نہیں کرتی۔"

ارمان نے فوراً لہجہ نرم کیا،

"اوہ، معذرت... لیکن میں نے جو سوچا آپ کو بتا دیا۔"

مومینہ نے آہستہ سے کہا،

"لیکن جو بھی ہو، مجھے نہیں لگتا کہ کوئی کسی کے پیار میں مرتا ہے، یہ سب فضول باتیں ہیں۔"

ارمان نے پوچھا،

"آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے؟"

"میں نے کبھی کسی کو پیار میں مرتے نہیں دیکھا نا۔"

ارمان نے ہلکے طنز میں کہا،

"جب دیکھیں گی تب پکا یقین آ جائے گا؟"

مومینہ نے تھوڑا رک کر کہا،

"پتہ نہیں"...

ارمان نے مسکرا کر کہا،

"پتہ نہیں... کیا جواب دیں مومینا جی؟"

مومینہ نے دھیرے سے کہا،

"میرے پاس جواب نہیں اس کا۔"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ارمان نے بات بدلی،

"اچھا خیر چھوڑیں، یہ بتائیں کلچر ڈے پر کیا پہن کر آئیں گی؟"

مومینہ کی آواز میں ہلکی سی اداسی آگئی،

"شاید میں آؤں ہی نہ، ارمان"...

ارمان چونکا،

"لیکن کیوں؟"

"گھر میں کوئی مان نہیں رہا... کوشش ہے کہ سب مان جائیں۔"

ارمان نے نرمی سے کہا،

"میں دعا کروں گا کہ آپ آئیں۔"

مومینہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی،

"اچھا ٹھیک ہے۔"

ارمان نے دل سے کہا،

"اللہ حافظ مومینہ... میری جان۔"

یہ سن کر مومینہ ایک لمحے کو خاموش ہو گئی، اس کے گال ہلکے سے سرخ ہو گئے۔

پھر آہستہ سے بولی،

"اللہ حافظ، ارمان جی۔"

فون بند ہو گیا، مگر دونوں کے دلوں میں ایک ان کہی سی بات باقی رہ گئی...

جیسے یہ رشتہ ابھی نام مانگ رہا ہو۔ لیکن ان رشتوں کا نام کہاں ہوتا ہے ان رشتوں میں بربادی ہوتی ہے اگر نکاح ہو جائے تو مزے نہیں تو اذیت ہی اذیت۔

وہ فون ہاتھ میں تھامے بیٹھی تھی، اس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ تھی۔ وہ دھیمی آواز میں بات کر رہی تھی، جیسے ہر لفظ میں کوئی چھپی ہوئی خوشی ہو۔ کبھی وہ ہلکا سا ہنس دیتی، کبھی نظریں جھکا لیتی۔

اتنے میں دروازہ ہلکے سے کھلا اور نسیم بی بی اندر آئیں۔ ان کی نظر سیدھی مومنہ پر پڑی مسکراتی ہوئی، کسی سے باتوں میں گم۔

"کس سے بات کر رہی تھی، مومنہ؟" ان کی آواز میں معمول کی سختی تھی، مگر آج اس میں ہلکی سی تجسس بھی شامل تھا۔

مومنہ چونک سی گئی۔ اس نے فوراً فون کان سے ہٹایا اور نظریں جھکا لیں۔

"ماما... میری دوست ہے نا، زینب گل... اسی سے بات ہو رہی تھی،" اس نے دھیرے سے جواب دیا، جیسے اپنی خوشی چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔

"اچھا..." نسیم بی بی نے گہری نظر سے اسے دیکھا اور چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئیں، جیسے اس کے چہرے سے کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

"دوست سے اتنی خوش ہو کر باتیں؟ حیرت ہے..." ان کے لہجے میں ہلکی سی طنز بھی تھی اور سوچ بھی۔

یہ سن کر مومنہ کی مسکراہٹ مدھم پڑ گئی۔ اس کا دل جیسے ایک دم سمٹ سا گیا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی، چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔

"خیر، مجھے تم سے کچھ کہنا تھا،" نسیم بی بی نے اپنی آواز کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"جی... بولیں،" مومنہ نے نظریں جھکائے ہوئے جواب دیا، مگر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی۔

"تم واقعی کلچر ڈے پر جانا چاہتی ہو؟"

یہ سوال سنتے ہی مومنہ کا دل ایک لمحے کو رک سا گیا۔ اس نے ہمت کر کے سر اٹھایا۔

"جی ماما..." اس کی آواز بہت ہلکی تھی، مگر اس میں چھپی خواہش صاف محسوس ہو رہی تھی۔

نسیم بی بی نے ایک گہرا سانس لیا، جیسے کسی اندرونی کشمکش سے گزر رہی ہوں۔

"ہمم... اچھا تو..." وہ رُک گئیں۔ کمرے میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ مومنہ کی نظریں بے چینی سے ان کے چہرے پر جمی تھیں، جیسے اگلا لفظ اس کی دنیا بدل دے گا۔

آخر کار نسیم بی بی نے نگاہیں ہٹائیں اور دھیرے سے کہا،

"چلی جاؤ۔"

ایک لمحے کے لیے مومنہ کو یقین ہی نہ آیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"کیا... ؟ واقعی ماما؟!" اس کی آواز خوشی سے کانپ گئی۔

"جی، چلی جاؤ،" نسیم بی بی نے ہلکی سی نرمی کے ساتھ کہا، گویا وہ خود بھی اس فیصلے پر حیران ہوں۔

اگلے ہی لمحے مومنہ خوشی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بے اختیار نسیم بی بی کے گلے لگ گئی۔

"آپ کا بہت شکریہ، ماما! آپ کو نہیں پتا میں کتنی خوش ہوں!" اس کی آواز میں خالص خوشی تھی، جیسے اسے کوئی بہت بڑی نعمت مل گئی ہو۔

نسیم بی بی ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئیں، پھر آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا—ایک ایسا لمس جس میں ان کہی محبت چھپی ہوئی تھی۔

دروازے کے قریب کھڑے طارق انور یہ سب خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آئی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کبھی کبھی چھوٹی سی خوشی دے دینا... کتنا بڑا سکون دے جاتا ہے،" انہوں نے دل ہی دل میں سوچا۔

"کلچر ڈے پر کیا پہنوں؟" سکندر گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ وہ پہلے کبھی کپڑوں کے بارے میں اتنا نہیں سوچتا تھا جو ہاتھ آ جاتا، وہی پہن لیتا۔ اسے ہمیشہ لگتا تھا کہ جو لوگ کپڑوں کے انتخاب پر اتنی فکر کرتے ہیں، وہ بس فضول پریشان ہوتے ہیں... جیسے زندگی میں اس سے بڑا کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔

لیکن آج بات کچھ اور تھی۔

آج وہ صرف سکندر نہیں تھا... آج اسے ایک "اصلی دیسی" بن کر جانا تھا۔

اور شاید پہلی بار، وہ خود کو دوسروں کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ اٹھا اور پرانے صندوق کی طرف بڑھا۔ صندوق کھولا تو ایک مانوس سی خوشبو اس کے اردگرد پھیل گئی—ماضی کی خوشبو، اپنے لوگوں کی خوشبو۔

اس نے دادا کی دھوتی نکالی۔ نرم کپڑا، مگر وقت کی کہانیوں سے بھرا ہوا۔ پھر اس نے بابا کی سادہ سی قمیض اٹھائی، جس میں ایک عجیب سا سکون تھا۔

وہ کچھ لمحے ان کپڑوں کو دیکھتا رہا، جیسے ان میں چھپی یادوں کو محسوس کر رہا ہو۔

پھر اس نے ایک چادر لی اور ذرا سی جھجک کے ساتھ اسے سر پر لپیٹنا شروع کیا۔ پہلی بار پگڑی باندھ رہا تھا—تھوڑی ٹیڑھی، تھوڑی سیدھی... مگر اس کی کوشش میں ایک سچائی تھی۔

آخر میں اس نے لکڑی کی چھڑی اٹھائی، اسے ہاتھ میں گھمایا، اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

چند لمحے وہ خود کو دیکھتا رہا...

پھر اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"یہ ہو گیا... میرا دیسی لُک تیار،" اس نے خود سے کہا، مگر اس کی آواز میں ہلکی سی حیرت بھی تھی۔

آج وہ صرف کپڑے نہیں پہن رہا تھا...

وہ اپنی پہچان پہن رہا تھا۔

جیسے ہی سلمیٰ جٹ اندر آئیں، سکندر کو اس حلیے میں دیکھ کر ایک دم ٹھٹک گئیں۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ چند لمحوں تک کچھ بول ہی نہ سکیں۔

"یا اللہ...!" وہ بے اختیار بول اٹھیں، پھر فوراً مڑ کر زور سے آواز دی،

"یعقوب جی"!

"کی ہویا؟" یعقوب گھبرا کر اندر آئے، جیسے کوئی بڑی خبر سننے والے ہوں۔

"تواڈے ابو...!" سلمیٰ جٹ نے سکندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ان کی آواز میں حیرت بھی تھی اور ہنسی بھی چھپی ہوئی تھی۔

"ہائیں؟" یعقوب نے تیزی سے آگے بڑھ کر دیکھا... اور پھر جیسے ہی ان کی نظر سکندر پر پڑی، ان کا چہرہ ایک دم لٹک گیا۔

"بڑے بے غیرت ہو تم دونوں، ماں بیٹا!" وہ جھنجھلا کر بولے اور سر جھٹکتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد سکندر اور سلمیٰ جٹ ایک دوسرے کو دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگے۔ کمرے میں ان کی ہنسی گونجنے لگی، جیسے سارا ماحول ہلکا پھلکا ہو گیا ہو۔

مگر ہنسی کے اس شور میں اچانک سکندر کی نظر دیوار پر لگی ایک پرانی تصویر پر جا ٹھہری۔

وہ آہستہ آہستہ خاموش ہو گیا۔

تصویر میں اس کے دادا جی تھے وقار سے بھرپور، سر پر پگڑی، ہاتھ میں چھڑی... بالکل ویسے ہی جیسے وہ ابھی خود کھڑا تھا۔

سکندر چند لمحوں تک تصویر کو دیکھتا رہا، جیسے وقت ایک دم تھم گیا ہو۔

اس کے چہرے کی مسکراہٹ دھیرے دھیرے مدھم پڑ گئی اور اس کی جگہ ایک عجیب سی سنجیدگی نے لے لی۔

"میں... بالکل دادا جی جیسا لگ رہا ہوں..." اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

اس کے ہاتھ میں پکڑی چھڑی اب صرف ایک چیز نہیں رہی تھی...

وہ ایک احساس بن گئی تھی اپنی جڑوں کا، اپنی پہچان کا۔

سلمیٰ جٹ نے بھی اس کی خاموشی محسوس کی۔ وہ آہستہ سے اس کے پاس آئیں اور تصویر کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں۔

"ہاں پُتر... بالکل اوہی رنگ، اوہی انداز..." انہوں نے دھیرے سے کہا۔

سکندر نے ایک گہرا سانس لیا...

اور پہلی بار، اسے اپنے اس "دیسی لُک" پر فخر محسوس ہوا۔

اب سب کو کل کے کلچر ڈے کا بے صبری سے انتظار تھا ارمان، مومنہ، سکندر... اور گھر کے باقی سب لوگ بھی کسی نہ کسی طرح اس دن کے لیے پُرجوش تھے۔ ہر کسی کے دل میں اپنی اپنی خوشیاں، اپنی چھوٹی چھوٹی امیدیں پل رہی تھیں۔

مومنہ آئینے کے سامنے کھڑی کبھی مسکراتی، کبھی خود کو دیکھ کر شرما جاتی...

ارمان بار بار موبائل اٹھا کر کچھ سوچتا، پھر رکھ دیتا... جیسے دل میں کوئی بات ہو جو ابھی کہنا باقی ہو۔

اور سکندر... وہ اپنے "دیسی لُک" کو یاد کر کے خود ہی ہلکا سا مسکرا دیتا، مگر اس کے دل میں ایک عجیب سی سنجیدگی بھی گھر کر چکی تھی۔

گھر کا ماحول غیر معمولی طور پر زندہ دل تھا... جیسے کوئی خاص دن آنے والا ہو۔

لیکن...

کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ آنے والا دن صرف خوشیوں کا نہیں ہو گا۔

کلچر ڈے...

جو سب کے لیے ایک یادگار دن بننا تھا...

وہی دن کچھ ایسے راز کھولنے والا تھا، کچھ ایسے موڑ لانے والا تھا— جن کے بارے میں کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔

کچھ رشتے آزمائے جائیں گے...

کچھ سچ سامنے آئیں گے...

اور کچھ دل... شاید ہمیشہ کے لیے بدل جائیں گے۔

رات آہستہ آہستہ گہری ہوتی جا رہی تھی...

مگر آنے والی صبح اپنے ساتھ کیا لے کر آئے گی

اس کا اندازہ کسی کو نہیں تھا۔

آج 12 جنوری تھی۔ پنجاب یونیورسٹی میں کلچر ڈے پورے جوش و خروش سے منایا جا رہا تھا۔

ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ کیمپس کا ہر کونا زندہ لگ رہا تھا، جیسے ثقافت خود سانس لے رہی ہو۔ طلبہ اپنی اپنی ثقافتی پہچان کو فخر سے اوڑھے پھر رہے تھے۔

کوئی پنجابی لباس میں تھا رنگین پگ، کرتا اور کھسّہ پہنے، پورے ٹھاٹھ سے۔

کوئی سندھی اجرک اور ٹوپی میں ملبوس تھا، جس سے روایت جھلک رہی تھی۔

بلوچی نوجوان ڈھیلے ڈھالے لباس میں وقار لیے چل رہے تھے۔

پٹھان شلوار قمیض اور واسکٹ میں اپنی الگ شان دکھا رہے تھے۔

اور کشمیری لباس پہنے طلبہ کی سادگی میں ایک الگ ہی خوبصورتی تھی۔

ہر طرف قہقہے گونج رہے تھے، کہیں ڈھول کی تھاپ تھی، کہیں روایتی گیتوں کی آوازیں۔

کینٹین کے پاس لڑکیاں تصویریں بنا رہی تھیں، جبکہ لان میں کچھ لڑکے بھنگڑا ڈال رہے تھے۔

یہ صرف ایک دن نہیں تھا...

یہ اپنی پہچان کو جینے کا دن تھا، اپنی جڑوں کو محسوس کرنے کا دن۔

اور اسی رنگین، خوشیوں سے بھرے ماحول میں

سب طلبہ اپنے اپنے انداز میں اس دن کو جینے آ رہے تھے...

ارمان نے سیاہ شلوار قمیض پہن رکھی تھی، جس کی سادگی میں ایک الگ ہی وقار تھا۔ پاؤں میں کھسّہ تھا جو اس کے انداز کو اور نمایاں کر رہا تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک خاموش سا اعتماد جھلک رہا تھا سادہ مگر پُر اثر۔

شاہویر پٹھان تو جیسے آج پورے کردار میں ڈھل گیا تھا۔ سفید شلوار قمیض، اوپر واسکٹ، سر پر ٹوپی… اس کا حلیہ دیکھ کر واقعی لگ رہا تھا جیسے وہ کسی پختون علاقے سے سیدھا یہاں آگیا ہو۔ اس کے چلنے کے انداز میں بھی ایک خاص رعب اور ٹھہراؤ تھا۔

اور دانیال…

وہ بیچارہ پوری کوشش میں تھا کہ سندھی لُک اپنائے، اجرک گلے میں ڈال رکھی تھی، سر پر ٹوپی بھی تھی… مگر نہ جانے کیوں سب کچھ اس پر تھوڑا بے جوڑ سا لگ رہا تھا۔ جیسے وہ خود بھی اندر سے کنفیوز ہو کہ آخر وہ کیا بننے کی کوشش کر رہا ہے۔

"اوئے… یہ کیا حال بنا لیا ہے تُو نے؟" سکندر نے اسے دیکھ کر ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ ٹھیک تو لگ رہا ہوں!" دانیال نے فوراً دفاعی انداز میں جواب دیا، مگر خود بھی تھوڑا جھجک رہا تھا۔

"ٹھیک؟" شاہویر نے ہنسی دباتے ہوئے کہا،

"بھائی تُو اصل سندھی کم... دراز سے منگوایا نکلی سندھی بھی نہیں لگ رہا ہے"!

یہ سنتے ہی سب زور سے ہنس پڑے۔

دانیال نے خفگی سے اجرک سیدھی کی اور منہ بنا کر بولا،

"ہنس لو ہنس لو... کل دیکھوں گا تم سب کو"!

مگر اس کی بات میں بھی ہلکی سی ہنسی شامل تھی۔

" ویسے بھائیوں! سکندر تو پورا آدمی لگ رہا ہے نا!" دانیال نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے شرارتی انداز میں کہا۔

"ہاں... اور تُو میری عورت!" سکندر نے فوراً جواب دیا، آنکھ مارتے ہوئے۔

یہ سنتے ہی باقی تینوں دوست زور زور سے دانیال پر ہنسنے لگے۔ دانیال نے منہ بنا کر انہیں گھورا، مگر خود بھی مسکرانے سے نہ رہ سکا۔

" اوئے چپ کر و یار!" وہ ہنستے ہوئے بولا، مگر اس کی آواز میں بھی ہنسی چھپی ہوئی تھی۔

اسی ہنسی مذاق کے بیچ اچانک سکندر کی نظر ارمان پر پڑی...

جو باقی سب کے برعکس کافی خاموش اور سنجیدہ کھڑا تھا۔

اس کے چہرے پر ایک عجیب سی بے چینی تھی، نظریں بار بار کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

"خیر تو ہے جانی؟ کون سی ٹینشن ہے؟" سکندر نے تھوڑا قریب آ کر پوچھا، اب اس کے لہجے میں سنجیدگی بھی شامل تھی۔

"نہیں... نہیں، کوئی ٹینشن نہیں..." ارمان نے جلدی سے کہا، مگر اس کی نظریں اب بھی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں،

"بس... کسی کا انتظار ہے۔"

سکندر کے ہونٹوں پر فوراً ایک شرارتی مسکراہٹ آ گئی۔

"اوہ ہو... سمجھ گیا میں!" اس نے اسے کہنی مارتے ہوئے کہا۔

ارمان نے فوراً گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا، پھر سکندر کی طرف جھک کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

"شش... چپ!" اس نے آہستہ سے سرگوشی کی۔

سکندر ایک لمحے کو اسے دیکھتا رہا... پھر اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ہنس پڑا۔

"اوئے... بات تو پکی ہے!" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

دانیال اور باقی دوست بھی اب ارمان کو گھور رہے تھے، جیسے کوئی راز پکڑ لیا ہو۔

اور ارمان...

وہ صرف ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نظریں چُرا گیا

مگر اس کے دل کی دھڑکن پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہو چکی تھی۔

"چلو ٹھیک ہے یار... دیکھتے ہیں سب کیا کر رہے ہیں۔ اگر ضرورت پڑے تو فوراً کال کر دینا... خود سے پہلوان نہ بننا!" سکندر نے ہلکے سے ہنستے ہوئے کہا، مگر اس کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی فکر بھی تھی۔

ارمان نے بس سر ہلا دیا، جیسے وہ سن تو رہا ہو... مگر اس کا دھیان کہیں اور ہی تھا۔

سکندر نے آخری نظر اس پر ڈالی، پھر مڑ کر ہجوم میں گم ہو گیا۔

دانیال اور باقی دوست بھی ادھر اُدھر پھیل گئے کوئی ڈھول کی تھاپ کی طرف، کوئی سٹالز کی طرف، کوئی تصویروں میں مصروف۔

کلچر ڈے اپنی پوری رونق پر تھا۔

ہر طرف رنگ، شور، قہقہے...

مگر اس ہجوم میں ارمان اکیلا کھڑا تھا۔

اس کی نظریں بار بار گیٹ کی طرف اٹھ جاتیں، جیسے کسی خاص لمحے کا انتظار ہو...

جیسے کسی کے آنے سے ہی یہ دن مکمل ہونا ہو۔

ہوا میں ہلکی سی ٹھنڈک تھی، مگر اس کے ہاتھوں میں پسینہ آ رہا تھا۔

دل بے قابو ہو کر دھڑک رہا تھا۔

"آئے گی نا...؟" اس نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا۔

اسی لمحے...

گیٹ کی طرف ایک ہلچل سی ہوئی۔

کسی کی آمد نے جیسے فضا کا رنگ بدل دیا ہو...

اور ارمان کی سانس ایک لمحے کو رک گئی۔

___

دوسری طرف، سکندر سب سے چپ کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر آ گیا تھا۔ نیچے کا شور یہاں مدھم سا ہو گیا تھا ڈھول کی تھاپ اب صرف ہلکی سی گونج بن کر رہ گئی تھی۔

اس نے جیب سے سگریٹ نکالی، ماچس جلائی اور ایک لمبا کش لیا۔ دھواں آہستہ آہستہ فضا میں بکھرنے لگا، جیسے وہ اپنی الجھنیں بھی اس کے ساتھ اڑا دینا چاہتا ہو۔

"آج کلچر ڈے پر تو اس کا پیچھا چھوڑ دو"...

اچانک پیچھے سے آنے والی آواز نے اسے چونکا دیا۔

سکندر نے بھنویں سکیڑ کر مڑ کر دیکھا

اور اگلے ہی لمحے جیسے وقت تھم سا گیا۔

وہ سامنے کھڑی تھی...

اس نے اسے گوسامر شفان سے بنے لیونڈر پیشوا میں روشنی سمیٹے دیکھا۔ یہ محض جامنی رنگ نہیں تھا... یہ جیسے بہار کی شام کا دھندلکا تھا، جو آہستہ آہستہ اس کے وجود پر اتر آیا ہو۔ چولی پر ہلکی ہلکی نیلی جھلک تھی، جو ہر حرکت کے ساتھ مدھم سی چمک بکھیر رہی تھی۔

اس کا دوپٹہ...

چاندی کے باریک مکیش کے کام سے سجا ہوا، ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے بکھرے ہوئے ستاروں کو سمیٹ کر اس کے گرد لپیٹ دیا ہو۔ ہر جھلک میں روشنی اس پر ٹھہر کر مسکرانے لگتی تھی۔

سکندر چند لمحوں تک بس اسے دیکھتا رہ گیا۔

ہاتھ میں پکڑی سگریٹ آہستہ آہستہ جل رہی تھی... مگر اسے ہوش ہی نہیں رہا۔

وہ نادیہ تھی اور بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"آپ... یہاں؟" اس کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا۔

وہ ہلکا سا مسکرائی، مگر اس کی آنکھوں میں سنجیدگی تھی۔

"اور تم؟ سب نیچے خوشیاں منا رہے ہیں... اور تم یہاں اکیلے دھواں اڑا رہے ہو۔"

سکندر نے نظریں ہٹائیں، جیسے ایک لمحے میں اپنی کیفیت چھپانا چاہتا ہو۔

"بس... تھوڑی ہوا لینے آیا تھا،" اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب آئی...

ہوا میں اس کے عطر کی ہلکی سی خوشبو گھل گئی۔

"ہوا... یا کچھ اور؟" اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"ایک تو جب بھی سگریٹ پیتا ہوں پتا نہیں کہاں سے سامنے آجاتی ہے؟" سکندر میں دھیرے سے کہا۔

"تم نے ابھی کیا کہا؟" نادیہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

"کچھ نہیں" سکندر نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا

سکندر اس بار خاموش ہو گیا۔

"اُس دن جب تم مجھے پل پر ملے تھے... تو اتنے اوور کانفیڈنٹ ہو کر باتیں کر رہے تھے،" نادیہ نے ہلکی سی خفگی کے ساتھ کہا،

"اور اُس کے بعد؟ جب بھی دیکھتی ہوں، تم غائب ہی ہو جاتے ہو۔"

سکندر نے ایک لمحے کو نظریں چرائیں، پھر آہستہ سے بولا،

"میں اُس دن بس یہی چاہتا تھا کہ آپ... کسی طرح بھی خودکشی نہ کریں۔"

نادیہ نے اسے غور سے دیکھا، جیسے اس کے لفظوں کے پیچھے چھپی سنجیدگی کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"ہمم... اچھا..." وہ دھیرے سے بولی، پھر اچانک اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آئی،

"اگر میں یہاں... اسی چھت سے کود جاؤں، تو کیا تم مجھے روکو گے؟"

سکندر کے چہرے پر فوراً جھنجھلاہٹ آگئی۔

"آپ کو خودکشی کا کیا دورہ پڑا ہے؟" اس نے قدرے سخت لہجے میں کہا،

"سالار سکندر کی روح آگئی ہے کیا آپ میں؟ ہر وقت یہی خیال"!

نادیہ کے چہرے پر حیرت آئی،

"سالار سکندر؟ وہ کون ہے؟"

سکندر ہلکا سا مسکرایا، مگر اس مسکراہٹ میں طنز تھا،

"ہے ایک شادی شدہ، بال بچوں والا بندہ... جس پر لڑکیاں گندی نظر رکھتی ہیں، جو ایڈوینچر کے نام پر خودکشی کرنا چاہتا تھا"

نادیہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی، مگر فوراً مدھم پڑ گئی۔

"میری خودکشی کی وجہ ہے، سکندر..." اس نے آہستہ سے کہا۔

سکندر کی آنکھوں میں سنجیدگی اتر آئی،

"اور وہ کیا ہے؟"

نادیہ نے نظریں جھکا لیں، جیسے لفظ اس کے گلے میں اٹک گئے ہوں۔

"وہ... میں تمہیں نہیں بتا سکتی۔"

چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔

"مرضی ہے آپ کی،" سکندر نے سرد لہجے میں کہا، اور مڑ کر جانے لگا۔

لیکن اگلے ہی لمحے نادیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

سکندر رک گیا۔

اس نے مڑ کر دیکھا

نادیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے، جو پلکوں سے لڑتے ہوئے چمک رہے تھے۔

وہ رو رہی تھی...

مگر عجیب بات یہ تھی کہ وہ اس حالت میں بھی خوبصورت لگ رہی تھی۔

یہ احساس سکندر کو خود حیران کر گیا۔

اس کا دل ایک لمحے کو الجھ سا گیا

جیسے وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے نادیہ کے آنسوؤں پر ترس آئے... یا اس کی اس کیفیت پر رک جانا چاہیے۔

ہوا خاموش ہو گئی تھی...

اور چھت پر کھڑے دو لوگ، اپنی اپنی جنگ لڑ رہے تھے۔

دانیال کینٹین میں بیٹھا مزے سے برگر کھا رہا تھا، جیسے دنیا میں اس وقت اس سے زیادہ ضروری کوئی کام ہی نہ ہو۔ ہر بائٹ کے ساتھ اس کے چہرے پر اطمینان بڑھتا جا رہا تھا۔

اتنے میں رمشا اور زینب گل وہاں آ پہنچیں۔

رمشا نے دانیال کو دیکھا تو اس کے ذہن میں فوراً ایک شرارت آئی۔ اس نے زینب کی طرف دیکھا، آنکھ ماری... اور آگے بڑھ گئی۔

"واہ ماشاء اللہ، دانیال! بہت اچھے لگ رہے ہو آج تو!" رمشا نے خاص انداز میں کہا۔

"کون... میں؟" دانیال نے حیرت سے اپنی طرف انگلی کرتے ہوئے کہا، جیسے اسے یقین ہی نہ آ رہا ہو کہ کوئی اس کی تعریف بھی کر سکتا ہے۔

"ہاں ہاں، آپ ہی دانیال!" رمشا نے ہنسی دباتے ہوئے کہا اور زینب کی طرف دیکھا۔

زینب فوراً منہ دوسری طرف کر کے ہنسنے لگی، تاکہ دانیال کو اس کی ہنسی نظر نہ آئے۔

"واہ... بہت شکریہ آپ کا، رمشا جی!" دانیال خوش ہوتے ہوئے بولا، اس کے چہرے پر ایک الگ ہی چمک آ گئی تھی۔

"اچھا یہ تو بتاؤ، تمہاری ساری گینگ کہاں ہے؟" رمشا نے casually پوچھا۔

"ارمان باہر گیٹ کے پاس ہے... شاہویر بھی شاید اسی کے ساتھ ہی تھا،" دانیال نے برگر کا ایک اور بائٹ لیتے ہوئے جواب دیا۔

"اور سکندر؟ وہ کہاں ہے؟" رمشا نے تھوڑا دھیان سے پوچھا۔

"اس کا کس کو پتا ہوتا ہے؟" دانیال نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا،

"ویسے میں نے اسے سیڑھیوں کی طرف جاتے دیکھا تھا... اب وہاں سے کہاں گیا، مجھے نہیں پتا۔"

"چلو ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں..." رمشا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

وہ دونوں مڑ کر جانے لگیں، مگر زینب بار بار پلٹ کر دانیال کو دیکھ رہی تھی۔

"زینب! آگے دیکھو... کیا اسے گھورے جا رہی ہو؟" رمشا نے اسے کہنی مارتے ہوئے کہا۔

زینب شرما گئی اور دونوں آگے جا کر ہنسنے لگیں۔

ادھر دانیال...

اب بھی اپنی جگہ بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

آج پہلی بار...

کسی کی تعریف نے اس کا دن بنا دیا تھا۔

—

"بتائیں مجھے، نادیہ جی... آخر کیوں کرنا چاہتی ہیں آپ خودکشی؟" سکندر کی آواز اب پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہو چکی تھی،

"کیا وجہ ہے اپنی زندگی ختم کرنے کی؟ پچیس سال آپ کی عمر ہے... ایک ٹیچر بھی ہیں آپ۔"

نادیہ نے کچھ کہنا چاہا... مگر الفاظ جیسے اس کے گلے میں ہی اٹک گئے۔ اس کی سانسیں بے ترتیب ہو گئیں، سینہ تیزی سے اٹھنے لگا۔

وہ ایک دم سے سکندر کا ہاتھ چھوڑ کر پیچھے ہٹی، جیسے اس کے سوالوں کا بوجھ برداشت نہ کر پا رہی ہو۔

پھر وہ تیز قدموں سے چھت کے ایک کونے کی طرف بڑھی... جہاں ایک پرانی سی بینچ رکھی تھی۔

وہ وہاں جا کر بیٹھ گئی۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ تھام لیا، سانسیں ابھی تک بے قابو تھیں۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے، مگر وہ انہیں گرنے سے روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

سکندر وہیں کھڑا اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کی سختی آہستہ آہستہ نرم پڑنے لگی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا...

اور بینچ کے دوسرے کونے پر کھڑا ہو کر رک گیا، جیسے اسے تھوڑی سی جگہ دینا چاہتا ہو۔

"میں سن رہا ہوں..." اس نے نرم مگر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا،

"جتنا کہنا چاہیں... کہہ دیں۔"

چند لمحوں تک صرف ہوا کی آواز تھی... اور نادیہ کی بے ترتیب سانسیں۔

پھر آخر کار... اس نے بولنا شروع کیا۔

"کبھی کبھی..." اس کی آواز بہت مدھم تھی، جیسے ہر لفظ بڑی مشکل سے نکل رہا ہو،

"انسان تھک جاتا ہے، سکندر... اتنا کہ سانس لینا بھی بوجھ لگنے لگتا ہے۔"

اس کی آنکھوں سے ایک آنسو پھسل کر گال پر آ گیا۔

"سب کچھ ٹھیک لگتا ہے باہر سے... ایک اچھی جاب، عزت... سب کچھ"...

وہ ہلکا سا ہنسی، مگر اس ہنسی میں درد صاف جھلک رہا تھا،

"لیکن اندر سے... کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔"

سکندر خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا، اس بار بغیر کسی مذاق، بغیر کسی طنز کے۔

نادیہ نے آہستہ سے سر اٹھایا، اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔

"تم پوچھ رہے تھے نا... وجہ کیا ہے؟"

وہ رک گئی، جیسے خود کو سنبھال رہی ہو،

"کبھی کبھی... وجہ ایک نہیں ہوتی... بہت ساری ہوتی ہیں... جو مل کر انسان کو ختم کر دیتی ہیں۔"

"ایک لڑکا تھا... فیس بک پر... مجھے پسند آگیا تھا،" نادیہ کی آواز دھیمی تھی، مگر ہر لفظ کے پیچھے ایک گہرا احساس تھا،

"اس کی باتیں مجھے بہت اچھی لگتی تھیں... اس میں ایک اپنا پن تھا... جیسے وہ مجھے سمجھتا ہو۔"

وہ کچھ لمحوں کے لیے رک گئی، جیسے یادوں میں کھو گئی ہو۔

"جب وہ میری زندگی میں آیا نا... تو مجھے لگا جیسے سب کچھ ٹھیک ہونے لگا ہے..." اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی، مگر آنکھیں نم ہو گئیں،

"میں... میں خود کو اس کے سامنے ایک بچے کی طرح محسوس کرتی تھی... بالکل بے بس"...

اس نے اپنے ہاتھوں کو آپس میں مضبوطی سے جکڑ لیا۔

"ایسا لگتا تھا جیسے... میری ساری خوشی، ساری دنیا... بس وہی ہے۔"

اس کی آواز ہلکی سی کانپ گئی۔

"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کسی اجنبی سے اتنا جُڑ جاؤں گی... اتنا کہ خود کو ہی بھول جاؤں"...

"پھر کیا ہوا، نادیہ جی؟" سکندر نے آہستہ سے پوچھا، اب اس کے لہجے میں نرمی اور توجہ تھی۔

نادیہ نے گہرا سانس لیا، جیسے خود کو ہمت دے رہی ہو۔

"اس نے... مجھے اپنے شہر بلایا... فیصل آباد..." اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی،

"میں گھر والوں سے چھپ کر اکیلی وہاں گئی... صرف اس سے ملنے کے لیے"...

سکندر کے چہرے پر سنجیدگی اور گہری ہوگئی، مگر وہ خاموش رہا۔

"وہاں... اس نے مجھ سے نکاح کر لیا..." نادیہ نے نظریں جھکا لیں،

"اور مجھے اپنے پاس رکھا... پورے دو دن"...

اس کے ہاتھ ہلکے سے کانپ رہے تھے۔

"میں نے گھر میں یہ کہا تھا کہ میں پڑھائی کے لیے جا رہی ہوں..." اس کی آواز ٹوٹنے لگی،

"اور شادی کے بعد... وہ سب ہو گیا... جو ایک شوہر اور بیوی کے درمیان ہوتا ہے"...

چھت پر ایک بھاری سی خاموشی چھا گئی۔

"میں چاہتی تھی کہ ہماری شادی اچھی طرح ہو... دونوں خاندان شامل ہوں..." اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے،

"لیکن... اس کے گھر والے مانے نہیں"...

وہ رک گئی، جیسے الفاظ ختم ہو رہے ہوں۔

"اور میں... میں نے بھی گھبراہٹ میں اپنے گھر والوں کو کچھ نہیں بتایا"...

اب اس کی آواز میں صرف پچھتاوا تھا۔

سکندر نے آہستہ سے آنکھیں بند کیں، ایک گہرا سانس لیا...

جیسے وہ اس ساری بات کو سمجھنے اور ہضم کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

نادیہ کی آواز ٹوٹ رہی تھی، جیسے ہر لفظ اس کے اندر کے درد کو اور گہرا کر رہا ہو۔

"جب میں گھر واپس آئی... تو اس نے مجھے ایک ہفتے بعد میسج کر کے طلاق دے دی..." اس نے بمشکل کہا،

"اور... پھر اپنی ہی کُھاندان کی ایک لڑکی سے شادی کرلی۔"

سکندر کا چہرہ سخت ہو گیا، مگر وہ خاموش رہا—اب وہ صرف سن رہا تھا۔

"آپ نے... کچھ کیا کیوں نہیں؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

نادیہ نے ایک درد بھری ہنسی ہنسی، جو فوراً آنسوؤں میں بدل گئی۔

"کیسے کرتی، سکندر؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی،

"میرے بابا کو سب پتا چل جاتا... وہ مجھ پر بہت اعتماد کرتے ہیں... میں اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی"...

وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

"مجھے اپنے جسم سے نفرت ہونے لگی ہے..." اس کے الفاظ بھاری ہو گئے،

"یہ وہی جسم ہے... جس کے لیے اس نے یہ سب کیا تھا... وہ نکاح بھی جھوٹ تھا... اور میری طرف کے گواہ بھی اس کے تھے"...

اس کی سانسیں ایک دم بے ترتیب ہو گئیں۔

"مجھے اب سانس نہیں آتی، سکندر..." وہ ہچکیوں سے روتے ہوئے بولی،

"میں... میں اس سب کے ساتھ زندہ نہیں رہ پا رہی"...

سکندر فوراً اس کے پاس بیٹھ گیا۔

اس کے چہرے پر اب غصہ نہیں تھا صرف ایک گہری سنجیدگی اور فکر تھی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا، نادیہ جی... سب ٹھیک ہو جائے گا،" سکندر نے نرمی سے کہا، اس کی آواز میں یقین تھا، جیسے وہ واقعی اس کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہو۔

نادیہ نے آنکھوں میں آنسو لیے سر اٹھایا،

"میرے بابا کو اس سب کا پتا چلا تو کیا ہو گا؟"

سکندر نے فوراً اس کے قریب ہو کر کہا،

"کچھ نہیں ہو گا... آپ ابھی شانت رہیں... بس آہستہ آہستہ سانس لیں۔"

اس نے اپنی جیب سے نکالا ہوا ٹشو نادیہ کی طرف بڑھایا۔

نادیہ نے کانپتے ہاتھوں سے ٹشو لیا اور اپنے آنسو اور چہرہ صاف کیا۔

ہوا میں ایک عجب سی خاموشی تھی— مگر اس بار یہ خاموشی ڈر والی نہیں تھی...

بلکہ ایک عجیب سا سکون دے رہی تھی۔

اسی دوران، سیڑھیوں سے اوپر آتی ہوئی رمشا آہستہ آہستہ چھت پر پہنچی۔

وہ ادھر ادھر نظر دوڑا رہی تھی، جیسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہو۔

پھر اچانک...

اس کی نظر ایک طرف جا ٹھہری۔

سکندر اور نادیہ ایک ساتھ بیٹھے تھے...

نادیہ کا سر سکندر کے کندھے پر جھکا ہوا تھا۔

یہ منظر دیکھتے ہی رمشا کے قدم جیسے رک گئے۔

اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، آنکھوں میں نمی آ گئی۔

دل میں ایک عجیب سی چبھن سی اٹھی...

جیسے کچھ ٹوٹ گیا ہو۔

وہ خاموشی سے چند لمحے انہیں دیکھتی رہی...

پھر آہستہ سے پیچھے مڑی اور سیڑھیوں کی طرف چل دی۔

اس کے قدم بھاری ہو چکے تھے...

اور آنکھوں میں آنسو، جنہیں وہ روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

چھت پر...

سکندر اور نادیہ ابھی بھی اسی خاموش لمحے میں بیٹھے تھے

مگر انہیں اس ٹوٹے ہوئے احساس کا اندازہ نہیں تھا جو ابھی وہاں سے گزر چکا تھا۔

پھر اچانک سکندر کو جیسے ہوش آیا۔

اس نے فوراً خود کو پیچھے کیا اور نادیہ سے فاصلہ بنا لیا۔ اس کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا، جیسے وہ اپنی ہی حدیں یاد کر رہا ہو۔

نادیہ بھی چونک گئی۔ اس نے سر اٹھا کر سکندر کی طرف دیکھا—اس کی آنکھوں میں ابھی بھی نمی تھی، مگر اب ایک ہلکی سی الجھن بھی تھی۔

سکندر نے نظریں دوسری طرف کر لیں، ایک لمحے کے لیے خاموش رہا، پھر آہستہ سے بولا،

"آپ... اب تھوڑا بہتر ہیں؟"

اس کی آواز میں وہی نرمی تھی، مگر اب اس میں فاصلہ بھی محسوس ہو رہا تھا۔

نادیہ نے ہلکا سا سر ہلایا، مگر اس کی سانسیں اب بھی بے ترتیب تھیں۔

"میں ٹھیک ہوں..." اس نے آہستہ سے کہا، مگر اس کے لہجے میں کمزوری صاف تھی۔

سکندر نے ایک گہرا سانس لیا، پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ اکیلی نہیں ہیں... بس خود کو سنبھالنے کی کوشش کریں، مرنا حل نہیں ہے اس نے جو کیا وہ غلط تھا لیکن اگر اپ مر کر جو کریں گی وہ بھی غلط ہو گا اپ کو ان سب سے نکلنا پڑے گا" اور میں کوشش کروں گا کہ اسے سبق سکھاؤں... اس نے جو کیا، اس کی سزا ملنی چاہیے۔ آخر آپ اکیلی کیوں بھگت رہی ہیں اس جرم کی جو آپ نے کیا ہی نہیں؟" سکندر نے غصے اور سنجیدگی کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

نادیہ نے فوراً سر اٹھایا، اس کی آنکھوں میں خوف اور بے بسی ایک ساتھ جھلکنے لگے۔

"وہ بہت طاقتور لوگ ہیں... تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے... بہت بڑا خاندان ہے اس کا..." اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

سکندر نے ایک لمحے کو دانت بھینچے، پھر آہستہ مگر پختہ لہجے میں بولا،

"وہ میری سر درد ہے... میں دیکھ لوں گا۔"

نادیہ نے اس کی طرف بے یقینی سے دیکھا،

"سکندر... تم نہیں سمجھ رہے... یہ اتنا آسان نہیں ہے۔"

سکندر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے نرمی سے کہا،

"میں آسان نہیں کہہ رہا... لیکن آپ اکیلی نہیں لڑیں گی۔"

وہ چند قدم پیچھے ہٹا، جیسے اپنے جذبات کو قابو میں کر رہا ہو۔

"کچھ چیزیں غلط ہوتی ہیں... اور اگر ان پر خاموش رہا جائے تو وہ اور بڑھ جاتی ہیں۔"

نادیہ خاموش ہو گئی... اس کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ ساتھ ایک ہلکی سی امید بھی ابھر آئی تھی۔

"ویسے لڑکے کا نام کیا ہے؟"

"فیصل"

رمشا کے قدم جیسے بے جان ہو گئے تھے۔

سیڑھیوں سے اترتے ہوئے ہر زینہ اسے بھاری لگ رہا تھا، جیسے وہ صرف نیچے نہیں... کسی حقیقت میں گر رہی ہو۔

اس کے ذہن میں وہی منظر بار بار گھوم رہا تھا

نادیہ کا سر... سکندر کے کندھے پر۔

اس نے آنکھیں زور سے بند کیں، مگر آنسو پلکوں سے نکل ہی آئے۔

"میں نے کبھی کہا ہی نہیں..." اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا،

"اور شاید... اب کہنے کا کوئی مطلب بھی نہیں"...

نیچے پہنچتے ہی اس نے جلدی سے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی، چہرہ سیدھا کیا... مگر آنکھوں کی نمی چھپ نہ سکی۔

زینب گل نے اسے دیکھا تو فوراً رک گئی،

"کیا ہوا، رمشا؟ سکندر ملا؟"

رمشا ایک لمحے کو ٹھٹکی، پھر نظریں چرا لیں۔

"کچھ نہیں، زینب..." اس نے زبردستی نارمل لہجہ بنانے کی کوشش کی،

"وہ اوپر سگریٹ پی رہا ہے... میں نے سوچا اُسے اکیلا چھوڑ دوں... بعد میں مل لوں گی۔"

زینب نے اسے غور سے دیکھا

اسے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔

"تم ٹھیک ہو؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔

رمشا نے فوراً ہلکی سی مسکراہٹ بنائی،

"ہاں، بالکل ٹھیک ہوں۔"

مگر اس کی آنکھیں اس کی بات کی تردید کر رہی تھیں۔

"آؤ... باہر سٹالز کی طرف چلتے ہیں،" رمشا نے اچانک کہا اور زینب کا ہاتھ پکڑ لیا، جیسے وہ رکنا ہی نہیں چاہتی۔

زینب خاموشی سے اس کے ساتھ چل دی... مگر اس کی نظریں اب بھی رمشا کے چہرے پر تھیں۔

رمشا تیز قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی

جیسے وہ ہجوم میں خود کو کھونا چاہتی ہو...

یا شاید...

اپنے دل کی آواز سے بھاگنا چاہتی ہو۔

"نہ تم نماز پڑھتے ہو... نہ کسی مذہبی محفل میں جاتے ہو... مذہب کے بغیر کیسے رہ لیتے ہو تم، سکندر؟" نادیہ نے سنجیدگی سے پوچھا، جیسے وہ واقعی اسے سمجھنا چاہتی ہو۔

سکندر نے ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا،

"اب خودکشی کرنے والی لڑکی میرے سامنے دین کی بات کرے گی؟"

نادیہ ایک لمحے کو چونکی... پھر خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی شرمندگی اور دکھ ایک ساتھ آ گیا۔

"اوہ..." وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

کچھ لمحے دونوں کے درمیان خاموشی رہی، پھر نادیہ نے دوبارہ بات چھیڑی،

"ویسے... تمہیں کبھی محبت نہیں ہوئی؟"

"نہیں،" سکندر نے فوراً جواب دیا،

"میں ان فضول چیزوں میں نہیں پڑتا۔"

نادیہ نے بھنویں سکیڑ لیں،

"تمہیں محبت فضول لگتی ہے؟"

"بہت فضول... وقت کی بربادی۔"

"بہت پتھر دل انسان ہو تم،" نادیہ نے ہلکی سی خفگی سے کہا۔

سکندر نے کندھے اچکائے،

"ایسا ہی ہوں میں۔ جس کو پسند کرنا ہے کرے، نہیں تو بھاڑ میں جائے۔"

نادیہ نے ایک گہرا سانس لیا، پھر ہلکے طنز سے بولی،

"مجھے تمہاری بیوی پر ترس آتا ہے۔"

سکندر نے فوراً پلٹ کر دیکھا،

"آپ ملی ہیں اس سے؟"

نادیہ نے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا،

"تمہاری تو شادی نہیں ہوئی نا۔"

"وہی تو... پھر آپ کو ترس کیسے آ گیا؟" سکندر نے جواب دیا۔

"میں ہونے والی بیوی کی بات کر رہی ہوں... ڈفر!" نادیہ نے پہلی بار ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

سکندر نے نظر ہٹا لی، جیسے یہ بات اسے تھوڑی عجیب لگی ہو،

"آپ اُس کی بات نہ کریں، نادیہ جی... جب ہو گی، دیکھی جائے گی۔"

ہوا ایک بار پھر خاموشی لے آئی...

—

ارمان کو مومنہ کا انتظار کرتے ہوئے خاصا وقت گزر چکا تھا۔

شروع میں جو بے چینی تھی، وہ اب آہستہ آہستہ مایوسی میں بدل رہی تھی۔

وہ بار بار گیٹ کی طرف دیکھتا...

پھر نظریں جھکا لیتا۔

"شاید... وہ نہیں آئے گی..." اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

اسی دوران شاہویر اس کے پاس آیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا،

"چل یار... چھوڑ اب، آجا ادھر۔"

ارمان نے ایک آخری نظر گیٹ کی طرف ڈالی...

پھر خاموشی سے شاہویر کے ساتھ چل پڑا۔

آج یونیورسٹی میں عام دنوں سے کہیں زیادہ رش تھا۔

کلچر ڈے کی وجہ سے ہر طرف ہجوم تھا رنگ، شور، قہقہے... ہر طرف زندگی ہی زندگی تھی۔

مگر اس ہجوم میں بھی ارمان خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔

وہ دونوں گیٹ سے دور ہوتے گئے...

اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر پہلے فلور پر آ گئے۔

ارمان آہستہ آہستہ بول رہا تھا، جیسے خود سے بات کر رہا ہو،

"اب نہیں آئے گی... کوئی امید نہیں رہی"...

شاہویر نے کچھ کہنا چاہا، مگر وہ خاموش ہی رہا۔

ارمان ریلنگ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور نیچے گارڈن کی طرف دیکھنے لگا۔

نیچے سب لوگ خوش نظر آ رہے تھے

کوئی ہنس رہا تھا، کوئی تصاویر بنا رہا تھا، کوئی دوستوں کے ساتھ جشن منا رہا تھا۔

ہر طرف خوشی تھی...

مگر ارمان کے دل میں ایک عجیب سی خالی جگہ تھی۔

"سب خوش ہیں..." اس نے آہستہ سے کہا،

"بس... ایک میں ہی پاگل ہوں جو اس کا انتظار کر رہا ہوں"...

ہوا ہلکی سی چلی...

مگر اس کے دل کا بوجھ کم نہ کر سکی۔

تبھی ارمان کے کانوں میں رمشا اور زینب کی ہلکی سی بحث کی آواز پڑی۔

اس نے چونک کر مڑ کر دیکھا۔

رمشا تیزی سے اس کی طرف آئی اور ہلکی سی جھجک کے ساتھ بولی،

"السلام علیکم"...

"وعلیکم السلام..." ارمان اور شاہویر نے ایک ساتھ جواب دیا۔

فضا میں ایک عجیب سی جھجک پھیل گئی تھی۔

زینب نے ارمان کو غور سے دیکھا، پھر سیدھا بولی،

"آپ مومنہ کا انتظار کر رہے ہو نا...؟"

رمشا نے فوراً گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا،

"کیا بک رہی ہو تم، زینب؟"!

پھر اس نے جلدی سے ارمان کی طرف دیکھا،

"سوری ارمان... یہ ایسے ہی بکواس کرتی رہتی ہے"...

اس کی آواز میں گھبراہٹ صاف تھی، جیسے وہ کچھ چھپانا چاہ رہی ہو۔

"چلو... یہاں سے،" رمشا نے زینب کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتے ہوئے لے جانے لگی۔

مگر جاتے جاتے بھی زینب کہاں رکنے والی تھی۔

اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دھیرے سے کہا،

"میں نے سچ ہی تو کہا ہے... سب کو پتا ہے ان دونوں کا"...

ارمان جیسے وہیں جم سا گیا۔

اس کے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی۔

"سب کو... پتا ہے؟" یہ الفاظ اس کے ذہن میں گونجنے لگے۔

شاہویر نے ارمان کی طرف دیکھا،

"یار... یہ کیا کہہ رہی تھی؟"

"پتا نہیں، شاہویر..." ارمان نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا، نظریں اب بھی کہیں دور جمی ہوئی تھیں۔

شاہویر نے اسے غور سے دیکھا، پھر ہلکے سے مسکرایا،

"ویسے... کیا تُو نے اسے بتا دیا ہے کہ تُو اسے پسند کرتا ہے؟"

ارمان نے ہلکی سی نظریں جھکائیں،

"ابھی صاف صاف الفاظ میں تو کچھ نہیں کہا... لیکن... وہ سب سمجھتی ہے۔"

"واہ... یہ بھی ہے!" شاہویر نے ہنستے ہوئے کہا، جیسے بات کو ہلکا کرنا چاہ رہا ہو۔

ارمان کے چہرے پر ایک عجیب سی سنجیدگی آ گئی،

"سوچ رہا ہوں... آج اسے پرپوز کر ہی دوں۔"

یہ سن کر شاہویر واقعی حیران رہ گیا،

"اوئے سچ میں؟ آج؟"!

ارمان نے سر ہلایا، مگر اس کی نظریں ایک بار پھر نیچے ہجوم میں کسی کو ڈھونڈنے لگیں،

"لیکن... وہ آئے تو سہی... پتا نہیں کہاں رہ گئی ہے"...

اس کی آواز میں بے چینی بڑھ گئی تھی۔

شاہویر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا،

"آجائے گی یار... اتنا ٹینشن نہ لے۔"

کھاسا وقت گزر چکا تھا تقریبا ادھا گھنٹہ۔

اس نے بیلٹ والا عبایا پہنا ہوا تھا خالص سفید رنگ کا، جس میں اس کا پورا وجود سادگی اور وقار کے ساتھ چھپا ہوا تھا۔

کلچر ڈے جیسے رنگین دن میں بھی وہ مکمل حجاب میں تھی... مگر اسی سادگی میں ایک الگ ہی کشش تھی۔

اس کے قدم آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔

ہیلس پہننے کی اسے عادت نہیں تھی... ہر قدم کے ساتھ ہلکی سی جھجھک، ہلکا سا ڈر۔

وہ ریلنگ کو تھامے اوپر بڑھ رہی تھی کہ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑکھڑا گئی۔

"آہ۔۔۔"

مگر زمین پر گرنے سے پہلے ہی کسی نے اسے تھام لیا۔

"دھیان سے، مومنہ جی..." ایک مانوس آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

مومنہ نے چونک کر اوپر دیکھا

ارمان تھا۔

اس کے ہاتھ مضبوطی سے اسے سنبھالے ہوئے تھے۔

چند لمحوں کے لیے دونوں کی نظریں ایک دوسرے میں الجھ گئیں۔

مومنہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا...

اور ارمان وہ جیسے ایک لمحے کے لیے سب کچھ بھول گیا۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" اس نے نرمی سے پوچھا، مگر اس کی آواز میں چھپی فکر صاف محسوس ہو رہی تھی۔

مومنہ نے فوراً نظریں جھکا لیں،

"ج... جی، میں ٹھیک ہوں... شکریہ آپ کا"

مگر اس کے ہاتھ اب بھی ہلکے سے کانپ رہے تھے۔

ارمان نے ابھی بھی اس کا ہاتھ نہ چھوڑا...

اس کے دل نے جیسے ابھی بھی اسے تھام رکھا تھا۔

سیڑھیوں پر ایک لمحے کے لیے وقت رک سا گیا

اور نیچے کلچر ڈے کا شور... اب بہت دور محسوس ہو رہا تھا۔

"ویسے... اب آپ مجھے چھوڑ دینا چاہیے... میں ٹھیک ہوں،" مومنہ نے آہستہ سے کہا، نظریں جھکائے ہوئے۔

"اوہ... معذرت..." ارمان فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی بھی تھی اور ہلکی سی جھجک بھی۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ ہلکا سا مسکرایا،

"مجھے یقین نہیں ہو رہا... آپ کے پیرنٹس نے آپ کو آج کے دن بھی یہاں آنے کی اجازت دے دی"...

مومنہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر دھیرے سے بولی،

"میرے والدین اتنے بھی بُرے نہیں ہیں"...

اس کے لہجے میں ہلکی سی نرمی تھی... مگر اس کے پیچھے چھپی حقیقت صرف وہی جانتی تھی۔

کتنی منتیں کی تھیں...

کتنی وضاحتیں دی تھیں...

تب جا کر کہیں اجازت ملی تھی۔

وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی، پھر آہستہ سے سیڑھی کی ریلنگ تھام لی، جیسے خود کو سنبھال رہی ہو۔

ارمان اسے دیکھتا رہا

آج وہ پہلے سے مختلف لگ رہی تھی...

زیادہ سنجیدہ... زیادہ خوبصورت... اور شاید... کچھ زیادہ دور بھی۔

تبھی شاہویر ان کے پاس آ گیا۔

"اوہ... بھابھی آ ہی گئی!" شاہویر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا؟" مومنہ نے حیرت سے پوچھا۔

ارمان کا دل جیسے ایک لمحے کو رک گیا۔

اس نے فوراً آگے بڑھ کر شاہویر کا ہاتھ پکڑا اور زور سے مروڑا۔

"آہ! چھوڑ... چھوڑ!" شاہویر درد سے کراہ اٹھا۔

"کچھ نہیں مومنہ جی..." ارمان نے جلدی سے بات سنبھالتے ہوئے کہا،

"یہ شاہویر بے بی کی بات کر رہا ہے... اس کے گھر بے بی آیا تھا۔"

مومنہ نے بھنویں سکیڑیں،

"کس کا بے بی؟"

ارمان اور شاہویر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا

دونوں کے چہروں پر ایک لمحے کی خاموشی۔

پھر شاہویر نے کھنکھارتے ہوئے بات گھما دی،

"جی... وہ محلے داروں کا بچہ تھا... چلتا چلتا میرے گھر آگیا اور مجھے 'بابابابا' کہنے لگا۔

گھر والے پریشان ہو گئے کہ میں نے کیا کر دیا... پھر اس نے میرے بابا اور دادا کو بھی بابا کہا تو سب کو یقین آ گیا کہ اس واردات میں میرا کوئی ہاتھ نہیں"!

مومنہ یہ سن کر ہنس پڑی،

اس کی ہنسی میں ایک سادہ سی خوشی تھی۔

"کوئی حال نہیں... آج کل کی مائیں بھی بچوں کی فکر نہیں کرتیں"!

وہ بولتے ہوئے ہلکی سی مسکرائی۔

آج مومنہ نے نقاب نہیں کیا تھا، صرف سادہ سا حجاب پہنا تھا۔

اس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا نرم، سادہ، اور بے حد پُر سکون۔

ارمان ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔

وہ اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا...

جیسے پہلی بار اسے اس طرح دیکھ رہا ہو۔

"چلیں، کینٹین میں چلتے ہیں... سب وہیں ہیں،" ارمان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"چلو ٹھیک ہے..." مومنہ نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

ارمان نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر ہاتھ سے راستہ دکھایا،

"پہلے آپ، محترمہ"...

مومنہ نے اس کی طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا،

"آپ کی اس کرم نوازی کا شکریہ"...

دونوں کے بیچ ایک لمحے کے لیے ہلکی سی خموشی چھاگئ

لیکن یہ خموشی بوجھ نہیں تھی...

بلکہ ایک انجانا سا سکون لے کر آئی تھی۔

ارمان کے قدم مومنہ کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنے لگے۔

وہ بار بار چوری چھپے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

مومنہ اپنی چادر سنبھالے، نرمی سے چل رہی تھی

اس کی موجودگی میں ایک عجیب سی سادگی اور وقار تھا۔

راستے میں شور، ہنسی، رنگ

سب کچھ تھا...

مگر ارمان کے لیے...

اس وقت سب سے اہم وہی ایک لمحہ تھا

جب وہ اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

اور شاید...

یہی وہ لمحہ تھا جس کا اسے انتظار تھا۔

جب وہ سب کینٹین پہنچے تو مومنہ کی نظر فوراً ایک کونے میں کھڑے دانیال پر پڑی۔

وہ کسی عجیب سی حالت میں تھا

کپڑے تھوڑے بکھرے ہوئے، چہرے پر ہلکی سی پریشانی، اور بال ایسے جیسے ابھی ابھی تیز ہوا سے گزرے ہوں۔ سندھی بننے کی کوشش میں وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ اور کافی ناکام ہو چکا تھا۔

مومنہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلا دیں،

"یہ... دانیال؟ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے اس نے؟ کلچر ڈے پر بھی ایسے آنا ہے کیا... کیا ہی بن گیا ہے"!

اس کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور ہلکی سی مسکراہٹ بھی۔

ارمان نے فوراً مومنہ کے چہرے کی طرف دیکھا

اور جیسے ہی اس نے اس کی حیرانگی دیکھی، اس کے اندر کا شرارتی پن جاگ گیا۔

وہ تھوڑا سا آگے بڑھا، اور ہلکے سے بولا،

"اوہ... دانیال صاحب! آج تو آپ نے فیشن میں انقلاب لا دیا ہے... یہ اسٹائل کہاں سے لیا چائنہ کا سندھی لگ رہے ہو آپ؟"

کینٹین میں بیٹھے چند لوگ بھی مڑ کر دیکھنے لگے۔

دانیال نے شرمندگی سے اپنا سر کھجایا،

"یار ارمان... چھوڑو بھی اب"...

مگر ارمان کہاں رکنے والا تھا،

"نہیں نہیں، سچ میں! ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ کلچر ڈے میں نہیں... کوئی فیشن شو میں آئے ہیں قسم سے اگر آپ ڈیزائنر بنے تو آپ بہت امیر ہو جائیں گے انگریز ویسے بھی ایسے کپڑے پسند کرتے ہیں اپنے فیشن شوز میں"!

یہ سن کر مومنہ خود کو روک نہ سکی۔

وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولی،

"ارمان... بس بھی کریں... بے چارے کو تنگ نہ کریں۔"

مگر اس کی ہنسی میں ایک خاص سی چمک تھی

اور ارمان نے پہلی بار اسے اس طرح کھل کر ہنستے دیکھا۔

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا...

اور صرف اسے دیکھتا رہ گیا۔

"یہ... ہنستی ہوئی کتنی خوبصورت لگتی ہے"...

یہ خیال اس کے دل میں آہستہ سے گزر گیا۔

اور شاید...

اس دن پہلی بار، ارمان کا دل واقعی تیز دھڑکا تھا۔

سب لوگ ٹیبل پر بیٹھ گئے۔

آج کلچر ڈے ہونے کے باوجود انہیں آسانی سے جگہ مل گئی تھی

شاید اس لیے کہ یہ ٹیبل سکندر کی ہوا کرتی تھی، اور یہاں کوئی بھی بلاوجہ تنازع میں پڑنا پسند نہیں کرتا تھا۔

ماحول کچھ دیر کے لیے ہلکا ہو گیا تھا...

ہنسی مذاق، چھوٹے چھوٹے جملے، اور عام سی باتیں۔

مگر اچانک مومنہ کی نظر سامنے جا ٹھہری۔

وہیں کچھ فاصلے پر رمشا اور زینب گل بیٹھی تھیں۔

جیسے ہی مومنہ کی نظر پڑی...

رمشا نے فوراً اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔

مومنہ ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئی۔

اس کے چہرے پر حیرت، الجھن... اور ہلکی سی بے چینی ایک ساتھ آ گئی۔

ارمان نے یہ سب محسوس کر لیا۔

اس نے فوراً نرمی سے پوچھا،

"ابھی بھی ان سے لڑائی ہے؟"

مومنہ نے ہلکا سا منہ بنا کر جواب دیا،

"میری کسی سے بھی لڑائی نہیں، ارمان... بس... یہ لوگ ہی ایسے کر رہے ہیں۔"

اس کے لہجے میں دکھ صاف جھلک رہا تھا۔

ارمان نے یہ سنا تو دل ہی دل میں چونک گیا۔

وہ مومنہ کو اداس نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"اچھا چھوڑیں..." اس نے فوراً ماحول بدلنے کے لیے کہا،

"ہم کیا آرڈر کریں؟ کچھ منگواتے ہیں"...

پھر اس نے جان بوجھ کر دانیال کو چھیڑنا شروع کر دیا

ہنسی مذاق، بے فکری باتیں، چھوٹے چھوٹے جملے

تاکہ مومنہ کا دھیان اس اداسی سے ہٹ جائے۔

دانیال پہلے تو الجھ گیا، پھر اس نے بھی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دینا شروع کر دیا۔

مگر ارمان کی نظر بار بار چوری چھپے مومنہ کی طرف جا رہی تھی

جیسے وہ صرف باتیں نہیں کر رہا تھا...

بلکہ کسی کے دل کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اور مومنہ...

کچھ دیر بعد واقعی... ہلکی سی باتوں میں واپس آ گئی۔

مگر اس کے دل کے ایک کونے میں...

رمشا کی وہ نظریں ابھی بھی کہیں نہ کہیں چبھ رہی تھیں۔

"ویسے... تم واقعی مجھ سے شادی کرتے؟" نادیہ نے اچانک، نرم مگر سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

سکندر نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے صاف جواب دیا،

"نہیں۔"

اس کے اس ایک لفظ نے جیسے ہوا کا رخ بدل دیا۔

نادیہ کے چہرے پر ہلکی سی حیرت آئی، پھر اس نے ہلکی سی ناراضی میں اس کے بالوں کو ہلکے سے کھینچا،

"اس دن تو بڑے بڑے باتیں کر رہے تھے شادی کی"!

سکندر نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ ہٹایا،

"کون سا دن؟ میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔"

نادیہ اب بالکل اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

سکندر ابھی بھی بینچ پر بیٹھا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ضد تھی،

"میں تم سے بڑی ہوں... میری عزت کرو۔ اور مجھے وہ دن نہیں بھولے گا۔ اس دن پل پر بہت بڑی بڑی پھینک رہے تھے تم"

سکندر نے آہستہ سے اس کی طرف دیکھا، پھر ہلکا سا مسکرایا،

"واقعی بڑی ہیں؟"

وہ بینچ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اب دونوں کے درمیان فاصلہ کم تھا...

مگر اونچائی کا فرق واضح تھا۔

نادیہ نے فوراً ایک قدم پیچھے لیا، جیسے اس کی سنجیدگی سے تھوڑا سا گھبرا گئی ہو۔

سکندر نے نرمی سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا،

اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

"لگتا نہیں کہ آپ مجھ سے بڑی ہیں... کندھے تک بھی نہیں آرہیں۔"

اس کے لہجے میں ہلکی سی چھیڑ بھی تھی... اور ایک عجیب سا اعتماد بھی۔

نادیہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی۔

مگر اس خاموشی میں...

ناراضی سے زیادہ کچھ اور تھا

ایک ایسا احساس...

جو وہ خود بھی پوری طرح سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"چلیں، نیچے چل کر کچھ کھاتے ہیں، بھوک لگ رہی ہے مجھے،" سکندر نے کہا۔

"آپ جائیں، مجھے رہنے دیں،" نادیہ نے آہستہ سے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" سکندر نے حیرت سے پوچھا۔

"میں سب کے سامنے آپ کے ساتھ آنا نہیں چاہتی،" نادیہ نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

"ایسا کیوں؟" سکندر نے الجھن سے پوچھا۔

"بس، آپ کو پتا ہے، سو مو، سو باتیں، مجھے اچھا نہیں لگے گا،" نادیہ نے آہستہ سے کہا۔

"پھر بھی، چھت سے تو کہیں اور چل لیں، یا یہی رہتے ہیں سارا دن؟" سکندر نے تھوڑا سوچتے ہوئے کہا۔

"جی، نیچے آ رہی ہوں، میں،" نادیہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"لیڈیز فرسٹ، پہلے آپ اتریں،" سکندر نے احترام سے کہا۔

"اچھا، ٹھیک ہے، سکندر،" نادیہ نے سر ہلا دیا۔

اور دونوں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے کی طرف بڑھنے لگے،

حالانکہ دونوں کے دل میں ایک پیچیدہ سا احساس تھا جو چھپا ہوا تھا۔

سکندر نیچے آ کر اپنے دوستوں کے پاس بیٹھ گیا اور ہنسی مذاق میں باتیں کرنے لگا۔

نادیہ کچھ فاصلے پر کھڑی سب کو دیکھ رہی تھی خاص طور پر سکندر کو۔

وہ حیران تھی...

"آخر یہ ایسا کیوں ہے؟" اس کے دل میں بار بار یہی سوال گونج رہا تھا۔

کچھ دیر پہلے تک جو شخص اس کے ساتھ اتنا سنجیدہ تھا...

اب وہ سب کے ساتھ اتنا نارمل اور بے فکر کیسے ہو سکتا ہے؟

اسی دوران اس کی نظر سامنے پڑی

رمشا اور مومنہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

رمشا نے فوراً نظریں ہٹا لیں،

مگر مومنہ نے ایک لمحے کے لیے نادیہ کو دیکھا... جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

نادیہ کو یہ بات محسوس ہوئی...

اور وہ تھوڑی سی الجھ گئی۔

"یہ سب مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟"

"کیا انہیں کچھ پتا ہے؟"

اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

وہ ایک قدم پیچھے ہٹی،

اور پھر اپنی نظریں سکندر کی طرف کر دیں۔

سکندر...

جو ہنس رہا تھا، باتیں کر رہا تھا، جیسے سب کچھ نارمل ہو۔

مگر نادیہ کے دل میں اب وہی سوال تھا

"کیا یہ سکندر وہی ہے... جو اوپر میرے ساتھ تھا؟"

اور یہ سوال...

اسے اندر سے اور زیادہ بے چین کر رہا تھا۔

"اوئے، ایسا کرتے ہیں... سب کہیں چلتے ہیں!" شاہویر نے اچانک تجویز دی۔

"لیکن کہاں؟" دانیال نے پوچھا۔

"کسی پارک میں..." شاہویر نے کندھے اچکا کر کہا۔

"ہماری یونی میں بھی تو پارک ہے..." سکندر نے نرمی سے کہا۔

"نہیں یار، یہاں سب اسٹوڈنٹس، ٹیچرز اور گارڈز ہیں... یہاں کیا مزہ؟" شاہویر نے فوراً جواب دیا۔

"یہ تو ہے..." سکندر نے ہلکے سے سر ہلایا۔

پھر وہ سب کی طرف دیکھ کر بولا،

"چلو پھر سب دوست چلتے ہیں۔"

"کون کون؟" ارمان نے پوچھا۔

سکندر تھوڑا سا کھڑا ہوا اور دوسری ٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا،

"رمشا اور زینب... آپ دونوں بھی ہمارے ساتھ چلو۔"

مومنہ کے دل میں ایک لمحے کو ہلکی سی گھبراہٹ اٹھی۔

اسے لگا...

شاید رمشا اور زینب اس کی وجہ سے انکار کر دیں۔

وہ سانس روکے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگی...

مگر حیرت کی بات یہ تھی

رمشا نے ایک نظر زینب کو دیکھا،

اور پھر دونوں نے سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے... چلتے ہیں۔"

مومنہ کے دل سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

اور ارمان...

وہ یہ سب نوٹ کر رہا تھا۔

وہ جانتا تھا...

کہ یہ چھوٹی سی "ہاں" صرف ایک سادہ سی رضامندی نہیں تھی

بلکہ اس لمحے میں چھپے احساسات کا ایک اشارہ تھی۔

اور یوں...

سب ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔

سکندر کھڑا ہو کر ادھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہا تھا، جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہو۔

ارمان نے اسے غور سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے پوچھا،

"کسے دیکھ رہے ہو؟ تمہیں بھی کسی کا انتظار ہے؟"

سکندر نے فوراً نظریں ہٹا لیں،

"نہیں ارمان، ایسی کوئی بات نہیں"...

اس کے لہجے میں ایک ہلکی سی بے قراری تھی، مگر وہ اسے چھپانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

ارمان نے مسکراتے ہوئے کندھے اچکائے،

"اچھا ٹھیک ہے"...

پھر سب دوست چار لڑکے اور تین لڑکیاں یونیورسٹی سے باہر نکل گئے۔

ان کا رخ اب ناصر پارک کی طرف تھا۔

راستے میں ہلکی ہلکی باتیں، ہنسی مذاق اور ہوا کا سکون

مگر ہر کسی کے دل میں کچھ نہ کچھ چل رہا تھا۔

ارمان بار بار چپکے سے مومنہ کو دیکھتا...

مومنہ کبھی آگے دیکھتی، کبھی زمین پر نظریں جما لیتی۔

زینب گل سکندر سے بات کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اس کی آواز میں ہلکی سی خوشی اور حیرت تھی۔

"سکندر بھائی! آپ نے کمال طریقے سے ہمیں یونی سے باہر نکال لیا، ورنہ گارڈ تو ہمیں جانے ہی نہیں دیتا... آپ واقعی بہت کمال ہیں"!

سکندر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

"شکریہ، بچے۔"

اس کی بات سن کر ماحول تھوڑا ہلکا ہو گیا۔

پھر رمشا نے بھی آہستہ سے کہا،

"واقعی... سکندر بہت کمال ہیں۔"

مگر اس کی آنکھوں میں نمی تھی

جیسے وہ کچھ چھپا رہی ہو، یا خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہو۔

مومنہ نے یہ دیکھا تو اس کے دل میں ایک لمحے کے لیے پرانی باتیں بھول گئیں۔

وہ نرم لہجے میں بولی،

"سب ٹھیک ہے نا؟"

رمشا نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا،

"ہاں... سب ٹھیک ہے۔"

مومنہ کو اس کے لہجے پر مکمل یقین نہیں آیا...

مگر اس نے مزید سوال نہیں کیا۔

سب ایک وین میں بیٹھے تھے

قریب، مگر پھر بھی ہر کوئی اپنے اپنے خیالوں میں گم تھا۔

وین کی ہلکی ہلکی آواز...

ہوا کی سرسراہٹ...

اور ان سب کے دلوں میں چلتی کہانیاں

جو ابھی مکمل نہیں ہوئی تھیں...

بلکہ ابھی شروع ہو رہی تھیں۔

آج ارمان کے لیے ایک خاص دن تھا۔

وہ بار بار اپنے دل میں جملے دہرا رہا تھا

الفاظ جو وہ مومنہ کو کہنا چاہتا تھا، مگر ہر بار کچھ نہ کچھ رک سا جاتا۔

شاہویر نے اس کی کیفیت کو بہت پہلے سے بھانپ لیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ ارمان آج اپنے دل کی بات کہنے والا ہے

اور یہ بات صرف اسی کو معلوم تھی۔

ارمان کبھی وین کی کھڑکی سے باہر دیکھتا...

کبھی مومنہ کی طرف چوری چھپے نظر ڈالتا...

اور پھر فوراً نظریں ہٹا لیتا۔

مومنہ بے خبر اپنی جگہ پر بیٹھی تھی،

مگر آج اس کی موجودگی ارمان کے لیے پہلے سے زیادہ اہم تھی۔

شاہویر نے ارمان کے کندھے پر ہلکے سے ہاتھ رکھا،

"آج... یہ موقع ہے یار۔"

ارمان نے گہری سانس لی،

"پتا نہیں... وہ کیا جواب دے گی"...

شاہویر نے مسکرا کر کہا،

"بس سچ بول دینا... باقی وہ خود سنبھال لے گی۔"

یہ سن کر ارمان کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

اب یہ صرف ایک سفر نہیں تھا...

بلکہ ایک لمحہ تھا

جہاں ارمان اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنے والا تھا۔

اور مومنہ...

ابھی تک یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی طرف آنے والی اگلی بات...

اس کی دنیا بدل سکتی ہے۔

ایمان نور اپنے بیٹے نعمان کے ساتھ ہسپتال پہنچی تو اُن کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔

قدم لڑکھڑا رہے تھے، سانس بے ترتیب تھی... جیسے دل ہر دھڑکن کے ساتھ ڈوب رہا ہو۔

"میرا ارمان... میرا بیٹا کہاں ہے؟" ان کے ہونٹ بے اختیار یہی الفاظ دہرا رہے تھے۔

اُنہیں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا...

نہ آس پاس کی آوازیں، نہ لوگوں کی باتیں

بس ایک ہی خیال تھا...

ارمان۔

وہی بیٹا... جو ان کے لیے صرف بیٹا نہیں تھا،

بلکہ اُن کی زندگی کا سہارا تھا۔

وہی جس نے ہمیشہ انہیں سمجھا، ان کے دکھ بانٹے، ان کے خاموش درد کو محسوس کیا۔

نعمان اُن کے ساتھ تھا، بار بار انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا،

"ماما... پلیز خود کو سنبھالیں... کچھ نہیں ہو گا بھائی کو"...

مگر ایمان نور کی آنکھوں میں صرف خوف تھا۔

دونوں بیٹے اُن کے لیے برابر عزیز تھے

لیکن ارمان...

وہ تو پہلے ہی زندگی کے بہت سے دکھ سہہ چکا تھا۔

بچپن سے لے کر آج تک...

وہ ہمیشہ دوسروں کے لیے مضبوط بنا رہا،

اپنے درد کو چھپا کر۔

"یا اللہ... میرے بچے کو سلامت رکھنا..." ایمان نور کے لب کانپ رہے تھے،

آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔

ہسپتال کی سفید دیواریں، تیز روشنی...

اور اس سب کے بیچ ایک ماں کا ٹوٹتا ہوا دل

جو صرف اپنے بیٹے کو ایک بار دیکھنا چاہتا تھا...

بس ایک بار۔

"السلام علیکم، ماں جی..." سکندر نے انہیں دیکھتے ہی جلدی سے کہا، اس کے لہجے میں احترام بھی تھا اور بے چینی بھی۔

مگر ایمان نور اس وقت کسی اور ہی دنیا میں تھیں۔

ان کے کان جیسے سن ہی نہیں رہے تھے... آنکھیں بس ایک ہی چہرہ ڈھونڈ رہی تھیں

ارمان۔

وہ جواب نہ دے سکیں۔

نعمان نے فوراً آگے بڑھ کر انہیں سنبھالا،

"ماما... پلیز... ادھر بیٹھ جائیں"...

وہ انہیں آہستہ سے پکڑ کر قریب پڑی ایک بینچ پر بٹھا دیتا ہے۔

ایمان نور کے ہاتھ کانپ رہے تھے، سانسیں تیز تھیں۔

وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھتی تھیں، جیسے ابھی ارمان باہر آجائے گا۔

"میرا بچہ... میرا ارمان کہاں ہے...؟" ان کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

نعمان ان کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا،

"ماما... کچھ نہیں ہوگا بھائی کو... آپ پلیز خود کو سنبھالیں"...

سکندر ایک طرف کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔

اس کے چہرے پر پہلی بار وہ بے بسی تھی... جو وہ چھپانا بھی چاہے تو چھپا نہیں پا رہا تھا۔

"یہ سب کیسے ہوا بھائی کے ساتھ؟" نعمان نے بے چینی سے سکندر سے پوچھا۔

سکندر کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

وہ خاموش کھڑا تھا، جیسے الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہوں۔

سب ارمان کے وارڈ کے باہر موجود تھے

ہر چہرہ اُترا ہوا، ہر آنکھ میں خوف۔

تبھی دانیال تیزی سے وہاں پہنچا۔

اس نے سب کے چہرے دیکھے... اور فوراً سمجھ گیا کہ سچ چھپایا نہیں جا سکتا۔

اس نے گہرا سانس لیا، پھر آہستہ سے بولنا شروع کیا،

"ارمان اور شاہویر... دونوں کار میں تھے"...

سب کی نظریں ایک دم اس پر جم گئیں۔

"بریک فیل ہو گئی..." اس کی آواز بھاری ہو گئی،

"گاڑی کنٹرول سے باہر ہو گئی"...

ایمان نور کے ہاتھ مزید کانپنے لگے، نعمان کا دل جیسے رک گیا۔

"شاہویر کو ہوش ہے..." دانیال نے کہا،

"لیکن"...

وہ رک گیا۔

کمرے میں ایک لمحے کی خاموشی چھا گئی

ایسی خاموشی، جو چیخوں سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔

"ارمان..." دانیال کی آواز ٹوٹ گئی،

"ارمان کوما میں ہے۔"

یہ الفاظ جیسے فضا میں گونج گئے۔

ایمان نور کے لب کانپے...

اور اگلے ہی لمحے وہ بے اختیار رونے لگیں۔

"نہیں... میرا بچہ... نہیں"...

نعمان نے فوراً انہیں سنبھالا،

مگر اس کی اپنی آنکھوں میں بھی آنسو آ چکے تھے۔

سکندر نے مٹھی بھینچ لی

اس کے چہرے پر غصہ، بے بسی اور درد سب ایک ساتھ تھا۔

سکندر خاموش کھڑا تھا...

آنکھیں کہیں دور جمی ہوئی تھیں، مگر ذہن میں طوفان برپا تھا۔

ارمان کا چہرہ، اس کی باتیں...

اور ارمان کی خوشی کا پہلا دن کلچر ڈے سب ایک ساتھ گھوم رہا تھا۔

اس نے آہستہ سے آنکھیں بند کیں،

اور دل میں ایک خیال ابھرا

"ایک نفرت ہے جو چند لمحوں میں محسوس کر لی جاتی ہے...

اور ایک محبت ہے جس کا یقین دلاتے دلاتے ساری عمر گزر جاتی ہے"...

اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی کڑوی مسکراہٹ آئی۔

"ارمان..." اس نے دل ہی دل میں کہا،

"تو بھی نا"...

اسے یاد آیا

ارمان اس دن مومنہ کو سب کچھ بتانے والا تھا...

اپنے دل کی وہ بات... جو شاید وہ کبھی کہہ نہ سکا۔

سکندر نے گہرا سانس لیا،

اور پہلی بار... اسے محبت اتنی "فضول" نہیں لگی۔

ہسپتال کی سفید دیواروں کے بیچ کھڑا

وہ زندگی کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہا تھا۔

اور کہیں نہ کہیں...

اسے احساس ہو رہا تھا

کچھ باتیں وقت پر نہ کہی جائیں...

تو ہمیشہ کے لیے ادھوری رہ جاتی ہیں۔

وہ سب ناصر باغ میں ایک بینچ پر بیٹھے تھے۔

آخرکار مومنہ، رمشا اور زینب گل ایک ساتھ بیٹھ گئی تھیں۔

ارمان نے یہ منظر دیکھا تو اس کے دل کو جیسے سکون مل گیا

"چلو... ان کی لڑائی تو ختم ہوئی"...

"معاف کرنا مومنہ... ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا،" رمشا نے نرمی سے کہا۔

زینب نے بھی فوراً سر ہلا کر اس کی بات کی تائید کی۔

مومنہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا،

"اٹس اوکے... میں باتیں بھول جاتی ہوں... یہ بھی بھول جاؤں گی۔"

"تمہارا شکریہ، مومنہ..." رمشا اور زینب نے ایک ساتھ کہا۔

مومنہ بس مسکرا دی۔

اسی لمحے ان تینوں کی نظر سامنے گئی

جہاں لڑکے اپنی ہی دنیا میں مصروف تھے۔

سکندر نے ایک چھوٹے بچے کی بال چھین لی تھی اور بڑے مزے سے فٹ بال کھیل رہا تھا۔

"اوئے سکندر! بچے کی بال واپس کر!" ارمان چلاتا ہوا اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

شاہویر بھی ہنستے ہوئے بولا،

"یار شرم کر... بچپنا ابھی تک ختم نہیں ہوا"!

دانیال بھی پیچھے پڑا ہوا تھا،

"اوئے بھائی، یہ چوری ہے سیدھی سیدھی"!

مگر سکندر کہاں ماننے والا تھا

وہ بال کو آگے مار کر خود ہی دوڑ رہا تھا، جیسے پورا میدان اسی کا ہو۔

بچہ بیچارہ پیچھے کھڑا منہ بنائے دیکھ رہا تھا۔

یہ سب دیکھ کر مومنہ بے اختیار ہنس پڑی

ایسی ہنسی جو دل سے نکلی ہو۔

رمشا اور زینب بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگیں

"یہ سکندر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا..." مومنہ نے ہنستے ہوئے کہا، نظریں اب بھی اس کی شرارتوں پر تھیں۔

"ہاں... ایسا ہی ہے یہ..." رمشا نے دھیرے سے کہا، مگر اس کی آواز میں ہلکی سی اداسی شامل تھی۔

مومنہ نے فوراً اس کی طرف دیکھا، جیسے کچھ محسوس کر لیا ہو،

"تمہیں پسند ہے نا وہ...؟"

رمشا ایک دم شرما گئی، نظریں جھک گئیں۔

"جی مومنہ جی! یہ تو بہت پسند کرتی ہیں انہیں!" زینب گل نے فوراً بول دیا۔

"زینب!" رمشا نے گھبرا کر اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کی۔

مومنہ یہ دیکھ کر ہنس پڑی،

"نہ کرو رمشا ایسے"...

رمشا رک گئی، پھر آہستہ سے بولی،

"میرے پسند کرنے کا کیا فائدہ، مومنہ ؟"

"کیوں؟ کیا ہوا؟" مومنہ نے نرمی سے پوچھا۔

رمشا نے ایک گہرا سانس لیا،

"بات تو تب ہے نا... جب وہ بھی مجھے پسند کرے"...

"کیا وہ تمہیں پسند نہیں کرتا؟" مومنہ نے حیرت سے پوچھا۔

"کرتا ہے..." رمشا نے فوراً کہا،

"لیکن... بس ایک دوست کی طرح۔ اس سے زیادہ نہیں"...

اس کے لہجے میں مایوسی صاف جھلک رہی تھی۔

"اور اس کی کیا وجہ لگتی ہے تمہیں؟" مومنہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

رمشا کچھ لمحے خاموش رہی، پھر آہستہ سے بولی،

"میں نے آج سکندر کو کسی کے ساتھ چھت پر بیٹھے دیکھا تھا... کسی لڑکی کے ساتھ"...

مومنہ چونک گئی،

"مجھے یقین نہیں آتا کہ سکندر کسی بھی لڑکی کے ساتھ ایسے بیٹھ سکتا ہے"...

"میں خود حیران ہوں..." رمشا نے نظریں جھکا لیں،

"لیکن میں اس لڑکی کا چہرہ نہیں دیکھ سکی... اور اب سکندر بھی کہاں مانے گا کہ وہ کسی کے ساتھ تھا"...

کچھ لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔

پھر مومنہ نے نرمی سے کہا،

"کوئی بات نہیں رمشا... کئی دفعہ ہم جو چاہتے ہیں، ہمیں وہ نہیں ملتا"...

اس نے ہلکے سے پوچھا،

"لیکن کیا تم نے سکندر سے اظہارِ محبت کیا؟"

رمشا نے فوراً سر ہلایا،

"نہیں... ابھی تک نہیں... اور شاید کبھی کروں بھی نہ"...

اس کی آواز مدھم ہو گئی۔

مومنہ نے اسے غور سے دیکھا...

مگر مزید کچھ نہ پوچھا۔

کبھی کبھی...

خاموشی ہی سب سے بڑا جواب ہوتی ہے۔

تبھی رمشا نے اچانک پوچھ لیا،

"کیا تمہیں ارمان پسند ہے، مومنہ؟"

مومنہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

رمشا اور زینب دونوں نے اسے غور سے دیکھا

جیسے اس کے چہرے سے جواب پڑھنا چاہتی ہوں۔

مومنہ نے آہستہ سے نظریں اٹھائیں...

اور دور کھیلتے ہوئے ارمان کو دیکھا۔

وہ ہنس رہا تھا...

بچوں کی طرح، بے فکر، زندہ دل۔

مومنہ کے ہونٹ ہلکے سے کھلے،

"پتا نہیں... میں اس کو لے کر الجھن میں ہوں"...

اس کی آواز نرم تھی، مگر سچی۔

"جب کسی نے مجھ پر یقین نہیں کیا تھا"...

وہ رکی، جیسے پرانی باتیں یاد آ گئی ہوں،

"تب وہ میرے پاس رہا... مجھے سمجھا"...

اس کی نظریں اب بھی ارمان پر تھیں۔

"میں بس یہ چاہتی ہوں... کہ وہ ایسا ہی رہے"...

وہ دھیرے سے بولی،

"اگر وہ ایسا ہی ہے... تو شاید... میں اسے پسند کرتی ہوں"...

رمشا اور زینب ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں

یہ کوئی سادہ جواب نہیں تھا...

یہ دل کا وہ اعتراف تھا...

جو ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔

مگر کہیں نہ کہیں...

یہی احساس،

کسی نئی کہانی کی شروعات تھا۔

ارمان، شاہویر اور دانیال تینوں نے مل کر سکندر کو پکڑ رکھا تھا

مگر سکندر جیسے ان تینوں پر بھی بھاری پڑ رہا تھا۔

وہ ہنستے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا،

اور اگلے ہی لمحے

ایک جھٹکے سے تینوں کو پیچھے دھکیل دیا۔

"اوئے!" تینوں ایک ساتھ لڑکھڑا گئے۔

سکندر زور سے ہنسا،

اور باقی سب بھی اس کی حرکت پر ہنسنے لگے۔

دور بیٹھی زینب گل نے مسکرا کر کہا،

"ان لڑکوں کے مزے ہیں ویسے"...

"ہاں، کپڑے گندے کرنے کی بھی کوئی فکر نہیں ان کو..." رمشا نے کہا۔

مومنہ بھی ہنس پڑی،

"یہ تو ہے"...

ادھر ڈینیل نے سانس بحال کرتے ہوئے کہا،

"ویسے سکندر... تو کھاتا کیا ہے؟ اتنی طاقت کیسے ہے تجھ میں؟"

سکندر نے سینہ چوڑا کرتے ہوئے فخر سے کہا،

"بیٹا جی... مردوں میں ہوتی ہے ایسی طاقت"!

یہ کہہ کر وہ ایک دم سے تینوں کے چنگل سے نکل گیا اور انہیں گرا دیا۔

پھر اس نے بال اٹھائی اور سیدھا اُس بچے کے پاس گیا

جو اب بھی منہ بنائے کھڑا تھا، آنکھوں میں آنسو لیے۔

سکندر اس کے سامنے جھکا،

"لے بھئی... تیرے ہیرو نے واپس کر دی بال"...

اس نے نرمی سے بال اس کے ہاتھ میں دی۔

پھر اپنے بیگ کے پاس گیا،

اس میں سے ایک چاکلیٹ نکالی...

اور بچے کی طرف بڑھادی۔

بچے نے روتے روتے چاکلیٹ لی...

اور آہستہ آہستہ خاموش ہو گیا۔

سکندر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

دور بیٹھی مومنہ، رمشا اور زینب یہ سب دیکھ رہی تھیں

تبھی اچانک آسمان پر بادل گھرے ہو گئے

اور دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہو گئی۔

پہلے ہلکی ہلکی بوندیں...

پھر تیز بارش۔

"اوئے بھاگو!" شاہویر نے زور سے کہا۔

سب دوست ایک دم ادھر اُدھر بھاگنے لگے،

کوئی درختوں کی طرف دوڑا، کوئی بینچ کے پیچھے، کوئی کسی شیڈ کی تلاش میں۔

"ادھر آؤ! یہاں سایہ ہے!" دانیال نے دور ایک چھوٹے سے شیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

سب تیزی سے اس طرف بھاگنے لگے۔

مومنہ اپنی چادر سنبھالتی ہوئی جلدی جلدی چل رہی تھی،

بارش کی بوندیں اس کے چہرے اور ہاتھوں پر گر رہی تھیں۔

ارمان نے فوراً اس کے ساتھ قدم ملا لیے،

"دھیان سے... پھسل نہ جائیں۔"

رمشا اور زینب بھی بھاگ رہی تھیں

بارش نے جیسے ان کے دلوں کا بوجھ کچھ لمحوں کے لیے ہلکا کر دیا تھا۔

ادھر سکندر

وہ تو بارش میں ہی کھڑا ہنس رہا تھا۔

"اوئے آ جاؤ اندر!" ارمان نے آواز دی۔

"آرہا ہوں!" سکندر نے جواب دیا، مگر پھر بھی چند لمحے وہیں کھڑا رہا

بارش کو اپنے اوپر گرنے دیتا ہوا، جیسے اسے اس لمحے سے خاص لگاؤ ہو۔

آخرکار سب ایک چھوٹے سے شیڈ کے نیچے اکٹھے ہو گئے

قریب قریب، سانسیں تیز، کپڑے ہلکے سے بھیگے ہوئے۔

مومنہ اور ارمان ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ جیسے بارش نے باقی

سب دنیا کو تھوڑی دیر کے لیے دھندلا دیا ہو

اور وہ لمحہ صرف ان دونوں کے لیے رہ گیا ہو۔

شیڈ کے نیچے ہلکی سی جگہ تھی،

سب ادھر اُدھر ہو کر کھڑے تھے، مگر مومنہ کی نظر بس ارمان پر ٹکی ہوئی تھی۔

ارمان بھی اس کے قریب کھڑا تھا...

بال بھیگے ہوئے، چہرے پر پانی کے قطرے...

مگر آنکھوں میں ایک عجیب سا سکون۔

"گیلے ہو رہے ہیں..." ارمان نے آہستہ سے کہا،

اور اپنے بیگ سے ایک چھوٹا سا کپڑا نکال کر مومنہ کی طرف بڑھایا۔

مومنہ نے چونک کر اسے دیکھا،

"آپ"...

"لے لیں..." اس نے نرمی سے کہا،

"چہرہ صاف کر لیں۔"

مومنہ نے کپڑا تھام لیا،

اور آہستہ آہستہ اپنا چہرہ صاف کرنے لگی

مگر اس کی نظریں بار بار ارمان کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

دونوں کے درمیان خاموشی تھی...

مگر یہ خاموشی خالی نہیں تھی۔

یہ وہ خاموشی تھی جس میں دل بولتے ہیں۔

مومنہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

"آپ ہمیشہ ایسے ہی کرتے ہیں... سب کا خیال رکھتے ہیں؟"

ارمان نے ہلکا سا مسکرا کر جواب دیا،

"اگر کوئی اہم ہو... تو پھر تو خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔"

یہ جملہ سادہ تھا...

مگر مومنہ کے دل پر سیدھا اثر کر گیا۔

وہ کچھ کہہ نہیں سکی...

بس اس کے دل کی دھڑکن تھوڑی تیز ہو گئی۔

بارش کی آواز تیز ہو رہی تھی...

اور ان دونوں کے درمیان فاصلہ...

محسوس ہونے کے باوجود...

کم ہوتا جا رہا تھا۔

دور کھڑے باقی دوستوں کو بھی یہ خاموش قربت محسوس ہو رہی تھی

لیکن کسی نے کچھ کہا نہیں۔

کیونکہ بعض لمحے...

باتوں کے نہیں ہوتے۔

وہ صرف... محسوس کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔

ہسپتال کی فضا بھاری اور خاموش تھی...

سفید دیواریں، مدھم روشنی، اور مشینوں کی مسلسل بیپ بیپ آواز

جیسے ہر لمحہ کسی بڑی خبر کی گواہی دے رہی ہو۔

ڈاکٹر سنجیدگی سے کھڑا تھا...

اس کی آنکھوں میں بھی ایک تھکن اور افسوس تھا۔

"ہمیں آپریشن کرنا پڑے گا..." اس نے آہستہ لیکن واضح لہجے میں کہا،

"کافی nerves ڈیمیج ہو چکی ہیں۔ ہم انہیں ٹھیک کرنے کی پوری کوشش کریں گے"...

وہ لمحہ بھر رکا...

پھر اس کی آواز مزید سنجیدہ ہو گئی،

"لیکن... مریض کے ہوش میں آنے کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔"

یہ الفاظ سن کر جیسے کمرے کی ہوا ابھی رک گئی۔

کوما ایک ایسی کیفیت جہاں انسان زندہ تو ہوتا ہے...

مگر زندگی جیسے اس سے بہت دور ہو جاتی ہے۔

ایمان نور کے چہرے کا رنگ اڑ گیا...

ہونٹ خشک ہو گئے... اور آنکھوں میں آنسو آہستہ آہستہ بھرنے لگے۔

ان کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

"کیا... میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟"

ان کی آواز میں بے بسی اور ماں کا درد صاف جھلک رہا تھا۔

ڈاکٹر نے پہلے ایک لمحہ سوچا...

شاید وہ اس درد کو سمجھ رہا تھا۔

پھر نرمی سے کہا،

"آپ ان کی والدہ ہیں... اس لیے آپ صرف پانچ منٹ کے لیے اندر جا سکتی ہیں۔"

یہ اجازت نہیں تھی...

یہ ایک ماں کے لیے آخری سہارا تھا۔

ایمان نور کے قدم خود بخود آگے بڑھ گئے...

جیسے دل نے راستہ دکھا دیا ہو۔

دروازہ آہستہ سے کھلا...

اندر داخل ہوتے ہی دنیا جیسے اور ساکت ہو گئی۔

کمرے میں مدھم روشنی تھی...

اور بستر پر ان کا بیٹا بے جان سا لیٹا تھا۔

اس کے چہرے پر خاموشی تھی...

سانسیں بہت آہستہ...

جسم کمزور... جیسے ہر چیز سے لڑ رہا ہو۔

ایمان نور ایک لمحے کے لیے رک گئیں...

پھر آہستہ آہستہ اس کے قریب گئیں۔

ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

"میرے بچے"...

ان کی آواز ٹوٹ گئی،

"یہ کیا حال بنا لیا ہے تم نے"...

انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے اس کے ماتھے کو چھوا

جیسے وہ اس کے درد کو محسوس کرنا چاہ رہی ہوں۔

"تم تو میری زندگی تھے"...

وہ روتے ہوئے بولیں،

"تمہارے بغیر یہ دنیا میرے لیے کچھ بھی نہیں"...

انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا

اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"آنکھیں کھولو بیٹا"...

ان کی آواز میں التجا تھی،

"میری خاطر... صرف میری خاطر"...

ان کا دل ٹوٹ رہا تھا...

مگر وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں

کیونکہ وہ جانتی تھیں...

اب انہیں مضبوط ہونا ہو گا... اپنے بیٹے کے لیے۔

"میں تمہیں ایسے نہیں دیکھ سکتی"...

وہ آہستہ سے بولیں،

"تمہیں ٹھیک ہونا ہی ہو گا... سن رہے ہو نا"...

کمرے میں صرف ان کی سسکیوں کی آواز گونج رہی تھی۔

وقت جیسے رک گیا تھا...

پانچ منٹ...

لیکن ان پانچ منٹوں میں

ایک ماں نے اپنی پوری دنیا اپنے بیٹے کے سامنے رکھ دی۔

باہر دنیا چل رہی تھی...

مگر اندر...

ایک ماں اپنی امیدوں کے ساتھ لڑ رہی تھی

اور دل ہی دل میں...

اپنے بیٹے کے لیے دعا مانگ رہی تھی۔

ڈاکٹر دوبارہ تیزی سے اندر آیا، اس کے قدموں کی آہٹ نے کمرے کی خاموشی توڑ دی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی اور اضطراب صاف جھلک رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر رکا نہیں اور فوراً بولا،

"ہمیں فوری طور پر O Negative blood کی ضرورت ہے... ارمان کا بہت خون بہہ گیا ہے اور بلڈ گروپ بھی O Negative ہے۔"

یہ سننا تھا کہ سب کے چہرے ایک دم بدل گئے۔ کمرے میں ایک عجیب سی گھبراہٹ پھیل گئی۔

سکندر فوراً آگے بڑھا، اس کی آواز میں پریشانی تھی،

"نعمان! تم اسے خون دے دو"!

مگر نعمان نے بے بسی سے سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی تھی،

"افسوس!! میرے بھائی کا blood میرے سے میچ نہیں کرتا"...

یہ سن کر سکندر کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے خاموشی چھاگئی، پھر اس نے دانت بھینچے۔ دانیال بھی ساتھ ہی پریشان ہو گیا، اس نے ادھر اُدھر دیکھا، جیسے کسی معجزے کی تلاش ہو۔ لیکن ہر طرف صرف خاموشی اور بے بسی تھی۔

کمرے میں موجود ہر شخص ایک دوسرے کو دیکھ رہا تھا، مگر کسی کے پاس کوئی حل نہیں تھا۔ ہر دل میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا اب کیا ہو گا؟ ایک طرف ارمان کی زندگی داؤ پر تھی، دوسری طرف ان کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔

تبھی ایمان نور بولی "صرف رحمان شیخ کا خون ہی ارمان سے ملتا ہے۔" یہ بول کر وہ اور زیادہ ناامید ہو گئی۔

کیونکہ صرف وہی تھے جن کا بلڈ O Negative تھا۔ اب سب کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اگر کوئی امید باقی ہے تو وہ انہی کے ذریعے ہے۔

سکندر اور دانیال دونوں سوچ میں ڈوب گئے۔ سکندر کے چہرے پر بے چینی تھی، وہ بار بار مٹھی بھینچ رہا تھا، جیسے اپنے اندر کے اضطراب کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دانیال بھی خاموش تھا، مگر اس کی آنکھوں میں سوالات اور خدشات واضح تھے۔

اصل مسئلہ اب یہ نہیں تھا کہ خون کہاں سے آئے گا...

بلکہ یہ تھا کہ ان کے پاس جا کر ان سے خون دینے کی درخواست کون کرے گا؟

یہ بات اتنی آسان نہیں تھی جتنی سننے میں لگ رہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے سب خاموش ہو گئے۔

سکندر نے آہستہ سے سر اٹھایا، اس کے دل میں ایک کشمکش چل رہی تھی

"اگر وہ انکار کر دیں تو؟ اگر وقت ختم ہو گیا تو؟"

دانیال بھی اسی سوچ میں گم تھا، اور سب ایک ایسی الجھن میں تھے جہاں نہ آگے بڑھنا آسان تھا اور نہ پیچھے ہٹنا ممکن۔

یہ وہ لمحہ تھا جہاں صرف فیصلہ نہیں...

بلکہ ہمت، احساس اور انسانیت کا امتحان تھا۔

کمرے میں خاموشی ایسی تھی جیسے سانسیں بھی ڈر رہی ہوں۔

مشینوں کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ہر دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، مگر کسی کے پاس کہنے کو الفاظ نہیں تھے۔

ایمان نور ایک طرف کھڑی تھیں، اپنے بیٹے کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے...

ان کی آنکھوں میں آنسو تھے، مگر وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

وہ جانتی تھیں کہ اب صرف دعا کافی نہیں... کچھ کرنا ہو گا۔

اسی بھاری لمحے میں سکندر نے آہستہ سے سر اٹھایا۔

اس کے چہرے پر ایک عجیب سی سختی تھی

مگر آنکھوں میں درد بھی چھپا ہوا تھا۔

وہ آگے بڑھا... ایک قدم... پھر دوسرا...

اور اچانک رک گیا۔

"میں جاؤں گا..." اس کی آواز آہستہ تھی، مگر اس میں فیصلہ تھا۔

سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

سکندر نے گہری سانس لی، جیسے ہر لفظ اس کے دل پر وزن ڈال رہا ہو،

"میں ان کے پاس جاؤں گا... اور کہوں گا کہ ارمان کو خون دیں۔"

کمرے میں ایک لمحے کے لیے پھر خاموشی چھا گئی۔

پھر وہ آہستہ آہستہ بولا

"وہ اس کے باپ ہیں"...

یہ جملہ کہتے ہوئے اس کی آواز تھوڑی بھاری ہو گئی۔

"ساری زندگی جو فرض نہیں نبھایا"...

وہ لمحہ بھر رکا،

"اب ادا کریں۔"

یہ الفاظ کمرے میں گونج گئے۔

ایمان نور کے ہاتھ کانپ گئے...

ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے

مگر وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔

دانیال نے سکندر کا بازو پکڑ لیا،

"سکندر... یہ وقت غصے کا نہیں... یہ وقت انسانیت کا ہے"...

نعمان بھی آہستہ سے بولا،

"نرمی سے کہنا... ورنہ بات بگڑ سکتی ہے... بابا بہت غصے والے ہیں۔"

مگر سکندر خاموش تھا۔

اس کے اندر ایک جنگ چل رہی تھی

غصہ، درد، بے بسی... اور ایک بے نام سی امید۔

وہ جانتا تھا...

کہ اگر اب کچھ نہیں کیا گیا...

توسب کچھ ختم ہو سکتا ہے۔

وہ آہستہ سے دروازے کی طرف مڑا۔

اس کے قدم بھاری تھے...

ہر قدم جیسے کسی فیصلے کی طرف جا رہا ہو۔

دروازے تک پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا...

اس نے پیچھے مڑ کر سب کو دیکھا

ایمان نور...

روتی ہوئی، مگر دعا کرتی ہوئی ماں...

اور ایک کمرہ... جو امید اور خوف کے درمیان لٹک رہا تھا۔

پھر اس نے دروازہ کھولا...

اور باہر نکل گیا

اس لمحے...

یہ صرف ایک بات کرنے کی ہمت نہیں تھی...

یہ ایک ایسے سچ کا سامنا تھا

جو کسی کی زندگی بچا بھی سکتا تھا...

اور کسی کے دل کو توڑ بھی سکتا تھا۔

سکندر نے خاموشی سے اپنی کار نکالی۔

انجن اسٹارٹ کیا... مگر اس کے ہاتھ کچھ لمحے کے لیے سٹیئرنگ پر ہی رک گئے۔

اس کے ذہن میں بار بار ایک ہی سوال گھوم رہا تھا

"کیا ایک باپ اپنے بیٹے کو خون دینے سے کیوں منع کرے گا...؟"

اور پھر ایک اور سوچ...

"اور اگر وہ دے بھی دے... تو کیا وہ باپ کہلانے کے قابل ہے...؟"

اس کے اندر ایک عجیب سی کشمکش چل رہی تھی۔

ایک طرف غصہ تھا

غصہ اس شخص پر جس نے شاید کبھی باپ کا حق ادا نہیں کیا...

اور دوسری طرف ایک خاموش سا درد

کہ کہیں وہ بھی اپنی باتوں سے کسی کا دل نہ توڑ دے۔

وہ آہستہ سے کار آگے بڑھاتا ہے،

اور ہسپتال سے دور جاتے ہوئے ہر موڑ پر یہی سوچتا رہتا ہے

"میں کیا کرنے جا رہا ہوں؟"

"اگر انھوں نے انکار کر دیا تو؟"

"اور اگر انھوں نے ہاں کر دی... تو کیا یہ سب ٹھیک ہو جائے گا؟"

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا...

لیکن اس کے قدم کہیں کہ اس کی کار

اسے ایک ہی طرف لے جا رہی تھی

سچ کا سامنا کرنے کی طرف...

اور اس شخص کے پاس جانے کی طرف

جو شاید اب...

ایک باپ ہونے کا آخری موقع حاصل کر سکتا تھا۔

بارش اب بھی مسلسل برس رہی تھی،

ہلکی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ بوندیں شیڈ کی چھت پر ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔

مومنہ اور ارمان ایک دوسرے کے قریب کھڑے تھے

اتنے قریب کہ بارش کی آواز کے بیچ بھی ان کی خاموشی صاف سنائی دے رہی تھی۔

مومنہ نے اچانک اس کی طرف دیکھا اور ہلکے سے مسکرا کر کہا،

"ایسے گھور کیوں رہے ہو؟"

ارمان نے ایک لمحہ اس کی آنکھوں میں دیکھا...

اور پھر آہستہ سے، جیسے دل کی بات زبان پر آ رہی ہو، بولا،

"اچھی لگتی ہو نا۔"

یہ سن کر مومنہ کے چہرے پر ہلکی سی شرمندگی آ گئی۔

وہ فوراً بولی،

"کتنی؟"

ارمان نے ایک لمحہ توقف کیا...

پھر مسکرا دیا،

"اتنی... کہ اگر محرم بن کر ملو...

تو سمجھو گا گنہگار کے لیے جنت کا اعلان ہو گیا۔"

یہ جملہ سن کر مومنہ کی آنکھیں تھوڑی سی پھیل گئیں...

اس کا دل جیسے ایک لمحے کے لیے رک گیا۔

وہ آہستہ سے بولی،

"کیا یہ... اظہارِ محبت ہے؟"

ارمان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا،

"کیا پتا"...

بارش کی بوندیں اب بھی گر رہی تھیں...

مگر ان دونوں کے درمیان ایک خاموش سی گرمی تھی۔

مومنہ نے نظریں جھکا لیں...

اور اس کے لبوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

کچھ باتیں کہی نہیں جاتیں...

بس محسوس کی جاتی ہیں۔

—

میو ہسپتال سے نکلے سکندر کو تقریباً ایک گھنٹہ گزر چکا تھا، مگر اس کے لیے وقت جیسے رک سا گیا تھا۔ ہر گزرتا لمحہ اسے اور بے چین کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار ایک ہی منظر آ رہا تھا ارمان کا بے ہوش چہرہ، مشینوں سے جڑا ہوا، اور ایمان نور کی ٹوٹتی ہوئی حالت۔ وہ جتنا اس سوچ کو جھٹکنے کی کوشش کرتا، یہ اتنی ہی شدت سے واپس آجاتی۔

اس نے کئی بار موبائل نکالا اور رحمان شیخ کو کال کرنے کی کوشش کی، مگر ہر بار ایک ہی نتیجہ کوئی جواب نہیں۔ کبھی کال جاتی رہی، کبھی کٹ گئی، مگر دوسری طرف سے کوئی آواز نہ آئی۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وقت اس کے ہاتھ سے پھسل رہا ہے، اور وہ کچھ کر نہیں پا رہا۔

آخر کار اس نے ایک گہری سانس لی اور خود سے فیصلہ کیا،

"اب بس... اب خود جا کر بات کرنی پڑے گی۔"

یہ فیصلہ آسان نہیں تھا، مگر ضروری تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اگر کوئی امید ہے تو وہ یہی ہے کہ وہ سامنے جا کر بات کرے۔ فون پر بات نہ ہونا ایک الگ بات تھی، مگر سامنے کھڑے ہو کر بات کرنا شاید دل بدل دے، شاید بات بن جائے۔

اسی سوچ کے ساتھ اس نے بائیک اسٹارٹ کر کے اور پوری رفتار سے کافی دیر پہلے سے نکل پڑا۔

سڑک پر معمول کا رش تھا، گاڑیاں اپنی رفتار سے چل رہی تھیں، لوگ اپنی دنیا میں مصروف تھے مگر سکندر کے لیے ہر چیز سست لگ رہی تھی۔ ہر سگنل اسے روک رہا تھا، ہر موڑ اسے دیر کا احساس دلا رہا تھا۔ اس نے کئی بار بے چینی میں بائیک کی رفتار بڑھائی، جیسے وقت کو پیچھے چھوڑنا چاہتا ہو۔

ہوا تیزی سے اس کے چہرے سے ٹکرا رہی تھی، مگر اس کے اندر کا طوفان اس سے کہیں زیادہ شدید تھا۔

اس کے ذہن میں ارمان کی آواز گونج رہی تھی، اس کی ہنسی، اس کی باتیں...

اور وہ دن جب ارمان نے اس سے وعدہ لیا تھا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم دونوں کا نکاح کرواؤں گا"...

سکندر کے کبھی کہے گئے اپنے الفاظ سکندر کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

"یار اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں مر جاؤں گا" ارمان کے کہے گئے الفاظ بھی اس کو یاد آئے۔

سکندر نے دانت بھینچ لیے،

"نہیں... کچھ نہیں ہو گا تجھے... میں ہوں نا"...

وہ خود کو مضبوط دکھانے کی کوشش کر رہا تھا، مگر اندر سے وہ بھی ٹوٹ رہا تھا۔

ٹھوکر نیاز بیگ کی طرف جاتے ہوئے اس کے ذہن میں بار بار ایک ہی سوال آ رہا تھا

"اگر انہوں نے انکار کر دیا تو؟"

یہ خیال اسے اندر تک ہلا دیتا تھا۔

مگر اگلے ہی لمحے وہ خود کو جھٹک دیتا،

"نہیں... مان جائیں گے... ماننا پڑے گا"...

کیونکہ اب یہ صرف ایک درخواست نہیں تھی

یہ ایک زندگی کا سوال تھا۔

وہ تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا،

دل میں بے شمار خدشات، مگر ساتھ ہی ایک امید بھی

کہ شاید...

وہ وقت پر پہنچ جائے...

اور شاید...

ارمان کی سانسیں ابھی اس کا انتظار کر رہی ہوں۔

رات کے 9 بج رہے تھے۔

اندھیرا پوری طرح چھا چکا تھا، سڑکوں پر لائٹس جل رہی تھیں، مگر سکندر کی نظر میں کچھ صاف نہیں تھا

اس کے لیے سب دھندلا سا ہو چکا تھا۔

وہ تیزی سے بائیک چلا رہا تھا،

جیسے ہر گزرتا لمحہ اس کے ہاتھ سے نکل رہا ہو۔

ہوا سرد تھی... مگر اس کے ماتھے پر پسینہ تھا۔

کل صبح ارمان کا آپریشن تھا

اور یہ رات...

یہ عام رات نہیں تھی۔

یہ وہ رات تھی جو سب کی زندگی بدلنے والی تھی۔

ہسپتال میں ایمان نور دعا میں بیٹھی تھیں،

نعمان خاموشی سے دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا،

دانیال اور شاہویر بے چینی میں تھے…

اور ادھر سکندر

اکیلا، سڑکوں پر، ایک امید کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

اس کے ذہن میں بار بار ایک ہی بات گونج رہی تھی،

"اگر آج میں ناکام ہو گیا… تو کل شاید بہت دیر ہو جائے گی"…

اس نے بائیک کی رفتار اور تیز کر دی۔

اندھیری سڑک، تیز ہوا، اور دل میں خوف

مگر اس سب کے بیچ ایک عزم بھی تھا۔

یہ رات صرف وقت کا گزرنا نہیں تھی…

یہ امتحان تھی

دوستی کا،

ہمت کا،

اور قسمت کا۔

اور سکندر جانتا تھا

کل کی صبح...

کسی کے لیے نئی زندگی لائے گی...

اور کسی کے لیے سب کچھ بدل دے گی۔

رات کے 9 بج رہے تھے۔

اندھیرا پوری طرح چھا چکا تھا، مگر ٹھوکر نیاز بیگ کی سڑکیں اب بھی زندگی سے خالی نہیں تھیں۔ کہیں کہیں دکانوں کی لائٹس جل رہی تھیں، کچھ لوگ آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے، اور ہوا میں مٹی اور مشین آئل کی ملی جلی بو تھی۔

سکندر تیزی سے بائیک چلاتا ہوا آخرکار ایک گلی کے کونے پر رکا۔

اس کے سامنے ایک بورڈ ہلکی سی ٹمٹماتی روشنی میں نظر آ رہا تھا:

"Rehman Sheikh Motorcycle Service"

بورڈ پر پرانا نیلا رنگ تھا، کچھ جگہوں سے اکھڑا ہوا، اور ایک بلب اس کے اوپر لٹک رہا تھا جو کبھی جلتا، کبھی مدھم پڑ جاتا۔

دکان آدھی کھلی تھی۔

اندر زرد روشنی تھی، دیواروں پر پرانے اوزار لٹک رہے تھے

پانے، پیچ کس، چین، اور تیل سے سنے ہوئے کپڑے ایک کونے میں پڑے تھے۔

سکندر نے بائیک کو ایک طرف روکا،

انجن بند کیا

اور آہستہ آہستہ گہری سانس لینے لگا۔

اس کا سینہ تیزی سے اوپر نیچے ہو رہا تھا،

جیسے وہ صرف بائیک نہیں چلا کر آیا...

بلکہ کسی جنگ سے گزر کر آیا ہو۔

اس نے سر اٹھا کر دکان کو غور سے دیکھا

یہی جگہ تھی...

یہی آخری امید۔

وہ بائیک سے اترا ہی تھا کہ اندر سے ایک مکینک باہر آیا۔

اس کے کپڑے تیل سے بھرے ہوئے تھے، ہاتھ کالے، اور چہرے پر تھکن صاف نظر آ رہی تھی۔

اس نے سکندر کو اوپر سے نیچے تک دیکھا،

پھر بولا،

"ہاں بھائی، کیا مسئلہ ہے؟ بائیک خراب ہو گئی ہے کیا؟"

سکندر ایک لمحے کے لیے خاموش رہا...

اس نے اپنی سانس کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔

پھر آہستہ سے بولا،

"مجھے... رحمان شیخ سے ملنا ہے"...

مکینک نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا،

"کس کام کے لیے؟"

سکندر کی آنکھوں میں اس وقت صرف ایک ہی چیز تھی

جلدی... اور بے چینی۔

"ضروری کام ہے..." اس نے مختصر جواب دیا۔

اب فیصلہ اگلے لمحے میں ہونا تھا...

کہ وہ اندر جا سکے گا... یا نہیں۔

"صاب جی سے ملنا ہے؟ رکو، میں پوچھ کر آتا ہوں..." مکینک نے کہا اور اندر چلا گیا۔

سکندر وہیں دروازے کے پاس کھڑا رہ گیا۔

اس کی نظریں کبھی دکان کے اندر جاتی روشنی پر ٹھہرتیں، کبھی سڑک کی طرف چلی جاتیں۔

دل اب بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

چند لمحے گزرے... مگر سکندر کو وہ بہت لمبے لگے۔

پھر اندر سے آواز آئی،

"صاب جی نے کہا ہے... آجاؤ اندر۔"

سکندر نے ایک گہری سانس لی،

جیسے خود کو آخری بار سنبھال رہا ہو۔

"اچھا..." وہ دھیرے سے بولا،

اور قدم اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔

اندر کا منظر اور بھی واضح تھا

ایک طرف موٹر سائیکل کھلی پڑی تھی، اس کے پرزے الگ الگ رکھے تھے،

فرش پر تیل کے دھبے، اور دیواروں پر لٹکے اوزار۔

کمرے کے اندرونی حصے میں، ایک کرسی کے پاس

رحمان شیخ کھڑے تھے۔

ان کا انداز سنجیدہ تھا،

ہاتھ اب بھی کام کے تیل سے سنے ہوئے، مگر نظریں سیدھی سکندر پر۔

سکندر چند قدم آگے بڑھا...

اور ایک لمحے کے لیے رک گیا۔

یہ وہ لمحہ تھا

جہاں اسے بات شروع کرنی تھی...

اور شاید...

کسی کی زندگی کا فیصلہ بھی یہی ہونے والا تھا۔

سکندر نے آہستہ آہستہ قدم بڑھانے شروع کیے...

ہر قدم جیسے بھاری ہو، جیسے زمین اس کے پاؤں پکڑ رہی ہو

مگر وہ رکا نہیں۔

اس نے دروازہ ہلکے سے دھکیلا اور دکان کے اندر داخل ہو گیا۔

اندر کی فضا مختلف تھی

تیل اور لوہے کی تیز بو، مشینوں کی ہلکی ہلکی آواز، اور زرد روشنی جو ہر چیز کو ایک پرانا سا رنگ دے رہی تھی۔

دیواروں پر اوزار ترتیب سے لٹکے ہوئے تھے

کچھ چمک رہے تھے، کچھ پرانا زنگ لیے ہوئے۔

ایک کونے میں کھلی ہوئی موٹر سائیکل پڑی تھی، اس کے پرزے الگ الگ رکھے ہوئے تھے، جیسے کسی ادھوری کہانی کے ٹکڑے۔

سکندر کی نظریں ہر چیز کو ایک نظر دیکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں...

مگر اس کا اصل مقصد سامنے تھا۔

اندر تھوڑا آگے

ایک شخص کھڑا تھا۔

رحمان شیخ

سادہ کپڑے، بازو کہنیوں تک چڑھے ہوئے، ہاتھ گریس سے بھرے ہوئے

مگر اس کے کھڑے ہونے کے انداز میں ایک عجیب سا وقار تھا۔

وہ کسی موٹر سائیکل پر جھکے ہوئے کچھ ٹھیک کر رہے تھے،

پھر انھوں نے آہستہ سے سر اٹھایا۔

ان کی نظریں سکندر سے ملیں۔

یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی

مگر اس ایک لمحے میں جیسے بہت کچھ گزر گیا۔

سکندر رک گیا۔

چند لمحوں کے لیے دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی

ایسی خاموشی جس میں سوال بھی تھے اور جواب بھی۔

ریمان شیخ نے اسے غور سے دیکھا

اس کے چہرے کی بے چینی، تیز سانسیں، آنکھوں میں چھپی جلدی...

وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی عام کام سے نہیں آیا۔

"ہاں جی..." اس نے سیدھے سادے لہجے میں کہا،

"کیا کام ہے؟"

سکندر نے بولنے کی کوشش کی

مگر الفاظ جیسے گلے میں اٹک گئے۔

اس نے ایک گہری سانس لی...

اور خود کو سنبھالا۔

یہ وہ لمحہ تھا

جہاں اسے صرف بات نہیں کرنی تھی...

بلکہ کسی کی زندگی کے لیے مانگنا تھا۔

"السلام علیکم رحمان جی میں میو ہسپتال سے آیا ہوں..." سکندر کی آواز کانپ رہی تھی، مگر اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"وہاں... آپ کا بیٹا ہسپتال میں کوما میں ہے۔ اسے آپ کے خون کی سخت ضرورت ہے O Negative ...خون... کہیں سے نہیں مل رہا..." اس نے ایک لمحہ رک کر سانس لی، اس کی آنکھوں میں بے بسی صاف جھلک رہی تھی۔

رحمان شیخ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔

ان کی بھنویں سکڑ گئیں، اور نظریں ایک دم گہری ہو گئیں جیسے وہ ہر لفظ کو اندر تک محسوس کر رہے ہوں۔

انہوں نے آہستہ، سنجیدہ لہجے میں پوچھا،

"اس کا آپریشن کب ہے؟"

سکندر نے فوراً جواب دیا، مگر اس کی آواز میں گھبراہٹ واضح تھی،

"صبح 8 بجے"...

یہ سن کر رحمان شیخ کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے بے چینی کی چمک آئی۔

انہوں نے آہستہ سے گردن ہلائی اور پھر پوچھا،

"اگر خون نہ دیں تو...؟"

سکندر نے بات شروع کی، مگر فوراً رک گیا...

اس کے ہونٹ کانپ گئے، اور نظریں جھک گئیں۔

"تو وہ..." اس نے نگاہ اٹھا کر ریمان کو دیکھا،

پھر جذبات پر قابو پاتے ہوئے عاجزی سے کہا،

"آپ مہربانی کریں... اسے خون دے دیں... آپ کی بیوی ایمان نور... وہاں اکیلی ہیں... وہ رو رو کر... بالکل ٹوٹ چکی ہیں"...

سکندر کی آواز بھاری ہو گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ لیے،

"ہم سب بہت پریشان ہیں... پلیز... ہماری مدد کریں... ایک باپ ہونے کا فرض نبھائیں"...

یہ الفاظ سن کر رحمان شیخ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے گہری خاموشی چھا گئی۔

انہوں نے سکندر کو غور سے دیکھا اس کی جھکی ہوئی آنکھیں، جوڑے ہوئے ہاتھ، اور کانپتا ہوا لہجہ...

پھر آہستہ سے اپنی آنکھیں بند کیں، جیسے اندر کسی احساس کو سنبھال رہے ہوں...

اور پھر کھول کر سکندر کو ایک گہری نظر سے دیکھا۔

ریمان شیخ کی آواز اچانک سخت اور کڑوی ہو گئی،

"میں اسے اپنا خون نہیں دوں گا"...

سکندر ایک دم ساکت رہ گیا۔

اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمایاں تھے، جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آرہا ہو۔

رحمان شیخ کے چہرے پر غصہ ابھر آیا،

بھنویں سخت ہو گئیں، اور آواز میں تلخی بڑھ گئی۔

"جا کر اس کی ماں سے پوچھو... آخری بار وہ مجھ سے کس طرح لڑ کر گیا تھا"!

انہوں نے سخت لہجے میں کہا،

"صرف ایک لڑکی کی خاطر... اس نے مجھے ذلیل کیا... میری عزت کو روند ڈالا... میرے سامنے کھڑے ہو کر میری بات نہیں مانی"...

ان کی مٹھیاں بند ہو گئیں،

اور آنکھوں میں دکھ اور غصے کا ملا جلا طوفان تھا۔

"اسی بدبخت نے... میرے ساتھ وہ کیا... کہ میں بھول نہیں سکتا"...

ان کی آواز بھاری ہو گئی،

"اور اب... وہی لڑکی اس سے ملنے آئے گی؟ جس کے لیے اس نے اپنے باپ کا گلا پکڑا تھا؟"

یہ الفاظ سکندر کے لیے بالکل نئے تھے۔

وہ ایک دم چونک گیا، اس کی آنکھیں پھیل گئیں،

جیسے وہ پہلی بار کسی ایسی حقیقت سے آشنا ہوا ہو جس کا اسے کوئی علم ہی نہ تھا۔

سکندر نے کچھ کہنے کی کوشش کی...

مگر الفاظ اس کے لبوں تک آکر رک گئے۔

اس کے چہرے پر بے یقینی اور الجھن صاف نظر آ رہی تھی

وہ یہ سب سن کر مکمل طور پر ہکا بکا کھڑا تھا۔

یونیورسٹی کا ماحول ان دنوں کچھ بدلا ہوا سا تھا۔

پہلا سمسٹر اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا، تمام امتحانات ختم ہو چکے تھے، اور اب ہر طرف ایک ہی کیفیت تھی انتظار۔

طلبہ کے چہروں پر بظاہر ہلکی سی مسکراہٹ تھی، مگر اندر ایک بے چینی اور بے قراری چھپی ہوئی تھی۔ کوئی اپنے اندازوں میں مصروف تھا، تو کوئی بار

بار اپنے پیپرز کو یاد کر کے خود کو تسلی دے رہا تھا، اور کسی کے چہرے پر خاموشی کے پیچھے چھپا ہوا خوف جھلک رہا تھا۔

کلاس روم میں سید عادل اپنی کلاس لے رہے تھے۔

ان کی آواز سنجیدہ اور متوازن تھی، اور وہ پوری توجہ سے لیکچر دے رہے تھے۔ وہ بورڈ پر لکھتے جاتے اور ساتھ ساتھ طلبہ کو سمجھاتے، مگر طلبہ کے ذہن اکثر ان کے الفاظ سے زیادہ اپنے مستقبل اور آنے والے نتائج کی طرف بھٹک رہے تھے۔ ماحول میں ایک بوجھل سی سنجیدگی تھی، جیسے ہر کوئی کسی بڑے امتحان کے دہانے پر کھڑا ہو۔

کچھ دیر بعد سر عادل نے اپنا لیکچر مکمل کیا اور کلاس سے باہر چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی کلاس میں ایک ہلکی سی سرگوشی پھیل گئی، جیسے سب ایک دم سانس لے رہے ہوں۔ کچھ طلبہ اپنی نشستوں پر سیدھے ہو گئے، کچھ نے اپنی کتابیں بند کیں، اور کچھ نے خاموشی سے اپنی سوچوں کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ اس خاموشی میں بھی ایک عجیب سا بے چین سکون تھا۔

اسی لمحے اگلی کلاس کا وقت آ گیا۔

یہ کوئی عام کلاس نہیں تھی یہ قرآنِ پاک کی کلاس تھی، جو ہر بار ایک مختلف ہی ماحول لے کر آتی تھی، جہاں الفاظ کم اور اثر زیادہ ہوتا تھا۔

چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور حافظ انیس اندر داخل ہوئے۔

ان کے چہرے پر ایک خاص سی نورانیت اور سکون تھا۔ ان کے داخل ہوتے ہی جیسے پورا کمرہ بدل گیا ہو۔ ان کی موجودگی میں ایک وقار تھا جو بغیر کچھ کہے ہی سب کو خاموش کر دیتا تھا۔

کلاس میں موجود تمام طلبہ فوراً سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

اب وہاں کوئی سرگوشی نہیں تھی، کوئی بے ترتیبی نہیں تھی صرف مکمل خاموشی تھی، اور ایک ایسا سکون جو دل کو چھو رہا تھا۔

آج کی کلاس میں

ارمان شاہویر، شاہویر، دانیال، سکندر،

مومنہ، رِمشا اور زینب گل

سب موجود تھے، اور سب کی توجہ ایک ہی سمت میں تھی۔

حافظ صاحب نے کلاس کا آغاز تلاوت سے کیا۔

ان کی آواز کلاس روم میں آہستہ آہستہ پھیلنے لگی ایسی آواز جو صرف سنائی نہیں دیتی تھی بلکہ دل میں اتر جاتی تھی۔ ہر لفظ ایک اثر رکھتا تھا، اور ہر آیت اپنے اندر ایک گہرائی لیے ہوئے تھی۔

طلبہ خاموشی سے سن رہے تھے۔

کچھ نظریں جھکائے بیٹھے تھے، کچھ آنکھیں بند کر کے تلاوت کو محسوس کر رہے تھے، اور کچھ ایسے تھے جو شاید پہلی بار دل سے سن رہے تھے۔ ان لمحوں میں کلاس روم ایک ایسی جگہ بن چکا تھا جہاں نہ صرف علم حاصل ہو رہا تھا بلکہ دلوں کو سکون اور روح کو تسکین بھی مل رہی تھی۔

قرآن کی آیات کے ساتھ جب حافظ صاحب مختصر تشریح کرتے، تو الفاظ میں ایک ایسی تاثیر آجاتی جو انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ ہر جملہ دل پر اثر کرتا تھا، اور ہر بات ذہن میں ایک نیا دروازہ کھول دیتی تھی۔

یوں یہ کلاس صرف ایک تعلیمی سیشن نہیں تھی، بلکہ ایک ایسا لمحہ تھی جہاں انسان اپنی اصل کے قریب ہو جاتا ہے، اور جہاں خاموشی بھی عبادت جیسی محسوس ہوتی ہے۔

کلاس کے اندر مکمل خاموشی تھی۔ طلبہ اپنی نشستوں پر سیدھے بیٹھے ہوئے تھے، اور ماحول میں ایک عجیب سا سکون تھا۔ ارمان شاہویر ابھی بھی اسی سوچ میں گم تھا جو حافظ انیس کی باتوں نے اس کے دل میں پیدا کر دی تھی۔

حافظ انیس نے نرمی سے تلاوت شروع کی، اور ایک خاص آیت کی طرف اشارہ کیا:

"وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً"

)اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو، اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی(

یہ آیت سن کر ارمان نے نظریں اٹھا کر بہت غور سے سنا،

جیسے ہر لفظ اس کے دل میں اتر رہا ہو۔

کلاس میں مکمل خاموشی تھی۔

پھر ارمان نے ہلکا سا ہاتھ اٹھایا،

"سر... ایک سوال ہے"...

حافظ انیس نے اس کی طرف دیکھا،

"جی ارمان، پوچھو۔"

ارمان نے تھوڑا جھجھکتے ہوئے پوچھا،

"سر... نِکاح سے پہلے محبت ہوتی ہے یا نِکاح کے بعد؟"

کلاس میں ایک لمحے کے لیے سب رک گئے،

سب کی نظریں حافظ صاحب پر تھیں۔

انہوں نے نرمی سے جواب دیا،

"اسلام ہمیں محبت سے منع نہیں کرتا... لیکن اسے ایک پاکیزہ اور محفوظ راستہ دیتا ہے۔

محبت کے بعد فوراً نکاح ہو کیونکہ وہی رشتہ حلال، ذمہ دار اور بابرکت ہوتا ہے۔"

پھر انہوں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا،

"نِکاح سے پہلے جو احساسات ہوتے ہیں... وہ انسان کو آزمائش میں ڈال سکتے ہیں، اسی لیے اسلام حدود کا درس دیتا ہے۔"

ارمان خاموشی سے سنتا رہا۔

پھر حافظ انیس نے کلاس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا،

"اب ایک اہم بات سمجھو مَحرَم اور نامَحرَم کا تصور۔"

انہوں نے سادہ انداز میں سمجھایا،

"مَحرَم وہ رشتے ہیں جن سے ہمیشہ کا تعلق حلال ہے، جیسے ماں، بہن، بیٹی...

ان سے پردے کے احکام مختلف ہوتے ہیں۔"

انہوں نے ایک لمحہ رک کر سب کو دیکھا،

"اور نامَحرَم وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ ہمیں اپنی نظر، گفتگو اور رویے میں حدود رکھنی چاہیے۔

یہی حدود انسان کو گناہوں سے بچاتی ہیں اور رشتوں کو پاکیزہ رکھتی ہیں۔"

ارمان نے آہستہ سے سر جھکایا...

اس کے دل میں ایک نیا شعور جاگ چکا تھا

سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے... اور ہر چیز اپنی جگہ پر ہی خوبصورت تھی۔

سکندر خاموش بیٹھا تھا، مگر اس کے چہرے پر الجھن صاف جھلک رہی تھی۔

"سر... لیکن اگر ہمیں کوئی پسند آ جائے، نیت نکاح کی ہو... اور پھر ہماری شادی ایسے شخص سے ہو جائے جس سے ہمیں محبت ہی نہ ہو؟" سکندر نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

کلاس میں سناٹا چھا گیا۔

سر عارف نے گہری سانس لی اور سنجیدگی سے بولے،

"سکندر بیٹا... انسان کو اس سے شادی کیوں کرنی چاہیے جسے وہ پسند نہ کرتا ہو؟ جب دل میں قبولیت ہی نہ ہو، تو پھر نکاح کیوں؟"

ان کی آواز میں ایک وزن تھا، جو سیدھا دل میں اتر رہا تھا۔

"کافی لڑکیوں کی شادیاں آج کل ایسے ہی ہو رہی ہیں..." انہوں نے آہستہ سے کہا،

"یونیورسٹی میں پڑھتے ہوئے ہی رشتے طے ہو جاتے ہیں... اور اکثر ایسے لوگوں سے جنہیں وہ خود دل سے قبول نہیں کرتیں۔"

پوری کلاس سن رہی تھی۔

"اگر آپ کسی کو پسند نہیں کرتے، تو اس سے شادی کر کے نہ صرف اپنی زندگی، بلکہ سامنے والے کی زندگی بھی کیوں برباد کریں؟"

ان کی بات ختم ہوئی تو کمرے میں ایک عجیب سا سکوت چھا گیا۔

اسی خاموشی کو شاہ ویر نے توڑا،

"سر جی... نکاح کے بعد تو محبت خود بخود ہو جاتی ہے نا؟"

سر عارف نے ہلکی سی مسکراہٹ دی، جیسے وہ اس سوال کے لیے پہلے سے تیار ہوں۔

"تو پھر طلاق کیوں ہوتی ہے، بیٹا؟"

یہ سوال فضا میں گونج گیا۔

شاہویر لاجواب ہو گیا۔ نظریں جھک گئیں۔

حافظ انیس نے نرم لہجے میں مگر واضح انداز میں کہا،

"یہ سوچ بالکل غلط ہے کہ نکاح کے بعد لازمی طور پر محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ نکاح ایک معاہدہ ہے... ایک contract ایک ذمہ داری۔"

انہوں نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر بولے،

"اگر آپ کسی کو پسند کرتے ہیں، تو اس کے ساتھ نکاح کر کے اس رشتے کو حلال کریں... رشتے دل سے شروع ہوتے ہیں، زبردستی سے نہیں۔"

پھر انہوں نے ایک سادہ مگر اثر انگیز مثال دی،

"جب آپ کوئی گاڑی خریدتے ہیں تو کیا بغیر پسند کیے، آنکھیں بند کر کے لے لیتے ہیں؟ یا پہلے دیکھتے ہیں، سمجھتے ہیں، پھر فیصلہ کرتے ہیں؟"

کلاس میں ہلکی سی سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔

"لوگ قرآن کو غلط طریقے سے quote کرتے ہیں..." حافظ انیس نے نرمی سے کہا،

"اور کہتے ہیں کہ نکاح کے بعد محبت خود بخود آ جائے گی۔ اسلام میں ایسا کوئی اصول نہیں کہ محبت لازمی بعد میں پیدا ہو۔"

انہوں نے سب کی طرف دیکھ کر آخری جملہ کہا،

"نکاح محبت کو مکمل کر سکتا ہے... مگر اسے زبردستی پیدا نہیں کرتا۔"

کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی...

لیکن اس بار خاموشی میں سمجھ بھی تھی۔

کلاس ختم ہو چکی تھی اور ہال کے دروازے کے پاس ہلچل مچی ہوئی تھی۔ سب طلبہ باہر نکل رہے تھے، باتوں اور قہقہوں کی آوازیں آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی تھیں۔

سکندر نے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر کی طرف بڑھا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک ہلکی سی آواز آئی۔

"سکندر"...

وہ رکا۔

آواز جانی پہچانی تھی۔

مومنہ تیزی سے اس کی طرف آئی۔ اس کی سانس تھوڑی پھولی ہوئی تھی، جیسے وہ جلدی میں ہو۔ اس نے ایک لمحے کے لیے ادھر اُدھر دیکھا شاہویر، دانیال اور ارمان کافی آگے نکل چکے تھے۔

سکندر نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔

"کیا ہوا، مومنہ؟"

موسم کی ہلکی سی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کلاس کے باہر ہلکی سی خاموشی تھی، جیسے سارا شور ابھی تھوڑا پیچھے رہ گیا ہو۔ مومینہ سکندر کے سامنے کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں ایک خاص سی چمک تھی۔

"مجھے کوئی پسند آگیا ہے"...

اس نے آہستہ مگر پختہ لہجے میں کہا۔

سکندر کے چہرے پر فوراً حیرت آئی، مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"اوہ... واہ! واقعی؟"

مومنہ نے ہلکی سی مسکراہٹ دی اور سر ہلایا۔

"ہاں... اور میں اس سے شادی بھی اسی طرح کروں گی جیسے سر نے بتایا...
نیت نکاح کی ساتھ، صاف نیت کے ساتھ"...

سکندر نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا،

"واہ... بہت اچھی بات ہے... ویسے کون ہے وہ خوش قسمت شخص؟"

مومنہ نے شرارتی انداز میں بھنویں اٹھائیں اور آہستہ سے کہا،

"خود guess کرو"...

سکندر چند لمحے خاموش رہا، پھر جیسے کسی خیال نے اس کے ذہن میں جگہ بنائی۔ اس نے بہت آہستہ، تقریباً خود سے کہا:

"شاید... ارمان"...

پھر فوراً آواز بلند کرتے ہوئے بولا،

"مجھے نہیں پتہ ہے... تم خود بتاؤ"!

مومنہ نے چند لمحے اس کی طرف دیکھا، جیسے اس کے انداز کو پرکھ رہی ہو... پھر مسکرادی۔

"وہ... ارمان ہے۔"

سکندر نے جان بوجھ کر اپنے چہرے پر حیرت ظاہر کی لیکن اس کو پہلے سے ہی پتہ تھا کہ ارمان مومنہ کو پسند کرتا ہے۔

"اوہ... مجھے تو خبر بھی نہیں تھی! تم نے واقعی حیران کر دیا"...

مومنہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی، اور اس نے نرمی سے کہا،

"شکریہ... تمہاری باتوں نے بھی مجھے بہت کچھ سکھایا... بس دعا کرو کہ ہمارا نکاح ہو جائے۔ مجھے وہ واقعی بہت پسند ہے"...

سکندر نے چند لمحے اس کی بات کو سنا، پھر دل کی گہرائی سے بولا،

"ان شاءاللہ... تم دونوں کا نکاح ضرور ہو گا۔"

ایک لمحے کے لیے فضا میں خاموشی چھا گئی

مگر یہ خاموشی خالی نہیں تھی... اس میں امید تھی، دعا تھی... اور ایک نئے آغاز کی ہلکی سی خوشبو بھی۔

لیکن جیسا لڑکیاں سوچتی ہیں ویسا ان کا نصیب کہاں ہوتا ہے؟

یونیورسٹی کی کینٹین ہمیشہ کی طرح شور سے بھری ہوئی تھی قہقہوں، چائے کے کپوں کی آوازیں اور دوستوں کی بے تکلف باتیں ہر طرف گونج رہی تھیں۔ مگر اس ہجوم کے بیچ ایک عجیب سا منظر تھا...

سکندر کافی دیر سے خاموش بیٹھا تھا، اور مسلسل ارمان کو دیکھے جا رہا تھا۔

اس کی نظریں عام نہیں تھیں کچھ سوچتی ہوئی، کچھ شرارتی... اور کچھ ایسی، جو دانیال اور شاہویر دونوں کو الجھا رہی تھیں۔

شاہویر نے آخر کار خاموشی توڑی،

"بھائی یہ کیا love birds والا سین بنا رکھا ہے تم دونوں نے؟"

ارمان نے فوراً چونک کر سکندر کی طرف دیکھا،

"بھائی مجھے ایسے کیوں دیکھ رہا ہے؟ بتا سکندر، کیا مسئلہ ہے؟"

سکندر نے کرسی پر تھوڑا پیچھے ٹیک لگائی، ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی،

"واہ لڑکے... ہم سے ہی ہوشیاریاں؟"

ارمان کی پیشانی پر بل آ گئے،

"کیا مطلب؟"

سکندر نے شرارتی انداز میں سر ہلایا، پھر آہستہ سے گنگنایا،

"مومو... واہ واہ... شادی شادی"

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی... پھر شاہویر نے زور سے قہقہہ لگایا۔

ارمان اب واضح طور پر جھنجھلا گیا تھا،

"اوئے بکواس بند کر"!

ارمان کا چہرہ واقعی سرخ ہو چکا تھا جیسے ایک ہی وقت میں شرمندگی، حیرت اور گھبراہٹ سب جمع ہو گئی ہوں۔

"کیا مطلب؟" دانیال ابھی تک پوری طرح کنفیوز تھا۔

اچانک اس کے دماغ میں کچھ کلک ہوا،

"اوہ... وہ بلبلے والی مومو کی شادی؟!" اس نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"ہاں بھائی دانیال... بالکل اسی کی شادی!" شاہ ویر نے فوراً بات پکڑی اور ہنسی دبانے لگا۔

"ارمان... تُو تو چھپا رستم نکلا!" سکندر نے ہنستے ہوئے کہا۔

ارمان خاموش تھا۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں، مگر ہونٹوں پر دبی دبی سی مسکراہٹ تھی جو سب کچھ بتا رہی تھی۔

شاہ ویر نے تجسس سے پوچھا،

"ویسے سکندر... تجھے کیسے پتا چلا؟"

سکندر نے فخر سے سینہ تھوڑا سا چوڑا کیا، پھر شرارتی انداز میں بولا،

"بھائیو... ہونے والی دلہن خود آ کر بتا گئی تھی... کہ ہمارا لڑکا اسے پسند آ گیا ہے"!

ایک لمحے کے لیے سب دوست واقعی حیران رہ گئے

پھر یکدم زور کا قہقہہ گونج اٹھا۔

"اوئے ہووے... سیدھا proposal پہنچ گیا!" دانیال نے ہنستے ہوئے کہا۔

سکندر نے ارمان کے کندھے پر ہاتھ رکھا،

"چل بھائی... اب تو جلدی جلدی مجھے دادا بنا دے"!

"اوئے چپ کر!" ارمان نے جھینپتے ہوئے کہا، مگر اس کے گالوں کی لالی اور بڑھ گئی تھی۔

وہ فوراً اٹھا، بیگ اٹھایا اور نظریں چُراتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

پیچھے رہ جانے والے تینوں دوست زور زور سے ہنس رہے تھے

اور سکندر کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی...

سکندر بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

جیسے اس نے نہ صرف ایک راز کھولا ہو بلکہ ارمان کی زندگی کی نئ داستان کھول دی ہو۔

ارمان ریلنگ کے پاس اکیلا کھڑا باہر دیکھ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی سنجیدگی تھی جیسے وہ پہلی بار خود کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

سکندر آہستہ سے اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے دونوں خاموش رہے... پھر ارمان نے خود ہی بولنا شروع کیا

"پتہ نہیں... اس لڑکی نے مجھ میں کیا دیکھا ہے۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں اس کے لیے ٹھیک ہوں بھی یا نہیں... لیکن"...

وہ تھوڑا رکا، ہلکی سی مسکراہٹ آئی،

"اب وہ مجھے واقعی بہت اچھی لگتی ہے۔"

سکندر خاموشی سے سنتا رہا۔

ارمان نے گہری سانس لی،

"وہ کافی پریشان رہتی ہے، سکندر... اور میں بس یہ چاہتا ہوں کہ اسے کبھی کوئی تکلیف نہ ہو"...

سکندر نے اس کی طرف دیکھا، اس بار اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی،

"دیکھ ارمان... مومنہ نے خود آکر مجھے بتایا کہ وہ تجھے پسند کرتی ہے۔ ایک لڑکی جب اپنی پسند کا اظہار خود کرے نا... تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ دل کی سچی ہے، اور ہمت والی بھی۔ ایسے لوگ آسانی سے پیچھے نہیں ہٹتے۔"

ارمان نے نظریں نیچے کرلیں، جیسے وہ اب بھی کہیں نہ کہیں ڈرا ہوا ہو۔

"لیکن... اگر وہ اپنی بات سے پھر گئی تو؟"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد سکندر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی

"پھر میں تیری قبر پر ڈانس کروں گا۔"

ارمان نے فوراً اس کی طرف دیکھا، پھر ہنسی روک نہ سکا

"بہت لعنتی ہے تُو"!

دونوں ہنس پڑے۔

ہوا کا ایک جھونکا آیا... اور ساتھ ہی وہ بوجھل فضا بھی ہلکی ہو گئی

جیسے کسی نے دل کی گرہ تھوڑی سی کھول دی ہو۔

سکندر نے آہستہ سے کہا،

"فکر نہ کر... کچھ رشتے ڈر سے نہیں، یقین سے بنتے ہیں، اور مجھے یقین ہے مومنہ تجھے مایوس نہیں کرے گی"

ارمان نے باہر دیکھتے ہوئے سر ہلایا

اور شاید پہلی بار، اسے اپنے دل میں تھوڑا سا سکون محسوس ہوا۔

کچھ لمحے دونوں خاموش کھڑے رہے۔ صرف ہوا چلنے کی آواز تھی... اور ریلنگ سے ٹکراتی ہلکی سی دھات کی کھنک۔

پھر ارمان نے بغیر اس کی طرف دیکھے بولنا شروع کیا

"وہ دیندار بھی بہت ہے سکندر...! اسے اسلام کی بہت knowledge ہے۔ قرآن کا ترجمہ بھی آتا ہے... اور ایک مکمل عورت ہے۔ میرے لیے عورت کی جو تعریف ہے نا... اس وقت وہ مومنہ ہے۔"

اس کے لہجے میں تعریف نہیں... یقین تھا۔ جیسے وہ ہر لفظ کو محسوس کر رہا ہو۔

سکندر نے تھوڑا سا چہرہ بنایا، جیسے بات اس کے مزاج کے خلاف جا رہی ہو۔ اس نے ایک ہلکی سی سانس لی اور نظریں دوسری طرف کر لیں

"یار... یہ دین کی باتیں مجھ سے نہ کیا کر۔"

ارمان نے فوراً اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی ناگواری اور فکر دونوں تھیں

"تجھے دین سے کیا مسئلہ ہے؟ آخری نماز کون سی پڑھی تھی تُو نے؟"

یہ سوال سیدھا تھا، مگر وزن رکھتا تھا۔

سکندر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ جیسے اسے جواب ڈھونڈنے میں مشکل ہو رہی ہو۔ پھر اس نے کندھے اچکائے، ہلکی سی بے پروائی کے ساتھ

"یاد نہیں... اور ویسے بھی مجھے نماز اتنی آتی نہیں"...

ارمان نے آہستہ سے سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر مایوسی واضح تھی، مگر وہ غصے میں نہیں تھا بس افسوس تھا۔

"یار... کیسا بندہ ہے تُو؟"

سکندر نے فوراً اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی ضد اور ایک عجیب سا دفاعی پن تھا

"جیسا بھی ہوں... تیرے سامنے کھڑا ہوں۔"

یہ جملہ سادہ تھا، مگر اس کے پیچھے ایک ان کہی کہانی تھی جیسے وہ اپنے آپ کو justify کر رہا ہو، یا شاید خود سے بھی لڑ رہا ہو۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ چند سوکھے پتے زمین پر لڑھک گئے۔

ارمان نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں، پھر نرم لہجے میں بولا

"بھائی... میری دعا ہے، مومنہ ملے یا نہ ملے... تُو ایک نیک، دیندار انسان بن جائے۔"

یہ الفاظ نصیحت نہیں تھے... دعا تھی۔ خالص اور سچی۔

سکندر نے پہلے تو اسے خاموشی سے دیکھا چند لمحوں کے لیے اس کے چہرے پر سنجیدگی آئی... جیسے وہ ان الفاظ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

مگر اگلے ہی لمحے وہ اچانک زور زور سے ہنسنے لگا

"بھائی میں practical بندہ ہوں... ان چیزوں میں نہیں پڑتا"!

اس کی ہنسی میں ہلکی سی بے فکری تھی... مگر کہیں نہ کہیں ایک بچاؤ بھی، جیسے وہ کسی سنجیدہ بات سے بھاگ رہا ہو۔

وہ مڑا، جیب میں ہاتھ ڈالا، اور بغیر پیچھے دیکھے چل دیا۔

ارمان وہیں کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

ہوا اب بھی ویسی ہی چل رہی تھی... مگر اس کے دل میں ایک عجیب سی خاموشی اتر آئی تھی۔

اس نے آہستہ سے، تقریباً سرگوشی میں کہا

"ایک دن آئے گا، سکندر... جب تجھے سب سمجھ آ جائے گی... اور میرے یہ سارے الفاظ تجھے یاد آرہے ہوں گے... اور میری دعا ہے اس دن تو دین کے بہت قریب ہو"

دور جاتا ہوا سکندر اب نظر سے اوجھل ہو چکا تھا...

مگر اس کے پیچھے چھوڑے گئے الفاظ ہوا میں کہیں ٹھہر گئے تھے۔

رات اپنی گہرائیوں میں اتر چکی تھی۔ کمرے کی لائٹ مدھم تھی، اور پنکھے کی ہلکی سی آواز اس خاموشی کو اور نمایاں کر رہی تھی۔ سکندر بیڈ پر لیٹا چھت کو دیکھ رہا تھا، مگر حقیقت میں وہ کہیں اور تھا...

اس کے ذہن میں بار بار ایک ہی منظر چل رہا تھا

ارمان کی شرمندہ مسکراہٹ... مومینہ کی سنجیدگی... اور ان دونوں کے درمیان وہ ان کہی سی ڈور۔

اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"یار... کیا سین لگایا ہے دونوں نے..." وہ آہستہ سے خود سے بولا، جیسے کسی خوبصورت کہانی کا گواہ ہو۔

اس نے کروٹ بدلی، تکیہ ٹھیک کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"کم از کم کوئی تو ہے جو اپنے دل کی بات کہہ دیتا ہے... نہ کوئی ڈر، نہ کوئی حساب..." اس نے سوچا۔

ایک عجیب سی ہلکی خوشی اس کے اندر پھیل رہی تھی...

مگر اچانک

فون کی تیز آواز نے اس سکون کو توڑ دیا۔

کمرے کی خاموشی میں وہ رنگ ٹون کچھ زیادہ ہی تیز محسوس ہوئی۔ سکندر نے ہلکی سی جھنجھلاہٹ کے ساتھ فون اٹھایا... اسکرین پر نظر پڑی...

نادیہ۔

وہ ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔

"اس وقت؟" اس نے دھیمی آواز میں کہا، جیسے خود سے سوال کر رہا ہو۔

دل میں ہلکی سی بے چینی اٹھی... اس نے فوراً کال ریسیو کر لی۔

"ہلو؟"

دوسری طرف کچھ لمحے خاموشی رہی... صرف سانسوں کی ٹوٹی ہوئی آوازیں۔

پھر اچانک نادیہ کی آواز آئی لرزتی ہوئی، بکھری ہوئی...

"سکندر... سب ختم ہو رہا ہے... سب کچھ... میں... میں مزید برداشت نہیں کر سکتی"...

اس کی آواز میں ایسا درد تھا جیسے ہر لفظ کسی زخم سے نکل رہا ہو۔

سکندر فوراً سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے کی ساری نرمی ختم ہو گئی، اب صرف سنجیدگی تھی۔

"نادیہ جی... کیا ہوا؟ آپ ٹھیک ہیں؟ آرام سے بات کریں"...

نادیہ کی سانسیں تیز ہو رہی تھیں، جیسے وہ خود کو سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہی ہو مگر ناکام ہو رہی ہو

"ٹھیک؟... تمہیں لگتا ہے میں ٹھیک ہوں؟" وہ ہلکی سی ہنسی، مگر وہ ہنسی نہیں تھی... درد تھا۔

"میں روز کوشش کرتی ہوں... خود کو سمجھانے کی... ہر بات برداشت کرنے کی... مگر اب نہیں ہو رہا، سکندر... اب نہیں"...

اس کی آواز ٹوٹ گئی۔

کچھ لمحے صرف سسکیوں کی آواز آتی رہی۔

"میں تھک گئی ہوں..." اس نے بمشکل کہا،

“ہر روز خود کو جھوٹ بولتے بولتے... ہر رات یہ سوچ کر سونے سے کہ شاید کل سب ٹھیک ہو جائے گا... مگر کچھ ٹھیک نہیں ہو رہا... وہ میرے ذہن سے نکل ہی نہیں رہا ہے سکندر”

سکندر خاموشی سے سنتا رہا، اس کی انگلیاں فون کے کنارے کو زور سے پکڑے ہوئے تھیں۔

نادیہ نے دوبارہ بولنا شروع کیا اب اس کے الفاظ اور بھی بھاری تھے

“میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں اس مقام پر آ جاؤں گی... کہ مجھے اپنی ہی زندگی سے ڈر لگنے لگے گا... ہر بات، ہر لمحہ... جیسے میں گھٹ رہی ہوں... جب تک چھپاؤں سب سے اب؟”

اس کی سانس رک رک کر آ رہی تھی۔

“کوئی سمجھتا ہی نہیں مجھے... کوئی نہیں...” اس کی آواز میں ایک گہری تنہائی تھی،

“میں بس... بس تھک گئی ہوں سکندر... واقعی تھک گئی ہوں”...

سکندر نے آنکھیں بند کیں، ایک گہری سانس لی اور خود کو مضبوط کرتے ہوئے بولا

"آپ پریشان نہ ہوں... پلیز... خود کو سنبھالیں... ہم صبح تفصیل سے بات کرتے ہیں... ابھی آپ آرام کریں"...

نادیہ کچھ لمحے خاموش رہی... جیسے اس کے الفاظ کو پکڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"کیا واقعی... کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے؟" اس نے بہت آہستہ پوچھا، جیسے اسے خود یقین نہ ہو۔

سکندر کے پاس اس سوال کا مکمل جواب نہیں تھا... مگر اس نے پھر بھی مضبوط لہجے میں کہا

"ہم کوشش کریں گے... ٹھیک کرنے کی... آپ اکیلی نہیں ہیں"...

دوسری طرف ایک ہلکی سی سسکی آئی... پھر کال آہستہ سے کٹ گئی۔

کمرے میں دوبارہ خاموشی چھا گئی

مگر اب یہ وہ خاموشی نہیں تھی۔

سکندر فون کو دیکھتا رہا... اس کے ذہن میں اب ارمان اور مومینہ نہیں تھے...

صرف نادیہ کی ٹوٹی ہوئی آواز گونج رہی تھی

"میں مزید برداشت نہیں کر سکتی"...

اس نے آہستہ سے سر دیوار سے ٹکا دیا...

اور پہلی بار

اس کے چہرے پر سنجیدگی کے ساتھ... ایک ہلکی سی بے بسی بھی تھی۔

اسی لمحے دروازہ ہلکے سے کھلا۔

یعقوب جٹ اندر داخل ہوئے۔ ان کے قدموں میں وہی ٹھہراؤ تھا، اور آنکھوں میں وہی گہری نظر جو ہمیشہ سکندر کے دل تک اتر جاتی تھی۔

انہوں نے سکندر کو دیکھا، جو ابھی تک سنجیدہ بیٹھا تھا۔

"کس سے بات کر رہے تھے، بیٹا ابراہیم؟" یعقوب جٹ نے پرسکون مگر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

سکندر تھوڑا چونکا، پھر فوراً خود کو سنبھالا۔

"کوئی نہیں بابا... ایسے ہی ایک دوست تھا..." اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

یہ اس وقت کہا

یعقوب جٹ نے بھنویں ہلکی سی اٹھائیں، جیسے وہ بات کو وہیں چھوڑنے والے نہ ہوں۔

"دوست... لڑکا ہے یا لڑکی؟"

سکندر نے ایک لمحے کو توقف کیا، پھر سیدھا جواب دیا

"لڑکی ہے، بابا"...

یعقوب جٹ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔

"ہماری تو کبھی کوئی لڑکی دوست نہیں بنی..." انہوں نے ماضی میں جھانکتے ہوئے کہا،

"ایک تمہاری ماں اچھی لگی... تو اس سے شادی کر لی"...

کمرے کی فضا میں ایک ہلکی سی گرمی آ گئی یادوں کی، سادگی کی۔

سکندر نے ہلکا سا مسکرا کر کہا،

"پاپا ایسا کچھ نہیں ہے... نادیہ بس ایک دوست ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں"...

یعقوب جٹ نے فوراً بات پکڑی، آنکھوں میں ہلکی سی شرارت کے ساتھ

"اچھاا... تو میری بہو کا نام نادیہ ہے؟"

سکندر ہنس پڑا،

"کوئی حال نہیں آپ کا، بابا"!

یعقوب جٹ بھی مسکرا دیے، مگر ان کی آنکھوں میں اب بھی ایک سنجیدگی باقی تھی۔

سکندر نے دوبارہ واضح کیا،

"بابا، وہ بس ایک دوست ہے... اگر اس سے زیادہ کچھ ہوتا تو کیا میں آپ کو نہیں بتاتا؟"

یعقوب جٹ نے سر ہلایا، جیسے وہ اس کی بات مان رہے ہوں

"اچھا ٹھیک ہے بچے... مان لیا، وہ آپ کی دوست ہے"...

سکندر نے سکھ کا سانس لیا،

"شکر"...

یعقوب جٹ مڑے اور دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے قدم دھیرے تھے، مگر جیسے وہ کچھ سوچ رہے ہوں۔

دروازے تک پہنچ کر وہ رکے... اور بغیر مڑے بولے

"لیکن کسی لڑکی کا دل نہ توڑنا، بچے... عورت بہت نازک چیز ہوتی ہے۔ وہ اکثر دوسروں کی باتوں میں آکر اپنے فیصلے لے لیتی ہے"...

ان کے الفاظ نرم تھے... مگر وزن رکھتے تھے۔

سکندر کچھ لمحے خاموش رہا، پھر آہستہ سے بولا

"ٹھیک ہے، بابا"...

یعقوب جٹ کمرے سے باہر چلے گئے۔

"ویسے بابا... ایک ڈائیورس لڑکی سے شادی کرنا کیسا ہے؟" سکندر نے اچانک آواز دی۔

یعقوب جٹ رک گئے۔

چند لمحے کے لیے مکمل خاموشی چھا گئی۔ جیسے اس سوال نے فضا کو تھوڑا بھاری کر دیا ہو۔

وہ آہستہ سے مڑے، دروازے کے پاس ہی کھڑے رہے۔ ان کے چہرے پر ہلکی سی سنجیدگی آ گئی تھی۔

"بیٹا... یہ بہت مشکل سوال پوچھ لیا تم نے..." انہوں نے گہری نظر سے سکندر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

سکندر نے ہلکی سی مسکراہٹ دی، مگر اس مسکراہٹ میں ایک بے چینی بھی چھپی ہوئی تھی جیسے وہ خود اپنے سوال کا وزن سمجھ رہا ہو۔

یعقوب جٹ آہستہ آہستہ واپس کمرے میں آئے۔ ان کے قدم ناپ تول کر تھے، جیسے وہ ہر لفظ سوچ سمجھ کر بولنا چاہتے ہوں۔

"یہ اس بات پر depend کرتا ہے... کہ اس کی divorce کیوں ہوئی..." انہوں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا،

"ہر کہانی کے دو رخ ہوتے ہیں... اور بعض اوقات سچ ان دونوں کے بیچ کہیں چھپا ہوتا ہے"...

کمرے میں سنجیدگی بڑھ گئی تھی۔

سکندر خاموشی سے سن رہا تھا، اس کی آنکھوں میں اب دلچسپی کے ساتھ ساتھ الجھن بھی تھی۔

یعقوب جٹ نے بات جاری رکھی

"اور اگر وہ تمہیں واقعی بہت پسند آجائے... دل مان جائے... تو پھر ایک کام کرنا"...

وہ ایک لمحے کے لیے رکے، جیسے اگلا جملہ زیادہ اہم ہو

"اس کے ex husband سے مل لینا"...

سکندر فوراً چونکا،

"Ex husband سے کیوں؟"

یعقوب جٹ کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی معنی خیز مسکراہٹ آئی۔ انہوں نے سیدھی نظر سے سکندر کو دیکھا

"اپنی کہانی میں سب سچے ہوتے ہیں"...

یہ جملہ کمرے میں گونج کر رہ گیا۔

انہوں نے مزید کچھ نہیں کہا۔

بس مڑے... اور آہستہ آہستہ کمرے سے باہر چلے گئے۔

دروازہ بند ہوا تو سکندر وہیں بیٹھا رہ گیا خاموش، گہری سوچ میں ڈوبا ہوا۔

اب اس کے ذہن میں صرف ایک سوال نہیں تھا...

بلکہ کئی سوال ایک ساتھ جاگ چکے تھے۔

اگلی صبح...

ہلکی سنہری دھوپ یونیورسٹی کی چھت پر پھیل رہی تھی۔ فضا میں صبح کی ٹھنڈک ابھی باقی تھی، مگر نادیہ کے اندر بے چینی کی آگ ویسے ہی جل رہی تھی جیسے پوری رات جلتی رہی ہو۔

وہ چھت پر ہی کھڑی تھی کبھی ریلنگ کے پاس جا کر نیچے دیکھتی، کبھی بے چینی سے ادھر اُدھر ٹہلنے لگتی۔ اس کے قدموں میں ٹھہراؤ نہیں تھا، جیسے دل کے اندر کا طوفان اسے ایک جگہ رکنے نہیں دے رہا تھا۔

اس کے ہاتھ میں موبائل تھا... مضبوطی سے تھاما ہوا۔

اسکرین بار بار روشن ہوتی

Sikandar Calling...

پھر چند لمحوں بعد... خاموشی۔

وہ دوبارہ کال کرتی۔

پھر وہی انتظار... وہی بے جوابی۔

اس کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان نہیں تھا۔ سرخ آنکھیں، بکھرے ہوئے بال، اور چہرے پر صاف لکھی ہوئی پریشانی جیسے پوری رات اس نے خود سے جنگ لڑی ہو۔

"اٹھاؤ نا..." اس نے ہلکی سی سرگوشی کی، آواز میں التجا تھی،

"پلیز سکندر... ایک بار بات کر لو"...

اس کی آواز ہوا میں بکھر گئی۔

وہ ریلنگ کے قریب جا کر کھڑی ہوئی۔ نیچے زندگی چل رہی تھی طلبہ آ رہے تھے، جا رہے تھے... کوئی ہنس رہا تھا، کوئی باتوں میں مصروف تھا...

مگر اس کے لیے سب کچھ دھندلا تھا۔

اس نے نظریں جھٹک کر ہٹا لیں، جیسے خود کو کسی خطرناک خیال سے بچا رہی ہو۔

ایک اور کال۔

اس بار اس کے ہاتھ ہلکے سے کانپ رہے تھے۔

کچھ لمحے... پھر وہی خاموشی۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں، گہری سانس لینے کی کوشش کی... مگر سانس بھی ادھوری سی رہ گئی۔

"میں آخر کیا کروں..." اس نے آہستہ سے کہا، جیسے جواب کہیں باہر نہیں، اندر ہی کھو گیا ہو۔

کافی دیر اسی بے چینی میں گزارنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

ہر قدم بھاری تھا۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے بھی اس کا فون اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ اس کی نظریں بار بار اسکرین پر جا رہی تھیں شاید اب کال آ جائے... شاید اب وہ جواب دے دے...

مگر اسکرین خاموش تھی۔

ہر سیڑھی کے ساتھ اس کا دل اور بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔

سوچیں... خوف... اور وہی ایک سوال

"کیا واقعی سب ختم ہو رہا ہے؟"

وہ رکی نہیں۔

بس آہستہ آہستہ نیچے اترتی گئی

فون اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا...

اور امید... اب بھی پوری طرح مری نہیں تھی۔

یونیورسٹی کا ماحول آج کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ عام دنوں کی نسبت زیادہ چہل پہل تھی۔ طلبہ کے چھوٹے چھوٹے گروپس ایک ہی سمت میں جا رہے تھے، جیسے کسی خاص چیز نے سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی ہو۔

نادیہ ابھی سیڑھیاں اتر کر اندر کی طرف آئی ہی تھی کہ اس کی نظر سامنے پڑی

ایک افسر اندر داخل ہو رہا تھا۔

اس کے ارد گرد کئی لوگ جمع تھے کچھ اساتذہ، کچھ اسٹاف ممبرز، اور چند طلبہ بھی فاصلے سے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سب کے چہروں پر سنجیدگی اور احترام واضح تھا۔

وہ شخص لمبا قد، سیدھا انداز اور پُر اثر چہرہ لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی چال میں ایک خاص رعب تھا ہر قدم ناپ تول کر، جیسے وہ ہر چیز کو کنٹرول میں رکھتا ہو۔

اس کی یونیفارم صاف ستھری اور مکمل ترتیب میں تھی۔ سائیڈ پاکٹ پر ایک نام نمایاں تھا

M. Kamran

یہ نام جیسے خود اپنی پہچان کرا رہا تھا۔

وہ کسی سے غیر ضروری بات نہیں کر رہا تھا۔ بس ہلکے ہلکے سر ہلا کر جواب دیتا، اور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی نظریں تیز تھیں ہر چیز کو دیکھتی ہوئی، جانچتی ہوئی۔

راستے میں کھڑے طلبہ خود بخود سائیڈ پر ہو جاتے، جیسے اس کی موجودگی ہی کافی ہو راستہ صاف کرنے کے لیے۔

سرگوشیاں شروع ہو گئیں

"کون ہے یہ؟"

"شاید کوئی بڑا آفیسر ہے"...

"لگ تو ویسا ہی رہا ہے"...

نادیہ بھی چند لمحوں کے لیے رک گئی۔ اس کی اپنی پریشانی جیسے ایک لمحے کے لیے پیچھے رہ گئی۔ اس نے غور سے اس شخص کو دیکھا

اس کے چہرے پر سختی تھی... مگر اس سختی کے پیچھے ایک عجیب سا اعتماد بھی۔

مگر اگلے ہی لمحے

اس کا فون اس کے ہاتھ میں ہلکا سا کانپا۔

وہ فوراً چونکی... اسکرین کی طرف دیکھا

Sikandar Calling...

اس کا دل ایک لمحے کے لیے جیسے رک گیا۔

"آخرکار..." اس نے بے اختیار سرگوشی کی، اور فوراً کال اٹھالی

"ہلو؟"

دوسری طرف سے سکندر کی آواز آئی، قدرے سنجیدہ مگر معمول کے مطابق پرسکون

"نادیہ جی... آپ کہاں ہیں؟"

اس کی آواز سنتے ہی نادیہ کی آنکھوں میں نمی آگئی، جیسے وہ پوری رات اسی لمحے کا انتظار کر رہی ہو۔

"میں یونیورسٹی میں ہوں... تم کہاں ہو؟" اس نے جلدی سے پوچھا، آواز میں بے چینی صاف محسوس ہو رہی تھی۔

"میں گراؤنڈ میں ہوں... آپ وہیں آجائیں، اگر آپ کو بات کرنی ہے..." سکندر نے مختصر مگر واضح انداز میں کہا۔

نادیہ نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا

"میں آ رہی ہوں"...

کال کٹ گئی۔

اس کے قدم خود بخود تیز ہو گئے۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، جیسے ہر دھڑکن اسے سکندر کے قریب لے جا رہی ہو۔

راستے میں لوگوں کی آوازیں، اردگرد کی چہل پہل سب دھندلا سا گیا تھا۔

صرف ایک خیال تھا

"آج بات ہو جائے گی"...

وہ تیزی سے گراؤنڈ کی طرف بڑھی۔

دھوپ اب ذرا تیز ہو چکی تھی، ہوا ہلکی سی چل رہی تھی۔ گراؤنڈ میں کچھ لڑکے کھیل رہے تھے، کچھ بینچز پر بیٹھے تھے...

اور تھوڑا دور

سکندر کھڑا تھا۔

ہاتھ جیب میں ڈالے... نظریں کہیں دور جمی ہوئی...

جیسے وہ بھی کسی گہری سوچ میں ہو۔

نادیہ چند قدم دور رک گئی۔

اس کی سانسیں اب بھی تیز تھیں... دل میں ہزاروں باتیں جمع تھیں...

مگر الفاظ ابھی تک ترتیب میں نہیں آئے تھے۔

وہ بس اسے دیکھ رہی تھی

گراؤنڈ کی ایک طرف سکندر اور نادیہ اپنی دنیا میں گم تھے، جبکہ دوسری طرف یونیورسٹی کے اندر ایک الگ ہی منظر چل رہا تھا۔

مسٹر کامران اور سر عادل ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ان کے قدم پُر سکون تھے، اور بات چیت میں ایک سنجیدہ مگر مثبت انداز تھا۔ ارد گرد کے طلبہ خود بخود ان کی طرف متوجہ ہو رہے تھے، مگر دونوں اپنی گفتگو میں مگن تھے۔

سر عادل نے یونیورسٹی کے ماحول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،

"سچ کہوں تو ہماری یونیورسٹی میں ایک خاص بات ہے... یہاں کے طلبہ کا رویہ کافی بہتر ہے۔"

مسٹر کامران نے ہلکی سی نظر ارد گرد دوڑائی طلبہ صفائی سے چل رہے تھے، ایک دوسرے کو راستہ دے رہے تھے، اور اساتذہ کا احترام بھی واضح تھا۔

انہوں نے ہلکا سا سر ہلایا،

"ہاں... یہ بات تو ماننی پڑے گی۔ نظم و ضبط بھی ہے اور شعور بھی نظر آتا ہے۔"

سر عادل نے مسکراتے ہوئے کہا،

"خاص طور پر جب باہر سے کوئی آتا ہے نا... تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں تعلیم صرف کتابوں تک محدود نہیں، بلکہ تربیت بھی ساتھ ہو رہی ہے۔"

مسٹر کامران نے تھوڑا سا رک کر ایک گروپ کو دیکھا جو ادب سے ایک استاد کو سلام کر رہا تھا۔

ان کے چہرے پر ایک ہلکی سی اطمینان بھری مسکراہٹ آئی۔

"یہی چیز کسی ادارے کو مضبوط بناتی ہے..." انہوں نے آہستہ سے کہا،

"تعلیم کے ساتھ اخلاق بھی ضروری ہے۔"

سر عادل نے ان کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا،

"بالکل... اور یہاں کے اکثر طلبہ واقعی well-mannered ہیں۔"

وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ ان کی گفتگو سادہ تھی، مگر اس میں ایک ایسی حقیقت جھلک رہی تھی جو یونیورسٹی کے ماحول کو بیان کر رہی تھی۔

نادیہ سست قدموں سے چلتی ہوئی سکندر کے بالکل قریب آ گئی۔ اس کے چہرے پر تھکن، بے بسی اور ایک انجانی سی امید سب ایک ساتھ جھلک رہے تھے۔

سکندر وہیں چوکھڑی مار کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نظریں نیچے زمین پر تھیں، مگر ذہن کہیں اور

رات کی باتیں...

نادیہ کی کال...

اور خاص طور پر اس کے بابا کے الفاظ —

"اپنی کہانی میں سب سچے ہوتے ہیں"...

اور...

"اس کے ex husband سے مل لینا"...

یہ جملے اس کے ذہن میں بار بار گونج رہے تھے، جیسے کوئی حقیقت اس کے سامنے رکھ دی گئی ہو جسے وہ ابھی تک پوری طرح سمجھ نہیں پایا تھا۔

نادیہ اس کے سامنے آکر رک گئی...

ایک لمحہ... دو لمحے...

پھر آہستہ سے اس کے قریب جھکی۔

"سکندر"...

اس نے دھیرے سے اس کا نام لیا، جیسے وہ اس کی توجہ حاصل کرنا چاہ رہی ہو، مگر اس میں اتنی کمزوری تھی کہ جیسے وہ چیخ بھی نہیں سکتی۔

سکندر نے فوراً نظر اٹھائی۔

"نادیہ..." اس کی آواز نرم تھی، مگر الجھن صاف جھلک رہی تھی۔

نادیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے، اور اس کی سانسیں ٹوٹی ہوئی لگ رہی تھیں۔

وہ مزید کچھ کہے بغیر... آہستہ سے آگے بڑھی

اور اچانک

اپنا سر سکندر کی گود میں رکھ دیا۔

سکندر ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔

اسے سمجھ ہی نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔

نادیہ آہستہ آہستہ لیٹ گئی... اس کا سر اب بھی سکندر کی گود میں تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، اور چہرے پر ایک عجیب سا سکون اور درد دونوں ساتھ تھے۔

سکندر نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا

اس کی پلکیں بھیگ چکی تھیں...

ہونٹ ہلکے سے کانپ رہے تھے...

وہ کچھ بولنا چاہتا تھا، مگر الفاظ کہیں کھو گئے۔

اس کے ہاتھ کچھ لمحے بے بسی میں رکے رہے... پھر آہستہ سے اس نے نادیہ کے بالوں کو سنبھال لیا، جیسے وہ اس لمحے کو توڑنے سے ڈر رہا ہو۔

سر عادل اور مسٹر کامران آہستہ آہستہ یونیورسٹی کے ایک حصے سے باہر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی گفتگو ابھی بھی اسی سنجیدہ اور پیشہ ورانہ انداز میں جاری تھی۔

سر عادل نے مسکراتے ہوئے کہا،

"اور ایک اچھی بات یہ بھی ہے کہ یہاں لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے سے مناسب فاصلہ رکھتے ہیں۔ ابھی تک کوئی بھی ایسا معاملہ یا شکایت سامنے نہیں آئی جس میں کسی جوڑے کی وجہ سے مسئلہ بنا ہو۔ یہ اس یونیورسٹی کے ماحول کی بڑی مضبوطی ہے۔"

مسٹر کامران نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا،

"یہ واقعی قابلِ تعریف ہے۔ جب طلبہ خود اپنی حدود کا خیال رکھتے ہیں تو ادارے کا ماحول خود بخود بہتر ہو جاتا ہے۔"

دونوں آہستہ آہستہ گراؤنڈ کی طرف بڑھنے لگے۔

گراؤنڈ میں قدم رکھتے ہی مسٹر کامران کی نظر سیدھی ایک طرف پڑی اور وہ ایک لمحے کے لیے رک گئے۔

ان کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسا منظر تھا جس کی انہیں بالکل توقع نہیں تھی

نادیہ...

اپنا سر سکندر کی گود میں رکھے ہوئے...

اور سکندر... خاموش بیٹھا ہوا، جیسے وہ خود بھی اس لمحے کی سنگینی کو سمجھ رہا ہو۔

مسٹر کامران کی آنکھیں سخت ہو گئیں۔ ان کا انداز فوراً بدل گیا۔

سر عادل، جو ابھی کچھ فاصلے پر تھے، انہوں نے بھی جب وہ منظر دیکھا تو ایک دم ٹھٹھک گئے۔

ان کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا... اور ان کی باتیں جیسے وہیں رک گئیں۔

"یہ..." سر عادل نے آہستہ سے کہا، مگر الفاظ آگے نہ بڑھ سکے۔

مسٹر کامران نے ایک گہری سانس لی، ان کا چہرہ سخت اور سنجیدہ تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

سر عادل کے طوطے اڑ گئے تھے وہ حیران، پریشان اور بے یقین کھڑے تھے۔

انہیں اپنی باتوں پر یقین نہ آرہا تھا، جیسے ابھی ابھی جو انہوں نے کہا تھا وہ اس منظر کے سامنے غلط ثابت ہو گیا ہو۔

وہ دونوں چند لمحے خاموش کھڑے رہے

پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھے، ان کے قدم بھاری ہو گئے تھے...

کیونکہ ان کے سامنے جو منظر تھا، وہ صرف ایک عام لمحہ نہیں تھا

بلکہ ایک ایسی صورتحال تھی جو یونیورسٹی کے اصولوں، نظم و ضبط اور ان کی سوچ کو چیلنج کر رہی تھی۔

سکندر ابھی تک اسی الجھن میں تھا... نادیہ اس کی گود میں سر رکھے خاموش لیٹی ہوئی تھی، اور وہ خود سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس لمحے کو کیسے سنبھالے تبھی...

اس کی نظر اچانک سامنے اٹھی۔

اور اس کا دل ایک لمحے کے لیے جیسے رک گیا۔

سامنے

سر عادل...

اور ان کے ساتھ مسٹر کامران...

اور پیچھے چند اور اساتذہ...

سب سیدھا اسی کی طرف آرہے تھے۔

ان کے چہروں پر سنجیدگی تھی... اور قدم تیز۔

سکندر کی سانس ایک دم بھاری ہو گئی۔

اس نے فوراً نیچے دیکھا

نادیہ کا سر ابھی بھی اس کی گود میں تھا۔

ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا۔

"یہ... کیا ہو گیا..." اس کے دل میں خیال ابھرا۔

یونیورسٹی کے ویٹنگ ایریا میں ایک عجیب سی خاموشی تھی۔ باہر طلبہ کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں، مگر اس حصے میں جیسے وقت رک سا گیا تھا۔

نادیہ ایک کرسی پر بیٹھی تھی، دونوں ہاتھوں میں اپنا فون مضبوطی سے پکڑے ہوئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے، سانسیں بے ترتیب تھیں... اور چہرے پر واضح خوف۔

"اگر گھر فون چلا گیا تو...؟" اس نے ٹوٹتی ہوئی آواز میں کہا،

"میں کیا جواب دوں گی...؟ وہ لوگ کیا سوچیں گے میرے بارے میں...؟"

وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی، مگر ہر لمحہ اس کی ہمت ٹوٹ رہی تھی۔

سکندر اس کے پاس ہی بیٹھا تھا غیر معمولی حد تک پر سکون۔

اس کے چہرے پر وہ گھبراہٹ نہیں تھی جو عام طور پر ایسے حالات میں ہوتی ہے۔ وہ جیسے اندر ہی اندر سب کچھ سوچ چکا تھا۔

اس نے آہستہ سے نادیہ کی طرف دیکھا اور نرمی سے کہا

"دیکھں... ہم دونوں adult ہیں۔ وہ ہمارے گھر کال کر کے ہمیں expose نہیں کر سکتے۔"

نادیہ نے فوراً سر اٹھایا، آنکھوں میں ڈر اب بھی تھا

"پکا...؟ ایسا نہیں کریں گے نا؟"

سکندر نے ہلکا سا سر ہلایا،

"ہم صاف کہہ دیں گے کہ ہم اپنی مرضی سے پڑھ رہے ہیں، اپنے فیصلے خود لے سکتے ہیں... وہ ہمیں بچوں کی طرح treat نہیں کر سکتے۔"

چند لمحے کے لیے نادیہ خاموش ہو گئی، جیسے وہ اس کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو...

مگر اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں ایک نیا خوف ابھرا

"اگر انہوں نے ہمیں یونیورسٹی سے نکال دیا تو...؟" اس کی آواز پھر کانپ گئی۔

یہ سن کر سکندر بھی چند لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔

اس نے گہری سانس لی... پھر سچ بول دیا

"ہاں... یہ مسئلہ ہو سکتا ہے"...

نادیہ نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ ہمیں یہاں سے نکال سکتے ہیں"...

یہ جملہ سنتے ہی نادیہ جیسے ٹوٹ گئی۔

"نہیں..." اس کے ہونٹوں سے آہستہ سا نکلا،

پھر اس کی آواز اونچی ہو گئی

"نہیں سکندر... ایسا نہیں ہو سکتا... میری پڑھائی... سب کچھ ختم ہو جائے گا"...

وہ دوبارہ رونے لگی۔ اس کے آنسو اب رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

اس نے اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپا لیا

"میں نے کیا کر دیا... مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا"...

سکندر نے اس کی طرف دیکھا۔

اس کے ذہن میں پھر وہی الفاظ گونجے

"کسی لڑکی کا دل نہ توڑنا"...

"اپنی کہانی میں سب سچے ہوتے ہیں"...

اس نے آہستہ سے کہا

"نادیہ جی... calm down... ابھی کچھ بھی final نہیں ہوا"...

مگر اندر ہی اندر

وہ خود بھی جانتا تھا

آج جو ہونے والا تھا... وہ ان دونوں کی زندگی بدل سکتا تھا۔

وٹینگ ایریا کی فضا مزید بوجھل ہو چکی تھی۔ نادیہ کی سسکیاں آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھیں، مگر اس کی آنکھوں میں خوف ابھی بھی زندہ تھا۔

سکندر کرسی سے تھوڑا آگے جھکا، کہنیوں کو گھٹنوں پر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا جیسے وہ واقعی خود کو وقت دے رہا ہو سوچنے کے لیے۔

چند لمحے وہ خاموش رہا...

پھر آہستہ سے بولا

"مجھے کچھ سوچنے دیں"...

نادیہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

سکندر نے سر اٹھایا، اس کی آنکھوں میں اب سنجیدگی تھی وہ والی سنجیدگی جو مشکل وقت میں آتی ہے۔

"سر عادل اگر دیکھ بھی لیتے... تو اتنا مسئلہ نہ ہوتا..." اس نے دھیرے سے کہا،

"لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ مسٹر کامران نے دیکھا ہے... اور وہ بھی باہر سے آئے ہیں"...

نادیہ کا دل دوبارہ تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"اس کا مطلب...؟" اس نے خوف سے پوچھا۔

سکندر نے گہری سانس لی

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اب یہ صرف ایک چھوٹی سی بات نہیں رہی... یہ impression کا مسئلہ بن گیا ہے... یونیورسٹی کی reputation کا"...

نادیہ کے ہاتھ دوبارہ کانپنے لگے۔

سکندر نے فوراً بات آگے بڑھائی

"لیکن... میں اس کا حل نکالوں گا"...

اس کے لہجے میں اب پہلے والی ہلکی پھلکی مزاح نہیں تھی

یہ سنجیدہ وعدہ تھا۔

"نادیہ جی... اس سے پہلے کہ یہ بات پوری یونیورسٹی میں پھیل جائے"...

وہ تھوڑا رکا، جیسے الفاظ کو ترتیب دے رہا ہو

"ہمیں خود جا کر situation clear کرنی ہو گی"...

نادیہ نے فوراً سر اٹھایا،

"کیا... ابھی؟"

"ہاں، ابھی..." سکندر نے مضبوطی سے کہا،

"اگر ہم چپ بیٹھے رہے تو لوگ اپنی کہانیاں بنا لیں گے... اور پھر کوئی بھی ہماری بات نہیں سنے گا"...

نادیہ کی سانس پھر تیز ہو گئی

"لیکن ہم کیا کہیں گے...؟"

سکندر نے چند لمحے سوچا، پھر اس کی طرف دیکھ کر بولا

"سچ... مگر پورا نہیں... اتنا جتنا situation کو control کر سکے"...

وہ کرسی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا

"ہم کہیں گے کہ آپ emotionally upset تھیں... اور میں بس آپ کو calm کر رہا تھا... بس اتنی سی بات ہے"...

نادیہ نے اس کی بات سنی... مگر اس کے چہرے پر ابھی بھی ڈر تھا۔

"وہ مان جائیں گے...؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

سکندر نے سیدھا جواب نہیں دیا...

بس اتنا کہا

"ماننا پڑے گا"...

ایک لمحے کی خاموشی چھا گئی۔

پھر اس نے آہستہ سے کہا

"یہ game اب simple نہیں رہا، نادیہ جی"...

اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا confidence اور خطرہ دونوں ساتھ تھے

"اب یا تو ہم situation کو control کریں گے"...

وہ تھوڑا سا جھکا، اس کی آواز اور دھیمی ہو گئی

"یا situation ہمیں control کرے گی"...

وٹینگ ایریا کی فضا میں ایک عجیب سا تناؤ پھیل چکا تھا۔ نادیہ کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے، اور سکندر مسلسل کسی حل کی تلاش میں تھا۔

"یہ آئیڈیا بالکل ٹھیک نہیں ہے، سکندر... پلیز کچھ اور سوچو..." نادیہ نے بے بسی سے کہا۔

سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ خاموش ہو گیا... مکمل خاموش۔

اس کی نظریں زمین پر تھیں، مگر دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ہر ممکن راستہ... ہر ممکن حل... سب اس کے ذہن میں آ کر ٹکرا رہے تھے اور ٹوٹ رہے تھے۔

پھر اچانک

اس کے ذہن میں ایک نام آیا...

شانی۔

وہی شانی... یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کا بیٹا...

اور وہی شانی... جس سے اس کی کبھی بنتی نہیں تھی۔

دونوں ایک دوسرے کو برداشت تک نہیں کرتے تھے۔

سکندر نے ہلکی سی کڑواہٹ کے ساتھ مسکرایا

"ایک بندہ ہے... شاید مدد کر دے"...

نادیہ نے فوراً پوچھا،

"کون؟"

"جس سے میری نہیں بنتی..." سکندر نے مختصر جواب دیا۔

یہ کہہ کر اس نے فوراً فون نکالا اور نمبر ڈائل کر دیا۔

چند سیکنڈ... پھر کال اٹھی۔

دوسری طرف سے آواز آئی سرد، طنزیہ، اور صاف نفرت بھری

"کیا ہوا؟ آج سورج کہاں سے نکلا... تُو مجھے کال کر رہا ہے؟"

سکندر نے دانت بھینچے، مگر خود کو قابو میں رکھا—

"شانی... ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ مجھے تیری مدد چاہیے"...

شانی ہنسا وہ ہنسی جو مذاق نہیں، تضحیک ہوتی ہے

"اوئے تُو اور مدد مانگ رہا ہے مجھ سے؟ آج تو دن ہی عجیب ہے"...

نادیہ بے چینی سے سکندر کو دیکھ رہی تھی، اس کے چہرے پر صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنے غرور کو دبا رہا ہے۔

سکندر نے دوبارہ کہا

"یار سیریس ہوں میں... اس بار واقعی بڑا مسئلہ ہے"...

شانی کی آواز فوراً سخت ہو گئی

"جب تُو ڈرامے کرتا ہے یکی کرتا ہے... تب یاد نہیں آتا؟ اب پھنس گیا تو میرے پاس آ گیا؟"

سکندر کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے غصہ چمکا

مگر اس نے خود کو روکا۔

"بھائی... پلیز... کچھ بھی کر کے اس بار نکال دے..." اس کی آواز میں پہلی بار جھکاؤ تھا،

"ورنہ مسئلہ بہت بڑھ جائے گا"...

چند لمحے خاموشی رہی...

پھر شانی نے آہستہ مگر زہر بھرے لہجے میں کہا

"سن... میں تیرا دوست نہیں ہوں۔ اور نہ ہی کبھی بنوں گا۔ اور نہ تو نے مجھے بہن دی ہے۔ جو تُو نے میرے ساتھ کیا تھا نا... وہ ابھی تک یاد ہے مجھے۔"

سکندر کے چہرے پر سختی آ گئی

"شانی بھڑوے"

"نہیں!" اس نے بات کاٹ دی،

"اس بار خود ہی بھگت۔ ہر بار بچ جاتا ہے، اس بار نہیں۔"

اور...

کال کٹ گئی۔

بیپ... بیپ... بیپ...

سکندر نے کچھ لمحے فون کو گھورا

جیسے یقین نہ آرہا ہو کہ اس نے واقعی امید اس بندے سے لگائی تھی۔

اس نے آہستہ سے فون نیچے کر دیا۔

نادیہ کی آواز آئی کمزور، ڈری ہوئی

"کیا ہوا...؟"

سکندر نے گہری سانس لی... آنکھیں بند کیں...

"وہ نہیں مانا... سالا"

اس کی آواز میں اس بار صرف مایوسی نہیں تھی

بلکہ ایک تلخ حقیقت بھی تھی۔

وہ کرسی سے پیچھے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا...

اور پہلی بار اسے محسوس ہوا

کچھ دشمنیاں... مشکل وقت میں سب سے زیادہ مہنگی پڑتی ہیں۔

ویٹنگ ایریا کی فضا اب اور بھی بھاری ہو چکی تھی۔ نادیہ کی سسکیاں مدھم ہو گئی تھیں، مگر اس کی آنکھوں میں خوف اب بھی زندہ تھا۔ سکندر کرسی پر بیٹھا تھا... خاموش... مگر اس کے اندر ایک جنگ چل رہی تھی۔

چند لمحے پہلے کی بے بسی... اب آہستہ آہستہ کسی اور چیز میں بدل رہی تھی۔

اس نے آہستہ سے فون اٹھایا۔

"کیا کر رہے ہو...؟" نادیہ نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

سکندر نے بس اتنا کہا

"ایک اور کوشش"...

اس نے دوبارہ شانی کا نمبر ملایا۔

ایک بار...

دو بار...

تین بار...

کوئی جواب نہیں۔

اس کی انگلیاں اب تیزی سے اسکرین پر چلنے لگیں بار بار کال۔

آخرکار

کال اٹھی۔

دوسری طرف سے غصے بھری آواز آئی

"پاگل ہوگیا ہے؟ کیوں بار بار کال کر رہا ہے؟"

سکندر نے اس بار بغیر وقت ضائع کیے کہا

"وہ ویڈیو یاد ہے نا...؟"

چند لمحے خاموشی۔

پھر شانی کی آواز بدلی

"کون سی ویڈیو...؟"

سکندر کا لہجہ سرد ہو گیا

"وہی... سیڑھیوں والی... فرسٹ سیمسٹر کی فوزیہ کے ساتھ جو بنی تھی...

میرے پاس پورے چار منٹ کی ویڈیو ہے"...

نادیہ نے چونک کر سکندر کی طرف دیکھا۔

فون کے دوسری طرف مکمل خاموشی چھاگئی۔

پھر

شانی کی سانس تیز ہو گئی، آواز میں واضح گھبراہٹ آگئی

"سکندر... تُو... کیا بکواس کر رہا ہے...؟"

"بکواس نہیں... حقیقت ہے..." سکندر نے بالکل ٹھنڈے لہجے میں کہا،

"اور یہ حقیقت ابھی... اسی وقت... ہر جگہ forward ہو سکتی ہے"...

یہ جملہ سیدھا لگا۔

شانی کی آواز اب بدل چکی تھی غرور غائب... صرف خوف باقی

"نہیں... ایسا مت کرنا..." اس نے جلدی سے کہا،

"بتا... کیا کرنا ہے مجھے...؟"

سکندر کی نظریں اب سیدھی تھیں۔ اس کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی تھی جیسے وہ خود بھی جانتا ہو کہ وہ ایک خطرناک حد پار کر چکا ہے۔

نادیہ اسے دیکھ رہی تھی حیران... ڈری ہوئی...

اور شاید تھوڑی سی پریشان بھی

کہ یہ سب کہاں جا رہا ہے۔

سکندر نے فون کو مضبوطی سے پکڑا

اور اب...

گیم اس کے ہاتھ میں تھی۔

ادھا گھنٹہ گزر چکا تھا ویٹنگ ایریا کی فضا میں ایک عجیب سی گھٹن تھی۔

دیوار پر لگی گھڑی کی ٹک ٹک غیر معمولی طور پر اونچی محسوس ہو رہی تھی۔ ہر گزرتا سیکنڈ نادیہ کے لیے جیسے ایک نیا خوف لے کر آ رہا تھا۔

وہ کرسی کے کنارے پر بیٹھی تھی، دونوں ہاتھوں میں فون مضبوطی سے تھامے ہوئے۔ انگلیاں بار بار اسکرین پر جا کر رک جاتیں... مگر اب کال کرنے کی ہمت بھی نہیں بچی تھی۔

"اگر... اگر انہوں نے گھر فون کر دیا تو...؟" اس نے دھیمی، ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا،

"میں... میں کیا کروں گی سکندر...؟"

اس کی آنکھوں سے آنسو ایک بار پھر بہنے لگے۔

سکندر اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا غیر معمولی طور پر خاموش، جیسے اس کے اندر کا شور باہر آنے سے انکار کر رہا ہو۔

تبھی

اس کے فون نے ہلکی سی وائبریشن دی۔

اس نے فوراً اسکرین دیکھی

"Shani Calling..."

سکندر کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے چمک آئی، مگر اس نے خود کو فوراً نارمل کیا۔ اس نے کال اٹھائی

"ہاں بول..." اس کی آواز کم مگر مضبوط تھی۔

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی... پھر شانی کی آواز آئی

اب وہ پہلے جیسی تیز اور زہریلی نہیں تھی... اس میں ایک عجیب سا دباؤ تھا

"میں نے بابا سے بات کر لی ہے"...

سکندر کچھ نہیں بولا، بس سنتا رہا۔

"تم tension نہ لو... میں نے clearly کہہ دیا ہے کہ معاملہ وہیں ختم ہونا چاہیے... کوئی inquiry نہیں ہو گی... نہ ہی کسی اور تک بات جائے گی"...

نادیہ کی سانس جیسے رک گئی۔ وہ پوری توجہ سے سکندر کے چہرے کو دیکھ رہی تھی، جیسے اس کے ایک ایک لفظ سے اپنی تقدیر جوڑ رہی ہو۔

سکندر نے آہستہ سے کہا

"sure ہے نا...؟"

شانی نے تھوڑا سا رک کر جواب دیا

"ہاں... لیکن سکندر"...

اس کی آواز میں ایک وارننگ تھی،

"یہ آخری بار ہے... دوبارہ کبھی مجھے call نہ کرنا اس طرح...اور وہ ویڈیو ڈیلیٹ کر دے"

سکندر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی

"دیکھتے ہیں"...

شانی نے پھر غصے سے کہا۔

"مادرچ"***

کال کٹ گئی۔

کچھ لمحوں تک سکندر فون کو دیکھتا رہا... پھر اس نے گہری سانس لی اور فون نیچے رکھ دیا۔

نادیہ فوراً اس کی طرف جھکی

"کیا ہوا...؟ کیا کہا اس نے...؟"

سکندر نے سیدھا جواب دیا

"مسئلہ ختم"...

نادیہ کی آنکھیں پھیل گئیں

"سچ...؟ واقعی...؟"

"ہاں..." سکندر نے پرسکون انداز میں کہا،

"بات وہیں رک جائے گی... نہ گھر کال جائے گی... نہ یونیورسٹی میں کسی کو پتا چلے گا"...

یہ سنتے ہی نادیہ کے آنسو ایک بار پھر بہنے لگے

مگر اس بار خوف کے نہیں... راحت کے۔

اس نے فوراً اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیے

"الحمدللہ... الحمدللہ"...

اس کی سانسیں اب بھی تیز تھیں، مگر ان میں گھبراہٹ کم ہو چکی تھی۔

اسی لمحے دروازہ کھلا۔

سر عادل اور مسٹر کامران اندر داخل ہوئے۔

نادیہ فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئی، اس کا دل دوبارہ زور سے دھڑکنے لگا۔

سکندر نے ایک نظر ان دونوں پر ڈالی مگر اس کے چہرے پر اب وہ گھبراہٹ نہیں تھی۔

سر عادل نے دونوں کو غور سے دیکھا... پھر نسبتاً نرم لہجے میں کہا

"آپ لوگ جا سکتے ہیں"...

نادیہ کو یقین نہیں آیا

"س... سر...؟"

مسٹر کامران نے سنجیدگی سے کہا

"ہم اس معاملے کو مزید آگے نہیں لے جا رہے... لیکن آئندہ ایسی کوئی چیز برداشت نہیں کی جائے گی"...

"جی سر..." سکندر نے فوراً کہا، بغیر ہچکچاہٹ کے۔

سر عادل نے ہلکا سا سر ہلایا

"یہ یونیورسٹی ہے... یہاں ایک حد ہوتی ہے... امید ہے آپ دونوں سمجھ گئے ہوں گے"...

نادیہ نے آہستہ سے کہا

"جی سر"...

دونوں اساتذہ مڑ کر باہر چلے گئے۔

دروازہ بند ہوا

اور جیسے کمرے کی فضا ایک دم بدل گئی۔

نادیہ نے گہری سانس لی، جیسے وہ پہلی بار صحیح طرح سانس لے پا رہی ہو۔

پھر اس نے سکندر کی طرف دیکھا

اس کی آنکھوں میں حیرت تھی... سوال تھا... اور کچھ ایسا بھی جو وہ خود سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"یہ... تم نے کیسے کر لیا...؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

سکندر نے کرسی سے ٹیک لگا لی، نظریں چند لمحے کے لیے چھت پر اٹھائیں... پھر اس کی طرف دیکھا

"بس... آتا ہے مجھے"...

"نہیں..." نادیہ نے سر ہلایا،

"یہ اتنا آسان نہیں تھا... میں تو... میں تو ڈر کے مارے ختم ہو گئی تھی... اور تم"...

وہ رک گئی۔

سکندر ہلکا سا مسکرایا

"مسئلہ بڑا نہیں ہوتا... بندہ گھبرا جاتا ہے"...

نادیہ اسے دیکھتی رہی۔

"تم گھبراتے نہیں ہو...؟" اس نے سچ مچ جاننے کے لیے پوچھا۔

سکندر نے چند لمحے کچھ نہیں کہا... پھر آہستہ سے بولا

"گھبراتا ہوں... لیکن دکھاتا نہیں"...

یہ سن کر نادیہ خاموش ہو گئی۔

وہ آہستہ سے کھڑی ہوئی، مگر اس کی نظریں اب بھی سکندر پر تھیں

جیسے وہ اسے نئے سرے سے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"تم واقعی different ...ہو..." اس نے دھیرے سے کہا۔

سکندر ہنسا

"نہیں... بس حالات نے سکھا دیا ہے"...

وہ کھڑا ہوا، جیب میں ہاتھ ڈالا

"چلیں... نکلتے ہیں یہاں سے"...

نادیہ بھی اس کے ساتھ چل پڑی

مگر اس کے دل میں ایک نئی سوچ جنم لے چکی تھی

یہ لڑکا صرف مسئلے حل نہیں کرتا...

بلکہ انہیں اپنے حق میں موڑ لیتا ہے...

اور شاید

یہی بات سب سے زیادہ خطرناک بھی تھی... اور متاثر کن بھی۔

نادیہ چند قدم سکندر کے ساتھ چلی... مگر اس کے دل میں جو بوجھ تھا، وہ اچانک جیسے ہلکا ہو گیا۔ وہ رک گئی۔

سکندر نے مڑ کر اسے دیکھا

"کیا ہوا...؟"

نادیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے... مگر اس بار وہ خوف کے نہیں تھے۔ وہ ایک عجیب سی راحت، شکر اور جذبات کا ملا جلا رنگ تھے۔

اگلے ہی لمحے

وہ اچانک آگے بڑھی...

اور سکندر کو زور سے گلے لگا لیا۔

سکندر ایک دم ساکت رہ گیا۔

یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ وہ ایک لمحے کے لیے سمجھ ہی نہ پایا کہ react کیسے کرے۔

نادیہ کی سانسیں اب بھی تیز تھیں، اس کے ہاتھ سکندر کے گرد مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے

جیسے وہ اس لمحے کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔

"تھینک یو..." اس نے آہستہ سے کہا، آواز ابھی بھی کانپ رہی تھی،

"اگر تم نہ ہوتے تو... میں... میں نہیں جانتی کیا ہو جاتا"...

سکندر نے فوراً ادھر اُدھر دیکھا

لوگ آجا رہے تھے... کچھ فاصلے پر طلبہ کھڑے باتیں کر رہے تھے...

اس نے ہلکے سے خود کو پیچھے کیا

"نادیہ جی..." اس نے دھیمی مگر سنجیدہ آواز میں کہا،

"چھوڑیں... کوئی دیکھ لے گا تو پھر سے مسئلہ ہو جائے گا"...

نادیہ جیسے اچانک حقیقت میں واپس آئی۔

اس نے فوراً خود کو پیچھے کیا، نظریں جھکا لیں۔ اس کے گال ہلکے سے سرخ ہو گئے تھے۔

"سوری..." اس نے دھیرے سے کہا،

"میں بس... تھوڑی سی over ہو گئی"...

سکندر نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا

اس کے چہرے پر شرمندگی تھی... مگر ساتھ ہی ایک خلوص بھی، جو صاف نظر آ رہا تھا۔

سکندر نے ہلکی سی سانس لی، پھر نظریں ہٹا لیں

"کوئی بات نہیں... بس careful رہیں"...

نادیہ نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

چند لمحوں کے لیے دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی

مگر یہ خاموشی عجیب نہیں تھی...

اس میں ایک نئی awkwardness بھی تھی...

اور ایک نیا احساس بھی

جسے دونوں نے محسوس تو کیا...

مگر کوئی بھی اسے لفظ نہیں دے سکا۔

سکندر نے چند لمحے نادیہ کی طرف دیکھا... پھر اچانک اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے مڑا اور تیز قدموں سے وہاں سے چل پڑا۔

اس کے قدم تیز تھے... جیسے وہ کسی چیز سے بھاگ رہا ہو

نہ صرف لوگوں کی نظروں سے... بلکہ اپنے اندر اٹھنے والے احساسات سے بھی۔

نادیہ وہیں کھڑی رہ گئی۔

وہ سکندر کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی... اس کی نظریں تب تک اس کا پیچھا کرتی رہیں جب تک وہ کوریڈور کے موڑ پر نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

اس کے چہرے پر ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی تھی۔

نہ مکمل خوشی...

نہ مکمل سکون...

بس ایک الجھی ہوئی کیفیت...

اس نے آہستہ سے اپنے دل پر ہاتھ رکھا

جیسے وہ خود بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ یہ دھڑکن صرف گھبراہٹ کی ہے...

یا کچھ اور بھی ہے۔

"سکندر..." اس نے آہستہ سے اس کا نام لیا، مگر آواز فضا میں ہی تحلیل ہو گئی۔

وہ چند لمحے اسی جگہ کھڑی رہی...

پھر آہستہ آہستہ مڑ کر اپنی راہ چل دی

لیکن اس کے دل میں سکندر کی تصویر اب بھی ویسی ہی تھی...

جیسے وہ ابھی بھی وہیں کھڑا ہو۔

گھر کے ڈنر ٹیبل پر ہلکی سی خاموشی تھی۔ برتنوں کی کھنک اور چمچوں کی آواز کے درمیان سب بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، مگر آج فضا میں ایک عجیب سی سنجیدگی محسوس ہو رہی تھی۔

سکندر پلیٹ کے سامنے بیٹھا تھا، مگر اس کا دھیان کھانے میں کم اور اپنے خیالات میں زیادہ تھا۔ وہ ایک ایک نوالہ لے تو رہا تھا، مگر اس کی نظریں کبھی ٹیبل پر ٹھہر جاتیں، کبھی کہیں اور کھو جاتیں۔

یہی خاموشی اچانک ٹوٹی۔

"سکندر..."

سلمٰی جٹ نے اسے غور سے دیکھا، ان کی آواز میں فکر تھی،

"آج کل تم کچھ... عجیب سے لگ رہے ہو۔ سب ٹھیک ہے نا بیٹا؟"

سکندر ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا۔ اس نے فوراً نظر اٹھائی، جیسے اس سوال کی توقع نہ ہو۔

"کچھ نہیں ماما..." اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

"بس assignments بہت مل گئے ہیں... انہی میں لگا ہوا ہوں..."

اس نے بات ختم کرنے کی کوشش کی، مگر اس کی آواز میں وہ قدرتی روانی نہیں تھی جو عام طور پر ہوتی ہے۔

سلمیٰ جٹ نے اسے غور سے دیکھا... جیسے وہ اس کے جواب سے مکمل مطمئن نہ ہوں۔

پھر انہوں نے آہستہ سے اپنی نظر یعقوب جٹ کی طرف موڑی

"آپ بھی..." انہوں نے نرمی سے کہا، مگر ان کی آنکھوں میں سوال تھا،

"آپ بھی آج کل اس کو ڈانٹتے نہیں ہیں... خیر تو ہے؟"

کچھ لمحے خاموشی رہی۔

یعقوب جٹ نے آہستہ سے پلیٹ پر رکھی چیز کو دیکھا... پھر سر اٹھایا۔

"میں پہلے کونسا ڈانٹا کرتا تھا..." انہوں نے ہلکے سے کہا۔

ان کے لہجے میں ایک عجیب سا سکون تھا... اور ہلکی سی بے پروائی بھی۔

یہ سن کر داود جٹ ہلکے سے ہنس پڑے

"ہاں بس اب یاد آگیا آپ کو... پہلے تو سکندر کی ہر بات پر lecture چلتا تھا"!

ہلکی سی ہنسی ٹیبل پر پھیل گئی۔

سلمیٰ جٹ نے ہلکے سے سر ہلایا،

"کیا حال بنا رکھا ہے آپ سب نے... کچھ سمجھ نہیں آ رہا"...

سکندر نے یہ سب سنا، مگر اس کا دھیان کہیں اور تھا۔

وہ اپنے بابا کو دیکھ رہا تھا

وہی بابا... جو پہلے ہر چھوٹی بات پر اس پر سوال کرتے تھے...

جو اسے ہر وقت correct کرتے تھے...

مگر اب...

وہ اتنے خاموش کیوں ہو گئے ہیں؟

سکندر کی آنکھوں میں ہلکی سی الجھن آئی۔

"یہ خاموشی... اچانک کیوں...؟"

اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا

رات اپنے عروج پر تھی۔ آسمان پر ستارے خاموشی سے جگمگا رہے تھے اور ہلکی ہلکی ہوا چھت پر ایک عجب سا سکون پھیلا رہی تھی۔ نیچے گھر میں سب لوگ کھانے کے بعد آہستہ آہستہ اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ لائٹوں کی مدھم روشنی اور گہرا سکوت پورے ماحول پر چھایا ہوا تھا۔

سکندر کچھ دیر تک کمرے میں بیٹھا رہا، جیسے کسی سوچ میں گم ہو۔ پھر وہ خاموشی سے اٹھا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے قدم آہستہ تھے... لیکن دل میں ایک بے چینی تھی، جیسے کوئی بوجھ اسے اندر ہی اندر دبا رہا ہو۔

وہ چھت پر آیا۔ دروازہ کھولتے ہی ٹھنڈی ہوا نے اس کے چہرے کو چھوا۔ اس نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں... پھر آہستہ آہستہ ایک کونے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں جا کر وہ رکا، ارد گرد دیکھا... اور پھر چپکے سے اپنی جیب سے سگریٹ نکالی۔

ہوا کے ساتھ سگریٹ کا دھواں آہستہ آہستہ فضا میں پھیلنے لگا۔ سکندر گہری سانسیں لیتا رہا، جیسے وہ اس دھوئیں میں اپنے اندر کے الجھے ہوئے خیالات کو بھی باہر نکالنا چاہ رہا ہو۔ اس کا ذہن کہیں اور تھا... شاہد نادیہ کے خیالات سے۔

"یہ عورتیں کتنی عجیب ہوتی ہے میں آج تک نہیں ان کو سمجھ سکا۔"

پھر وہ کچھ اور سوچنے لگا اور وہ خیالات اس پر اور ابھی ہم بھی حاوی ہونے وہ بہت دور جانا چاہتا تھا شاید اپنی ذمہ داریوں سے، شاید اپنے اندر کے خوف سے، یا شاید اپنے آپ سے۔

وہ اسی کیفیت میں کھڑا تھا کہ اچانک سیڑھیوں سے قدموں کی ہلکی آہٹ سنائی دی۔

سکندر فوراً چونک گیا۔ اس نے جلدی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

یعقوب جٹ آہستہ آہستہ اوپر آ رہے تھے۔

وہ لمحہ... جیسے وقت تھم سا گیا ہو۔

سکندر کے ہاتھ سے سگریٹ تقریباً گرنے ہی والی تھی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ واضح تھی۔ اسے لگا جیسے اب سب ختم ہو جائے گا... اب ڈانٹ پڑے گی، سوال ہوں گے، شاید غصہ...

مگر یعقوب جٹ کے چہرے پر نہ غصہ تھا، نہ سختی۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سا سکون تھا۔

وہ قریب آئے... خاموشی سے... بغیر کچھ کہے۔

سکندر کی سانسیں تیز تھیں، دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

یعقوب جٹ نے اس کے پاس آ کر رک کر، آہستگی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

یہ لمس... سختی کے بجائے نرمی کا تھا۔

سکندر حیران تھا۔ اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا... جیسے پوچھ رہا ہو:

"بابا... آپ ناراض نہیں ہیں؟"

یعقوب جٹ نے کچھ دیر خاموشی اختیار کی۔ ہوا چلتی رہی... سگریٹ کی ہلکی خوشبو فضا میں گھلتی رہی... اور پھر انہوں نے آہستہ، گہرے لہجے میں بات شروع کی:

"جب سے تم نے سگریٹ پینا شروع کیا تھا اس کے ایک ہفتے بعد ہی مجھے پتہ چل گیا تھا کہ تم سگریٹ پیتے ہو لیکن میں نے تمہیں کچھ کہا نہیں "

سکندر کے طوطے اڑ گئے اس کو سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ کیا کہے

"ہیں بابا! لیکن آپ نے مجھے کچھ کہا کیوں نہیں؟"

یعقوب جٹ مسکرانے لگے پھر بولے

"کیونکہ تم میرے بیٹے ہو"!

وہ مسکرائے

"بیٹا... مرد وہ نہیں ہوتا جو اپنی مرضی سے جیئے... مرد وہ ہوتا ہے جو اپنی ذمہ داریوں کو پہچانے۔"

انہوں نے ایک لمحہ لیا، پھر کہا:

"جب تم اس گھر کے بڑے بیٹے ہو... تو تم پر صرف اپنی نہیں، بلکہ اپنے پورے گھر کی فکر بھی آتی ہے۔ یہ بوجھ نہیں... یہ عزت ہے۔"

سکندر خاموش تھا... مگر اس کے اندر طوفان اٹھ رہا تھا۔ ہر لفظ اس کے دل میں اتر رہا تھا۔

یاقوب جٹ نے آسمان کی طرف دیکھا، جیسے وہ الفاظ کو اور گہرائی دینا چاہتے ہوں، پھر بولے:

"دنیا تمہیں تب تک مرد نہیں مانتی جب تک تم دوسروں کے لیے جینا نہ سیکھ لو... اور سب سے پہلے تمہیں خود اپنی عزت کرنی ہوگی۔"

انہوں نے سکندر کی طرف دیکھا:

"سکندر... اپنی صحت کا خیال رکھو۔ یہ جسم امانت ہے۔ اگر یہ کمزور ہوا... تو تم کچھ نہیں کر سکو گے۔"

سکندر نے آہستہ سے سر ہلایا... مگر اس کی آنکھوں میں اب ایک نئی سوچ پیدا ہو رہی تھی۔

یعقوب جٹ نے اپنی بات جاری رکھی، ان کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ نرم اور گہرا ہو گیا:

"بیٹا... جب ایک مرد خود غرض ہو کر صرف اپنے لیے جینا شروع کر دیتا ہے نا... تو وہ آہستہ آہستہ سب کی نظروں میں بھی گر جاتا ہے... اور پھر سب سے خطرناک بات... وہ اپنی نظر میں بھی گرنے لگتا ہے۔"

یہ جملہ سکندر کے دل میں تیر کی طرح لگا۔

وہ نیچے دیکھنے لگا... جیسے وہ اپنے آپ سے شرمندہ ہو۔

یعقوب جٹ نے تھوڑا سا آگے جھک کر کہا:

"لیکن اگر تم اپنے گھر والوں کا خیال رکھتے ہو... اگر تم اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہو... تو تم صرف ایک انسان نہیں رہتے... تم ایک سہارا بن جاتے ہو۔"

وہ تھوڑا رکے... پھر آہستہ سے مسکرا کر بولے:

"بادشاہ کی طرح جیو... مگر بادشاہ وہ ہوتا ہے جو رعایا کا خیال رکھتا ہے، نہ کہ صرف اپنے محل کا۔"

ہوا چلتی رہی... دور کہیں سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی... اور چھت پر ایک عجیب سا سکون چھا گیا۔

سکندر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس نے ہلکی سی آواز میں کہا:

"بابا... میں غلط تھا... مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی"...

یعقوب جٹ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا:

"غلطی کرنا مسئلہ نہیں... غلطی پر رک جانا مسئلہ ہے۔ تم سیکھ رہے ہو... یہی کافی ہے۔"

سکندر نے پہلی بار خود کو ہلکا محسوس کیا۔

"اپنے اس پاس کے لوگوں کا خیال رکھو ان سب کی فکر کرو جہاں تک تمہاری طاقت ہے وہاں تک ان کا ساتھ دو اور جو تم سے محبت کرتے ہیں ان کا ساتھ کبھی نہ چھوڑنا"

انہوں نے اس کے سر پر دوبارہ ہاتھ پھیرا۔

وہ اب صرف کھڑا نہیں تھا... بلکہ بدلنے کی طرف ایک قدم بڑھا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے بابا میں بہتر بننے کی کوشش کروں گا"

اور وہ اہستہ اہستہ کر کے سیڑھیوں کی طرف اور وہاں سے نیچے اتر گیا۔

سکندر نیچے اُتر آیا تھا... اس کے قدم ابھی بھی بھاری تھے، مگر دل میں ایک عجیب سا سکون بھی تھا، جو اوپر چھت پر ملی نصیحتوں کے بعد آہستہ آہستہ بن رہا تھا۔

وہ ابھی سیڑھیوں سے اتر ہی رہا تھا کہ پیچھے سے ایک ہلکی سی کھانسی کی آواز آئی

سکندر نے پلٹ کر دیکھا، مگر اس نے اس آواز کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ اسے لگا شاید گھر کی عام سی کوئی آواز ہو گی۔

وہ آگے بڑھ گیا۔

اوپر چھت پر، یعقوب جٹ ابھی وہیں کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر وہی مضبوطی تھی، مگر اچانک ان کے سینے میں ہلکی سی کھنچاؤ کی کیفیت پیدا ہوئی۔

انہوں نے فوراً اپنا ہاتھ منہ پر رکھا... کھانسی دبانے کے لیے۔

یہ کھانسی پہلے سے زیادہ گہری تھی... مگر انہوں نے خود پر قابو رکھا۔

چند لمحے بعد جب انہوں نے ہاتھ ہٹایا...

ان کی نظر اپنی ہتھیلی پر پڑی۔

ایک لمحے کے لیے وہ ساکت ہو گئے۔

ہتھیلی پر ہلکے سے خون کے نشانات تھے۔

انہوں نے فوراً ارد گرد دیکھا... جیسے کوئی انہیں دیکھ نہ لے۔

پھر تیزی سے اپنی جیب سے رومال نکالا اور خاموشی سے ہاتھ صاف کر لیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

چہرے پر وہی سکون واپس لے آئے... وہی مضبوطی... وہی خاموشی۔

"ابھی کسی کو نہیں پتا چلنا چاہیے... ابھی میرا بیٹا تیار بھی نہیں ہے میرے رب مجھے تھوڑا اور وقت دے دے میرے بیٹے کو سدھار دیا" انہوں نے خود سے آہستہ کہا۔

نیچے، سکندر اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ چکا تھا... اسے کچھ بھی اندازہ نہیں تھا کہ اوپر کیا ہوا ہے۔

اور اوپر... یعقوب جٹ رات کی تاریکی میں کھڑے... خاموشی سے اپنے درد کو چھپا رہے تھے...

یہ ایک ایسی خاموشی تھی... جس کے بارے میں ابھی سکندر کو کچھ خبر نہیں تھی۔

اور یہی خاموشی... آنے والے وقت میں سب کچھ بدلنے والی تھی۔

دو فروری کے بعد سے سکندر یونیورسٹی نہیں آیا تھا۔

پہلے دن اس کی غیر موجودگی عام سی لگی۔ دوسرے دن بھی کسی نے زیادہ غور نہیں کیا۔ تیسرے دن اس کا نام حاضری میں پکارا گیا تو خاموشی رہی، اور استاد نے اگلے نام کی طرف بڑھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ آہستہ آہستہ دن گزرتے گئے، اور اس کی غیر حاضری جیسے ماحول کا حصہ بنتی چلی گئی۔

کلاس روم ویسا ہی تھا دیواریں، کھڑکیاں، بورڈ، سب کچھ اپنی جگہ پر۔ مگر ایک جگہ خالی رہتی تھی۔ وہی جگہ جہاں سکندر بیٹھا کرتا تھا۔ شروع میں وہ خالی جگہ نمایاں لگتی تھی، جیسے کسی کی کمی کو ظاہر کر رہی ہو، لیکن وقت کے ساتھ وہ بھی عام سی لگنے لگی۔ کبھی کوئی اور آ کر وہاں بیٹھ جاتا، اور وہ خلا بھی خاموشی سے بھر جاتا۔

کوریڈور میں ہنسی مذاق جاری رہتا، کینٹین میں معمول کے مطابق رش ہوتا، گروپس بنتے اور بکھرتے رہتے۔ زندگی اپنی رفتار سے چلتی رہی، جیسے کسی ایک شخص کے نہ ہونے سے کچھ بدلا ہی نہ ہو۔

کسی نے اس کے نمبر پر کال نہیں کی۔ کسی نے پیغام بھیج کر حال نہیں پوچھا۔ کسی کو یہ جاننے کی جلدی نہیں ہوئی کہ آخر وہ کیوں غائب ہے۔ ایک غیر

محسوس سی بے حسی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، جس میں سکندر کا ذکر آہستہ آہستہ دھندلا جاتا جا رہا تھا۔

سکندر کئی دنوں سے یونیورسٹی نہیں آ رہا تھا۔

شروع میں کسی نے خاص توجہ نہیں دی... مگر نادیہ کے لیے یہ بات معمولی نہیں تھی۔ اُس نے پہلے دن انتظار کیا... دوسرے دن بھی خود کو تسلی دی کہ شاید کوئی مصروفیت ہو گی... مگر جب دن گزرتے گئے، تو اُس کے دل میں بے چینی بڑھنے لگی۔

ہر صبح وہ کلاس میں آتی... اور غیر محسوس انداز میں اُس خالی جگہ کی طرف دیکھتی جہاں سکندر بیٹھا کرتا تھا۔ پہلے وہ خود کو سمجھاتی رہی... مگر اب اُس خالی کرسی نے جیسے سوال بن کر اُس کے سامنے کھڑا ہونا شروع کر دیا تھا۔

کوریڈور میں چلتے ہوئے اُس کی نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھتیں... جیسے وہ ہر لمحہ یہ امید کر رہی ہو کہ شاید اگلے ہی لمحے سکندر اندر آ جائے گا۔

مگر ایسا کبھی نہیں ہوا۔

نادیہ نے آخر کار ہمت کر کے اسے کال کی۔

پہلی بار... کوئی جواب نہیں۔

دوسری بار... پھر خاموشی۔

پھر اُس نے بار بار کال کرنے کی کوشش کی... مگر ہر بار فون بجتا رہتا... اور آخر کار خود ہی بند ہو جاتا۔

ہر ناکام کال کے ساتھ اُس کی بے چینی بڑھتی گئی۔

اب یہ صرف غیر حاضری نہیں رہی تھی... یہ ایک سوال بن چکا تھا آخر سکندر کے ساتھ ہوا کیا ہے؟

نادیہ کے چہرے پر اب واضح پریشانی نظر آنے لگی تھی۔ وہ کلاس میں ہوتی تو دھیان کہیں اور ہوتا، لیکچر سنتے ہوئے بھی اُس کا ذہن بار بار اُسی طرف چلا جاتا۔

وہ خود سے بار بار یہی سوچتی...

آخر وہ جواب کیوں نہیں دے رہا؟

کیا وہ ٹھیک ہے بھی یا نہیں؟

کبھی اُس کے دل میں ہلکا سا غصہ آتا... کہ کم از کم ایک بار بتا تو دیتا... اور اگلے ہی لمحے وہی غصہ فکر میں بدل جاتا۔

انتظار... بے خبری... اور خاموشی

یہ تینوں مل کر اُس کے اندر ایک عجیب سی بے چینی پیدا کر رہے تھے۔

اور پہلی بار... نادیہ کو شدت سے احساس ہوا...

کہ سکندر کی غیر موجودگی صرف ایک کمی نہیں ہے...

بلکہ ایک فکر ہے... جو اب اُس کے دل پر اثر ڈالنے لگی ہے۔

نادیہ ایک نجی اکیڈمی میں پڑھاتی تھی، اور اپنے کام میں جتنے بھی وہ مصروف رہنے کی کوشش کرتی، سکندر کی غیر موجودگی اُس کے ذہن کے کسی نہ کسی کونے میں موجود رہتی۔

وہ کلاس لیتی... بچوں کو پڑھاتی... بورڈ پر لکھتی... سوالوں کے جواب دیتی... مگر جیسے ہی کلاس ختم ہوتی، اُس کا ذہن پھر اُسی طرف چلا جاتا۔ کمرے میں موجود خاموشی اسے اور زیادہ یاد دلاتی کہ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔

آہستہ آہستہ اُس نے خود کو مشغول رکھنے کی کوشش اور تیز کر دی۔ کتابیں، نوٹس، بچوں کے سوال... سب کچھ وہ سنبھالتی رہی، مگر اندر سے وہ ہر لمحہ الجھتی جا رہی تھی۔

اس دوران اُس نے سکندر کو بار بار کال کرنے کی کوشش کی۔

پہلی چند کالز میں اُس نے خود کو تسلی دی... شاید وہ مصروف ہو گا... شاید فون پاس نہ ہو... مگر وقت کے ساتھ جب یہ سلسلہ بڑھتا گیا تو اُس کی بے چینی بھی بڑھتی چلی گئی۔

کبھی فون "بزِی" آتا... کبھی مسلسل "آف"... اور کبھی بغیر جواب کے خاموشی۔

یہ ایک دن یا دو دن کی بات نہیں تھی۔

دن گزرے... پھر ہفتے کی شکل اختیار کر گئے۔

اور ہر دن کے ساتھ نادیہ کی کالز بھی بڑھتی گئیں۔

آخر کار یہ تعداد سیکڑوں میں جا پہنچی۔

وہ سکندر کو پانچ سو سے زائد کالز کر چکی تھی۔

ہر بار جب فون ہاتھ میں آتا، وہ ایک امید کے ساتھ نمبر ڈائل کرتی... اور ہر بار وہی نتیجہ اسے ملتا یا تو نمبر بند، یا کال مشغول۔

یہ مسلسل ناکامی اس کے دل پر اثر ڈال رہی تھی۔

وہ اکیڈمی میں بچوں کے سامنے خود کو مضبوط دکھاتی... مگر جیسے ہی وہ اکیلے بیٹھتی، اُس کے چہرے پر تھکن اور فکر نمایاں ہو جاتی۔

اب یہ صرف رابطہ نہ ہونے کی بات نہیں رہی تھی...

یہ ایک ایسی بے چینی بن چکی تھی جو ہر دن کے ساتھ گہری ہو رہی تھی۔

اور نادیہ کے دل میں ایک ہی سوال بار بار گونج رہا تھا...

سکندر آخر جا کہاں گیا ہے؟

دن گزرتے گئے... کالز بڑھتی گئیں... اور ہر بار وہی خاموشی، وہی بے جواب ٹون۔

نادیہ نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ اکیڈمی میں جاتی، بچوں کو پڑھاتی، نوٹس بناتی، اور خود کو کام میں الجھانے کی کوشش

کرتی... مگر جیسے ہی ایک لمحہ بھی خالی ہوتا، اُس کے ذہن میں سکندر کی یادیں اور سوالات ایک ساتھ اُبھر آتے۔

اب اُس کی آنکھوں میں وہ پہلا سا اعتماد نہیں رہا تھا...نہ ہی وہ بے فکری۔

بار بار کی کالز، بے شمار کوششیں، اور مسلسل خاموشی... آہستہ آہستہ اُس کے حوصلے کو کمزور کرتی چلی گئیں۔

آخر کار ایک دن...

وہ خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

فون اُس کے ہاتھ میں تھا... اسکرین پر وہی نمبر جسے وہ بار بار ڈائل کر چکی تھی۔

اس نے گہری سانس لی...

اور پہلی بار اُس کے چہرے پر ہار مان لینے کا سا تاثر آ گیا۔

وہ اب مزید کال کرنے کی ہمت نہیں کر رہی تھی۔

ہاتھ آہستہ سے نیچے ہو گیا... اور فون اس کی گود میں آ گیا۔

کمرہ خاموش تھا... باہر سے ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں... مگر نادیہ کے اندر ایک عجیب سی خاموشی پھیل چکی تھی۔

وہ تھک چکی تھی...

صرف جسم سے نہیں... بلکہ دل سے بھی۔

اس کی نظریں کہیں دور ٹکی ہوئی تھیں... اور آنکھوں میں ایک سوال تھا

جو ابھی تک جواب کا انتظار کر رہا تھا... مگر اب نادیہ کے پاس اس انتظار کی بھی طاقت نہیں بچی تھی۔

یونیورسٹی میں دن معمول کے مطابق گزر رہے تھے... مگر ایک چیز اب بھی سب کے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔

سکندر۔

شروع میں سب نے اس کی غیر موجودگی کو معمولی سمجھا تھا، مگر وقت گزرنے کے ساتھ یہ بات سوال بن گئی کہ آخر وہ ہے کہاں؟

کلاس میں وہی خالی نشست... لیکچر کے دوران وہی ادھورا سا احساس... اور کوریڈور میں وہی موضوع بار بار زیرِ بحث آنے لگا۔

کچھ دوستوں نے آپس میں بات کی، کچھ نے اندازے لگائے، مگر حقیقت کسی کو معلوم نہیں تھی۔

نہ کوئی ٹھوس خبر... نہ کوئی واضح وجہ۔

بس ایک خاموشی تھی... جو ہر جگہ پھیل چکی تھی۔

صرف مومِنہ ایسی تھی جس سے سکندر کی حال ہی میں بات ہوئی تھی۔

لیکن اُس نے بھی بات کو آگے نہیں بڑھایا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ باقی لوگ اور بھی زیادہ حیران تھے کیونکہ سکندر کے قریب ہونے کے باوجود... کوئی بھی اس کی اصل حالت تک نہیں پہنچ پا رہا تھا۔

نادیہ کی پریشانی الگ تھی... اور یونیورسٹی کا ماحول الگ۔

دو مختلف دنیاوں میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا

سکندر آخر ہے کہاں؟

اور ہر گزرتے دن کے ساتھ...

یہ سوال مزید گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

ارمان اور مومِنہ کی کلاس میں ایک لڑکی پڑھتی تھی، جو عمر میں باقی سب سے تقریباً دو تین سال بڑی تھی۔ اسی وجہ سے کلاس کے اکثر لڑکے اور لڑکیاں اسے عزت اور احترام سے "آپی" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

اصلی نام تھا فوزیہ۔

فوزیہ کا انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا پر سکون، سمجھدار، اور بات کرتے ہوئے ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہر بات کو پہلے غور سے سنتی ہو، پھر ناپ تول کر جواب دیتی ہو۔ کلاس میں اگر کبھی کسی کو کوئی مسئلہ ہوتا، پڑھائی کا ہو یا زندگی کا، تو لوگ اکثر اس کے پاس ہی جاتے تھے۔

وہ بھی کسی بڑے کی طرح سب کو سنے بغیر ٹوکے جواب نہیں دیتی تھی۔ اس کی باتوں میں نرمی بھی ہوتی تھی اور حقیقت بھی، جس کی وجہ سے لوگ اُس پر اعتماد کرتے تھے۔

وقت کے ساتھ ارمان نے بھی یہ محسوس کیا کہ وہ اسے ایک اچھا رہنما سمجھنے لگا ہے۔ اس کے دل میں یہ خیال آہستہ آہستہ مضبوط ہوتا گیا کہ شاید اگر وہ اس سے بات کرے تو اسے کوئی درست اور سنجیدہ مشورہ مل سکتا ہے خاص طور پر ان معاملات میں جن میں وہ خود الجھ چکا تھا۔

اسے لگنے لگا کہ وہ صرف ایک کلاس فیلو نہیں... بلکہ کوئی ایسا شخص ہے جو چیزوں کو زیادہ گہرائی سے سمجھتا ہے۔

اور اسی احساس کے ساتھ... ارمان نے ایک دن یہ سوچ لیا کہ وہ اُس "آپی فوزیہ" سے اپنے دل کی بات کہے گا اور شاید وہاں سے اسے وہ رہنمائی مل جائے جس کی اسے تلاش تھی۔

ارمان نے فوزیہ آپی کے سامنے بیٹھ کر گہری سانس لی، جیسے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے آیا ہو۔

"فوزیہ آپی... مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے،" ارمان نے ہلکی جھجک کے ساتھ کہا۔

فوزیہ آپی نے نرمی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا، "ہاں ارمان، بتاؤ کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔"

ارمان نے نظریں جھکا لیں، "آپی... وہ مومنہ کے بارے میں... مجھے وہ پسند ہے۔"

یہ سن کر فوزیہ آپی کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا، مگر لہجہ اب بھی نرم تھا، "ارمان، پسند ہونا کوئی بری بات نہیں... لیکن یہ بتاؤ کہ تم اس کو کس نیت سے پسند کرتے ہو؟"

ارمان نے فوراً جواب دیا، "آپی، میری نیت صاف ہے۔ میں کوئی حرام تعلق نہیں رکھنا چاہتا... اگر سب ٹھیک رہا تو میں اس سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔"

فوزیہ آپی نے سر ہلایا، "یہی بات مجھے سننی تھی۔ دیکھو ارمان، میں مومنہ کی فطرت جانتی ہوں۔ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے جو غلط راستے پر چلے۔ اسی لیے میں تمہیں یہی مشورہ دوں گی کہ تم کسی بھی قسم کے حرام تعلق سے دور رہو۔"

ارمان نے ہلکا سا اعتماد سے کہا، "آپی، اس نے سکندر کو بتایا تھا کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے"...

فوزیہ آپی نے فوراً اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا، "ارمان، سنی سنائی باتوں پر زندگی کے فیصلے نہیں کیے جاتے۔"

کچھ لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔

پھر فوزیہ آپی نے قدرے سنجیدہ لہجے میں کہا، "اگر تم واقعی سنجیدہ ہو، تو ایک دفعہ خود تصدیق کرو۔ سیدھے اور صاف طریقے سے... یا پھر گھر والوں کے ذریعے بات آگے بڑھاؤ۔"

ارمان نے الجھن میں پوچھا، "لیکن آپی... اگر اس نے منع کر دیا تو؟"

فوزیہ آپی نے نرمی سے مسکرا کر کہا، "تو کم از کم تمہارا دل مطمئن ہو جائے گا کہ تم نے سچ جان لیا۔ اور اگر وہ واقعی تمہیں پسند کرتی ہے، تو پھر بھی یہ رشتہ صحیح طریقے سے ہی آگے بڑھے گا۔"

ارمان نے سر ہلایا، جیسے اس نے بات سمجھ لی ہو، "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپی... میں جلد بازی نہیں کروں گا۔"

فوزیہ آپی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، "بس یہی سمجھداری ہے، ارمان۔ محبت خوبصورت ہوتی ہے، لیکن اسے پاک طریقے سے نبھایا جائے تو ہی اس میں برکت ہوتی ہے۔"

ارمان کے چہرے پر اب پہلے سے زیادہ سکون تھا، جیسے اسے اپنی الجھن کا راستہ مل گیا ہو۔

چھے فروری کی رات تھی۔ ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی، اور کمرے کے اندر ایک مدھم سی روشنی جل رہی تھی جو دیواروں پر لمبے سائے بنا رہی تھی۔ باہر سب کچھ خاموش تھا... مگر اَرمان کے دل کے اندر عجیب سا شور تھا۔

وہ بستر کے کنارے بیٹھا تھا، موبائل کان سے لگا ہوا... اور انگلیاں بے اختیار ایک دوسرے میں الجھ رہی تھیں۔ جیسے وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہو۔

دوسری طرف مومِنہ تھی...

آج کی بات عام نہیں تھی۔ اَرمان کافی دیر سے بات کر رہا تھا، لیکن آج اُس کے لہجے میں وہ ہلکا پن نہیں تھا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ ہر لفظ بھاری لگ رہا تھا... جیسے دل کے بہت اندر سے نکل کر آ رہا ہو۔

"مومِنہ جی..." اس نے آہستہ سے کہا۔

اس کی آواز میں ایک ہلکی سی لرزش تھی۔

"میں... میں آپ سے ایک بات دل سے کہنا چاہتا ہوں۔"

چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔ اُس خاموشی میں اَرمان کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔

"میں آپ کو لے کر بہت سنجیدہ ہوں..." اس نے آخرکار کہہ دیا، "یہ سب میرے لیے ٹائم پاس نہیں ہے... میں واقعی... آپ کو اپنی زندگی میں چاہتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں... جیسے وہ اپنے ہی الفاظ کا بوجھ محسوس کر رہا ہو۔

دوسری طرف مومِنہ خاموش ہو گئی۔

نہ کوئی فوراً جواب... نہ کوئی ہنسی... نہ ہی بات کو بدلنے کی کوشش۔

یہ خاموشی اَرمان کو اندر سے بے چین کرنے لگی۔

"کچھ تو کہے..." اس نے دھیرے سے کہا، "پلیز"...

مومِنہ نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی آواز جب آئی تو اس میں نرمی بھی تھی... اور فاصلے کا احساس بھی۔

"ارمان... میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں"...

وہ رکی...

"لیکن میں ریلیشن شپ میں نہیں آسکتی۔"

یہ جملہ جیسے سیدھا اَرمان کے دل پر لگا۔

ایک لمحے کے لیے اس کی سانس رک گئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا... مگر الفاظ گلے میں ہی اٹک گئے۔

کمرے کی خاموشی اب پہلے سے زیادہ بھاری ہو گئی تھی۔

مگر مومِنہ نے بات ختم نہیں کی۔

"میں چیزوں کو ایسے نہیں دیکھتی..." اس نے آہستہ سے کہا، "اگر آپ واقعی سنجیدہ ہیں... تو پھر سیدھا راستہ لیں۔ اپنے گھر والوں کو بھیجیں... باقاعدہ رشتہ بھجوائیں"...

اَرمان کی آنکھیں کھل گئیں۔

یہ وہ جواب نہیں تھا جس کی اسے توقع تھی... مگر یہ مکمل انکار بھی نہیں تھا۔

..."پھر میں غور کروں گی۔"

یہ آخری جملہ دھیرے سے بولا گیا... مگر اس میں ایک حد بھی تھی اور ایک امید بھی۔

اَرمان نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کا دل ابھی بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"یعنی..." اس نے تھوڑی ہمت جمع کر کے کہا، "اگر میں رشتہ بھیجوں... تو آپ"...

وہ رک گیا۔ جیسے اسے خود اپنے سوال سے ڈر لگ رہا ہو۔

..."تو آپ انکار نہیں کریں گی؟"

دوسری طرف پھر خاموشی۔

یہ خاموشی اس بار اور لمبی تھی... اور زیادہ تکلیف دہ بھی۔

اَرمان کے ذہن میں ہزاروں خیال ایک ساتھ آنے لگے کیا وہ واقعی تیار ہے؟ کیا اس کے گھر والے مان جائیں گے؟ کیا مومِنہ واقعی اس کے لیے ٹھہرے گی؟

پھر مومِنہ کی آواز آئی... آہستہ، مگر واضح:

"میں وعدہ نہیں کر رہی، اَرمان"...

یہ سن کر اس کا دل جیسے تھوڑا سا ڈوب گیا۔

..."لیکن میں سنجیدگی سے سوچوں گی۔"

یہ جملہ سن کر اس کے اندر کہیں ایک چھوٹی سی روشنی جل اٹھی۔

ادھوری... مگر موجود۔

اَرمان نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی تھکن تھی... مگر ساتھ ہی ایک عجیب سا سکون بھی۔

"ٹھیک ہے..." اس نے آہستہ سے کہا، "پھر میں بھی اب آدھے راستے پر نہیں رکوں گا۔

لیکن مومِنہ جی... میری بات سنیں۔"

اس کے لہجے میں نرمی بھی تھی اور سنجیدگی بھی۔

"ابھی میرے چھوٹے چاچو، یاسر کی شادی ہونی ہے"...

وہ رکا... جیسے اس بات کا وزن خود بھی محسوس کر رہا ہو۔

"اُس کے بعد... میں بات کروں گا۔"

یہ جملہ سادہ تھا، مگر اس کے پیچھے ایک وعدہ چھپا ہوا تھا ایک وقت مانگنے کا وعدہ، ایک موقع لینے کی درخواست۔

دوسری طرف چند لمحوں کی خاموشی رہی۔

مومِنہ نے اس بات کو سنا... سمجھا... اور شاید دل میں تول بھی لیا۔

پھر اُس نے آہستہ، مختصر مگر واضح انداز میں کہا:

"ٹھیک ہے، اَرمان۔"

اس کی آواز میں اب پہلے سے زیادہ ٹھہراؤ تھا۔

یہ صرف ایک جملہ نہیں تھا... یہ ایک فیصلہ تھا۔

دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔

مگر اس خاموشی میں اب خوف کے ساتھ ساتھ امید بھی تھی... اور ایک انجانا سا مستقبل بھی۔

اچانک مومِنہ کی آواز پھر آئی... مگر اس بار اُس کے لہجے میں پہلے سے زیادہ سنجیدگی تھی، اور ایک ہلکی سی جھجک بھی۔

"اَرمان"...

وہ رک گئی... جیسے الفاظ کو ترتیب دے رہی ہو۔

"ایک بات کہوں؟"

اَرمان فوراً سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"ہاں... کہیے۔"

چند لمحوں کی خاموشی...

پھر مومِنہ نے آہستہ مگر واضح لہجے میں کہا:

"لیکن اَرمان... یہ بات صرف ہم دونوں کے درمیان رہے گی۔ کہیں آگے نہیں جائے گی۔"

اَرمان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ وہ غور سے سننے لگا۔

مومِنہ نے اپنی بات جاری رکھی:

"مجھ سے وعدہ کریں... میری عزت مجھے بہت عزیز ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ بات کسی تیسرے تک پہنچے... نہ دوستوں میں، نہ کسی اور کے سامنے۔"

اس کی آواز میں ایک ہلکی سی کپکپاہٹ تھی... جیسے وہ صرف بات نہیں کر رہی، بلکہ اپنے دل کا ایک حساس پہلو سامنے رکھ رہی ہو۔

"صرف آپ تک... اور مجھ تک... یہی رہے۔"

یہ جملہ بولتے ہوئے اس نے جیسے اپنی ساری سنجیدگی اس میں ڈال دی۔

اَرمان کچھ لمحے خاموش رہا۔

اس نے آنکھیں بند کیں... ایک گہری سانس لی... اور پھر دھیرے سے بولا:

"آپ کو مجھ پر اتنا بھی یقین نہیں ہے؟"

یہ سوال شکایت نہیں تھا... بس ایک ہلکی سی تکلیف تھی۔

مومِنہ فوراً بولی:

"یقین ہے... تبھی تو کہہ رہی ہوں۔ لیکن دنیا پر نہیں ہے۔ لوگ باتوں کو بدل دیتے ہیں... اور پھر وہی بات عزت کو چھو جاتی ہے۔"

یہ سن کر اَرمان کے چہرے پر سنجیدگی آگئی۔

اس نے سر ہلایا... جیسے وہ اس بات کو سمجھ گیا ہو۔

"ٹھیک ہے..." اس نے نرمی سے کہا، "میں وعدہ کرتا ہوں۔ یہ بات صرف ہمارے درمیان ہی رہے گی۔ نہ میں کسی کو بتاؤں گا... نہ کبھی آپ کو شرمندہ ہونے دوں گا۔"

اس کے لہجے میں اب پختگی تھی... اور ایک حفاظت دینے والا احساس بھی۔

مومِنہ کچھ دیر خاموش رہی...

پھر آہستہ سے بولی:

"Thank you..."

یہ لفظ چھوٹا تھا... مگر اس میں ایک سکون تھا، جیسے اس نے دل کا بوجھ تھوڑا سا ہلکا کر لیا ہو۔

اَرمان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

"آپ کی عزت... اب میری ذمہ داری بھی ہے۔"

یہ جملہ سنتے ہی مومِنہ کے دل میں ایک عجیب سی کیفیت اٹھی اعتماد کی... مگر ساتھ ہی ایک انجانے خوف کی بھی۔

کال ابھی جاری تھی... مگر اب دونوں کے درمیان صرف بات نہیں تھی...

ایک وعدہ تھا۔

اور کبھی کبھی... کہانیوں میں سب سے بھاری چیز الفاظ نہیں ہوتے...

بلکہ وہ وعدے ہوتے ہیں... جو دل پر رکھے جاتے ہیں۔

چھے فروری کی وہ رات...

ایک عام کال نہیں تھی۔

یہ وہ لمحہ تھا جہاں دل نے خواہش سے آگے بڑھ کر ذمہ داری کو چھوا تھا... اور کہانی نے پہلی بار حقیقت کا رخ اختیار کیا تھا۔

نو فروری کی شام تھی۔ پانچ بج رہے تھے۔ گھر میں عام سی خاموشی تھی، کہیں دور ٹی وی کی ہلکی سی آواز، اور کچن سے برتنوں کی مدھم کھنک سنائی دے رہی تھی۔ مومِنہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی، ہاتھ میں موبائل لیے، مگر نظریں کہیں اور تھیں۔ اُس کے ذہن میں پچھلے دنوں کی باتیں بار بار گھوم رہی تھیں... اور دل کسی انجانے احساس سے بوجھل تھا۔ کبھی وہ موبائل اسکرین کو دیکھتی، کبھی اسے لاک کر دیتی، جیسے کسی چیز کا انتظار کر رہی ہو مگر خود بھی نہ جانتی ہو کیا۔

اچانک... ایک زوردار چیخ سنائی دی۔

"مومِنہ! جلدی آؤ"!

یہ نسیمِ بی بی کی آواز تھی کانپتی ہوئی، گھبراہٹ سے بھری ہوئی۔

مومِنہ فوراً چونک گئی۔ اس کا دل ایک دم زور سے دھڑکا، جیسے سینے میں جھٹکا لگا ہو۔ اس نے موبائل ایک طرف رکھا اور تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ قدم تیز تھے مگر دل کہیں رکا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟" اُس نے بے چینی سے پوچھا، مگر اس کی آواز میں خود گھبراہٹ نمایاں تھی۔

جیسے ہی وہ کمرے کے باہر نکلی... سامنے کا منظر دیکھ کر اُس کے قدم وہیں جم گئے۔

طارق انور صوفے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے... مگر ان کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ اپنا سینہ پکڑے ہوئے تھے، جیسے کسی نے اندر سے سخت دباؤ ڈال دیا ہو۔ چہرہ زرد پڑ چکا تھا، آنکھوں میں کمزوری اور درد واضح تھا، اور سانس لینے میں شدید دشواری تھی۔ ان کی سانسیں بے ترتیب تھیں، کبھی تیز، کبھی رکتی ہوئی۔

"آہ..." اُن کے منہ سے ایک دبیز سی کراہ نکلی، جیسے درد اندر سے چیخ رہا ہو مگر آواز باہر آکر ٹوٹ رہی ہو۔

نسیمِ بی بی اُن کے قریب بیٹھی تھیں، دونوں ہاتھوں سے اُنہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"طارق! سنیں میری بات... آنکھیں کھولیں!" وہ گھبراہٹ میں بار بار اُنہیں ہلانے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز کانپ رہی تھی۔ "یا اللہ... یہ اچانک کیا ہو گیا... کچھ تو کہیں"!

مومِنہ جیسے ساکت ہو گئی ہو۔ اُس کے ہاتھ ٹھنڈے پڑ گئے، اور جسم میں ایک عجیب سی جکڑن محسوس ہوئی۔

"بابا..." اُس کی آواز مدھم، ٹوٹی ہوئی تھی۔ "بابا کیا ہوا آپ کو؟"

وہ تیزی سے آگے بڑھی... مگر جیسے ہی قریب گئی، اپنے بابا کی ایسی حالت دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کا دل جیسے ایک لمحے کے لیے رک گیا۔

طارق انور کی سانسیں تیز اور بے ترتیب ہو رہی تھیں، اور ان کا جسم ہلکا سا کانپ رہا تھا۔ وہ آنکھیں آدھی کھولنے کی کوشش کر رہے تھے، مگر کمزوری ان پر حاوی تھی۔

"سینے... میں... درد..." وہ مشکل سے، ٹوٹی پھوٹی آواز میں بولے۔

مومِنہ کی آنکھوں میں ایک دم آنسو بھر آئے۔

"بابا... کچھ نہیں ہو گا آپ کو... آپ ٹھیک ہو جائیں گے..." وہ کانپتی آواز میں بولی، مگر خود اُس کی آواز میں یقین کم اور خوف زیادہ تھا۔ اُس نے اپنے بابا کا ہاتھ تھام لیا، جیسے اس لمس سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

نسیمِ بی بی نے زور سے کہا:

"مومِنہ! کچھ کرو... جلدی! کچھ کرو!" ان کی آواز میں بے بسی اور خوف واضح تھا۔

مومِنہ نے فوراً خود کو سنبھالا، مگر اس کے ہاتھ اب بھی کانپ رہے تھے۔ اُس نے موبائل اٹھایا، اسکرین پر نمبر ڈائل کیے، مگر انگلیاں کانپنے کی وجہ سے مشکل سے کام کر رہی تھیں۔

"ہیلو! ایمبولینس... جلدی... میرے بابا کی طبیعت بہت خراب ہے..." وہ ایک ہی سانس میں بول گئی، پھر رک کر خود کو سنبھالا، اور ایڈریس بتانے لگی۔ "وہ ٹھیک نہیں ہیں... سینے میں شدید درد ہے... پلیز جلدی آجائیں"!

فون رکھتے ہی وہ فوراً واپس اپنے بابا کے پاس آ گئی۔

"بابا... آنکھیں کھولیں... پلیز..." وہ اُن کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر بولی، جیسے وہ ہاتھ چھوڑ دے گی تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل گر رہے تھے۔

"مجھے... سانس..." طارق انور نے آہستہ، بہت کمزور آواز میں کہا۔

نسیم بی بی روتے ہوئے بولیں:

"یا اللہ... ہم پر رحم فرما... اسے کچھ نہ ہو..." وہ بار بار دعا کر رہی تھیں اور ساتھ ہی بے چینی میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں، جیسے وقت رک گیا ہو۔

چند لمحے بعد ہی باہر ایمبولینس کی آواز سنائی دینے لگی۔ سائرن کی تیز آواز نے ماحول کو اور بھی خوفناک بنا دیا۔

"وہ آگئی!" مومِنہ نے فوراً کہا، جیسے امید کی ایک کرن نظر آئی ہو۔

کچھ ہی دیر میں ایمبولینس گھر کے باہر رک گئی۔ دو افراد تیزی سے اندر داخل ہوئے۔

"کیا حالت ہے مریض کی؟"

مومِنہ نے جلدی سے بتایا: "سینے میں شدید درد... سانس لینے میں مشکل... وہ... بہت کمزور ہو رہے ہیں"...

انہوں نے فوراً طارق انور کو سنبھالا۔ ایک نے ان کا ہاتھ چیک کیا، دوسرے نے فوری طور پر انہیں اسٹریچر پر منتقل کرنے کی تیاری کی۔

"ہم انہیں فوراً لے جا رہے ہیں... جلدی کریں!" ایک نے کہا۔

مومِنہ بھی ساتھ جانے کے لیے فوراً تیار ہو گئی، اُس نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔

ایمبولینس میں... مومِنہ اپنے بابا کے قریب بیٹھی تھی۔ گاڑی تیزی سے چل رہی تھی، سڑکوں کی جھٹکوں کے ساتھ اندر کا ماحول اور بھی بے چین ہو رہا تھا۔

"بابا... آپ کچھ نہ کہیں... ہم آپ کو ہسپتال لے جا رہے ہیں..." وہ روتے ہوئے بولی، اس کی آواز مسلسل ٹوٹ رہی تھی۔

طارق انور نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبایا... جیسے اُسے تسلی دینا چاہتے ہوں، جیسے کہنا چاہتے ہوں کہ وہ مضبوط رہیں۔

"بیٹا... اپنی... ماں کا خیال رکھنا..." وہ بڑی مشکل سے بولے۔

مومِنہ کی آنکھوں سے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"نہیں بابا... آپ کو کچھ نہیں ہو گا... آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے..." اُس کی آواز رونے کی شدت سے مزید ٹوٹ گئی۔

ایمبولینس تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ باہر اندھیرا گہرا ہو رہا تھا، مگر اندر مومِنہ کے لیے جیسے ہر لمحہ روشنی مدھم ہو رہی تھی۔ سائرن کی آواز فضا میں گونج رہی تھی... اور اس شور کے درمیان مومِنہ کے دل کی دھڑکن سب سے زیادہ تیز تھی۔

وہ بس ایک ہی دعا کر رہی تھی... بار بار، آنکھیں بند کر کے، دل سے:

"یا اللہ... میرے بابا کو بچا لے... مجھے میرے بابا واپس دے دے"...

اور وہ لمحہ...

جیسے وقت کے ساتھ ساتھ اور بھی بھاری ہوتا جا رہا تھا... جیسے ہر سیکنڈ ایک صدی بن رہا تھا... اور ہر سانس ایک امتحان...

گیارہ فروری

ہسپتال کے سفید، ٹھنڈے دیواروں والے کمرے میں دو دن گزر چکے تھے... مگر مومِنہ کے لیے وقت جیسے رک گیا تھا۔ ہر لمحہ ایک بوجھ بن کر اُس کے دل پر گرتا تھا۔ کبھی وہ کرسی پر بیٹھی رہتی، کبھی اُٹھ کر اپنے بابا کے قریب جا کھڑی ہوتی، اور کبھی کھڑکی سے باہر اندھیرے کو دیکھتی... جیسے وہاں سے کوئی جواب مل جائے گا۔

طارق انور بیڈ پر لیٹے تھے۔ چہرہ پہلے سے زیادہ کمزور، آنکھیں بند، سانسیں مشین کی ہلکی سی آواز کے ساتھ جڑی ہوئی۔ مومِنہ ہر چند لمحوں بعد اُن کا ہاتھ تھام لیتی... جیسے ڈر ہو کہ اگر اُس نے چھوڑ دیا تو کہیں وہ ساتھ بھی نہ چھوڑ دیں۔

نسیمِ بی بی ایک کونے میں بیٹھی تھیں، ہاتھوں میں تسبیح... مگر اُن کے ہونٹوں سے نکلنے والی ہر دعا میں کپکپاہٹ تھی۔

دروازہ آہستہ سے کھلا... اور ڈاکٹر اندر آئے۔

مومِنہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی... صرف انتظار تھا۔

"ڈاکٹر صاحب... بابا ٹھیک ہو جائیں گے نا؟" اُس کی آواز اتنی دھیمی تھی جیسے ٹوٹ نہ جائے۔

ڈاکٹر نے چند لمحے خاموشی سے فائل دیکھی، پھر سنجیدگی سے کہا:

"ہم نے تمام رپورٹس دیکھ لی ہیں... مسئلہ سنجیدہ ہے۔ دل کی کچھ وال تقریباً بند ہو چکی ہیں۔"

مومِنہ کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کو رک گئی۔

"ہمیں جلد از جلد آپریشن کرنا ہو گا۔"

یہ الفاظ سیدھے اُس کے دل میں اتر گئے۔

"آپریشن...؟" اُس نے مشکل سے کہا۔

ڈاکٹر نے سر ہلایا، "جی۔ ہم پوری کوشش کریں گے کہ سب ٹھیک ہو جائے... لیکن اگر پیچیدگی بڑھی... تو ہمیں ہارٹ ٹرانسپلانٹ تک جانا پڑ سکتا ہے۔"

یہ سن کر جیسے مومِنہ کے اندر سب کچھ ٹوٹ گیا۔

اس کے کانوں میں صرف ایک لفظ گونجنے لگا

"ہارٹ... ٹرانسپلانٹ"...

اُس کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے، مگر وہ وہیں کھڑی رہ گئی... جیسے جسم ساتھ چھوڑ گیا ہو۔

ڈاکٹر نے نرمی سے کہا، "آپ دعا کریں... ہم اپنی پوری کوشش کریں گے،" اور وہ باہر چلے گئے۔

کمرے میں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔

ایسی خاموشی... جو چیخ رہی تھی۔

مومِنہ آہستہ آہستہ چل کر اپنے بابا کے قریب آئی۔ اُس نے اُن کا ہاتھ تھاما...

وہ ہاتھ جو ہمیشہ مضبوط لگتا تھا، آج کمزور محسوس ہو رہا تھا۔

"بابا..." اُس نے بہت آہستہ کہا، جیسے وہ خود سن بھی نہ پائے، "آپ کو کچھ نہیں ہو گا نا...؟"

کوئی جواب نہیں آیا۔

صرف مشین کی بیپ... بیپ... بیپ...

نسیم بی بی روتے ہوئے زیرِ لب دعا کر رہی تھیں۔

مومِنہ کی آنکھوں سے آنسو اب بہنے لگے تھے۔ وہ اب خود کو روک نہیں پا رہی تھی۔

"یا اللہ... میں کچھ نہیں مانگتی... بس میرے بابا کو ٹھیک کر دے..." اُس کے الفاظ ٹوٹ رہے تھے، سانسیں بھاری ہو رہی تھیں۔

اچانک...

بیپ کی آواز بدل گئی۔

پہلے سے تیز... بے ترتیب...

"بیپ... بیپ... بیییپ"...

مومِنہ چونک کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

"بابا...؟"

اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔

دروازہ ایک دم کھلا

نرس تیزی سے اندر آئی۔

"پلیز سائیڈ پر ہو جائیں"!

مومِنہ کے ہاتھ خود بخود پیچھے ہٹ گئے۔

کمرے میں ایک دم بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔

"ڈاکٹر کو فوراً بلاؤ!" نرس نے زور سے کہا۔

مومِنہ ایک کونے میں کھڑی رہ گئی... آنکھیں پھیلی ہوئی... سانس رکی ہوئی...

اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے...

بس ایک ہی خیال تھا

"یا اللہ... یہ کیا ہو رہا ہے...؟"

اور پھر...

مشین کی آواز اچانک ایک سیدھی لائن میں بدلنے لگی

"بیییییییپ۔۔۔۔"

اور وہ لمحہ...

جہاں سب کچھ رک سا گیا... یا شاید ہمیشہ کے لیے بدلنے والا تھا...

گیارہ فروری کا دن تھا۔

ہسپتال کی لمبی، ٹھنڈی راہداریوں میں ایک بے چینی سی پھیلی ہوئی تھی... اور اُنہی راہداریوں میں مومِنہ اکیلی بھٹک رہی تھی۔ نہ اُس کے قدموں کو سکون تھا، نہ ذہن کو۔ کبھی وہ فارمیسی کی طرف جاتی، ہاتھ میں پرچی لیے... کبھی لیب کے باہر کھڑی رپورٹس کا انتظار کرتی... اور کبھی وارڈ کے دروازے کے سامنے کھڑی ہو کر اندر جھانکتی، جیسے ہر بار اپنے بابا کو دیکھ کر یقین کر لینا چاہتی ہو کہ وہ ابھی بھی وہیں ہیں۔

اُسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔

وہ بس کر رہی تھی۔

جیسے کوئی مشین... جسے صرف چلتے رہنا ہو۔

آنکھوں کے نیچے گہرے سائے پڑ چکے تھے۔ بال بکھرے ہوئے، چہرہ تھکن سے نڈھال... مگر اُس کے قدم رک نہیں رہے تھے۔ پچھلے کئی دنوں سے اُس نے ٹھیک سے نیند نہیں لی تھی، نہ ہی سکون سے کچھ کھایا تھا۔ اُس کے لیے اب صرف ایک ہی چیز باقی رہ گئی تھی

اس کے بابا۔

نسیمِ بی بی کو اُس نے خود گھر بھیج دیا تھا۔

"آپ جائیں ماما... میں بابا کو سنبھال لوں گی..." اُس نے زبردستی انہیں بھیجا تھا، حالانکہ اندر سے وہ خود ٹوٹ رہی تھی۔

اب وہ واقعی اکیلی تھی۔

ہر کام... ہر ذمہ داری... سب کچھ اُس کے کندھوں پر آچکا تھا۔

کون سی دوا کب دینی ہے... کون سی ڈرِپ لگنی ہے... کون سی رپورٹ کب آنی ہے... کس ڈاکٹر سے بات کرنی ہے...

وہ سب کچھ خود کر رہی تھی۔

کبھی وہ نرس سے کہتی: "یہ دوا ابھی دینی ہے نا؟"

کبھی فائل کھول کر خود چیک کرتی کہ اگلا ٹیسٹ کب ہے۔

کبھی دوڑتے ہوئے کہتی: "رپورٹ آ گئی میرے بابا کی؟ پلیز جلدی بتائیں"...

مگر اس سب کے بیچ...

وہ خود کہیں کھو گئی تھی۔

ایک لمحے کے لیے وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں دوا کی تھیلی تھی... مگر اُس کی نظر کہیں خالی جگہ پر جمی ہوئی تھی۔

سانسیں بھاری تھیں۔

آنکھیں جل رہی تھیں۔

لیکن آنسو بھی جیسے اب تھک چکے تھے۔

"مجھے کچھ نہیں ہونا... مجھے مضبوط رہنا ہے..." اُس نے خود سے آہستہ کہا، مگر اس کی آواز میں کمزوری صاف محسوس ہو رہی تھی۔

دور آپریشن تھیٹر کا دروازہ بند تھا۔

وہ دروازہ...

جس کے پیچھے اُس کی پوری دنیا تھی۔

مومِنہ نے آہستہ آہستہ قدم بڑھائے اور اُس دروازے کے سامنے آکر رک گئی۔

اس نے دیوار کو چھوا... جیسے اُس پار تک اپنے احساس پہنچانا چاہتی ہو۔

"بابا... میں یہاں ہوں..." اُس نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

وقت گزر رہا تھا...

مگر ہر منٹ ایک صدی لگ رہا تھا۔

اور مومِنہ...

اب بھی وہیں کھڑی تھی...

اکیلی...

تھکی ہوئی...

مگر ٹوٹی نہیں تھی

کیونکہ اُس کے پاس ٹوٹنے کا وقت ہی نہیں تھا۔

آخر کار جب وہ اپنے بابا کو دوا دے کر ایک لمحے کے لیے بیٹھی... تو اسے احساس ہوا کہ وہ کتنی تھک چکی ہے۔ ہاتھ ابھی بھی ہلکے ہلکے کانپ رہے تھے، اور سانسیں جیسے اب آہستہ آہستہ نارمل ہو رہی تھیں۔ کمرے میں ہلکی سی خاموشی تھی، بس مشینوں کی بیپ... بیپ... بیپ...

وہ کرسی پر بیٹھی... اور پہلی بار اس نے اپنا موبائل اٹھایا۔

اسکرین آن ہوئی... تو نوٹیفکیشنز کی ایک لمبی لائن سامنے آ گئی۔

کئی مسڈ کالز... اور بہت سارے میسجز۔

اُس کی نظریں آہستہ آہستہ ناموں پر پڑنے لگیں

ارمان...

سکندر...

فوزیہ آپی...

اور بھی کئی لوگ...

ایک لمحے کے لیے وہ ساکت رہ گئی۔

جیسے اُسے یاد ہی نہ رہا ہو کہ اس دنیا میں ہسپتال کے باہر بھی کچھ لوگ ہیں...

جو اُس کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔

اس نے آہستہ سے اسکرین کو سکرول کیا۔

ارمان کے میسجز بار بار آرہے تھے

"مومِنہ آپ ٹھیک ہیں؟"

"آپ ریپلائی کیوں نہیں کر رہیں؟"

"مجھے آپ کو دیکھنا ہے اپنی پک سینڈ کریں؟"

اس کے دل میں ایک ہلکی سی لہر اٹھی... مگر اس کے پاس جواب دینے کی طاقت نہیں تھی۔

پھر اس کی نظر سکندر کے نام پر رکی۔

چند میسجز... سادہ سے...

"آپ ٹھیک ہیں؟"

"ہسپتال میں ہیں؟"

"اپنا خیال رکھیں میں نے ادھر سب سنبھال لیا ہے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو آپ نے پوچھ لیا یہی کافی ہے"

مومِنہ نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

اتنے دنوں کے بعد بھی... سکندر نے صرف حال پوچھا تھا۔

نہ زیادہ سوال... نہ دباؤ... بس ایک سادہ سی فکر۔

مومِنہ نے ہلکے سے فون کو مضبوطی سے پکڑا... اور پہلی بار اُس نے سکندر کو ریپلائی کرنے کا سوچا۔

اس نے آہستہ آہستہ ٹائپ کیا

"میں ہسپتال میں ہوں... بابا کا آپریشن ہے... آپ ان کے لیے بھی دعا کرنا اور اللہ آپ کو بھی صبر دے"

چند لمحے اُس نے اس میسج کو دیکھا... جیسے خود کو ہمت دے رہی ہو۔

پھر اُس نے سینڈ کر دیا۔

میسج جاتے ہی وہ کچھ دیر اسکرین کو دیکھتی رہی...

اور جیسے ہی "seen" آیا...

اُس کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے تیز ہو گئی۔

اسی لمحے... سکندر کی طرف سے ٹائپنگ شروع ہو گئی...

مگر اس سے پہلے کہ جواب آئے

نرس نے آکر کہا:

"آپ کو ڈاکٹر بلا رہے ہیں۔"

مومِنہ فوراً چونک کر کھڑی ہو گئی۔

اس کا دل ایک دم زور سے دھڑکنے لگا۔

فون اُس کے ہاتھ میں ہی رہ گیا...

اور وہ تیزی سے ڈاکٹر کے کمرے کی طرف بڑھ گئی...

پیچھے موبائل اسکرین پر اب بھی "typing..." لکھا آرہا تھا

مگر مومِنہ کو نہیں معلوم تھا...

کہ اُس پیغام میں کیا لکھا جانے والا ہے... یا ڈاکٹر کیا خبر دینے والے ہیں...

آپریشن تھیٹر کے باہر وہ لمبے، بے رحم لمحے آخرکار ختم ہوئے۔

دروازہ کھلا... اور ڈاکٹر باہر آئے۔

مومِنہ کا دل جیسے سینے سے باہر آ جائے گا۔ وہ فوراً اُن کی طرف بڑھی، سانسیں تیز، آنکھوں میں خوف اور امید ایک ساتھ۔

"ڈاکٹر صاحب... بابا...؟"

ڈاکٹر کے چہرے پر ہلکی سی سنجیدگی تھی، مگر اس بار اُن کی آنکھوں میں پہلے جیسی تشویش نہیں تھی۔

"آپریشن کامیاب رہا ہے۔"

یہ سن کر جیسے مومِنہ کے اندر جمی ہوئی سانس ایک دم سے باہر نکلی۔

اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے... مگر اس بار یہ آنسو خوف کے نہیں تھے... بلکہ شکر کے تھے۔

"اللہ کا شکر ہے..." اُس نے آہستہ سے کہا، ہاتھ خود بخود دعا کے لیے اٹھ گئے۔

نسیمِ بی بی بھی جو اب واپس آچکی تھیں، روتے ہوئے سجدہ شکر میں جھک گئیں۔

مگر ڈاکٹر نے بات جاری رکھی:

"لیکن ابھی خطرہ مکمل طور پر ٹلا نہیں ہے۔ انہیں مکمل بیڈ ریسٹ پر رکھا جائے گا۔ اگلے چند دن بہت اہم ہیں۔"

مومِنہ نے فوراً سر ہلایا۔

"جی... ہم خیال رکھیں گے"...

"کوئی بھی لاپرواہی نہیں ہونی چاہیے۔ دوا وقت پر، آرام مکمل، اور ذہنی دباؤ بالکل نہیں دینا۔"

"جی ڈاکٹر صاحب..." اُس کی آواز میں اب ایک ذمہ داری تھی... اور ایک عزم بھی۔

کچھ دیر بعد جب مومِنہ کو اپنے بابا کو دیکھنے کی اجازت ملی، وہ آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہوئی۔

طارِق انور بیڈ پر لیٹے تھے، آنکھیں بند... مگر سانسیں اب پہلے سے بہتر اور پر سکون تھیں۔

مومِنہ اُن کے قریب آئی، آہستہ سے اُن کا ہاتھ تھاما۔

وہ ہاتھ اب بھی کمزور تھا... مگر زندہ تھا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو پھر بہنے لگے۔

"بابا... آپ ٹھیک ہو گئے..." اُس نے بہت آہستہ کہا، جیسے آواز بھی انہیں تکلیف نہ دے۔

چند لمحے بعد تارِق انور نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔

نظر دھندلی تھی... مگر جیسے ہی اُن کی نظر مومِنہ پر پڑی، اُن کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"مومِنہ"...

یہ لفظ بہت آہستہ نکلا... مگر مومِنہ کے لیے سب کچھ تھا۔

وہ فوراً جھک گئی، اُن کا ہاتھ اپنے ماتھے سے لگا لیا۔

"میں یہاں ہوں بابا... میں کہیں نہیں گئی"...

کمرے میں ایک عجیب سا سکون پھیل گیا۔

وہ سکون... جو طوفان کے بعد آتا ہے۔

مگر اس سکون کے پیچھے ایک احتیاط بھی تھی...

کیونکہ جنگ جیتی ضرور گئی تھی...

لیکن مکمل فتح ابھی باقی تھی۔

بارہ فروری کا دن تھا۔ ہسپتال کے کمرے میں اب پہلے جیسی گھبراہٹ نہیں تھی، مگر تھکن اور خاموشی اب بھی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ دیواروں کی سفیدی آنکھوں کو چبھنے لگی تھی، اور مشینوں کی مسلسل بیپ ایک عجیب سی بے چینی پیدا کر رہی تھی۔ مومِنہ اپنے بابا کے پاس بیٹھی تھی، اُن کی دوائیں اور رپورٹیں ایک طرف رکھے ہوئے... اور کبھی کبھار اُن کی سانسوں کو غور سے دیکھ لیتی، جیسے اب بھی دل مکمل طور پر مطمئن نہ ہوا ہو۔ وہ ہر سانس

کے ساتھ ایک چھوٹی سی دعا مانگتی... اور ہر سانس کے بعد ایک لمحہ رک کر خود کو تسلی دیتی کہ سب ٹھیک ہے۔

اُس کے ہاتھ اب بھی ہلکے ہلکے کانپ رہے تھے، نیند کی کمی اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سائے... مگر نظر میں اب بھی ایک چوکنا پن، جیسے وہ ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہونا چاہتی۔

اُسی وقت اُس کے فون کی اسکرین روشن ہوئی۔

فوزیہ آپی کی کال تھی۔

مومِنہ نے فوراً فون اٹھایا، جیسے اسے کسی اپنے کی آواز کی شدت سے ضرورت ہو۔

"اسلام علیکم آپی"...

دوسری طرف سے فوزیہ کی نرم، میٹھی آواز آئی، جس میں ایک خاص سی شفقت تھی:

"وعلیکم السلام مومِنہ... کیسی ہو تم؟ اور انکل اب کیسے ہیں؟"

یہ لہجہ سن کر مومِنہ کے اندر جیسے ایک سکون سا اتر گیا۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے مسلسل تناؤ میں تھی، اور یہ پہلی آواز تھی جس میں خالص فکر اور نرمی تھی۔ اس کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے بند ہو گئیں... جیسے وہ اس سکون کو محسوس کرنا چاہتی ہو۔

"الحمدللہ آپی... اب بہتر ہیں۔ آپریشن کامیاب ہو گیا ہے... بس ابھی بیڈ ریسٹ پر ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی آواز میں ایک ہلکی سی تھکن اور شکر دونوں شامل تھے۔

فوزیہ نے فوراً کہا:

"اللہ کا بہت شکر ہے... اللہ انہیں مکمل صحت دے۔ تم نے بہت ہمت کی ہے مومِنہ۔"

یہ سنتے ہی مومِنہ کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی آ گئی۔ کسی نے پہلی بار اس کی محنت اور برداشت کو محسوس کیا تھا۔

"بس آپی... اللہ نے آسانی کر دی"...

اس نے نظریں جھکا لیں، جیسے وہ اپنے جذبات چھپانا چاہتی ہو۔

فوزیہ نے نرمی سے کہا:

"اپنا بھی خیال رکھو... تمہاری آواز سے لگ رہا ہے تم بہت تھک گئی ہو۔"

مومِنہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

"ہاں... تھوڑی سی"...

مگر یہ "تھوڑی سی" دراصل بہت زیادہ تھی۔ وہ اندر سے ٹوٹنے کے قریب تھی، مگر خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔

کچھ لمحے دونوں خاموش رہیں... مگر یہ خاموشی بھی عجیب طرح کی پُرسکون تھی۔ جیسے دونوں ایک دوسرے کی کیفیت کو بغیر الفاظ کے سمجھ رہی ہوں۔

پھر فوزیہ نے اچانک کہا:

"مومِنہ... ایک بات کہوں؟"

مومِنہ تھوڑی سی سیدھی ہو کر بیٹھی، جیسے وہ خود کو سنبھال رہی ہو۔

"جی آپی؟"

"تم چودہ فروری کو یونیورسٹی آجانا۔"

مومِنہ تھوڑی سی چونک گئی۔ اُس کے چہرے پر ہلکی سی حیرانی آگئی، جیسے یہ بات اس وقت غیر متوقع ہو۔

"چودہ فروری...؟ کیوں آپی؟"

فوزیہ ہلکا سا مسکرائیں، اُن کی آواز میں وہی مٹھاس تھی:

"بس ایسے ہی... آ کر مل لینا۔ بہت دن ہو گئے ہیں... میں تمہیں مس کر رہی ہوں۔"

یہ سن کر مومِنہ کچھ لمحے کے لیے خاموش ہو گئی۔ اُس کے ذہن میں کئی سوال ایک ساتھ آئے اتنے دنوں بعد اچانک کیوں؟ ابھی؟ اس وقت؟

مگر فوزیہ کے لہجے میں ایسی نرمی اور اپنائیت تھی کہ وہ زیادہ پوچھ نہ سکی۔ اُس نے ایک نظر اپنے بابا کی طرف ڈالی... جیسے اجازت لے رہی ہو، یا شاید خود کو یقین دلا رہی ہو کہ وہ جا سکتی ہے۔

"ٹھیک ہے آپی... میں آجاؤں گی۔"

فوزیہ نے اطمینان سے کہا:

"گڈ... اپنا خیال رکھنا، اور انکل کو میری طرف سے سلام کہنا۔"

"جی ضرور۔"

کال ختم ہو گئی۔

مومِنہ نے آہستہ سے فون نیچے رکھا... اور چند لمحوں کے لیے خاموش بیٹھی رہی۔ اُس کی نظریں خالی سی ہو گئیں، جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی ہو۔

کمرے میں پھر وہی مشینوں کی بیپ سنائی دینے لگی... اور بابا کی پر سکون سانسیں۔

اُس کے دل میں ایک ہلکی سی حیرانی تھی...

اور ساتھ ہی ایک انجانی سی سوچ

۱۴ فروری کو آخر ایسا کیا ہونے والا ہے...؟

اُس نے آہستہ سے اپنے بابا کا ہاتھ تھاما... اور دل ہی دل میں ایک اور دعا مانگی

"یا اللہ... جو بھی ہو... آسانی سے ہو"...

مومِنہ اتنی زیادہ اپنے حالات اور اپنے بابا کی فکر میں کھو چکی تھی کہ اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ چودہ فروری آخر ہوتا کیا ہے۔ اُس کے لیے تو اب ہر دن بس ایک جیسا تھا ہسپتال، دعائیں، اور بے چینی۔

حالانکہ ۱۴ فروری کو دنیا بھر میں ایک خاص دن کے طور پر جانا جاتا ہے، جسے ویلنٹائن ڈے کہا جاتا ہے۔ یہ دن عموماً محبت کے اظہار کے نام پر منایا جاتا ہے خاص طور پر لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کو تحفے دیتے ہیں، ملتے ہیں، اور اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے اور خاص طور پر اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس دن کو جس انداز میں منایا جاتا ہے، اُس میں اکثر حدود پار کی جاتی ہیں۔ بغیر نکاح کے تعلقات، جذباتی وابستگیاں، اور ایسے رشتے جن کی کوئی شرعی بنیاد نہیں ہوتی یہ سب چیزیں عام ہو جاتی ہیں، جو کہ اسلام میں جائز نہیں ہیں۔ محبت خود کوئی غلط چیز نہیں، مگر اُس کا طریقہ اور حد بہت اہم ہے۔

آج کل سوشل میڈیا خاص طور پر انسٹاگرام اور ٹک ٹاک پر اس دن کو ایک فیشن بنا دیا گیا ہے۔ خوبصورت ویڈیوز، رومانٹک سینز، گفٹس، سرپرائزز... یہ

سب چیزیں اس طرح دکھائی جاتی ہیں جیسے یہی اصل خوشی ہو۔ نوجوان نسل ان ویڈیوز سے متاثر ہو کر اکثر بغیر سوچے سمجھے ایسے راستوں پر چل پڑتی ہے جو بعد میں پچھتاوے کا باعث بنتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب وقتی جذبات ہوتے ہیں، جو انسان کو حقیقت سے دور لے جاتے ہیں۔ اسلام میں رشتوں کی خوبصورتی نکاح میں ہے، عزت میں ہے، اور ذمہ داری میں ہے نہ کہ چھپ کر کیے گئے تعلقات میں۔

مومِنہ کو ان سب چیزوں کا شاید اس وقت اندازہ بھی نہیں تھا...

وہ بس یہ سوچ رہی تھی کہ ۱۴ فروری کو یونیورسٹی جا کر فوزیہ آپی سے ملنا ہے

مگر وہ نہیں جانتی تھی...

کہ اُس دن کا ماحول، لوگوں کا رویہ، اور کچھ فیصلے...

اُس کی زندگی کا رخ بھی بدل سکتے ہیں۔

آخر کار ۱۴ فروری کا دن آ گیا۔

مومِنہ کئی دنوں بعد یونیورسٹی پہنچی تھی۔ گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی ایک عجیب سا احساس اُس کے دل میں آیا جیسے وہ کسی اور دنیا میں آ گئی ہو۔ ہسپتال کی خاموش، سنجیدہ فضا کے بعد یہاں ہر طرف رنگ، شور اور بے فکری تھی۔ کچھ لڑکیاں ہاتھوں میں گلاب لیے گھوم رہی تھیں، کہیں قہقہے گونج رہے تھے، اور ہر طرف ایک غیر معمولی ہلچل تھی۔

مگر مومِنہ کے اندر کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔

وہی تھکن… وہی خاموشی… وہی اندر کا بوجھ۔

اُس نے آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، جیسے کسی خاص چہرے کو تلاش کر رہی ہو۔

"فوزیہ آپی کہاں ہیں…؟" اُس نے دل ہی دل میں سوچا۔

کچھ لمحے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اُس نے فون نکالا اور کال ملائی۔

"آپی… میں یونیورسٹی آ گئی ہوں… آپ کہاں ہیں؟"

دوسری طرف سے فوزیہ کی پر سکون آواز آئی:

"اوپر آ جاؤ… میں وہیں ہوں۔"

"اوپر...؟" مومِنہ نے ایک لمحہ رُک کر دہرایا، مگر پھر آہستہ سے "ٹھیک ہے" کہہ کر کال بند کر دی۔

اُس نے گہری سانس لی... اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

ہر قدم کے ساتھ اُس کا دل ہلکا سا دھڑک رہا تھا نہ جانے کیوں۔

وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ہر قدم تھکا ہوا، مگر پُر ارادہ۔

راستے میں ارد گرد کی آوازیں واضح ہونے لگیں۔

"وہ آج مجھے سرپرائز دینے والا ہے..." ایک لڑکی ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میرا تو پہلے ہی گفٹ آگیا ہے..." دوسری نے فخر سے جواب دیا۔

"آج تو سب باہر جا رہے ہیں..." کسی نے خوشی سے کہا۔

یہ سب سن کر مومِنہ کے قدم ایک لمحے کو سست پڑ گئے۔

اُس نے ایک نظر اُن لڑکیوں کی طرف دیکھا... پھر فوراً اپنی نظریں ہٹا لیں۔

اس کے چہرے پر نہ کوئی دلچسپی تھی... نہ کوئی حسرت۔

بس ایک خاموشی تھی۔

وہ سب باتیں اُس کے لیے اجنبی تھیں... جیسے کسی اور کی زندگی ہو۔

"لوگ کیسے اتنے بے فکر ہو سکتے ہیں...؟" ایک لمحے کے لیے یہ سوال اُس کے دل میں آیا... مگر اُس نے فوراً خود کو روکا۔

"مجھے اس سب سے کیا"...

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی... اُن سب باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے۔

سیڑھیاں ختم ہونے کو تھیں... اور اُس کا دل اب پہلے سے زیادہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

اوپر پہنچ کر اُس نے ایک لمحے کے لیے رُک کر سانس لی...

اور پھر نظریں اُٹھا کر آگے دیکھا

وہ نہیں جانتی تھی...

کہ اُس سیڑھی کے اوپر...

صرف فوزیہ آپی نہیں...

بلکہ اُس کے لیے ایک ایسا لمحہ انتظار کر رہا ہے...

جو شاید اُس کی زندگی کی سمت بدل دے۔

پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی... اُس کے قدموں میں ہلکی سی جھجک تھی، جیسے دل ابھی تک کسی انجانے احساس میں گرفتار ہو۔ راہداری سے گزرتے ہوئے اُس نے ایک کلاس کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ دروازہ آدھا کھلا تھا، اندر سے ہلکی سی آوازیں آ رہی تھیں۔

جیسے ہی وہ اندر داخل ہونے لگی...

اُس کی نظر سامنے پڑی

فوزیہ آپی وہیں کھڑی تھیں۔

سادگی میں بھی ایک وقار تھا اُن کے انداز میں۔ جیسے وہ ہمیشہ کی طرح پُرسکون اور مطمئن ہوں۔ اُنہیں دیکھتے ہی مومِنہ کے دل پر جیسے ایک ہلکا سا بوجھ کم ہوا۔

ایک لمحے کے لیے...

مومِنہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

وہ مسکراہٹ جو پچھلے کئی دنوں سے کہیں کھو گئی تھی۔

فوزیہ نے بھی اُسے دیکھ لیا تھا۔ اُن کی آنکھوں میں ایک نرم سی چمک آئی... جیسے وہ واقعی اُس کا انتظار کر رہی ہوں۔

مومِنہ آہستہ آہستہ اُن کی طرف بڑھنے لگی۔

ہر قدم کے ساتھ اُس کے دل کی دھڑکن تھوڑی تیز ہو رہی تھی نہ جانے کیوں۔

کمرے کا ماحول باقی یونیورسٹی سے مختلف تھا... یہاں ایک عجیب سی سنجیدگی تھی، جیسے کچھ ہونے والا ہو... یا شاید کچھ پہلے ہی طے ہو چکا ہو۔

مومِنہ اُن کے قریب پہنچی...

"آپی"...

اُس کی آواز میں ہلکی سی تھکن تھی، مگر ایک سکون بھی۔

فوزیہ نے اُسے غور سے دیکھا... جیسے اُس کے چہرے پر لکھی ہر کہانی پڑھ رہی ہوں۔

"کیسی ہو مومِنہ؟"

یہ سوال سادہ تھا... مگر اُس کے پیچھے فکر چھپی ہوئی تھی۔

مومِنہ نے ہلکی سی سانس لی...

"ٹھیک ہوں"...

مگر دونوں جانتی تھیں

یہ "ٹھیک" مکمل سچ نہیں تھا۔

فوزیہ نے آہستہ سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا... ایک لمحے کے لیے خاموش رہیں... پھر نرمی سے بولیں:

"آؤ... بیٹھتے ہیں... مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

یہ سنتے ہی مومِنہ کے دل میں ہلکی سی بے چینی جاگی۔

"بات...؟ کیسی بات...؟"

مگر اُس نے کچھ کہا نہیں۔

وہ خاموشی سے اُن کے ساتھ چلنے لگی...

اُسے اندازہ نہیں تھا...

تبھی کسی نے آہستہ سے کہا، "مومنہ جی..." مومنہ نے چونک کر پلٹ کر دیکھا۔ سامنے ارمان کھڑا تھا ایک ہاتھ میں تازہ پھولوں کا گلدستہ اور

دوسرے میں ایک خوبصورت سا کیک تھا، جس پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ کلاس کے تمام لڑکے اور لڑکیاں اس کے ارد گرد اکٹھے ہو چکے تھے، جیسے کسی خاص لمحے کا انتظار ہو۔ مومنہ کے لیے یہ سب ایک الجھی ہوئی گتھی بن گیا، اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب آخر ہو کیا رہا ہے۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"ارمان... یہ سب کیا ہے؟" اس نے ہلکی مگر الجھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

ارمان نے گہری سانس لی، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی سنجیدگی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا، اور پھر اچانک سب کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ پوری کلاس میں خاموشی چھا گئی، جیسے وقت تھم گیا ہو۔

"مومنہ جی..." ارمان کی آواز نرم مگر بھاری تھی، "میں جانتا ہوں شاید آپ حیران ہوں... لیکن میں آپ سے بہت عرصے سے کچھ کہنا چاہتا تھا... اور آج میں مزید چھپانا نہیں چاہتا۔" اس نے ایک لمحہ لیا، پھر کہا، "میں آپ سے محبت کرتا ہوں... اور میں چاہتا ہوں کہ آپ میری زندگی کا حصہ بنو... ہمیشہ کے لیے۔"

یہ سنتے ہی کلاس میں ہلکی سی سرگوشی پھیل گئی۔ شاشا ہویر نے کہا، "واہ... "تو دانیال کے چہرے پر حیرت کے ساتھ مسکراہٹ بھی آ گئی۔ وہ دونوں بھی وہی تھے سوائے سکندر کے مگر مومنہ کے چہرے پر حیرت، الجھن اور دباؤ سب کچھ ایک ساتھ جھلکنے لگا۔

وہ پیچھے ہٹی، جیسے اس سب سے خود کو بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔ "ارمان... آپ یہ کیا کر رہے ہو؟ سب کے سامنے... میں..." اس کی آواز کانپنے لگی، اس کی نظریں زمین پر جم گئیں۔ اس کے اندر ایک عجیب سا طوفان برپا تھا ایک طرف اس کی اپنی الجھن، اور دوسری طرف کلاس کا دباؤ، سب کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

ارمان نے آہستہ سے مسکرا کر کہا، "مجھے جواب ابھی نہیں چاہیے... بس آپ کو بتانا تھا کہ میں آپ کو کتنا چاہتا ہوں۔"

مگر مومنہ کے دل میں کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ اسے اپنے اندر ایک عجیب سا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس لمحے سب اس کی طرف دیکھ رہے ہیں، سب ایک جواب کے منتظر ہیں۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ کچھ اور

چاہتی ہے... مگر اس دباؤ، اس بھیڑ، ان نظریں کے سامنے وہ خود کو کمزور محسوس کر رہی تھی۔

"مومنہ جی..." ارمان نے آہستہ سے کہا، جیسے اس کے جواب کی امید ہو۔

مومنہ نے آنکھیں بند کرلیں، اس کی پلکوں پر آنسو ٹھہر گئے۔ ایک لمحے کے لیے سب کچھ خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے گہری سانس لی، اور آہستہ آہستہ بولی،

"ارمان... میں... مجھے سمجھ نہیں آرہا... لیکن..." وہ رک گئی، کلاس کی نظریں اس پر بھاری ہو رہی تھیں۔ اس نے ارمان کو کہا بھی تھا کہ ہمیں اس سب کو راز رکھنا ہے اور نہ ہی وہ کوئی ریلیشن شپ چاہتی تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا تیر کمان سے نکل چکا تھا پوری کلاس نے یہ سب دیکھ لیا تھا "شاید... شاید میں بھی تمہیں بہتر طور پر جاننے کی کوشش کر سکتی ہوں"...

یہ سنتے ہی کلاس میں ایک ہلکی سی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ رمشاہ اور زینب گل نے خوشی سے سرگوشی کی، "اوہ ہو..." اور ارمان کے چہرے پر ایک امید بھری مسکراہٹ آگئی۔

ارمان نے کھڑے ہو کر کیک آگے کیا، اور نرمی سے کہا، "تو پھر... یہ شروع ہو سکتا ہے؟"

مومنہ نے آہستہ سے سر ہلایا۔ اس کا دل ابھی بھی الجھا ہوا تھا، مگر اس نے اس لمحے کو قبول کر لیا شاید دباؤ میں، شاید الجھن میں، مگر اس نے ہاں کہہ دی۔

اور اس لمحے کلاس کے سب لوگ خوشی سے شور مچانے لگے، مگر مومنہ کے دل میں ایک خاموش سا خوف اور بے یقینی اب بھی باقی تھی جیسے وہ جانتی ہو کہ یہ فیصلہ آسان نہیں ہو گا... اور آنے والے دن اس کے لیے کچھ اور ہی کہانی لکھنے والے ہیں۔

مومنہ تیزی سے کلاس سے باہر نکلی

ارمان نے اسے روکنا چاہا: "مومنہ جی کہاں جا رہی ہیں؟"

مگر فوزیہ آپی نے اسے روک دیا اور کہا: " جانے دو! اسے اکیلا وقت چاہیے۔"

اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ وہ راہداری میں بے ترتیب قدموں سے چلتی رہی، پھر کھڑکی کے پاس آکر ٹھنڈی ہوا میں گہری سانس لی، مگر دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوا۔ کچھ ہی لمحوں بعد نادیہ سامنے آتی دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر بھی پریشانی صاف جھلک رہی تھی، آنکھوں میں بے چینی اور قدموں میں بے قراری۔

نادیہ نے مومنہ کو دیکھتے ہی فوراً کہا،

"مومنہ! تم کہاں چلی؟ میں تمہیں ڈھونڈ رہی تھی... تم ٹھیک تو ہو نا؟ اور تمہارے بابا کیسے ہیں؟"

پھر اس نے قریب آکر نرم مگر فکر مند لہجے میں پوچھا،

"اور سکندر... اس سے بھی میری بات نہیں ہو پا رہی... اس کا فون بند آرہا ہے... وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

مومنہ نے ایک لمحے کے لیے نادیہ کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے نظریں جھکا لیں۔

"نادیہ... کبھی کبھی سب کچھ ٹھیک ہونے کے باوجود بھی کچھ نہ کچھ ٹوٹا ہوا محسوس ہوتا ہے..." اس نے ایک ہلکی سی سانس لی، "اور انسان اپنے ہی دکھ میں دوسروں کی آوازیں سننا بھی بھول جاتا ہے...ویسے اللہ کا شکر ہے میرے بابا ٹھیک ہیں"

نادیہ خاموش ہو گئی، پھر کچھ لمحوں بعد آہستہ سے بولی،

"ماشاءاللہ جان کر بہت خوشی ہوئی ویسے تم ٹھیک کہہ رہی ہو... لیکن سکندر... وہ آخر کدھر غائب ہو گیا ہے؟"

اس کی آواز میں بے چینی صاف تھی، "میں نے اسے کئی بار میسج کیا، کال کی... کوئی جواب نہیں... مجھے بہت فکر ہو رہی ہے"...

مومنہ نے اس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں ہمدردی بھی تھی اور درد بھی۔

"کبھی کبھی ہم جسے ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں... وہ خود کہیں کھویا ہوتا ہے..." اس نے آہستہ سے کہا۔

نادیہ نے بے بسی سے سر جھکا لیا، پھر اچانک پوچھا،

"مومنہ... تمہیں کچھ معلوم ہے نا؟ تم کچھ چھپا رہی ہو؟ پلیز مجھے بتاؤ... میں مزید انتظار نہیں کر سکتی"...

مومنہ نے گہری سانس لی، اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ کچھ لمحے خاموش رہی، جیسے الفاظ تلاش کر رہی ہو...

پھر دھیرے سے بولی،

"نادیہ... 2 فروری کو... سکندر کے بابا... کی ڈیتھ ہو گی"...

—

30 جنوری کی سرد دوپہر تھی۔ یونیورسٹی کے لان میں ہلکی دھوپ پھیلی ہوئی تھی، مگر اس سکون کے پیچھے کچھ ان دیکھا تناؤ بھی موجود تھا۔ سکندر ایک بینچ پر اکیلا بیٹھا تھا، جیسے اپنے ہی خیالوں میں گم ہو۔ اسی دوران ثاقب اور ذیشان نے اسے دور سے دیکھا۔ دونوں کے چہروں پر ایک عجیب سی

مسکراہٹ آئی وہ مسکراہٹ جو دوستی سے زیادہ کسی اور ارادے کی نشاندہی کر رہی تھی۔

"آج تو خود ہی اکیلا بیٹھا ہے..." ثاقب نے آہستہ سے ذیشان کے کان میں کہا۔

ذیشان نے ہلکا سا سر ہلایا، "موقع اچھا ہے... چل دیکھتے ہیں"...

وہ دونوں آہستہ آہستہ سکندر کی طرف بڑھے۔

"او سکندر!" ثاقب نے آواز لگائی، جیسے بہت اپنا پن ہو، "کیا حال ہے؟ بڑے دنوں بعد اکیلے نظر آئے ہو"...

سکندر نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ ان دونوں کی حقیقت سے ناواقف نہیں تھا۔ ان کے درمیان پہلے بھی کئی بار تلخی ہو چکی تھی۔ اس نے ہلکے سے جواب دیا،

"ٹھیک ہوں... تم لوگ سناؤ"...

ذیشان اس کے ساتھ بیٹھ گیا،

"یار آج کل تو تم بڑے مصروف لگتے ہو... ہمیں تو بھول ہی گئے ہو"...

اس کے لہجے میں ہلکی سی چبھن تھی، جو عام آدمی شاید محسوس نہ کر پاتا، مگر سکندر نے محسوس کرلی۔

سکندر نے سیدھا سا جواب دیا،

"ایسی کوئی بات نہیں"...

ثاقب نے فوراً بات بدلی،

"چلو چھوڑو یہ سب... آج ایک پارٹی ہے... زبردست ماحول ہو گا... سب جا رہے ہیں... تم بھی چل رہے ہو ہمارے ساتھ"...

سکندر نے فوراً انکار کیا،

"نہیں... میرا موڈ نہیں ہے"...

ذیشان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر ہنستے ہوئے بولا،

"یار موڈ کا کیا ہے... بن جائے گا... یا پھر ڈر لگ رہا ہے؟"

یہ سن کر سکندر کی آنکھوں میں ہلکی سی سختی آگئی،

"ڈر؟ مجھے؟ نہیں... بس دل نہیں چاہ رہا"...

ثاقب تھوڑا جھکا اور دھیرے سے بولا،

"دیکھو سکندر... کبھی کبھی باہر نکلنا بھی ضروری ہوتا ہے... یا پھر تم ہمیشہ ایسے ہی اکیلے بیٹھے رہنا چاہتے ہو...؟"

یہ جملہ سیدھا سکندر کے غرور پر لگا۔ وہ کچھ لمحے خاموش رہا، جیسے سوچ رہا ہو کہ یہ دونوں کیا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اسے ان پر مکمل بھروسہ نہیں تھا، مگر انکار بھی اب اسے کمزوری لگ رہا تھا۔

آخر کار اس نے گہری سانس لی اور کہا،

"ٹھیک ہے... آجاؤں گا"...

ثاقب اور ذیشان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ان کی آنکھوں میں ایک خاموش سی کامیابی جھلک رہی تھی۔

"بس یہی تو سننا تھا..." ذیشان نے مسکرا کر کہا۔

سکندر اٹھا اور تھوڑا دور جا کر فون ملایا۔

"ماما..." اس نے آہستہ سے کہا، "آج میں تھوڑا لیٹ آؤں گا... دوستوں کے ساتھ ایک پارٹی میں جا رہا ہوں"...

دوسری طرف سے سلمیٰ جٹ کی فکر مند آواز آئی،

"بیٹا، زیادہ دیر نہ کرنا... اور اپنا خیال رکھنا"...

"جی ماما..." سکندر نے مختصر جواب دیا۔

کال ختم کر کے اس نے ایک لمحے کے لیے پیچھے مڑ کر ثاقب اور ذیشان کو دیکھا وہ دونوں اب بھی ایک دوسرے سے کچھ سرگوشی کر رہے تھے... اور ان کے چہروں پر وہی پراسرار مسکراہٹ تھی۔

سکندر نے نظریں ہٹا لیں... مگر اس کے دل میں ایک عجیب سا خدشہ پیدا ہو چکا تھا

جیسے وہ جانتا ہو... کہ یہ دعوت صرف ایک پارٹی کی نہیں... بلکہ کسی اور کھیل کی شروعات ہے۔

ثاقب اور ذیشان سکندر سے تھوڑا فاصلے پر کھڑے تھے، مگر ان کی نظریں مسلسل اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ سکندر نادیہ کے ساتھ بات کرتے ہوئے کہیں اور مصروف تھا جیسے آج کل اسے ارد گرد کی فضا کا کوئی اندازہ ہی نہ ہو۔

ثاقب نے ہلکی سی طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا،

"آج کل یہ نادیہ کے ساتھ پھر رہا ہے"...

ذیشان نے بھی مسکرا کر سر ہلایا،

"ہاں یار... اور دیکھو تو سہی انداز اس کے... جیسے کوئی ہیرو ہو"...

ثاقب نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے کہا،

"ان جناب کا سارا شوخا پن وہیں نکلے گا... زیادہ ہی اوور ہو تا ہے"...

ذیشان نے ذرا جھک کر دھیرے سے کہا،

"اور سب لڑکیوں کو اپنے پیچھے پاگل کیا ہوا ہے... جیسے کوئی خاص چیز ہو"...

ثاقب نے دانت بھینچتے ہوئے ہلکی آواز میں کہا،

"بس اب بہت ہو گیا... اب اس کی عقل ٹھکانے آئے گی"...

ذیشان نے اس کی طرف دیکھا، آنکھوں میں ایک عجیب سا ارادہ تھا،

"آج رات... پارٹی میں... سب سمجھ آجائے گا اسے"...

دونوں ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے، پھر آہستہ سے مسکرا دیے وہ مسکراہٹ جو کسی سیدھے منصوبے کی نہیں، بلکہ کسی چھپے ہوئے کھیل کی نشانی تھی۔

دور کھڑا اسکندر ان سب سے بے خبر تھا... وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے بارے میں صرف باتیں نہیں ہو رہیں... بلکہ اس کے لیے کچھ طے بھی کیا جا چکا ہے... اور شاید وہ خود چل کر اسی جال میں قدم رکھنے والا ہے...

واپس آ کر سکندر نے ایک نظر دونوں پر ڈالی، جیسے ان کے چہروں سے کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو، پھر ہلکے سے مسکرا کر بولا،

"چلو بھائیو... چلیں پھر؟"

ثاقب نے فوراً کہا،

"ہاں کیوں نہیں... بس تمہارا ہی انتظار تھا"...

ذیشان نے بھی سر ہلایا، مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی،

"آج مزہ آئے گا"...

تینوں ایک ہی بائیک پر سوار ہو گئے۔ ثاقب آگے، اور پیچھے سکندر اور ذیشان۔ انجن کی آواز کے ساتھ وہ یونیورسٹی کے گیٹ سے باہر نکلے۔ پیچھے سے باقی لڑکے بھی اپنی اپنی بائیکس پر ان کے ساتھ شامل ہونے لگے، جیسے

کوئی قافلہ بن گیا ہو۔ سڑک پر بائیکس کی قطار تھی، ہنسی مذاق کی آوازیں، مگر اس سب کے بیچ ایک خاموش سا تناؤ بھی موجود تھا۔

چلتے چلتے سکندر نے ایک لمحے کے لیے ریئر ویو مرر میں پیچھے دیکھا سب کے چہرے دھندلے سے لگ رہے تھے، مگر کچھ نظریں ایسی تھیں جو اس پر جمی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس کے دل میں اچانک ایک عجیب سا احساس پیدا ہوا... جیسے کچھ ٹھیک نہیں ہے۔

اس نے ہلکا سا سر جھٹکا اور خود سے ہی کہا،

"فضول سوچ رہا ہوں... سب ٹھیک ہے"...

آگے بیٹھا ثاقب آہستہ سے ذیشان کے قریب ہوا اور دھیمی آواز میں بولا،

"بس تھوڑا سا اور... پھر دیکھتے ہیں"...

ذیشان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا،

"ہاں... آج اسے سب سمجھ آجائے گا"...

ہوا تیز چل رہی تھی، بائیک رفتار پکڑ رہی تھی... اور سکندر ان سب باتوں سے بے خبر آگے بڑھ رہا تھا۔

مگر اس کے دل کی بے چینی کم ہونے کے بجائے اور بڑھتی جا رہی تھی...

جیسے کوئی انجانا خطرہ اس کے قریب آ رہا ہو اور وہ خود اس کی طرف جا رہا ہو...

آخر کار اتنا لمبا سفر کرنے کے بعد سب لوگ اُس جگہ پہنچ گئے جہاں انہیں ہونا تھا۔ وہ ایک وسیع سا فارم ہاؤس تھا، باہر سے تو عام لگ رہا تھا مگر اندر سے روشنیوں اور شور سے جگمگا رہا تھا۔ دور سے ہی تیز میوزک کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ڈسکو گانے، قہقہے، اور ہنسی کی ملی جلی آوازیں۔ کئی بائیکس ایک کے بعد ایک رُکیں، اور سب لڑکے اتر کر اندر کی طرف بڑھنے لگے۔

سکندر نے بائیک سے اتر کر ایک لمحے کے لیے ارد گرد دیکھا۔ اس کے دل میں ایک عجیب سی ہچکچاہٹ تھی، جیسے قدم آگے بڑھانے سے پہلے وہ کچھ سوچ رہا ہو۔

"چلو سکندر..." ثاقب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، "اب آ ہی گئے ہو تو اندر بھی آ جاؤ"...

ذیشان نے ہنستے ہوئے کہا،

"ڈر تو نہیں لگ رہا؟"

سکندر نے ہلکی سی نظر ان دونوں پر ڈالی،

"ڈرنے والی کوئی بات نہیں"...

مگر اس کے لہجے میں وہ اعتماد نہیں تھا جو الفاظ ظاہر کر رہے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا اور پھر اندر داخل ہو گیا...

اندر کا منظر دیکھ کر وہ جیسے ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔

تیز روشنیوں کے نیچے لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ ناچ رہے تھے، بلند آواز میں میوزک گونج رہا تھا۔ وہی لوگ... وہی چہرے... جو یونیورسٹی میں اس کے سامنے بڑے دین دار بنتے تھے، یہاں بالکل مختلف تھے۔ کچھ لڑکے قہقہے لگا رہے تھے، کچھ لڑکیوں کے ساتھ بے تکلفی سے قریب کھڑے تھے۔

سکندر کی نظریں ایک طرف جم گئیں چند لڑکیاں جو یونیورسٹی میں ہمیشہ برقعہ اور پردے میں نظر آتی تھیں، یہاں بغیر کسی جھجھک کے لڑکوں کے

ساتھ ہنسی مذاق میں مصروف تھیں، کچھ تو ان کے کندھوں سے لگی ہوئی تھیں۔

سکندر نے بے یقینی سے آہستہ سے کہا،

"یہ... یہ وہی لوگ ہیں...؟"

اس کے اندر ایک عجیب سا جھٹکا لگا، جیسے اس کا کوئی یقین ٹوٹ گیا ہو۔

"یہ سب... یونیورسٹی میں کچھ اور ہوتے ہیں... اور یہاں..." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

پیچھے کھڑے ثاقب نے ہنستے ہوئے کہا،

"یار... دنیا ایسی ہی ہے... سب کے دو چہرے ہوتے ہیں"...

ذیشان نے بھی طنزیہ انداز میں کہا،

"اور تم بھی آج دیکھ لو اصل چہرے"...

سکندر خاموش کھڑا رہا، اس کی نظریں اب بھی اس ہجوم پر جمی ہوئی تھیں۔

اس کے دل میں حیرت بھی تھی... بے چینی بھی... اور کہیں نہ کہیں ایک ٹوٹتا ہوا اعتماد بھی۔

مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا... کہ یہ سب صرف ایک آغاز ہے...

اصل کھیل ابھی شروع ہونا باقی تھا...

تبھی ثاقب نے اس کے قریب آکر ہنستے ہوئے کہا،

"آؤ سکندر... کچھ پی لو... ماحول تب ہی سیٹ ہوتا ہے"...

سکندر نے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا، پھر آہستہ آہستہ ڈرنکس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے قدموں میں ہچکچاہٹ تھی، جیسے دل اب بھی اسے روک رہا ہو۔ جیسے ہی وہ میز کے قریب پہنچا، اس کی نظر بوتلوں پر پڑی... اور وہ ایک دم چونک گیا۔

"یہ... شراب ہے...؟" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

اس کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رک گئے۔ اس نے اردگرد دیکھا ہر طرف لڑکے اور لڑکیاں ہنستے ہوئے گلاس اٹھا رہے تھے، جیسے یہ کوئی عام سی چیز ہو... کوئی جھجھک نہیں، کوئی خوف نہیں... جیسے سب کچھ معمول کا حصہ ہو۔

ایک لڑکا ہنستے ہوئے بولا،

"یار گلاس خالی کیوں ہے؟ بھرو اسے"!

دوسری طرف سے آواز آئی،

"آج تو کھل کے پیو... کوئی دیکھنے والا نہیں"...

سکندر یہ سب دیکھ کر مزید حیران ہو گیا۔

"یہ وہی لوگ ہیں...؟" اس کے ذہن میں سوال گونج رہا تھا، "جنہیں میں ہر وقت دین کی باتیں کرتے سنتا تھا...؟"

ثاقب اس کے قریب آیا اور ایک گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا،

"بس ایک گھونٹ... کچھ نہیں ہوتا... اتنا بھی سید ھا مت بنو"...

ذیشان نے ہنستے ہوئے کہا،

"ہاں سکندر... آج تمہیں بھی اصل دنیا دکھاتے ہیں"...

سکندر نے گلاس کو ہاتھ میں تھاما، اس کی نظریں اس مائع پر جم گئیں۔ دل میں ایک جنگ چل رہی تھی ایک طرف اس کی تربیت، اس کے اصول... اور دوسری طرف یہ ماحول، یہ دباؤ، یہ سب لوگ...

اس نے ارد گرد ایک بار پھر دیکھا سب لوگ بے فکری سے پی رہے تھے، جیسے کوئی حساب نہ ہو... کوئی انجام نہ ہو...

اس کے ہاتھ ہلکے سے کانپے...

وہ فیصلہ کرنے ہی والا تھا...

جیسے ہی سکندر نے گلاس کو ہاتھ پکڑ کر منہ کی طرف بڑھایا، اچانک پیچھے سے کسی نے آکر اسے مضبوطی سے تھام لیا۔ ایک نرم سا لمس اس کے سینے پر محسوس ہوا، جیسے کسی کے ہاتھ آہستہ آہستہ حرکت کر رہے ہوں۔ سکندر ایک دم ساکت رہ گیا۔ اس نے جھٹکے سے نیچے دیکھا ان ہاتھوں پر نیل پالش لگی ہوئی تھی... یہ کسی لڑکی کے ہاتھ تھے۔

اس کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے فوراً گلاس میز پر رکھا اور خود کو پیچھے سے چھڑانے کی کوشش کی،

"کون ہے؟ یہ کیا۔۔۔؟"

وہ مڑا... تو سامنے رمشا کھڑی تھی۔

"تم...؟" سکندر کی آواز میں حیرت اور ناگواری دونوں تھیں۔

رمشا کی آنکھیں نیم بند تھیں، وہ نشے میں پوری طرح ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بے قابو سی مسکراہٹ تھی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے دوبارہ اس کے قریب آئی اور اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے،

"سکندر... تم تو آج بڑے الگ لگ رہے ہو..." اس کی آواز مدہوش تھی۔

سکندر نے فوراً اس کے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی،

"رمشا... ہوش میں آؤ... یہ کیا کر رہی ہو تم؟"

مگر وہ جیسے سن ہی نہ رہی ہو۔ وہ اور قریب آئی، اس کے چہرے کے قریب جھک کر اسے چومنے کی کوشش کی۔

سکندر نے فوراً اپنا چہرہ پیچھے کیا اور ایک قدم دور ہو گیا،

"بس کرو رمشا! یہ ٹھیک نہیں ہے"!

اس کے لہجے میں سختی آ گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر فاصلے بنانے کی کوشش کی، مگر رمشا لڑکھڑاتے ہوئے پھر اس کی طرف بڑھی،

"کیوں...؟ تم بھی تو سب کی طرح ہو نا..." وہ ہنسی، مگر اس ہنسی میں ہوش نہیں تھا۔

سکندر نے جھنجھلا کر کہا،

"نہیں! میں ایسا نہیں ہوں"!

وہ فوراً ایک طرف ہٹ گیا، جیسے اس ماحول سے بھی دور جانا چاہتا ہو اور اس لمحے سے بھی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی، سانسیں بے ترتیب تھیں۔ اس نے ایک نظر اردگرد ڈالی مگر کسی کو اس سب سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

وہ خود سے ہی بڑبڑایا،

"یہ... سب کیا ہو رہا ہے"...

اور اس لمحے اسے شدت سے محسوس ہوا...

کہ وہ ایک ایسی جگہ آ گیا ہے... جہاں وہ کبھی آنا ہی نہیں چاہتا تھا...

تبھی سامنے سے ذیشان آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ وہ سکندر کے قریب آیا، ایک نظر رمشا پر ڈالی اور پھر ہلکے طنزیہ انداز میں بولا،

"کیا بات ہے سکندر... اگر تم دونوں کو روم چاہیے تو اوپر خالی ہیں"...

سکندر نے فوراً نفی میں سر ہلایا،

"نہیں... ایسی کوئی بات نہیں... میں۔۔۔۔"

اس کی بات ابھی مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ ثاقب فوراً درمیان میں آگیا،

"ارے! پہلے تو یہ سب بڑے شوق سے کرتے تھے... اب کیا ہو گیا؟"

ذیشان نے حیرانی ظاہر کرتے ہوئے آنکھیں اٹھائیں،

"واہ سکندر... تم تو ہم سے بھی آگے نکل گئے تھے... اب اچانک کیا ہوا؟"

سکندر نے تھوڑا سخت لہجہ اختیار کیا،

"میں نے کہا نا... آج موڈ نہیں ہے... پھر کبھی سہی"...

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ثاقب نے رمشا کی طرف دیکھا، پھر سکندر کے قریب جھک کر آہستہ مگر کاٹ دار لہجے میں بولا،

"رمشا کنواری لڑکی ہے... ٹرین کرو اسے... آج کل کنواری لڑکی ملنا بڑا مشکل ہوتا ہے... اور تمہارے پاس تو خود چل کر آ رہی ہے"...

یہ الفاظ سن کر سکندر کے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا۔ وہ ایک دم خاموش ہو گیا، اس کی نظریں زمین پر جم گئیں۔ چند لمحوں بعد اس نے سر اٹھایا اور سنجیدگی سے پوچھا،

"اسے یہاں کون لایا ہے...؟"

ذیشان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا،

"جب اسے بتایا کہ سکندر آنے والا ہے... تو خود ہی چلی آئی"...

یہ سن کر سکندر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کے ذہن میں کئی سوال ایک ساتھ گھومنے لگے یہ سب اتفاق تھا... یا کچھ اور؟

اسی لمحے ثاقب نے ایک اور جملہ پھینکا،

"دیکھو... وہ نشے میں ہے... اگر تم اس کے ساتھ نہیں جاؤ گے... تو کوئی اور چلا جائے گا"...

یہ سن کر سکندر چونک اٹھا۔ اس نے فوراً ارمشا کی طرف دیکھا وہ واقعی بے خودی میں تھی، جیسے اسے اپنے ارد گرد کا کوئی ہوش نہ ہو۔

سکندر کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی...

ایک طرف اس کے اصول... اور دوسری طرف یہ لمحہ... یہ دباؤ... اور یہ خطرناک بات...

وہ ساکت کھڑا رہ گیا...

جیسے اگلا قدم اس کی زندگی کا رخ بدلنے والا ہو...

سکندر نے ایک گہری سانس لی، جیسے خود کو کسی فیصلے کے لیے تیار کر رہا ہو۔ پھر اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا،

"اچھا ٹھیک ہے... میں اسے روم میں چھوڑ آتا ہوں... لیکن میں کچھ نہیں کروں گا۔ جیسے ہی اس کا نشہ اترے گا، تم دونوں اسے گھر چھوڑ دینا"...

ثاقب اور ذیشان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر ہلکے سے مسکرا کر کہا،

"ہاں ہاں... فکر نہ کرو... ہم دیکھ لیں گے"...

سکندر نے ان کی آنکھوں میں جھانکا، جیسے یقین کرنا چاہتا ہو... مگر پھر بھی وہ مڑ گیا۔ وہ رمشا کی طرف بڑھنے لگا۔ ارد گرد کا ماحول اب اور بھی بھاری لگ

رہا تھا ہر طرف دھواں، حقے کے کش، قہقہے، اور مدہوش آوازیں... سب جیسے اپنے اپنے نشے میں کھوئے ہوئے تھے۔

سکندر نے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کیا، مگر اچانک اس کی ٹکر کسی سے ہوگئی۔

"اوہ... سوری..." سکندر نے فوراً کہا اور آگے بڑھنے لگا۔

مگر وہ شخص وہیں کھڑا رہا... اور پھر اس نے سکندر کا بازو پکڑ کر اسے روک لیا۔

سکندر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ شخص باقی سب سے مختلف تھا چہرہ سخت، آنکھیں گہری اور انداز ایسا جیسے وہ یہاں کا عام مہمان نہ ہو۔ عمر بھی باقی سب سے زیادہ لگ رہی تھی... تقریباً تیس کے قریب۔

"اتنی جلدی میں کہاں جا رہے ہو...؟" اس نے دھیرے مگر وزنی آواز میں کہا۔

سکندر نے بازو چھڑانے کی ہلکی سی کوشش کی،

"بس... ایک کام ہے"...

وہ شخص ہلکا سا مسکرایا، مگر اس مسکراہٹ میں عجیب سی سنجیدگی تھی،

"کام... یا موقع...؟"

سکندر نے بھنویں سکیڑ لیں،

"میں سمجھا نہیں"...

اس نے ذرا قریب ہو کر کہا،

"یہاں جو بھی آتا ہے... وہ کچھ نہ کچھ لینے آتا ہے... تم کیا لینے آئے ہو، سکندر...؟"

اپنا نام سن کر سکندر چونک گیا،

"تم... تم مجھے جانتے ہو؟"

وہ شخص خاموشی سے اسے دیکھتا رہا، پھر آہستہ سے بولا،

"اتنا ضرور جانتا ہوں... کہ تم یہاں کے نہیں لگتے"...

تبھی ثاقب تیزی سے وہاں آیا اور ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا،

"آخر آپ دونوں کی ملاقات ہو ہی گئی"...

سکندر چونک گیا۔ اس نے حیرت سے پہلے ثاقب کو دیکھا، پھر اُس شخص کی طرف۔

"یہ... کیا مطلب ہے؟" اس کے لہجے میں الجھن صاف تھی۔

ثاقب نے ہلکے طنزیہ انداز میں کہا،

"سکندر... شاید تم انہیں نہیں جانتے... لیکن یہ تمہیں بہت اچھی طرح جانتے ہیں"...

سکندر کے لیے یہ سب اور بھی الجھا ہوا ہو گیا۔

"میں واقعی کچھ نہیں سمجھ رہا... ہو کیا رہا ہے یہاں؟"

تبھی وہ شخص ایک قدم آگے بڑھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی، مگر آنکھوں میں عجیب سی سنجیدگی۔

"میرا نام فیصل ہے"...

یہ نام سنتے ہی سکندر جیسے ساکت رہ گیا۔ اس کے ذہن میں ایک دم نادیہ کی بات گونجی

"فیصل"...

وہی نام... نادیہ کا سابق شوہر... وہی جس کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ اس نے اسے دھوکہ دیا تھا...

"تم...؟" سکندر کی آواز دھیمی مگر حیران تھی، "تم وہی فیصل ہو...؟"

فیصل نے کچھ نہیں کہا، بس ہلکا سا مسکرا دیا جیسے جواب کی ضرورت ہی نہ ہو۔

سکندر ابھی سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ ثاقب نے ایک اور وار کیا،

"فیصل صاحب... یہ ہیں سکندر... آپ کی ایکس وائف کا نیا بکرا"...

یہ سن کر سکندر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"ثاقب! زبان سنبھال کر بات کرو!" اس نے سخت لہجے میں کہا، مگر اس کے اندر ہلچل مچ چکی تھی۔

فیصل نے گہری نظر سے سکندر کو دیکھا،

"تو... تم ہی ہو سکندر..." اس نے آہستہ سے کہا، "نادیہ نے تمہارا ذکر تو نہیں کیا... لیکن اندازہ تھا کہ کوئی نہ کوئی تو ہوگا"...

سکندر کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔

"نادیہ نے جو بتایا... وہ۔۔۔"

فیصل نے بات کاٹ دی،

"ہر کہانی کے دو رخ ہوتے ہیں، سکندر..." اس کی آواز اب پہلے سے زیادہ سنجیدہ تھی، "تم نے صرف ایک رخ سنا ہو گا"...

سکندر خاموش ہو گیا۔ اس کے ذہن میں سوالات کا طوفان آ گیا تھا نادیہ... فیصل... یہ سب یہاں... اور ثاقب و ذیشان کا یہ رویہ...

پیچھے رمشا اب بھی بے خودی میں کھڑی تھی...

اور سامنے ایک نیا سچ اس کے سامنے آنے کو تھا...

فیصل نے آہستہ سے کہا،

"اگر ہمت ہے... تو سچ سن لو"...

اور اس لمحے... سکندر کو پہلی بار محسوس ہوا...

کہ شاید وہ جس کہانی کا حصہ بنا ہے... وہ اتنی سادہ نہیں جتنی اسے لگ رہی تھی...

ثاقب نے پہلے کبھی فیصل کو سکندر اور نادیہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور اسی بات کو بنیاد بنا کر اس نے اسے وہاں بلایا تھا۔ سکندر یہ دیکھ کر ایک لمحے کے لیے بالکل ساکت رہ گیا، جیسے اس کے قدموں تلے زمین نکل گئی ہو۔ اس کی نظریں ثاقب پر جم گئیں، پھر آہستہ آہستہ فیصل کی طرف گئیں، مگر اس کے چہرے پر اب صرف حیرت نہیں بلکہ گہرا صدمہ تھا، جبکہ اردگرد کا شور اس کے لیے جیسے اچانک کہیں دور جا چکا تھا۔

فیصل نے ایک لمحہ سکندر کو گھورا، پھر اپنا فون نکالا اور خاموشی سے اس کے سامنے کر دیا۔ اسکرین پر ایک کے بعد ایک نازیبا تصاویر اور ویڈیوز چلنے لگیں... نادیہ کے مختلف لڑکوں کے ساتھ موجود ہونے کے واضح ثبوت، جنہیں دیکھ کر سکندر کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس کی آنکھیں جیسے جم سی گئیں، سانس رک سی گئی، اور وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

"یہ... یہ کیا ہے؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی، جیسے اسے اپنے ہی الفاظ پر یقین نہ آ رہا ہو۔

فیصل نے ٹھنڈے لہجے میں کہا،

"نادیہ ایک دھوکے باز لڑکی ہے، سکندر... وہ مختلف لڑکوں کے ساتھ رہتی ہے۔ اسے ایک مرد کبھی کافی نہیں ہوتا۔ یہ سب اس کے بہت سے افیئرز ہیں... جن کا مجھے شادی کے بعد پتہ چلا۔ میں نے اسے کئی بار معاف کیا، مگر وہ نہیں بدلی"...

سکندر کے ہاتھ ہلکے سے کانپنے لگے، وہ بار بار اسکرین کو دیکھ رہا تھا جیسے کسی غلطی کی امید ہو، مگر ہر تصویر اس کے اندر کچھ توڑ رہی تھی۔

فیصل نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا،

"نادیہ دھوکہ دیتی ہے... یہ اس کی عادت ہے... تم جیسے اچھے لڑکے کو اس سے دور رہنا چاہیے۔ اپنی عمر کی کسی سیدھی لڑکی کو دیکھو..." اس نے ہلکی نظر رمشا کی طرف ڈالی، پھر دوبارہ سکندر کی طرف دیکھا،

"ورنہ وہ تمہاری زندگی بھی تباہ کر دے گی"...

یہ سب سن کر سکندر جیسے کسی اور ہی دنیا میں چلا گیا ہو۔ اس کے چہرے پر یقین، غصہ اور درد سب ایک ساتھ تھے۔ وہ ایک جگہ ٹھہر کر بس خالی

نظروں سے دیکھ رہا تھا، جیسے اسے ابھی تک سمجھ نہ آ رہا ہو کہ وہ کیا سن اور دیکھ چکا ہے...

سکندر بالکل ٹوٹ چکا تھا، جیسے اس کے اندر کچھ بکھر گیا ہو اور وہ خود کو سنبھال ہی نہ پا رہا ہو۔ فیصل کی آواز اب بھی اس کے ارد گرد گونج رہی تھی، مگر اسے ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ہر چیز دھندلی ہو گئی تھی، صرف وہ نازیبا ویڈیوز اور تصاویر اس کے ذہن میں بار بار چل رہی تھیں جیسے کوئی بوجھ اس کے سینے پر رکھ دیا گیا ہو۔ اس کی نظریں ایک جگہ جم گئیں، سانسیں بے ترتیب ہو گئیں، اور وہ خاموش کھڑا رہ گیا، جیسے اس دنیا میں موجود ہو کر بھی کہیں اور کھو چکا ہو۔

رمشا نے ایک بار پھر سکندر کے قریب آ کر اسے آہستہ سے گلے لگا لیا۔ اس بار سکندر نے نہ کوئی مزاحمت کی، نہ ہی خود کو پیچھے کھینچا۔ وہ جیسے اندر سے بالکل خالی ہو چکا تھا نہ غصہ، نہ حیرت، نہ سوال... بس ایک خاموش سا درد تھا جو اس کی آنکھوں میں جم گیا تھا۔ رمشا کی گرفت مضبوط تھی، مگر اس کی اپنی حالت بھی بہتر نہیں تھی؛ نشہ اب بھی اس کے حواس پر غالب تھا، مگر پھر

بھی اس لمحے میں وہ ایک سہارا بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ سکندر کی آنکھیں خالی تھیں، جیسے وہ سب کچھ دیکھ کر بھی دنیا سے کٹ چکا ہو۔

فیصل کچھ لمحے وہ منظر دیکھتا رہا، پھر اس کے چہرے پر ایک سرد سی مسکراہٹ آئی۔ اس نے دھیرے سے سر ہلایا اور کہا،

"سکندر! خوش رہو اور نادیہ سے دور رہو"...

اس کی آواز میں طنز بھی تھا اور ایک عجیب سی بے نیازی بھی، جیسے وہ اپنا کام مکمل کر چکا ہو۔ اس کے بعد وہ بغیر کسی اور لفظ کے مڑ گیا اور بھیڑ میں گم ہو گیا۔

سکندر کے ہونٹ ہلے، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو، مگر الفاظ کہیں اندر ہی دم توڑ گئے۔ اس کے ذہن میں بار بار وہی مناظر گھوم رہے تھے وہ تصاویر، وہ ویڈیوز، وہ آوازیں... "یہ سب جھوٹ ہے یا سچ؟" اس کے اندر ایک جنگ چل رہی تھی، مگر باہر وہ بالکل خاموش تھا، جیسے اس کی روح ہی تھک چکی ہو۔

رمشا نے اس کا ہاتھ تھاما اور آہستہ سے کہا،

"سکندر... آؤ"...

اس کی آواز مدھم تھی، مگر اس میں ایک بے نام سی وابستگی تھی۔ وہ اسے سہارا دیتی ہوئی اوپر کی طرف لے جانے لگی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دونوں کے قدم بے ترتیب تھے رمشا نشے میں لڑکھڑا رہی تھی، اور سکندر جیسے اپنے ہی وزن سے ٹوٹا جا رہا تھا۔

اوپر پہنچ کر رمشا نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ اندر اندھیرا سا تھا، صرف باہر سے آنے والی روشنی مدھم سی فضا بنا رہی تھی۔ وہ اسے اندر لے گئی اور آہستہ سے بستر کے قریب بٹھایا۔ دروازہ بند ہوتے ہی باہر کا شور جیسے بہت دور رہ گیا۔

کمرے میں ایک لمبی خاموشی چھا گئی۔ رمشا نے سکندر کے قریب بیٹھ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا، مگر سکندر کی نظریں اب بھی کہیں اور تھیں نہ یہاں، نہ اس لمحے میں۔ وہ جیسے اپنے ہی اندر کہیں گم ہو چکا تھا، جہاں فیصل کے الفاظ اور وہ تصویریں مسلسل اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔

رمشا نے آہستہ سے کہا،

"سکندر... تم ٹھیک ہو؟"

مگر جواب میں صرف خاموشی تھی۔ سکندر نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں، جیسے وہ سب کچھ بھلانے کی کوشش کر رہا ہو، مگر ہر چیز اور واضح ہو رہی تھی۔

باہر موسیقی کی دھیمی دھمک اب بھی آ رہی تھی، مگر اس کمرے کے اندر صرف دو ٹوٹے ہوئے لمحے تھے ایک خاموش درد میں ڈوبا ہوا سکندر، اور ایک مدہوش رمشا، جو خود بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ کس کہانی کا حصہ بن چکی ہے...

رمشا پہلے ہی نشے کی حالت میں تھی، اس کی آنکھوں میں دھند سی چھائی ہوئی تھی اور وہ بار بار توازن کھو رہی تھی۔ اس نے اچانک دروازے کی طرف جا کر کنڈی لگا دی۔ سکندر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اس کی پیشانی پر الجھن اور بے چینی صاف نظر آ رہی تھی۔

رمشا واپس مڑی تو اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مدہوشی تھی، جیسے اسے خود بھی اندازہ نہ ہو کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ سکندر کے قریب آئی، اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کی جیکٹ کو کھینچ کر ایک طرف پھینک

دیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بے ترتیب سی مسکراہٹ تھی، اور وہ سیدھا اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

"تم... واقعی سب سے الگ ہو..." رمشا نے دھیمی مگر لڑکھڑاتی آواز میں کہا، اس کی انگلیاں سکندر کے کندھے پر بے ترتیب حرکت کر رہی تھیں، جیسے وہ کسی خواب میں ہو۔

سکندر فوراً پیچھے ہٹا،

"رمشا... تم ہوش میں نہیں ہو... یہ سب مت کرو"...

مگر رمشا نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ ایک قدم اور قریب آئی اور اچانک اسے مضبوطی سے گلے لگا لیا۔ اس کا سر سکندر کے سینے پر جھک گیا۔ اس نے آہستہ سے اس کے ماتھے پر ہونٹ رکھ دیے، پھر اس کے چہرے کو اوپر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

"تمہیں پتا ہے... مجھے تم پہلے دن سے ہی اچھے لگے تھے..." اس کی آواز مدھم اور ٹوٹی ہوئی تھی، "اتنے الگ... اتنے پیارے اُففففف"...

سکندر کا چہرہ سخت ہو گیا، مگر اس نے خود کو سنبھالا۔

"یہ سب جذبات نہیں ہیں رمشا... یہ نشہ ہے..." اس نے نرمی سے اس کے ہاتھ تھام کر خود سے الگ کیا۔

رمشا ہلکی سی ہنسی،

"نہیں... شاید آج پہلی بار میں سچ بول رہی ہوں"...

وہ دوبارہ قریب آئی، اس بار اس کا چہرہ سکندر کے چہرے کے بہت قریب تھا۔ اس کی سانسیں تیز تھیں، اور وہ لمحہ لمحہ حدیں پار کرتی جا رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا، پھر اس کے گال پر ہاتھ رکھا۔

"تم ایسے کیوں ہو...؟ سب جیسے نہیں ہو سکتے کیا تم..." اس کی آواز میں ایک عجیب سی ضد اور کشش تھی پھر اس نے اس کے ماتھے کو چوما پھر گال کو اور آگے بڑھنے لگی۔

سکندر نے گہری سانس لی، اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، مگر اس نے خود کو پیچھے کیا۔

"بس کرو..." اس نے سخت مگر کنٹرولڈ آواز میں کہا، "یہ ٹھیک نہیں ہے"...

رمشا چند لمحے خاموش رہی، پھر جیسے تھک کر بستر پر بیٹھ گئی۔ کمرے میں ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی، صرف ان دونوں کی سانسوں کی آواز باقی تھی۔

سکندر نے فوراً اپنی جیکٹ اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے کنڈی کھولنے کی کوشش کی... مگر دروازہ بند تھا۔

وہ ایک دم رک گیا۔

"کیا...؟" اس نے دوبارہ زور لگایا، مگر دروازہ نہیں کھلا۔

وہ پیچھے ہٹا اور دروازے کو گھورنے لگا۔

"یہ باہر سے بند ہے"...

اس کی آواز میں اب الجھن کے ساتھ ساتھ ہلکی سی گھبراہٹ بھی آ چکی تھی۔

اسی لمحے رمشا نے آہستہ سے کہا،

"لگتا ہے کسی نے باہر سے کنڈی لگا دی"...

سکندر نے فوراً اس کی طرف دیکھا۔

"ان کی تو...؟"

کمرے میں ایک بھاری سی خاموشی چھا گئی۔ باہر سے شور بڑھنے لگا... قدموں کی آوازیں، چیخیں، اور پھر دور سے آنے والے سائرن کی دھیمی مگر مسلسل آواز۔ پارٹی کے سب لوگ بھاگ دوڑ کرنے لگ گئے تھے۔

سکندر کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"پولیس...؟"

وہ آہستہ سے بڑبڑایا، اور پہلی بار اس کے چہرے پر اصل پریشانی نظر آئی۔

رمشا بھی اب پوری طرح ہوش میں نہیں تھی، مگر ماحول کی سنگینی محسوس کر رہی تھی۔

سائرن کی آوازیں تیز ہو رہی تھیں...

اور کمرے کے اندر، سکندر پہلی بار سمجھ رہا تھا کہ وہ صرف ایک پارٹی میں نہیں آیا تھا... بلکہ کسی بڑے جال کے اندر پھنس چکا ہے۔

سکندر کے دل میں ایک عجیب سا خوف اتر آیا تھا۔ اس کی سانسیں تیز ہو رہی تھیں اور پیشانی پر پسینہ ابھر آیا تھا۔ ایک طرف رمشا تھی ابھی تک پوری طرح ہوش میں نہیں، بے خبر، بے قابو... اور دوسری طرف باہر پولیس کی آوازیں، جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ قریب آتی جا رہی تھیں۔

"یہ... میں کہاں پھنس گیا ہوں..." وہ آہستہ سے خود سے بڑبڑایا۔

اس نے ایک بار پھر دروازے کی طرف بڑھ کر پوری طاقت سے دھکا دیا۔ دروازہ زور سے ہلا... مگر کھلا نہیں۔ اس نے مٹھیوں سے زور زور سے مارا، پھر رک گیا۔

"نہیں... اگر آواز ہو گئی تو..." اس نے فوراً ہاتھ روک لیا، جیسے اچانک اسے اپنی ہی حرکت کا انجام سمجھ آ گیا ہو۔

باہر سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں، کسی کے چیخنے کی آواز،

"سب کو باہر نکالو! کوئی بھی اوپر نہ رہے"!

سکندر کا دل ایک دم سے زور سے دھڑکا۔ اس نے پیچھے مڑ کر رمشا کو دیکھا وہ بستر پر بیٹھی ہوئی تھی، نیم بے ہوشی میں، جیسے اسے کچھ سمجھ ہی نہ آ رہا ہو۔

"اگر پولیس نے ہمیں یہاں دیکھ لیا..." اس نے سوچا، "ایک لڑکا اور لڑکی... ایک کمرہ... بند دروازہ"...

اس کے ذہن میں ایک کے بعد ایک خیال بجلی کی طرح کوندنے لگا۔

"میں کچھ بھی کہوں... کوئی یقین نہیں کرے گا... میں خود کو کیسے ثابت کروں گا...؟"

اس نے بے بسی سے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور کمرے میں ادھر ادھر چلنے لگا۔ ہر قدم کے ساتھ اس کی گھبراہٹ بڑھ رہی تھی۔

"یہ سب پلان تھا..." اس کے ذہن میں اچانک خیال آیا، "مجھے یہاں پھنسانے کے لیے"...

اس نے دروازے کی طرف دوبارہ دیکھا، پھر کھڑکی کی طرف جیسے کوئی راستہ ڈھونڈ رہا ہو۔ مگر ہر طرف بندش تھی۔

باہر سائرن کی آوازیں اب بالکل قریب آ چکی تھیں...

اور ہر گزرتا لمحہ سکندر کے لیے خطرہ بنتا جا رہا تھا...

اس نے آہستہ سے سر دیوار سے ٹیک دیا اور آنکھیں بند کر لیں،

"بھینس کی ٹانگ اب کیا کروں"...

کمرے میں گھٹن بڑھتی جا رہی تھی...

اور دروازے کے اُس پار... شاید اگلا لمحہ اس کی پوری زندگی بدلنے والا تھا...

سکندر نے گھبراہٹ میں کمرے کے اندر ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں، جیسے کوئی راستہ تلاش کر رہا ہو۔ اسی دوران اس کی نظر سامنے کھڑکی پر جا کر ٹھہر گئی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ نیچے ایک سنسان سی پچھلی گلی تھی اندھیری، خاموش... اور اس لمحے اس کے لیے شاید واحد راستہ۔

اس نے کھڑکی کو کھولا، ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ اس نے نیچے جھک کر غور سے دیکھا صرف ایک ہی منزل تھی، اور ساتھ ہی ایک مضبوط سا پائپ لگا ہوا تھا جو سیدھا نیچے جا رہا تھا۔

سکندر نے فوراً ہاتھ بڑھا کر پائپ کو پکڑا اور ہلکا سا جھٹکا دیا۔

"یہ تو مضبوط ہے..." اس نے آہستہ سے خود سے کہا۔

اس کے دل میں ایک امید سی جاگی،

"میں... میں اس سے نیچے اتر سکتا ہوں"...

مگر جیسے ہی اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا اس کی نظر رمشا پر جا کر رک گئی۔

وہ اب بھی بستر پر بیٹھی تھی، نیم بے ہوشی میں، آنکھیں آدھی بند، جیسے اسے اپنے ارد گرد کی کوئی خبر ہی نہ ہو۔

سکندر کا دل ایک لمحے کو رک سا گیا۔

"میں... اسے یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتا..." اس نے بے بسی سے سوچا۔

وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب آیا،

"رمشا... سنو... ہمیں یہاں سے نکلنا ہو گا..." اس نے اسے ہلکا سا ہلایا، مگر وہ بمشکل آنکھیں کھول سکی۔

"مجھے... چومونا سکندر کتنے پیارے لگ رہے ہو..." رمشا نے دھیرے سے کہا اور دوبارہ جھک گئی۔

سکندر کے لیے یہ لمحہ اور مشکل ہو گیا۔

"توبا... میں کیا کروں...؟"

اس نے دوبارہ کھڑکی کی طرف دیکھا، پھر رمشا کی طرف۔

"اگر میں اسے لے کر جاتا ہوں... تو خطرہ ہے... اگر چھوڑتا ہوں... تو"...

اس کے ذہن میں پولیس، الزامات، اور وہ ساری صورتحال گھومنے لگی۔

"ٹھیک ہے... اب صرف ایک ہی راستہ ہے..." سکندر نے خود سے سرگوشی کی، اس کی آواز میں بے بسی بھی تھی اور ایک زبردستی کا حوصلہ بھی۔

وہ فوراً پلٹ کر رمشا کے پاس آیا اور اسے جھنجھوڑنے لگا،

"رمشا! ہوش میں آؤ... ہمیں یہاں سے نکلنا ہے"...

مگر رمشا کی حالت اب بھی ویسی ہی تھی وہ بے قابو ہو کر ہنس رہی تھی، جیسے اسے کچھ سمجھ ہی نہ آ رہا ہو۔ اس کی ہنسی اس سنجیدہ اور خطرناک ماحول میں اور بھی عجیب لگ رہی تھی۔

"رمشا! پلیز..." سکندر کی آواز اب گھبراہٹ میں بدل چکی تھی۔

جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے دانت بھینچے، اور ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر مارا۔

"ٹھاہ"!

کمرے میں آواز گونج گئی۔

رمشا ایک دم خاموش ہو گئی۔ اس کی ہنسی رک گئی، آنکھیں پھیل گئیں جیسے اچانک اسے کچھ احساس ہوا ہو۔ وہ چند لمحے ساکت رہی۔

سکندر نے فوراً اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔

"سن سکتی ہو میری بات؟ ہمیں ابھی یہاں سے نکلنا ہے"...

وہ لڑکھڑا رہی تھی، مگر اب کم از کم کھڑی تھی۔

سکندر نے جلدی سے بستر کی چادر اٹھائی اور اسے اپنے اور رمشا کے گرد لپیٹ دیا، پھر مضبوطی سے باندھ دی جیسے وہ اسے خود سے الگ نہ ہونے دینا چاہتا ہو۔

اسی لمحے باہر سے دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔

"دروازہ کھولو! اندر کون ہے؟" ایک سخت آواز گونجی۔

سکندر کے دل کی دھڑکن جیسے رک گئی۔

رمشا نے کچھ بولنے کے لیے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ سکندر نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"چپ...!" اس نے سرگوشی کی، اس کی آواز میں خوف صاف تھا۔

مگر رمشا نے اچانک اس کے ہاتھ کو دانتوں سے کاٹ لیا۔

سکندر کے چہرے پر درد کی ایک جھلک آئی، مگر اس نے ہاتھ نہیں ہٹایا۔ اس کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔

باہر سے آواز دوبارہ آئی، اس بار زیادہ سخت،

"دروازہ توڑ دو"!

سکندر کے پاس اب وقت نہیں تھا۔

وہ رمشا کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے کھڑکی کی طرف لے گیا۔ اس کے قدم تیز تھے، سانسیں بے ترتیب، اور دل جیسے سینے سے باہر نکلنے کو تھا۔

کھڑکی کے پاس پہنچ کر اس نے ایک لمحے کے لیے نیچے جھانکا... اندھیری گلی... خاموشی... مگر خطرہ ہر طرف۔

پیچھے دروازے پر زور زور سے ضربیں لگ رہی تھیں...

دروازے کے باہر کھڑے پولیس والوں میں سے ایک نے زور سے کہا،

"سر! یہ دروازہ سیدھا نہیں کھلے گا... یہ اڑا ہوا ہے، اسے اٹھا کر کھولنا پڑے گا"!

انسپکٹر نے فوراً بات سمجھ لی، اس کی آنکھوں میں شک کی چمک آ گئی،

"سب مل کر... ایک ساتھ"!

اگلے ہی لمحے چار پانچ پولیس والوں نے دروازے کو نیچے سے پکڑا اور زور لگا کر ایک جھٹکے میں اوپر اٹھایا

"ابھی"!

دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔

مگر اندر... کوئی نہیں تھا۔

کمرہ خالی تھا۔ بستر بکھرا ہوا، چادر غائب، کھڑکی آدھی کھلی... اور ایک عجیب سا سناٹا۔

"کہاں گئے؟" ایک سپاہی نے حیرت سے کہا۔

انسپکٹر تیزی سے اندر آیا، اس کی نظریں ہر چیز کو بغور دیکھ رہی تھیں۔

"یہیں تھے... ابھی کچھ دیر پہلے... انہوں نے تو ابھی یہی بتایا تھا" اس نے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔

پولیس والے کمرے کے ہر کونے میں دیکھنے لگے۔ ایک کانسٹیبل آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اس نے باہر جھانکا

مگر نیچے اندھیری گلی خاموش تھی... جیسے وہاں کبھی کوئی آیا ہی نہ ہو۔

ادھر... اسی لمحے... سکندر کھڑکی کے باہر پائپ کو مضبوطی سے تھامے آہستہ آہستہ نیچے اتر رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پائپ تھا، اور دوسرے سے وہ رمشا کا منہ دبائے ہوئے تھا تاکہ وہ کوئی آواز نہ نکال سکے۔ رمشا نیم بے ہوشی میں تھی، اس کا جسم ڈھیلا پڑا ہوا تھا، جسے سنبھالنا اور بھی مشکل ہو رہا تھا۔

سکندر کی سانسیں تیز تھیں، ہاتھ پسینے سے پھسل رہے تھے، مگر اس نے گرفت مضبوط رکھی۔

"بس... تھوڑا سا اور..." اس نے دل ہی دل میں کہا۔

اوپر کھڑکی کے پاس کھڑا کانسٹیبل کچھ لمحے تک نیچے دیکھتا رہا، جیسے اسے کوئی آہٹ محسوس ہوئی ہو... مگر پھر اس نے کندھے اچکا دیے اور پیچھے ہٹ گیا۔

سکندر نے ایک لمحے کے لیے اوپر دیکھا پولیس چند انچ کے فاصلے پر تھی... بس ایک نظر اور سب ختم ہو سکتا تھا...

مگر قسمت اس بار اس کے ساتھ تھی۔

آخرکار وہ نیچے زمین پر پہنچ گیا۔ اس کے قدم لڑکھڑائے، مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس نے فوراً رمشا کو سہارا دیا، جو اب بھی نیم بے ہوشی میں تھی۔

اوپر سے پولیس کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں...

"پورا گھر چیک کرو! کوئی باہر نہ نکلے"!

سکندر نے ایک لمحے کے لیے گہری سانس لی، پھر جلدی سے رمشا کو لے کر اندھیری گلی کی طرف بڑھ گیا...

وہ اس جال سے نکل تو آیا تھا...

اب مسئلہ یہ تھا کہ ایک اکیلی، نشے میں ڈوبی ہوئی لڑکی کو لے کر وہ کہاں جائے۔ سڑک سنسان تھی، رات گہری ہوتی جا رہی تھی، اور ہر گزرتا لمحہ

خطرہ بن سکتا تھا۔ سکندر نے رمشا کو دیوار کے ساتھ سہارا دے کر کھڑا کیا، وہ بمشکل خود کو سنبھال پا رہی تھی۔ اس نے جیب سے فون نکالا، ہاتھ اب بھی ہلکے ہلکے کانپ رہے تھے۔ چند لمحے وہ سکرین کو دیکھتا رہا... جیسے فیصلہ کرنا بھی مشکل ہو رہا ہو۔

آخرکار اس نے ایک نمبر ڈائل کیا۔

کال بجی... ایک، دو، تین بار... پھر دوسری طرف سے آواز آئی،

"ہاں... اس وقت کیوں کال کی ہے؟"

سکندر نے جلدی سے کہا،

"مجھے تمہاری مدد چاہیے... ابھی... فوراً"...

دوسری طرف چند لمحوں کی خاموشی رہی، پھر قدرے سخت لہجہ آیا،

"میں کسی مسئلے میں نہیں پڑنا چاہتا... خاص طور پر اس وقت نہیں"...

سکندر نے بے بسی سے آنکھیں بند کیں،

"بات سنو... میں مشکل میں ہوں... بہت بڑی مشکل میں... اکیلا نہیں ہوں... میرے ساتھ ایک لڑکی ہے... وہ ہوش میں نہیں ہے"...

"تو میں کیا کروں؟" دوسری طرف سے جواب آیا، جیسے وہ جان چھڑانا چاہ رہا ہو،

"مجھے اس سب میں مت گھسیٹو"...

سکندر کی آواز اور نیچی ہو گئی، مگر اس میں ایک دباؤ تھا،

"اگر تم نے آج مدد نہ کی... تو شاید میں خود کو کبھی سنبھال نہ سکوں... پلیز... بس ایک بار... اپنی ماما کے لیے کر دو"

کچھ لمحے خاموشی رہی... جیسے دوسری طرف والا سوچ رہا ہو۔

پھر آخر کار ایک لمبی سانس کی آواز آئی،

"ٹھیک ہے... کہاں ہو تم؟"

سکندر نے فوراً جگہ بتائی۔

"وہیں رکو... میں آرہا ہوں... لیکن یہ آخری بار ہے، سمجھ گئے؟"

کال کٹ گئی۔

سکندر نے فون نیچے کیا اور ایک گہری سانس لی، جیسے تھوڑی دیر کے لیے اس کے اندر کا بوجھ ہلکا ہوا ہو۔ اس نے رمشا کی طرف دیکھا وہ اب بھی نیم بے ہوشی میں تھی۔

"بس... تھوڑی دیر اور..." اس نے آہستہ سے کہا۔

دور کہیں بائیک کے آنے کی ہلکی سی آواز سنائی دینے لگی...

اور سکندر جانتا تھا...

کہ اب اگلا موڑ بھی آسان نہیں ہونے والا...

---

31 جنوری کی صبح تھی۔ رمشا کی آنکھ آہستہ آہستہ کھلی، سر بھاری تھا، جیسے ہر چیز گھوم رہی ہو۔ اس نے پیشانی کو ہاتھ سے تھاما اور چند لمحے آنکھیں بند کر کے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ سانسیں ہلکی ہلکی تیز تھیں، دل میں ایک انجانا سا خوف بھی تھا۔ پھر وہ دھیرے سے اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی۔

اس نے ارد گرد دیکھا... کمرہ اجنبی تھا۔ دیواریں، پردے، فرنیچر سب کچھ اس کے لیے نیا تھا۔

"میں... کہاں ہوں...؟" اس نے خود سے سرگوشی کی۔

اسی لمحے اس کی نظر سامنے پڑی

سکندر ایک کرسی پر خاموش بیٹھا تھا۔

وہ جھٹکے سے سیدھی ہوگئی، آنکھیں پھیل گئیں،

"سکندر...؟ تم...؟" اس کی آواز میں حیرت بھی تھی اور الجھن بھی۔

سکندر نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے ہلکے سیاہ حلقے تھے، جیسے وہ پوری رات نہیں سویا ہو۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی، اور ایک عجیب سی خاموشی۔

رمشا نے جلدی سے ادھر ادھر دیکھا،

"یہ جگہ... یہ کس کا گھر ہے؟ میں یہاں کیسے...؟" اس کی آواز کانپنے لگی، جیسے اسے کچھ دھندلی سی یادیں واپس آرہی ہوں۔

سکندر نے چند لمحے اسے دیکھا، پھر دھیرے سے بولا،

"تم محفوظ ہو... بس اتنا سمجھ لو"...

"محفوظ...؟" رمشا نے الجھن سے دہرایا، "کل رات... کیا ہوا تھا؟ مجھے کچھ یاد نہیں"...

وہ اپنے سر کو تھام کر بیٹھ گئی،

"مجھے بس... کچھ ٹوٹے ہوئے لمحے یاد ہیں... شور... روشنی... اور پھر..." وہ رک گئی، اس کی سانس تیز ہو گئی، "اور پھر کچھ بھی نہیں"...

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

رمشا نے آہستہ سے سکندر کی طرف دیکھا،

"سکندر... تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو...؟ اور... ہم کہاں ہیں...؟"

سکندر نے ایک گہری سانس لی، جیسے وہ جواب دینے سے پہلے خود کو سنبھال رہا ہو...

رمشا نے اچانک اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا، پھر چونک کر سکندر کی طرف مڑی۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور الجھن ایک ساتھ تھی۔

"ایک منٹ... میرے کپڑے... یہ کیسے بدلے؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

سکندر نے ہلکے سے کندھے اچکائے، جیسے بات عام سی ہو،

"جیسے بدلتے ہیں"...

"لیکن... میں نے تو اپنے کپڑے نہیں بدلے تھے..." رمشا کی آواز اب مزید کمزور ہو گئی، جیسے اسے کسی بڑے خدشے نے گھیر لیا ہو۔

سکندر خاموش رہا۔

یہ خاموشی رمشا کے لیے سب سے زیادہ خوفناک تھی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، وہ پیچھے ہٹ گئی،

"تم نے... تم نے میرے ساتھ وہ سب کر لیا...؟" اس کی آواز ٹوٹ گئی، اور وہ رونے لگی، "میں ہوش میں بھی نہیں تھی"...

سکندر نے اسے دیکھا، پھر ایک عجیب سے لہجے میں بولا،

"تم ہی تو مجھے پسند کرتی تھی... اور وہاں پارٹی میں بھی میرے ساتھ چپکی ہوئی تھی"...

"نہیں...!" رمشا نے روتے ہوئے سر ہلایا، "وہ سب... وہ میں نہیں تھی... میں ہوش میں نہیں تھی"...

اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیا، "تم نے میرے ساتھ یہ کیا کیوں، سکندر...؟"

کمرے میں اس کے رونے کی آواز گونجنے لگی۔

اور اچانک...

سکندر ہنسنے لگا۔

وہ ہنسی رمشا کے لیے اور بھی تکلیف دہ تھی، جیسے اس کے دل پر کوئی اور وار ہو گیا ہو۔

تبھی دروازے کی طرف سے ایک آواز آئی،

"اب بس بھی کرو سکندر بیٹا... کیوں بیچاری کو پریشان کر رہے ہو؟"

رمشا نے چونک کر سر اٹھایا۔ دروازے پر ایک عمر رسیدہ عورت کھڑی تھی، چہرے پر نرمی اور آنکھوں میں سمجھداری۔

سکندر نے فوراً اپنی ہنسی روکی اور ہلکے سے مسکرا کر بولا،

"اچھا معذرت خالہ"...

عمر رسیدہ عورت نے نرم لہجے میں آگے بڑھ کر کہا،

"بیٹا، گھبراؤ نہیں... تمہارے کپڑے میں نے بدلے ہیں... اور تم نے بھی نیند میں خود ہی اتارنے میں تھوڑی مدد کی تھی... میں سکندر کی خالہ ہوں۔ رات کو یہ میرے بیٹے کو بلا کر تمہیں یہاں لے آیا تھا"...

یہ سنتے ہی رمشا کے چہرے پر جیسے ایک دم سکون اتر آیا۔ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ آہستہ آہستہ تھم گئے، آنکھوں میں جو خوف تھا وہ کم ہونے لگا۔ اس نے گہری سانس لی، جیسے کسی بڑے بوجھ سے آزاد ہوئی ہو۔

"میں... میں سمجھ گئی..." وہ آہستہ سے بولی، مگر اس کی آواز اب بھی ہلکی سی لرزش لیے ہوئے تھی۔

مگر دوسری طرف سکندر اب بھی ہلکے ہلکے ہنس رہا تھا۔

رمشا نے حیرت اور ہلکی ناراضی سے اس کی طرف دیکھا،

"تم ہنس کیوں رہے ہو...؟"

سکندر آہستہ آہستہ کھڑا ہوا اور اس کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے پر اب ایک عجیب سی سنجیدگی اور ہلکی سی شرارت دونوں تھیں۔ وہ اس کے بالکل قریب آیا، اتنا کہ رمشا ایک لمحے کو پھر سے ساکت رہ گئی۔

پھر وہ جھک کر اس کے کان کے قریب آہستہ سے بولا،

"دیکھو... اگر مجھے کچھ کرنا ہوتا نا... تو وہیں پارٹی میں کر لیتا"

اس کی آواز دھیمی مگر صاف تھی،

"تمہیں اپنی خالہ کے پاس نہ لاتا...... اور ویسے بھی تم اتنی پیاری بھی نہیں ہو کہ کوئی تمہارا ریپ کرے"

رمشا ایک لمحے کے لیے اسے دیکھتی رہ گئی اس کے دل میں شرمندگی، سکون اور ایک نئی الجھن سب ایک ساتھ اتر آئے تھے۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی...

مگر اب اس خاموشی کا رنگ بدل چکا تھا...

تبھی دروازہ ہلکے سے کھلا اور ایک لڑکا اندر داخل ہوا۔ اس نے رمشا کو بیٹھا دیکھ کر بھنویں اٹھائیں اور آدھی سنجیدگی، آدھی مزاح میں بولا،

"اوہ... یہ اٹھ گئی؟ رات کو تو مجھے لگا تھا ہم کوئی کِڈنیپنگ کر رہے ہیں... آپ کا اغوا تو نہیں ہوئی نا؟"

رمشا ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئی، پھر ہلکی سی گھبراہٹ کے ساتھ سکندر کی طرف دیکھا۔

سکندر نے فوراً آنکھیں تنگ کر کے کہا،

"دانش! تجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کیا؟"

وہ لڑکا، دانش، ہلکا سا ہنسا اور کندھے اچکائے،

"مسئلہ یقین کا نہیں ہے... مسئلہ تمہارا ہے... تم بچپن سے ہی الٹے کاموں میں لگے رہے ہو، اسی لیے ڈر لگ رہا تھا"...

کمرے میں ایک لمحے کو خاموشی چھا گئی۔ سکندر نے ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

"بڑی جلدی کردار سرٹیفکیٹ دینا شروع کر دیا تُو نے"...

دانش نے رمشا کی طرف دیکھ کر کہا،

"خود ہی پوچھ لیتا ہوں... بہتر ہے کلیئر ہو جائے"...

سکندر نے ہاتھ کے اشارے سے کہا،

"ہاں ہاں، پوچھ لو... سامنے بیٹھی ہے"...

رمشا نے فوراً نفی میں سر ہلایا،

"نہیں... نہیں، میں اغوا نہیں ہوئی... سب ٹھیک ہے"...

دانش نے چند لمحے اسے غور سے دیکھا، جیسے یقین کر رہا ہو، پھر ایک ہلکی سی سانس لی اور سکندر کی طرف مڑ کر بولا،

"دیکھ لیا... اب ٹھیک ہے"...

سکندر نے فاتحانہ انداز میں کہا،

"ہاں، اب تو مان گیا نا؟"

"اچھا ٹھیک ہے..." دانش نے مختصر سا جواب دیا، پھر دروازے کی طرف مڑا، "میں باہر ہوں"...

اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی...

مگر اس بار اس خاموشی میں ایک عجیب سی سنجیدگی بھی شامل تھی... جیسے ابھی بہت سی باتیں باقی ہوں...

پھر رمشا نے ہلکی سی جھجھک کے ساتھ نظریں جھکائیں اور آہستہ سے پوچھا،

"خالہ جی... وہ... باتھ روم کدھر ہے...؟"

اس کے لہجے میں شرمندگی بھی تھی اور ایک عجیب سی گھبراہٹ بھی، جیسے وہ اب بھی خود کو اس صورتحال میں مکمل طور پر سنبھال نہیں پا رہی ہو۔

خالہ سلوٰی نے نرمی سے مسکرا کر ہاتھ کے اشارے سے راستہ بتایا،

"ادھر بیٹا... سیدھا جا کر دائیں طرف"...

"شکریہ..." رمشا نے دھیرے سے کہا اور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی خالہ سلوٰی نے ایک گہری سانس لی اور پھر کمرے سے نکل کر کچن کی طرف بڑھ گئیں،

"بچی نے کچھ کھایا بھی نہیں ہو گا... میں کچھ بنا دیتی ہوں"...

سکندر بھی خاموشی سے ان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ کچن میں داخل ہوتے ہی خالہ سلوٰی نے برتن نکالنے شروع کیے، جبکہ سکندر دروازے کے پاس کھڑا کچھ سوچتا رہا۔

خالہ سلوٰی نے ایک نظر اس پر ڈالی اور ہلکے سے بولیں،

"بہت بڑی مصیبتوں میں پڑتے ہو تم"...

سکندر نے گردن جھکا کر آہستہ سے کہا،

"مجبوری تھی خالہ... چھوڑ نہیں سکتا تھا اسے وہاں"...

خالہ نے کام کرتے کرتے سر ہلایا،

"ہاں، ٹھیک کیا... لیکن اب سنبھالنا بھی تمہیں ہی ہوگا"...

سکندر خاموش ہو گیا، جیسے وہ پہلے ہی اس بات کا بوجھ محسوس کر رہا ہو۔

کچن میں چولہے کی ہلکی آنچ جل رہی تھی...

اور باہر... ایک نئی صبح کے ساتھ ایک نئی الجھن بھی جنم لے رہی تھی...

"پسند کرتے ہو اسے؟" وہ بولی، آواز میں ہلکی سی شرارت تھی مگر آنکھوں میں گہری سنجیدگی چھپی ہوئی تھی۔

"نہیں،" سکینڈر نے فوراً جواب دیا، جیسے خود کو بچانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"پھر؟"

"یہ مجھے کرتی ہے"...

وہ لمحے بھر کو رکا، پھر آہستہ سے بولا، "تم کسی کو کرتے ہو؟"

"رہنے دو... جسے بھی کرتا ہوں،" اس نے نظریں چرا لیں۔

تبھی خالہ سالوہ قریب آئیں اور ہلکے سے اس کا کان کھینچ لیا۔

"اب اپنی خالہ سالوہ سے بھی باتیں چھپاؤ گے؟"

سکندر نے ہلکی سی مسکراہٹ دبائی، مگر پھر اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔

"جس کو میں پسند کرتا ہوں... وہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔"

خالہ سالوہ ایک لمحے کو خاموش ہو گئیں۔

"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟"

"میں کل اس کے سابق شوہر سے ملا تھا... اس نے کہا کہ وہ اچھی لڑکی نہیں ہے"...

یہ سنتے ہی سکندر خود بھی خاموش ہو گیا، جیسے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا ہو۔

خالہ سالوہ نے گہرا سانس لیا اور آہستہ سے بولیں،

"اگر تم میرے سابق شوہر سے ملو تو کیا وہ تمہیں یہی نہیں کہے گا کہ میں اچھی ہوں؟"

سکندر خاموش تھا۔

"یہی تو ہمارا معاشرہ ہے، سکندر... رشتے ختم ہو جائیں تو کردار پر بھی مہر لگ جاتی ہے۔

ہم دوسرے انسان کا اچھا یا برا حصہ صرف اپنے تجربے سے جوڑ دیتے ہیں۔"

وہ تھوڑی دیر رکی، پھر بولی،

"دانش کے ابو اور میری علیحدگی ہو گئی... تو کیا اس کا مطلب ہے کہ وہ برے انسان تھے؟ نہیں... وہ بہت اچھے انسان ہیں، مگر شاید وہ مجھے سکون نہ دے سکے"...

سکندر نے دھیرے سے پوچھا،

"آپ نے دوبارہ شادی کیوں نہیں کی خالہ؟"

خالہ سالوہ کی آنکھوں میں ایک پرانی تھکن اتر آئی۔

"بیٹا... یہی تو مسئلہ ہے۔

طلاق یافتہ عورت سے کون شادی کرتا ہے؟

لوگ کہتے ہیں کہ جس نے اسے چھوڑ دیا، وہ لازماً اس میں کوئی برائی دیکھ کر ہی چھوڑے گا۔

اس کا کردار خراب ہو گا"...

وہ ہلکی سی ہنسی ہنسیں، مگر وہ ہنسی آنسوؤں کے قریب تھی۔

"میں نے بھی پھر امید چھوڑ دی... حالانکہ دل چاہتا تھا، گھر ہو، کوئی ہو جو مجھے پسند کرے... مگر زیادہ تر لوگ صرف جسم کے پیچھے آتے ہیں، عزت کے ساتھ کوئی نہیں اپناتا"...

اسی لمحے باہر سے آواز آئی،

"لگتا ہے رمشا آگئی ہے"...

خاموشی ٹوٹ گئی، مگر کمرے میں لفظوں کا بوجھ اب بھی کہیں ہوا میں لٹکا ہوا تھا۔

"بیٹا... ساتھ تم نے رہنا ہے، یہ فیصلہ تم نے کرنا ہے۔ مرد اپنی مرضی سے شادی کرتا ہے جب وہ خود مختار ہو۔ لیکن میرا ایک مشورہ ہے"...

"کیا؟" سکندر نے فوراً پوچھا۔

خالہ سالوہ نے اس کی طرف دیکھا، آواز میں نرمی مگر وزن تھا۔

"ہمیشہ اس سے شادی کرو جو تمہیں پسند کرے۔"

سکندر نے ہلکی سی بے بسی سے مسکرا کر سر جھکا لیا۔

"یہی تو مسئلہ ہے خالہ جی"...

"مطلب؟"

وہ لمحے بھر کو رکا، پھر صاف گوئی سے بولا،

"یہ دونوں ہی مجھے پسند کرتی ہیں۔"

خاموشی ایک پل کو چھا گئی، پھر خالہ سالوہ زور سے ہنس پڑیں، جیسے اس کی بات نے سارا ماحول ہلکا کر دیا ہو۔

"اوہ ہو!" وہ ہنستی ہوئی بولیں، "پھر تو تمہاری دونوں سے نہیں ہونی"!

سکندر نے بھی ہلکی سی مسکراہٹ دی، مگر آنکھوں میں الجھن باقی تھی۔

"مگر خالہ... مسئلہ یہ ہے کہ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا۔ دل بھی دونوں طرف کھنچتا ہے اور دماغ بھی الجھ جاتا ہے۔"

خالہ سالوہ نے ہنسی روکی، پھر اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے بولیں،

"بیٹا... جب دل دو کشتیوں میں سوار ہو جائے نا، تو آخر میں انسان دونوں سے ہی اتر جاتا ہے"...

"اسی لیے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو..." خالہ سالوہ نے نرمی سے کہا۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور دانیال اندر آیا۔ وہ کافی دیر سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرایا اور بولا،

"بھائی... تو پھر ایسا کر، ان دونوں سے ہی کر لے"!

سکندر نے فوراً اس کی طرف دیکھا، آنکھوں میں حیرت بھی تھی اور ہلکی سی بے یقینی بھی۔

"پہلے تو تُو مولانا طارق مسعود کو سننا بند کر، باس! یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اجازت نامہ لکھوانا پڑے گا پہلی بیوی سے... اور یہ بھی سوچ کہ ان دونوں میں پہلی کون بنے گی اور دوسری کون؟ اور جو پہلی بنے گی، وہ دوسری کی اجازت کیوں دے گی؟"

کمرے میں ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ بات کی سنگینی نے ماحول کو بھاری کر دیا تھا۔

دانیال نے آنکھیں پھیلا کر سکینڈر کو دیکھا، پھر آہستہ سے سر ہلاتے ہوئے بولا،

"یہ تو بہت ہی heavy سوال ہے"...

اور وہ آہستہ سے اٹھ کر باہر چلا گیا، جیسے اس کے پاس اس بحث کا کوئی آسان جواب ہی نہ ہو۔

سکندر نے خالہ سالوہ کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں اب بھی الجھن تھی۔

خالہ سالوہ نے ایک گہرا سانس لیا اور نرمی سے بولیں،

"تم زیادہ ٹینشن نہ لو، سکینڈر... وقت کے ساتھ سب پتہ چل جائے گا۔"

رمشا کچن میں داخل ہوئی تو خالہ سلویٰ پراٹھے پلیٹ میں نکال رہی تھیں اور سکندر میز کے پاس بیٹھا ہلکی سی خاموشی میں کھا رہا تھا۔ رمشا نے دروازے کے پاس ہی رک کر ہلکے سے پوچھا،

"کیا باتیں ہو رہی تھیں آپ لوگوں کی؟"

سکندر نے فوراً نظر اٹھائی اور معمولی سی مسکراہٹ کے ساتھ بات بدل دی،

"کچھ نہیں... بس یہی کہ خالہ کے پراٹھے کتنے زبردست ہوتے ہیں"...

خالہ سلویٰ نے چمچ رکھتے ہوئے ہنستے ہوئے کہا،

"ہاں ہاں، اب تعریفیں بعد میں، پہلے پلیٹ صاف کرو"!

سکندر نے ہلکا سا سر ہلایا،

"خالہ سچ میں... اتنے اچھے پراٹھے کم ہی ملتے ہیں"...

رمشا نے یہ سن کر ہلکی سی مسکراہٹ دی اور اندر آ کر بیٹھ گئی۔ ماحول کچھ دیر کے لیے نارمل ہو گیا، باتیں چلتی رہیں، کبھی خالہ کچھ کہتیں، کبھی دانش کا ذکر آ جاتا، اور سکندر خاموشی سے سنتا رہتا۔

کچھ دیر بعد سکندر نے پلیٹ رکھ دی اور کھڑا ہو گیا،

"چلو... اب رمشا کو چھوڑ آتا ہوں"...

دانش نے بائیک کی چابی اچھالتے ہوئے کہا،

"ہاں ہاں لے جاؤ... لیکن احتیاط سے، میری بائیک ہے یاد رکھنا"!

سکندر نے ہنستے ہوئے چابی پکڑی،

"فکر نہ کر، واپس ویسی ہی آئے گی جیسے لی ہے"...

رمشا نے اپنا دوپٹہ ٹھیک کیا اور باہر نکل آئی۔ سکندر نے بائیک اسٹارٹ کی اور وہ دونوں آہستہ آہستہ رات کی خاموش سڑک پر نکل پڑے۔

پھر وہ دونوں خاموشی سے بائیک پر رمشا کے گھر کی طرف چل پڑے۔ رات کافی گہری ہو چکی تھی، سڑکیں سنسان تھیں اور ہوا میں ایک عجیب سا سکون تھا۔ کچھ دیر بعد رمشا نے پیچھے سے آہستہ آواز دی،

"سکندر"...

"ہاں؟" اس نے سامنے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

رمشا نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر کہا،

"تمہارا شکریہ"...

سکندر نے ہلکے سے سر جھکا کر پوچھا،

"کس لیے؟"

رمشا نے دھیرے سے کہا،

"تمہاری جگہ اگر کوئی اور ہوتا نا... تو ایک نشے میں دھت لڑکی کے ساتھ پتہ نہیں کیا کر دیتا"...

سکندر نے ایک لمحے کے لیے سانس روکی، پھر آہستہ سے بولا،

"مجھے خود بھی اُس وقت سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا کروں... زیشان اور ثاقب نے سب کچھ پلان کیا تھا... مجھے پولیس کے ہاتھوں پھنسوانا چاہتے تھے... اب ان سے نمٹنا پڑے گا"...

رمشا فوراً بولی،

"پلیز... کوئی خطرہ مت مول لینا"...

سکندر نے ہلکی سی سختی سے جواب دیا،

"میری کسی سے ذاتی دشمنی نہیں ہے رمشا... بس وہ لوگ حد سے بڑھ رہے ہیں"...

رمشا نے نرمی سے کہا،

"پھر بھی... اپنا خیال رکھنا"...

سکندر نے مختصر سا جواب دیا،

"اچھا ٹھیک ہے"...

کچھ ہی دیر میں وہ رمشا کے گھر کے باہر پہنچ گئے۔ بائیک رک گئی۔ رمشا نیچے اتری اور ایک لمحے کے لیے رکی، پھر آہستہ سے آگے بڑھ کر اس کے گال پر ہونٹ رکھ دیے۔

سکندر ایک دم ساکت رہ گیا، جیسے وقت رک گیا ہو۔

اس نے فوراً سر گھما کر رمشا کو دیکھا، آنکھوں میں حیرت اور غصے کی ملی جلی کیفیت تھی،

"تمہاری تو...؟"

مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، رمشا تیزی سے پلٹی اور ہنستے ہوئے دروازے کی طرف بھاگ گئی۔

سکندر وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا، ہاتھ ابھی بھی ہوا میں ہلکا سا اٹھا ہوا تھا، جیسے وہ اس لمحے کو سمجھ ہی نہ پایا ہو...

سکندر نے ابھی بائیک اسٹارٹ ہی کی تھی کہ اچانک اس کا فون بج اٹھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اسکرین دیکھی کال داؤد جٹ کی تھی، اس کا چھوٹا بھائی۔

اس نے فوراً کال اٹھائی،

"ہاں داؤد؟ کیا ہوا؟"

دوسری طرف سے داؤد کی گھبراہٹ بھری آواز آئی،

"بھائی... بابا کو کچھ ہو گیا ہے... اچانک گر گئے تھے... ہم نے فوراً 1122 بلالی ہے... ابھی انہیں لے کر ہسپتال جا رہے ہیں"!

یہ سن کر سکندر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کی گرفت بائیک کے ہینڈل پر سخت ہو گئی،

"کیا... بابا کو؟"

داؤد کی آواز کانپ رہی تھی،

"ہاں بھائی... حالت ٹھیک نہیں ہے... تم جلدی آجاؤ"...

سکندر ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا، جیسے دماغ نے خبر کو پوری طرح قبول کرنے سے انکار کر دیا ہو۔ پھر اس نے فوراً خود کو سنبھالا،

"میں ابھی آرہا ہوں... تم ہسپتال ہی جاؤ... میں سیدھا وہیں پہنچتا ہوں"...

اس نے کال بند کی، بائیک کا ایکسلیریٹر زور سے موڑا اور اندھیرے میں تیزی سے نکل گیا۔

اس کے چہرے پر اب ساری ہلکی مسکراہٹ، ساری الجھن ختم ہو چکی تھی صرف ایک بے چینی، ایک خوف باقی تھا۔

"بس بابا ٹھیک ہوں..." وہ بار بار دل ہی دل میں یہی دہرا رہا تھا۔

اور خاموش سڑک پر اس کی بائیک کی رفتار اب پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہو چکی تھی...

لاہور کے دل میں، جہاں زندگی کا شور کبھی مکمل طور پر خاموش نہیں ہوتا، وہاں میو ہسپتال ایک پرانے، تھکے ہوئے دیو کی طرح کھڑا ہے. ایسا دیو جو صرف اینٹوں اور دیواروں سے نہیں بلکہ انسانوں کے دکھ، امیدوں اور بے بسی سے بنا محسوس ہوتا ہے۔

دور سے دیکھو تو یہ ایک عام سرکاری عمارت لگتی ہے، مگر جیسے جیسے آپ قریب جاتے ہیں، اس کی وسعت اپنا اثر دکھانے لگتی ہے۔ عمارت کے حصے ایک دوسرے میں یوں جڑے ہوئے ہیں جیسے یہ کبھی مکمل نہ ہوئی ہو، بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ پھیلتی گئی ہو ہر نئے مریض، ہر نئی کہانی کے ساتھ۔

اندر داخل ہوں تو ایک عجیب سا بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ لمبی، سنسان راہداریوں میں قدموں کی چاپ گونجتی ہے۔ دیواروں کا رنگ ماند پڑ چکا ہے، جیسے وقت نے ان سے زندگی نچوڑ لی ہو۔ ہر طرف ایک ہلچل ہے مگر پھر بھی ایک عجیب سی اداسی فضا میں گھلی ہوئی ہے۔

انتظار گاہوں میں بیٹھے لوگ صرف بیمار نہیں لگتے، بلکہ تھکے ہوئے، ہارے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کسی کی آنکھوں میں امید کی مدھم سی روشنی ہے، تو

کسی کے چہرے پر مایوسی کا سایہ۔ وقت یہاں رک سا جاتا ہے منٹ گھنٹوں میں بدل جاتے ہیں اور ہر گزرتا لمحہ دل پر بوجھ بڑھاتا جاتا ہے۔

باہر کا منظر بھی کم مختلف نہیں۔ ایمبولینسوں کی آوازیں، رکشوں کا ہجوم، اور بے چین چہروں کا سیلاب سب کچھ ایک ایسی تصویر بناتے ہیں جس میں زندگی اور موت ایک دوسرے کے بہت قریب کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ ہسپتال صرف بڑا نہیں، بلکہ اپنے اندر بے شمار کہانیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ ہر کونے میں ایک ادھوری دعا، ایک خاموش فریاد، اور ایک ان دیکھا درد موجود ہے۔ اور شاید یہی چیز اسے صرف ایک عمارت نہیں، بلکہ ایک احساس بنا دیتی ہے بھاری، تھکا ہوا، اور کسی حد تک دل کو دبا دینے والا۔

پاکستان کے کسی بھی کونے میں کوئی بھی بیمار ہوتا ہے تو سارے اسے میو ہسپتال لے جانے کا ہی کہتے ہیں۔

پھر آتی ہے وہ جگہ... جسے لوگ دھیمی آواز میں "گھڑی وارڈ" کہتے ہیں۔ کہتے ہیں، "اس میں جو بھی جاتا ہے، زندہ واپس نہیں آتا"...

یہ جملہ وہاں کی دیواروں سے ٹکرا کر جیسے ہر آنے والے کے دل میں اتر جاتا ہے۔

دروازے کے باہر کھڑے لوگ خاموش ہوتے ہیں، مگر ان کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی ہوتی ہیں۔ ہر چہرہ ایک دعا لیے کھڑا ہوتا ہے... اور ہر دعا میں ایک ڈر چھپا ہوتا ہے۔

روز یہاں سے اسٹریچرز گزرتے ہیں کبھی سفید چادروں میں لپٹی لاشیں، اور کبھی ایسے وجود جو سانس تو لے رہے ہوتے ہیں مگر زندگی جیسے کہیں پیچھے رہ گئی ہو۔

ہر گزرتا ہوا لمحہ ایک نئی کہانی ختم کرتا ہے... اور پیچھے چھوڑ جاتا ہے ٹوٹی ہوئی امیدیں، بکھرے ہوئے خواب، اور آنکھوں میں جمے آنسو۔

دروازہ جب بھی کھلتا ہے، سب کی نظریں ایک ساتھ اٹھتی ہیں۔

دل ایک لمحے کو رک جاتا ہے...

مگر اکثر باہر نکلتی ہے ایک ایسی خاموشی، جو کسی بھی چیخ سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔

یہ وارڈ صرف بیماریوں کا نہیں... یہ انسان کی بے بسی کا عکس ہے۔

یہاں آکر انسان کو سمجھ آتا ہے کہ زندگی کتنی نازک ہے... اور امید کتنی ضدی۔

کیونکہ ان سب کے باوجود...

لوگ آج بھی اس دروازے کے باہر کھڑے ہوتے ہیں

شاید اس امید میں کہ ایک دن، کوئی اندر جائے... اور زندہ واپس بھی آئے۔

اسی لمحے اسٹریچر پر ایک مریض کو تیزی سے اندر لایا گیا۔ دو تین وارڈ بوائز اسے سنبھالے ہوئے تھے اور جلدی جلدی آئی سی یو کی طرف لے جا رہے تھے۔ یہ وہی گھڑی وارڈ تھا جہاں ہر لمحہ بے چینی اور خوف فضا میں گھلا ہوتا تھا۔ اسٹریچر کے پیچھے پیچھے کئی لوگ گھبرائے ہوئے چہرے لیے بھاگ رہے تھے... وہ سب یعقوب جٹ کے رشتہ دار تھے۔

"راستہ دو! راستہ خالی کرو!" ایک کمپاؤنڈر نے زور سے آواز لگائی۔

سلمیٰ جٹ اپنے بھائی سجاد کے ساتھ تیزی سے چلتی ہوئی ان کے پیچھے تھی۔ اس کے چہرے پر ہوش اڑا دینے والی گھبراہٹ تھی، آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"بھائی... کچھ نہیں ہو گا نا...؟" اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

سجاد بھائی نے خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی کوشش کی،

"اللہ خیر کرے گا... ڈاکٹر دیکھ لیں گے"...

مگر اس کے اپنے لہجے میں بھی یقین کم اور خوف زیادہ تھا۔

یعقوب جٹ کو فوراً آئی سی یو کے دروازے کے اندر لے جایا گیا۔ دروازہ بند ہوا... اور باہر ایک بے چین انتظار شروع ہو گیا۔

"اچانک کیا ہوا تھا انہیں؟" کسی نے پریشانی سے پوچھا۔

"پتہ نہیں... بس اچانک طبیعت خراب ہوئی... سانس بھی ٹھیک سے نہیں آ رہی تھی..." داؤد جٹ نے تیزی سے جواب دیا، اس کی آواز میں گھبراہٹ صاف تھی۔

ہر کوئی ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہا تھا، مگر کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

سلمیٰ جٹ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی، اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے،

"یااللہ... رحم کر دے"...

آئی سی یو کے باہر لگی سرخ لائٹ جل رہی تھی...

اور اس کے اندر... یعقوب جٹ زندگی اور موت کے درمیان کہیں جھول رہے تھے...

اور باہر کھڑے سب لوگ...

بس ایک خبر کے انتظار میں تھے...

جو ان کی دنیا بدل سکتی تھی...

آئی سی یو کا دروازہ اچانک کھلا... اور سب کی نظریں ایک ساتھ دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ ڈاکٹر تیز قدموں سے باہر آیا، چہرہ سنجیدہ... آنکھوں میں وہ بوجھ جو کسی اچھی خبر کا اشارہ نہیں دیتا۔

"ڈاکٹر صاحب... کیا ہوا؟ میرے شوہر ٹھیک ہیں نا؟" سلمیٰ جٹ تقریباً دوڑ کر اس کے سامنے آگئی، ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

ڈاکٹر نے ایک لمحے کے لیے سب کو دیکھا... جیسے الفاظ چن رہا ہو۔ پھر اس نے گہری سانس لی اور دھیرے مگر بھاری لہجے میں کہا،

"مجھے افسوس ہے... مگر آپ کو یہ جاننا ہوگا"...

سب کے دل جیسے ایک ساتھ رک گئے۔

"انہیں... پھیپھڑوں کا کینسر ہے... اور وہ بھی کافی عرصے سے"...

ایک لمحے کے لیے مکمل سناٹا چھا گیا۔

"ک... کیا؟" داؤد کے منہ سے بے اختیار نکلا، جیسے اسے یقین ہی نہ آیا ہو، "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمیں تو کبھی پتا ہی نہیں چلا"...

سلمیٰ جٹ کی آنکھیں پھیل گئیں، اس کے ہونٹ ہلکے سے کھلے، مگر آواز نہ نکلی۔

"نہیں... یہ ممکن نہیں..." وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا،

"شاید انہوں نے علامات کو نظر انداز کیا... یا کسی کو بتایا نہیں... مگر اب حالت کافی نازک ہے"...

سکندر جو ابھی ابھی پہنچا تھا، وہیں دروازے کے قریب رک گیا۔ اس کے کانوں میں بس ایک ہی لفظ گونج رہا تھا

"کینسر"...

اس کے قدم جیسے زمین میں جم گئے۔

ڈاکٹر نے بات جاری رکھی،

"ہم نے انہیں دوا دے کر بے ہوش کر دیا ہے تاکہ درد کم ہو... مگر ہمیں فوری آپریشن کرنا ہو گا... ورنہ"...

وہ جملہ ادھورا چھوڑ گیا... مگر سب سمجھ گئے۔

سلمٰی جٹ کے آنسو بہنے لگے،

"یااللہ... یہ کیا ہو گیا"...

داؤد نے سر پکڑ لیا،

"بابا نے ہمیں بتایا کیوں نہیں...؟..."

ایک لمحے میں...

ان سب کی دنیا بدل چکی تھی...

سکندر نے بائیک ہسپتال کے باہر آ کر اس طرح روکی جیسے وقت اس کے ہاتھ سے نکل رہا ہو۔ اس نے اسٹینڈ لگانے کی بھی کوشش نہیں کی—بائیک ایک طرف زور سے گری، مگر اسے ذرا پرواہ نہ ہوئی۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی آواز گونج رہی تھی...

"بابا"...

وہ دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔ سانسیں بے ترتیب تھیں، سینہ تیزی سے اٹھ رہا تھا، جیسے دل قابو سے باہر ہو گیا ہو۔ ہر طرف لوگوں کی آوازیں، شور، اسٹریچرز... مگر اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

"بھائی... گھڑی وارڈ کدھر ہے؟!" اس نے ایک وارڈ بوائے کو تقریباً بازو سے پکڑ کر پوچھا۔

"سیدھا جا کر دائیں—" وہ کہہ ہی رہا تھا کہ سکندر اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بھاگ چکا تھا۔

لمبی راہداری… سفید دیواریں… ہر قدم کے ساتھ اس کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگ راستے میں آتے تو وہ بے دھیانی میں انہیں ایک طرف کر دیتا۔ اس کے چہرے پر خوف تھا… وہ خوف جو انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔

آخرکار وہ گھڑی وارڈ کے باہر پہنچا۔

وہاں کھڑے چہرے دیکھتے ہی اس کے قدم خود بخود سست ہو گئے۔

سلمیٰ جٹ… آنکھیں سرخ، چہرہ زرد… داؤد… سر جھکائے کھڑا… اور باقی رشتہ دار، سب کے چہرے ایسے جیسے کسی بری خبر کا سایہ ان پر پڑ چکا ہو۔

"بابا کہاں ہیں؟" سکندر کی آواز نکلی… مگر اس میں وہ مضبوطی نہیں تھی جو ہمیشہ ہوتی تھی۔

داؤد فوراً اس کے قریب آیا، آنکھیں بھر آئیں،

"بھائی…" اس کی آواز ٹوٹ گئی، "اندر ہیں… آئی سی یو میں"…

سکندر نے ایک جھٹکے سے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ سرخ لائٹ… بند دروازہ… اور اس کے پیچھے اس کا باپ…

"کیا ہوا ہے انہیں؟" اس نے جلدی سے پوچھا، جیسے ہر سیکنڈ اہم ہو۔

سلمیٰ جٹ نے اس کی طرف دیکھا، لب ہلے... مگر آواز نہ نکل سکی۔ آنسو خاموشی سے اس کے گالوں پر بہہ گئے۔

داؤد نے ہمت کر کے کہا،

"ڈاکٹر... کہہ رہے ہیں... انہیں کینسر ہے... پھیپھڑوں کا... کافی عرصے سے"...

ایک لمحے کے لیے سب کچھ رک گیا۔

سکندر کے کانوں میں جیسے شور بند ہو گیا۔ بس ایک لفظ... بار بار گونج رہا تھا...

"کینسر"...

"نہیں..." اس کے لبوں سے آہستہ سے نکلا، جیسے وہ حقیقت کو ماننے سے انکار کر رہا ہو، "یہ نہیں ہو سکتا... بابا کو کچھ نہیں ہو سکتا"...

اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی، مگر وہ اب بھی دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا... ہر قدم جیسے زمین میں دھنس رہا ہو۔

اس کے ذہن میں ایک کے بعد ایک یادیں ابھرنے لگیں

بابا کی آواز... ان کی ڈانٹ... ان کی ہنسی... وہ لمحے جب وہ ان کے ساتھ تھا...

اور آج... وہ دروازے کے اُس پار تھے... جہاں وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا...

وہ دروازے کے بالکل قریب جا کر رک گیا۔ ہاتھ آہستہ سے دروازے پر رکھا... جیسے وہ فاصلے کو کم کرنا چاہتا ہو۔

"بابا..." اس نے بہت دھیمی آواز میں کہا، جو شاید صرف اس کے دل نے سنی۔

اس کے پیچھے سب لوگ کھڑے تھے... مگر اس لمحے وہ بالکل اکیلا تھا۔

ایک ایسا بیٹا...

جو پہلی بار...

اپنے باپ کے لیے کچھ بھی نہ کر سکنے کی بے بسی محسوس کر رہا تھا...

سکندر دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا... آنکھیں بند... سانسیں بوجھل... اور دماغ میں وہی باتیں بار بار چل رہی تھی جو اس نے اپنے بابا کے ساتھ کی تھی...

"بیٹا... مرد وہ نہیں ہوتا جو اپنی مرضی سے جیئے... مرد وہ ہوتا ہے جو اپنی ذمہ داریوں کو پہچانے۔"

وہ اُس وقت بھی خاموش تھا... اور آج بھی...

"تم اس گھر کے بڑے بیٹے ہو... تو تم پر صرف اپنی نہیں، بلکہ اپنے پورے گھر کی فکر بھی آتی ہے۔ یہ بوجھ نہیں... یہ عزت ہے۔"

اس نے اُس وقت شاید صرف پڑھا تھا... آج وہی الفاظ دل پر وزن بن کر اتر رہے تھے...

"دنیا تمہیں تب تک مرد نہیں مانتی جب تک تم دوسروں کے لیے جینا نہ سیکھ لو... اور سب سے پہلے تمہیں خود اپنی عزت کرنی ہو گی۔"

سکندر کی نظریں جھک گئیں...

"سکندر... اپنی صحت کا خیال رکھو۔ یہ جسم امانت ہے۔ اگر یہ کمزور ہوا... تو تم کچھ نہیں کر سکو گے۔"

اس نے اُس وقت جواب نہیں دیا تھا...

"بیٹا... جب ایک مرد خود غرض ہو کر صرف اپنے لیے جینا شروع کر دیتا ہے نا... تو وہ آہستہ آہستہ سب کی نظروں میں بھی گر جاتا ہے... اور پھر سب سے خطرناک بات... وہ اپنی نظر میں بھی گرنے لگتا ہے۔"

یہ جملہ اب جا کر اس کے اندر کہیں گہرائی میں چبھ رہا تھا...

"لیکن اگر تم اپنے گھر والوں کا خیال رکھتے ہو... اگر تم اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہو... تو تم صرف ایک انسان نہیں رہتے... تم ایک سہارا بن جاتے ہو۔"

سکندر کی سانس بھاری ہو گئی...

"بادشاہ کی طرح جیو... مگر بادشاہ وہ ہوتا ہے جو رعایا کا خیال رکھتا ہے، نہ کہ صرف اپنے محل کا"...

سکندر نے آنکھیں کھولیں...

آئی سی یو کا دروازہ اب بھی بند تھا...

اور اس کے اندر...

وہ پہلی بار واقعی ان باتوں کو سمجھ رہا تھا...

مگر وقت... شاید اب ہاتھ سے نکل چکا تھا...

ڈاکٹر دوبارہ باہر آیا تو سب کی نظریں فوراً اس پر جم گئیں۔ اس کے چہرے کی سنجیدگی پہلے سے زیادہ تھی، جیسے اب وقت کم رہ گیا ہو۔

"ہم نے فیصلہ کر لیا ہے... ہم ان کا آپریشن شروع کرنے جا رہے ہیں۔"

اس نے مختصر سا کہا، "ہوش کب آئے گا، یہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پھیپھڑے کافی حد تک متاثر ہو چکے ہیں... اور اس کی بڑی وجہ سگریٹ نوشی ہے۔"

یہ جملہ سکندر کے سینے میں سیدھا اتر گیا۔

"سگریٹ..." وہ آہستہ سے بڑبڑایا، جیسے اسے پہلی بار واقعی مطلب سمجھ آیا ہو۔

اس کے ذہن میں اچانک وہ سب باتیں گھومنے لگیں جو اس کے بابا اسے بار بار کہتے تھے

"اپنے جسم کا خیال رکھو"...

"یہ جسم امانت ہے"...

"کمزوری تمہیں روک دے گی"...

اور وہ... ہر بار سن کر بھی نظر انداز کرتا رہا تھا۔

سکندر کے چہرے پر ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ اس کی آنکھیں بھاری ہو گئیں، مگر آنسو نہیں گرے — بس اندر ہی اندر کچھ ٹوٹ گیا تھا۔

ڈاکٹر نے بات جاری رکھی،

"ہم نے انہیں دوا دے کر مستحکم کیا ہے... اب ہم آپریشن کی تیاری کر رہے ہیں۔"

"آپریشن کی تاریخ دو فروری رکھی گئی ہے... مگر ابھی ہر چیز نازک ہے، دعا کریں۔"

یہ سنتے ہی سلمیٰ جٹ نے ہاتھ منہ پر رکھ لیا، اور داؤد ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

سکندر وہیں کھڑا تھا... بالکل ساکت۔

اس کے ذہن میں بس ایک ہی احساس تھا

کہ بابا اسے صرف نصیحت نہیں کرتے تھے...

وہ اسے بچانے کی کوشش کر رہے تھے... اور وہ سمجھ ہی نہیں پایا۔

اب ڈاکٹر اندر جا چکا تھا، اور وارڈ کے باہر ایک نئی خاموشی چھا گئی...

بھاری... تکلیف دہ... اور انتظار سے بھرپور...

سکندر اس خبر کے بعد اندر ہی اندر ٹوٹ چکا تھا۔ وہ آئی سی یو کے دروازے کے باہر مزید کھڑا نہیں رہ سکا۔ خالہ سلویٰ اور دانش بھی اب وہاں پہنچ چکے تھے، مگر سکندر کی حالت ایسی تھی کہ وہ کسی کی بات سننے کے قابل نہیں تھا۔

وہ آہستہ آہستہ وارڈ سے باہر نکلا، جیسے ہر قدم اس پر بھاری ہو۔ اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے، نظریں نیچے، اور سانسیں بے ترتیب۔

راہداری میں پہنچ کر اس نے دیوار کا سہارا لیا اور ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر سکون پھر بھی نہیں آیا۔ ہر طرف بس وہی آوازیں گونج رہی تھیں ڈاکٹر کی باتیں، "کینسر"، "آپریشن"، "سگریٹ"...

اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"میں نے کیوں نہیں سنا..." وہ آہستہ سے بڑبڑایا، جیسے خود سے سوال کر رہا ہو۔

اس کے ذہن میں بابا کی شکل بار بار آ رہی تھی وہی نصیحتیں، وہی سنجیدہ لہجہ، وہی فکر...

خالہ سلویٰ اور دانش پیچھے سے اسے دیکھ رہے تھے، مگر سکندر کسی سے بات کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔

وہ کچھ قدم آگے بڑھا، پھر رک گیا۔ اس کے دل پر عجیب سا بوجھ تھا، جیسے سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہو۔

"بابا..." اس کے ہونٹوں سے بس اتنا ہی نکلا۔

اور پھر وہ ہسپتال کی راہداری میں اکیلا کھڑا رہ گیا...

بھاری قدموں کے ساتھ، مگر زیادہ بھاری دل کے ساتھ...

سکندر ہسپتال کی راہداری میں دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ ہاتھ اب بھی کانپ رہے تھے، مگر اس نے جیب سے فون نکالا۔ اس کی انگلیاں بے ترتیب سی اسکرین پر چل رہی تھیں، جیسے دماغ کام کرنا چھوڑ چکا ہو۔

اس نے پہلا نمبر ڈائل کیا۔

"ارمان"...

کال جا رہی تھی... مگر کوئی جواب نہیں آیا۔

اس نے دانت بھینچے اور دوبارہ کوشش کی۔

"ارمان... اٹھا یار"...

مگر پھر بھی خاموشی۔

سکندر نے فون ہٹایا، ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں، پھر دوسرا نمبر ملایا۔

"دانیال"...

رنگ جا رہا تھا...

کوئی جواب نہیں۔

اس کے چہرے پر بے چینی بڑھ گئی۔ اس نے تیزی سے تیسرا نمبر ڈائل کیا۔

"شاہویر"...

پھر بھی... کوئی نہیں اٹھا رہا تھا۔

وہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا۔ فون ہاتھ میں ہی تھا، مگر اب اس کی اسکرین دھندلی لگ رہی تھی۔

"11 بج رہے ہیں... سب یونیورسٹی میں ہوں گے... اور کلاسز لے رہے ہوں گے اسی لیے فون نہیں اٹھا رہے..." اس نے یہ بات خود سے کی جیسے وہ باقی لوگوں کے لیے صفائی دے رہا ہو۔

اور ادھر وہ... ہسپتال کی دیوار کے ساتھ کھڑا، ایک ایسی خبر کے ساتھ جو اس کی پوری دنیا بدل چکی تھی۔

سکندر نے فون آہستہ سے نیچے کر دیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک کڑوی سی مسکراہٹ آئی۔

"سب مصروف ہیں..." وہ آہستہ سے بولا، جیسے خود کو ہی سنانا چاہ رہا ہو۔

اس نے دوبارہ ہسپتال کے اندر کی طرف دیکھا...

جہاں اس کا باپ زندگی اور موت کے درمیان تھا...

اور اس لمحے اسے پہلی بار شدت سے احساس ہوا کہ کچھ لمحات میں انسان واقعی اکیلا رہ جاتا ہے...

سکندر نے فون ہاتھ میں لیا مگر ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ اس کے ذہن میں پہلے رمشا اور پھر نادیہ کا خیال آیا... مگر فوراً ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"نہیں..." وہ آہستہ سے بڑبڑایا، "وہ پہلے ہی بہت کچھ سہہ چکی ہیں"...

اس نے فون جیب میں ڈالنے کی کوشش کی، مگر ہاتھ رک گیا۔ پھر ایک ہی نام ذہن میں آیا مومنہ۔

دل بھاری ہو گیا مگر پھر اس نے نمبر ڈائل کر دیا۔

کچھ ہی دیر میں کال مل گئی۔

"ہیلو؟" دوسری طرف سے مومنا کی عام سی آواز آئی۔

سکندر نے منہ کھولا مگر آواز نہیں نکلی... جیسے گلا بند ہو گیا ہو۔ وہ لمحہ جس میں وہ ہمیشہ مضبوط لگتا تھا، آج ٹوٹ گیا۔

"سکندر؟" مومنا نے دوبارہ پکارا، اس بار لہجے میں ہلکی سی تشویش تھی۔

اور پھر... سکندر نے بولنا شروع کیا۔

"مومنہ..." اس کی آواز ٹوٹ گئی، بھاری اور اجنبی سی... جیسے وہ خود بھی پہچان نہ پا رہا ہو۔

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

"کیا ہوا ہے؟ تم ٹھیک ہو؟" مومنہ فوراً سنجیدہ ہو گئی۔

سکندر نے ایک لمبی سانس لی، مگر الفاظ ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

"بابا..." بس اتنا کہا اور پھر خاموش ہو گیا۔

اس ایک لفظ میں ہی سب کچھ تھا۔

مومنہ ساکت رہ گئی۔ اس کے ہاتھ میں فون جیسے بھاری ہو گیا ہو۔

"ک... کیا ہوا بابا کو؟"

سکندر کی آواز مزید ٹوٹ گئی،

"ہسپتال میں ہیں... بہت سیریس ہے... ڈاکٹر کہہ رہے ہیں"...

وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔

مومنہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کی سانس رک سی گئی۔

"سکندر... تم رو تو نہیں رہے؟" اس نے دھیرے سے پوچھا، جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔

دوسری طرف سکندر کی خاموشی ہی جواب تھی۔

مومنہ کی اپنی آواز کانپ گئی،

"میں آ رہی ہوں... ابھی"...

مگر سکندر نے جلدی سے کہا،

"نہیں... بس دعا کرو... بس دعا"...

اور اس لمحے مومنہ کو پہلی بار شدت سے احساس ہوا کہ وہ سکندر جسے وہ ہمیشہ ہنستا، مزاق کرتا، سب کچھ ہلکے میں لیتا دیکھتی تھی...

آج واقعی ٹوٹ چکا ہے...

سکندر کی آواز بھاری تھی، "میں... سمجھ نہیں آرہا کیا کروں"...

مومنہ نے فوراً ٹون بدلا،

"تمہیں ابھی سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی تمہیں صرف وہاں کھڑے رہنا ہے، ٹھیک ہے؟"

سکندر نے ہلکے سے سر ہلایا، پھر خود کو یاد دلایا کہ وہ فون پر ہے،

"میں کوشش کر رہا ہوں"...

مومنہ نے نرمی سے کہا،

"کوشش نہیں... تم کر رہے ہو۔ فرق سمجھو۔"

سکندر ایک لمحے کو خاموش ہو گیا۔

پھر آہستہ سے بولا،

"مجھے لگ رہا ہے سب ختم ہو رہا ہے"...

مومنہ نے فوراً بات کاٹ دی،

"نہیں۔ ابھی کچھ ختم نہیں ہوا۔ تم بس اپنے بابا کے پاس رہو۔ تمہاری presence ابھی سب سے اہم ہے۔"

سکندر نے ہلکی سی سانس لی،

"میں نے ان کی باتیں ignore کیں... وہ بار بار کہتے تھے صحت کا خیال رکھو... میں نے سنا ہی نہیں"...

مومنا کی آواز تھوڑی نرم ہو گئی،

"اب guilt بعد میں سوچنا۔ ابھی تمہیں ان کے ساتھ ہونا ہے، خود کو کھونا نہیں ہے۔"

سکندر نے آہستہ سے کہا،

"تم اتنی نارمل کیسے ہو سکتی ہو اس وقت؟"

مومنہ نے ہلکی سی سانس لی،

"میں نارمل نہیں ہوں سکندر... میں بس تمہیں بکھرتے نہیں دیکھ سکتی۔"

یہ جملہ سن کر سکندر خاموش ہو گیا۔

کچھ لمحوں بعد مومنا نے نرمی سے کہا،

"مجھے بتاتے رہو کیا ہو رہا ہے... میں لائن پر ہوں۔ تم اکیلے نہیں ہو۔"

سکندر نے پہلی بار قدرے سیدھی آواز میں کہا،

"ٹھیک ہے... میں وہیں ہوں ICU ...کے باہر"...

مومنہ نے آہستہ سے جواب دیا،

"بس... وہیں رہو۔ میں ہوں یہاں۔"

اور اس خاموش لائن کے ساتھ، سکندر کو پہلی بار لگا کہ وہ واقعی اکیلا نہیں ہے...

سکندر کی آواز اب پہلے سے بھی زیادہ بھاری تھی، جیسے وہ ہر لفظ مشکل سے نکال رہا ہو۔

"مومنہ... 2 فروری کو بابا کا آپریشن ہے... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے"...

وہ رُکا، پھر آہستہ سے بولا،

"امی کی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے... میں انہیں ایسے روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا... میں کیا کروں؟"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔

پھر مومنہ کی آواز آئی نرم بھی، مگر سیدھی بھی۔

"سکندر... سب سے پہلے ایک بات سنو... تم ابھی سب کچھ ٹھیک کرنے کی کوشش مت کرو۔ تم بس سنبھلو، بس یہی کافی ہے۔"

سکندر نے ہلکی سی سانس لی، مگر کچھ بولا نہیں۔

مومنہ نے تھوڑا سا وقفہ لیا، پھر آہستہ مگر واضح لہجے میں کہا،

"تمہاری امی رو رہی ہیں کیونکہ وہ ڈری ہوئی ہیں... اور تم ڈرے ہوئے ہو تو وہ اور زیادہ ٹوٹ رہی ہیں۔"

سکندر کی انگلیاں فون پر سخت ہو گئیں۔

"تمہیں ان کے سامنے مضبوط ہونا پڑے گا، سکندر..." اس نے نرمی سے لیکن صاف کہا،

"جھوٹا مضبوط نہیں اصل مضبوط۔ جس کی آواز کانپ رہی ہو مگر وہ پھر بھی کھڑا ہو۔"

سکندر نے آہستہ سے کہا،

"مجھ سے نہیں ہو رہا"...

مومنہ فوراً بولی،

"ہو رہا ہے۔ تم کر رہے ہو ابھی بھی۔ تم نے مجھے فون کیا، تم نے بات کی... یہ ہی پہلا قدم ہے۔"

وہ ذرا نرم ہوئی،

"اپنی امی کے پاس جاؤ... بس ان کا ہاتھ پکڑ لو۔ زیادہ بات مت کرو اگر الفاظ نہیں مل رہے۔ کبھی کبھی خاموشی بھی سہارا ہوتی ہے۔"

سکندر نے ایک لمبی سانس لی۔

مومنہ اس سے ایک بڑی بہن کی طرح بات کر رہی تھی... نرم بھی، مگر مضبوط بھی۔ اس کی آواز میں وہ سکون تھا جو ٹوٹے ہوئے انسان کو سہارا دے دیتا ہے۔

اور سکندر... بس سن رہا تھا۔

پہلی بار وہ جواب دینے کے بجائے خاموش تھا، اور اس خاموشی میں بھی ایک عجیب سا سکون آ رہا تھا۔

مومنہ ہر لفظ میں اسے سنبھال رہی تھی، اور وہ دیوار کے ساتھ لگا بس اس کی باتیں سنتا جا رہا تھا... جیسے کسی نے اس کے اندر کا شور آہستہ آہستہ کم کر دیا ہو۔

سکندر فون بند کر کے آہستہ سے اٹھا۔ اس کے قدم اب بھی بھاری تھے مگر اس نے خود کو سنبھالا۔ وہ سیدھا اپنی ماں سلمیٰ جٹ کے پاس آیا جو ایک طرف بیٹھ کر تسبیح ہاتھ میں لیے مسلسل دعا کر رہی تھیں۔

سکندر ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور آہستہ سے ان کے کندھے سے لگا،

"ماما... سب ٹھیک ہو جائے گا... بابا ٹھیک ہو جائیں گے ان شاء اللہ"...

سلمیٰ جٹ نے کوئی جواب نہ دیا، بس تسبیح کے دانے تیزی سے چلتے رہے اور آنکھوں سے آنسو خاموشی سے گرتے رہے۔

سکندر نے ان کا ہاتھ تھام لیا،

"ماما... اللہ ہے نا... سب ٹھیک ہو جائے گا"...

اس کی آواز میں اب وہی لڑکھڑاہٹ تھی مگر اس میں ایک کوشش بھی تھی خود کو اور اپنی ماں کو سنبھالنے کی۔

وہ تھوڑا سا آگے ہوا اور داؤد کی طرف دیکھا،

"بھائی... تم بھی ہمت رکھو... بابا کو ہماری ضرورت ہے ابھی"...

داؤد نے سر جھکا لیا، مگر اس کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔

تھوڑی دور سلمیٰ جٹ کے پاس خالہ سلوٰی، دانش اور سجاد بھی کھڑے تھے۔ سب کے چہروں پر پریشانی صاف تھی۔ وہ سب سکندر کو دیکھ رہے تھے — جو خود ٹوٹا ہوا ہونے کے باوجود دوسروں کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سکندر نے ایک بار پھر سب کی طرف دیکھا اور دھیرے سے کہا،

"ہم سب کو ہمت رکھنی ہے... بابا کے لیے"...

اس کی بات پر وہاں ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی... مگر اس خاموشی میں بھی دعا تھی، امید تھی، اور ایک ایسا انتظار جو ہر دل کو بوجھل کیے ہوئے تھا۔

وہ اتنا مضبوط نہیں تھا لیکن وہ سب کو دکھاتا تھا کہ وہ کتنا زیادہ مضبوط ہے اور یہ بات کسی کو نہیں پتہ تھی۔

دو دن ہسپتال میں ایسے گزرے جیسے وقت تھم گیا ہو۔

سکندر نے ان دو دنوں میں خود کو بالکل نہیں روکا تھا۔ کبھی ڈاکٹر کے پیچھے، کبھی نرس کے پاس، کبھی دوائیوں کے لیے بھاگتا، کبھی آئی وی ڈرِپ چیک کرواتا۔ اس نے نہ صحیح طرح آنکھ بند کی، نہ سکون سے بیٹھا۔ اس کی ماں سلمٰی جٹ بھی مسلسل اسی حال میں تھیں، تسبیح ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹی، مگر نیند دونوں کی آنکھوں سے دور ہو چکی تھی۔

راتیں ہسپتال کی سفید روشنیوں میں گزر رہی تھیں... اور دن بھی کسی دھند میں لپٹے ہوئے لگتے تھے۔

سکندر کئی بار خون دے چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ اس کا بلڈ گروپ A positive ہے، جو یعقوب جٹ سے میچ کرتا ہے، اور ضرورت کے مطابق وہ بار بار اپنا خون دے رہا تھا۔ ہر بار سوئی لگتے وقت بھی وہ خاموش رہتا... جیسے جسم کی تکلیف اس کے دل کے مقابلے میں کچھ بھی نہ ہو۔

"بس بابا ٹھیک ہو جائیں..." وہ ہر بار یہی کہتا اور اگلے لمحے پھر کسی اور کام میں لگ جاتا۔

سلمٰی جٹ نے کئی بار اسے روکا بھی،

"سکندر... تھوڑا آرام کر لو"...

مگر وہ بس سر ہلا دیتا،

"نہیں ماما... ابھی نہیں"...

اور پھر وہی دوڑ بھاگ شروع ہو جاتی۔

آج 2 فروری تھی۔

ہسپتال کا ماحول پہلے سے زیادہ بھاری تھا۔ آئی سی یو کے باہر خاموشی اور بے چینی ایک ساتھ موجود تھی۔ ڈاکٹرز بار بار اندر باہر آ رہے تھے۔ سب کچھ تیار کیا جا رہا تھا۔

"آپریشن کچھ ہی دیر میں شروع ہو گا..." کسی نرس کی آواز نے ماحول کو اور سنجیدہ کر دیا۔

سکندر ایک لمحے کو رک گیا۔ اس نے آئی سی یو کے دروازے کی طرف دیکھا... جہاں اس کا بابا اندر تھے۔

اس کے ہاتھ خود بخود بند ہو گئے۔

آنکھوں میں تھکن بھی تھی، خوف بھی... اور ایک عجیب سی امید بھی۔

وہ آہستہ سے اپنی ماں کے پاس آیا اور ان کے برابر کھڑا ہو گیا۔

"ماما... آج سب ٹھیک ہو جائے گا..." اس نے دھیرے سے کہا۔

سلمٰی جٹ نے آنکھیں بند کر لیں، تسبیح تیز ہو گئی۔

سکندر نے ایک لمبی سانس لی اور خود سے جیسے وعدہ کیا...

"آج بس بابا واپس آ جائیں"...

آپریشن تھیٹر کے باہر ہسپتال کی راہداری میں ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دیواروں پر لگی سفید روشنی بھی جیسے سب کی گھبراہٹ بڑھا رہی تھی۔ دروازے کے اوپر سرخ بلب جل رہا تھا "Operation in Progress"

سکندر ایک جگہ کھڑا تھا مگر اس کے قدم بے چین تھے۔ کبھی وہ دروازے کے قریب جاتا، کبھی واپس آ کر دیوار سے ٹیک لگا لیتا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر اندر سب کچھ بھیگ رہا تھا۔

سلمٰی جٹ ایک کونے میں بیٹھی تسبیح لیے مسلسل دعا کر رہی تھیں۔ ان کے ہونٹ ہل رہے تھے مگر آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ہر دانہ جیسے ایک امید اور ایک خوف کے درمیان پھنس گیا ہو۔

داؤد جٹ بار بار دروازے کی طرف دیکھتا، پھر مٹھی بھینچ کر دیوار پر ہاتھ رکھ دیتا۔

"یا اللہ... بس خیر کر دے..." وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

خالہ سلوٰی آنکھوں میں آنسو لیے بیٹھی تھیں، اور دانش کبھی سکندر کو دیکھتا، کبھی زمین کو۔ سجاد ایک طرف کھڑا تھا مگر اس کا چہرہ بھی سخت پریشانی میں تھا۔

سکندر نے اچانک دیوار پر ہاتھ مارا اور سر جھکا لیا۔

"اتنا وقت کیوں لگ رہا ہے..." اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

داؤد فوراً اس کے پاس آیا،

"بھائی... حوصلہ رکھو"...

سکندر نے سر اٹھایا، آنکھیں سرخ تھیں،

"میں حوصلہ ہی تو رکھ رہا ہوں"...

اور پھر خاموشی۔

آپریشن شروع ہوئے تقریباً آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا... پھر ایک گھنٹہ... پھر ڈیڑھ گھنٹہ...

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ باہر کھڑے لوگوں کے چہروں پر تھکن بڑھتی جا رہی تھی۔ کوئی بول نہیں رہا تھا، صرف دلوں کی دھڑکنیں تیز تھیں۔

سکندر نے ایک بار آئی سی یو کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا،

"بابا... آپ سن رہے ہیں نا؟"

اس کی آواز کسی نے نہیں سنی، مگر اس کے دل نے سنی۔

دو گھنٹے مکمل ہونے کو تھے۔

سلمٰی جٹ کی تسبیح رک رک کر چل رہی تھی۔ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"یااللہ... رحم کر دے..." وہ بار بار دہرا رہی تھیں۔

داؤد کی آنکھوں میں اب تھکن واضح تھی۔

"یہ وقت اتنا لمبا کیوں ہو رہا ہے..." وہ خود سے بولا۔

خالہ سلوٰی نے آنسو صاف کیے،

"اللہ بہتر کرے گا"...

دانش نے پہلی بار سکندر کی طرف دیکھا،

"بھائی... انکل ٹھیک ہو جائیں گے"

سکندر نے اس کی طرف دیکھا... کچھ لمحے خاموش رہا... پھر دھیرے سے بولا،

"ہونگے... ضرور ہونگے"...

لیکن اس کی آواز میں اب وہ پہلے والی مضبوطی نہیں تھی بس ایک امید تھی جو ٹوٹنے سے بچی ہوئی تھی۔

اور پھر...

آپریشن تھیٹر کے دروازے کے اوپر سرخ لائٹ ابھی بھی جل رہی تھی...

اور ہر کوئی اسی لمحے کے انتظار میں تھا جو ان کی زندگی بدل سکتا تھا...

آپریشن تھیٹر کے دروازے پر سرخ لائٹ ابھی بھی جل رہی تھی۔ دو گھنٹے مکمل ہو چکے تھے مگر اندر سے کوئی خبر نہیں آرہی تھی۔

سکندر اب ایک ہی جگہ کھڑا تھا... جیسے اس کے جسم میں طاقت ہی ختم ہو گئی ہو۔ اس کی آنکھیں دروازے پر جمی تھیں، پلکیں بھی کم جھپک رہی تھیں۔

سلمیٰ جٹ کی تسبیح اب تقریباً رکی ہوئی تھی... وہ بس ہونٹوں سے کچھ الفاظ دہرا رہی تھیں، مگر آواز بہت مدھم تھی۔ ان کا چہرہ تھکن سے سفید پڑ چکا تھا۔

داؤد بار بار دروازے کے قریب جاتا، پھر واپس آکر رک جاتا۔

"یار... اتنا وقت کیوں لگ رہا ہے..." اس نے بے چینی سے کہا۔

خالہ سلوٰی نے روتے ہوئے کہا،

"یا اللہ... بس خیر ہو"...

سجاد نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے سر جھکایا ہوا تھا، اور دانش خاموش کھڑا کبھی سکندر کو دیکھتا، کبھی زمین کو۔

سکندر نے اچانک قدم آگے بڑھائے اور دروازے کے بالکل سامنے آگیا۔

اس نے آہستہ سے کہا،

"بابا... بس... اب اور نہیں"...

اس کی آواز بھاری تھی، ٹوٹتی ہوئی۔

اسی لمحے آئی سی یو کا دروازہ کھلا۔

سب ایک ساتھ سیدھے کھڑے ہو گئے۔

ایک ڈاکٹر باہر آیا، ماسک ابھی بھی چہرے پر تھا، مگر اس کی آنکھوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ خبر آسان نہیں۔

سکندر فوراً آگے بڑھا،

"ڈاکٹر... بابا؟"

ڈاکٹر نے ایک لمحے کے لیے سب کو دیکھا... پھر آہستہ سے کہا،

"آپریشن کا ایک حصہ ہو گیا ہے"...

یہ سنتے ہی سب نے سانس لیا، مگر ڈاکٹر نے فوراً ہاتھ اٹھا دیا۔

"لیکن... حالت ابھی بھی نازک ہے۔ ہم نے دوسرے حصے میں پوری کوشش کریں گے ہے، مگر اگلے 24 گھنٹے بہت اہم ہیں۔"

یہ جملہ سنتے ہی ماحول پھر سے بھاری ہو گیا۔

سلمٰی جٹ کی ٹانگیں جیسے جواب دے گئیں، وہ دیوار سے لگ کر بیٹھ گئیں۔

"یا اللہ..." بس اتنا ہی نکل سکا۔

داؤد نے مٹھیاں بھینچ لیں،

"ڈاکٹر... وہ ہوش میں کب آئیں گے؟"

ڈاکٹر نے سنجیدگی سے جواب دیا،

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہم نے انہیں ICU میں شفٹ کر دیا ہے۔ دوبارہ سے اپریشن شروع کرنے لگے ہیں آپ سب دعا کریں۔"

سکندر ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا۔ پھر آہستہ آہستہ ICU کے شیشے کی طرف بڑھا۔

وہ شیشے کے پار اپنے بابا کو دیکھ رہا تھا... ٹیوبز، مشینیں، اور خاموش جسم...

اس کے ہونٹ ہلے،

"بابا"...

پہلی بار اس کی آواز میں امید اور خوف دونوں تھے۔

پیچھے سب کھڑے تھے... خاموش... ٹوٹے ہوئے... مگر ابھی بھی ایک آخری امید کے ساتھ...

ٹھیک ہے، اس بار زیادہ قدرتی اور کم ڈرامائی انداز میں لکھتے ہیں:

سکندر ICU کے باہر کھڑا تھا۔ آنکھیں تھکی ہوئی تھیں، جسم جیسے بالکل جواب دے چکا ہو۔ بابا ابھی اندر بے ہوش تھے اور ہر طرف مشینوں کی آواز تھی۔

اسی وقت اس کے فون کی گھنٹی بجی۔

"مومنہ" لکھا ہوا تھا۔

اس نے فوراً کال اٹھائی۔

"ہیلو"...

مومنہ نے سیدھا پوچھا،

"کیا ہوا؟ آپریشن ہو گیا؟"

سکندر نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا،

"ہاں... ایک حصہ ہو گیا دوسرا حصہ ہونا ہے۔ بابا ابھی ICU میں ہیں، بے ہوش ہیں"...

کچھ لمحے خاموشی رہی۔

پھر مومنہ نے آہستہ سے کہا،

"اچھا... شکر ہے ایک آپریشن ہو گیا۔ اب صرف دوسرا ہونا ہے"

اس کی آواز میں سکون تھا، کوئی جلد بازی نہیں۔

"اب تم وہاں اکیلے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں..." سکندر نے مختصر جواب دیا۔

مومنہ نے نرمی سے کہا،

”ٹھیک ہے، اب تم بس وہیں رہو۔ زیادہ ادھر اُدھر مت بھاگو، خود کو تھوڑا سا آرام دو۔ سب کچھ ایک دم ٹھیک نہیں ہو گا، لیکن ابھی سب سے ضروری تمہاراوہاں ہونا ہے۔“

سکندر نے ICU کے شیشے کی طرف دیکھا۔

”میں وہیں ہوں...“ اس نے آہستہ کہا۔

مومنہ نے بس اتنا کہا،

”بس یہی کافی ہے۔ اگر تم بیٹھ سکتے ہو تو بیٹھ جاؤ، خود کو ٹوٹنے مت دو۔“

سکندر نے ایک گہری سانس لی۔

”ٹھیک ہے...“

کال بند ہو گئی۔

وہ فون ہاتھ میں لیے کچھ دیر کھڑا رہا، پھر آہستہ سے دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا...

اور شیشے کے پار اپنے بابا کو دیکھتا رہا۔

سکندر ابھی دیوار کے ساتھ بیٹھا ہی تھا، آنکھیں شیشے کے پار اپنے بابا پر جمی ہوئی تھیں، جب خالہ سلوٰی آہستہ سے اس کے پاس آئیں۔

وہ کچھ دیر اس کے چہرے کو دیکھتی رہیں وہ تھکن، وہ بے بسی، سب صاف نظر آ رہا تھا۔

پھر وہ اس کے برابر بیٹھ گئیں اور نرمی سے بولیں،

"میرا بہادر بچہ... پریشان نہ ہو۔"

سکندر نے نظریں اٹھا کر خالہ کو دیکھا، مگر کچھ بول نہ سکا۔

خالہ سلوٰی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا، پھر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"بس... بس کر میرے بیٹے..." ان کی آواز بھی بھاری ہو گئی تھی۔

سکندر ایک لمحے کو بالکل ساکت ہو گیا... پھر آہستہ سے ان کے کندھے سے لگ گیا۔ وہ پہلی بار تھا کہ اس نے خود کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔

خالہ سلوٰی نے اس کے ماتھے پر پیار سے بوسہ دیا اور آہستہ سے کہا،

"اللہ سب ٹھیک کرے گا"

سکندر نے بس ہلکے سے سر ہلا دیا۔

اس کے چہرے پر ابھی بھی تکلیف تھی... مگر اس لمحے اسے تھوڑا سا سہارا مل گیا تھا۔

ایک گھنٹہ گزرا اور پھر آپریشن اپنے آخری مرحلے میں تھا۔ دروازے کے اوپر جلتی سرخ لائٹ اب بھی مسلسل روشن تھی، مگر اندر کی حرکت تیز ہو چکی تھی کبھی کسی کے قدموں کی ہلکی سی آواز، کبھی مشینوں کی بیپ... باہر کھڑے لوگوں کے لیے ہر آواز کسی اشارے جیسی لگ رہی تھی۔

سکندر دروازے سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ آپس میں جکڑے ہوئے تھے، انگلیاں اتنی زور سے بند تھیں کہ رنگ بدل گیا تھا۔ وہ بار بار دروازے کو دیکھتا، پھر نظریں جھکا لیتا... جیسے دیکھنے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی۔

سلمٰی جٹ اب بھی تسبیح لیے بیٹھی تھیں، مگر اب ان کے ہونٹوں کی حرکت تیز ہو گئی تھی۔ داؤد ایک طرف کھڑا تھا، سر جھکا کر... خالہ سلوٰی آہستہ آہستہ دعا پڑھ رہی تھیں، اور دانش خاموشی سے سب کو دیکھ رہا تھا۔

اسی بے چینی کے درمیان سکندر کے فون کی گھنٹی بجی۔

اس نے سکرین دیکھی

"مومنہ"...

اس نے فوراً کال اٹھائی، جیسے اسے کسی سہارے کی ضرورت ہو۔

"ہاں مومنہ..." اس کی آواز تھکی ہوئی تھی، مگر اس میں چھپی ہوئی گھبراہٹ صاف تھی۔

"اب کیا ہو رہا ہے وہاں؟" مومنہ نے فوراً پوچھا، "آپریشن ختم ہوا؟"

سکندر نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

"نہیں... ابھی نہیں... بس لگ رہا ہے آخری سٹیج ہے"...

مومنہ کچھ لمحے خاموش رہی، پھر آہستہ سے بولی،

"تم ٹھیک ہو؟"

سکندر نے ہلکی سی ہنسی نکالی، مگر وہ ہنسی خالی تھی،

"پتہ نہیں... بس کھڑا ہوں"...

"بیٹھ جاؤ..." مومنہ نے فوراً کہا، "تم پچھلے دو دن سے سوئے بھی نہیں ہو، ایسے گر جاؤ گے تو مسئلہ اور بڑھ جائے گا۔"

"دل نہیں کر رہا بیٹھنے کا..." سکندر نے آہستہ سے جواب دیا۔

مومنہ نے سانس لی، پھر تھوڑا سا سیدھے انداز میں بولی،

"دل کو چھوڑو اس وقت... تمہیں اپنے آپ کو زبردستی سنبھالنا پڑے گا۔ تم اکیلے نہیں ہو وہاں، سب تمہیں دیکھ بھی رہے ہیں۔"

سکندر نے ایک نظر اپنی ماں اور باقی لوگوں کی طرف ڈالی...

پھر آہستہ سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی۔

"ہوں..." اس نے بس اتنا کہا۔

مومنہ نے نرم ہو کر پوچھا،

"پانی پیا تم نے؟"

"نہیں"...

"سکندر..." اس نے ہلکے سے ڈانٹا، "یہ ہیرو بننے کا وقت نہیں ہے۔ کم از کم پانی پی لو۔"

سکندر کے ہونٹوں پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ آئی،

"ٹھیک ہے... پی لیتا ہوں"...

چند لمحے دونوں خاموش رہے... مگر اس خاموشی میں بھی ایک ساتھ تھا۔

پھر مومنا نے آہستہ سے کہا،

"بس... تھوڑا سا اور... سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ"...

اسی لمحے آپریشن تھیٹر کے دروازے کے اوپر جلتی لائٹ ہلکی سی مدھم ہوئی...

سکندر ایک دم سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"مومنہ... لگتا ہے..." اس کی آواز جلدی میں بدل گئی، "دروازہ کھلنے والا ہے"...

"اوکے... جاؤ، میں بعد میں بات کرتی ہوں..." مومنہ نے فوراً کہا۔

"ہاں..." سکندر نے جلدی سے کال بند کی۔

اب اس کی نظریں صرف دروازے پر تھیں...

اور اس کے پیچھے کھڑے سب لوگ بھی ایک ساتھ کھڑے ہو گئے...

وہ لمحہ... جس کا سب کو انتظار تھا...

بالکل سامنے آچکا تھا...

دروازہ آہستہ سے کھلا... ایک دھیمی سی چرچراہٹ کے ساتھ... اور جیسے پوری راہداری نے ایک ہی لمحے میں سانس روک لی۔

سرخ لائٹ بجھ چکی تھی۔

ڈاکٹر باہر آیا۔ اس کے چہرے پر وہی تھکن، وہی سنجیدگی... مگر اس بار کچھ اور بھی تھا ایک ایسی خاموشی جو الفاظ سے پہلے سب کچھ کہہ دیتی ہے۔ اس نے دستانے اتارے، ایک نظر سامنے کھڑے سب لوگوں پر ڈالی... پھر نظریں ہلکی سی جھکا لیں۔

سکندر کے قدم خود بخود آگے بڑھے۔ اسے یاد بھی نہیں رہا کہ وہ کیسے دروازے تک پہنچا۔

"ڈاکٹر... بابا...؟"

اس کی آواز بہت ہلکی تھی... جیسے وہ خود بھی جواب سننے سے ڈر رہا ہو۔

ڈاکٹر نے ایک لمحہ آنکھیں بند کیں... پھر آہستہ سے کہا،

"I am sorry... ہم انہیں نہیں بچا سکے"...

یہ الفاظ جیسے فضا میں پھیل گئے... اور پھر ہر چیز رک گئی۔

نہ کسی نے فوراً رویا... نہ کوئی ہلا...

بس ایک سنّاٹا...

پھر اچانک...

"نہیں ییییی"!...

سلمٰی جٹ کی چیخ نے اس خاموشی کو چیر دیا۔

وہ ایک دم آگے بڑھیں، پھر ان کے قدم لڑکھڑائے اور وہ وہیں فرش پر بیٹھتی چلی گئیں۔

"میرے یعقوب...! یہ کیا کر دیا آپ نے...! مجھے اکیلا چھوڑ گئے"!...

ان کے ہاتھ بے قابو ہو کر سر پر جا رہے تھے، آنسو رُکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ تسبیح ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر بکھر گئی، دانے فرش پر پھیل گئے... جیسے ان کی دعائیں بھی ٹوٹ کر بکھر گئی ہوں۔

خالہ سلوٰی فوراً ان کے پاس جھک گئیں، انہیں اپنے بازوؤں میں لے لیا،

"باجی... اللہ کے لیے خود کو سنبھالیں... صبر کریں"...

مگر ان کی اپنی آواز بھی کانپ رہی تھی، آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔

داؤد پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا ہاتھ دیوار سے ٹکرایا، اس نے فوراً سہارا لیا جیسے وہ خود گرنے والا ہو۔

"نہیں... یہ نہیں ہو سکتا"...

وہ سر ہلا رہا تھا، بار بار...

"بابا ایسے نہیں جا سکتے... ابھی تو"...

اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ آنسو اس کے چہرے پر بہنے لگے، وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا، دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

دانش تیزی سے اس کے پاس آیا، اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا،

"داؤد... پلیز... خود کو سنبھالو"...

مگر اس کے اپنے ہونٹ بھی کانپ رہے تھے، آنکھیں بھر چکی تھیں۔

سجاد ماموں کچھ لمحے کے لیے وہیں کھڑے رہے... جیسے وہ بھی سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ ابھی کیا ہوا ہے... پھر انہوں نے ایک گہری سانس لی اور سیدھا سکندر کی طرف بڑھے۔

سکندر...

وہ ابھی بھی وہیں کھڑا تھا۔

بالکل اسی جگہ... جہاں ڈاکٹر نے وہ جملہ کہا تھا۔

اس کی آنکھیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں... جیسے وہ ابھی بھی انتظار کر رہا ہو کہ کوئی کہے "غلطی ہو گئی"... یا "وہ ٹھیک ہیں..."

سجاد ماموں نے اس کے کندھوں کو پکڑا،

"سکندر... بیٹا"...

کوئی جواب نہیں۔

انہوں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا،

"ہمت کرو... اللہ کی مرضی تھی"...

مگر سکندر کے ہاتھ ویسے ہی ڈھیلے لٹکے رہے۔

نہ اس نے ماموں کو پکڑا...

نہ خود کو چھڑایا...

اس کی سانسیں چل رہی تھیں... مگر جیسے اندر کچھ رک گیا ہو۔

اس کے کانوں میں شاید اب بھی وہی جملہ گونج رہا تھا

"ہم انہیں نہیں بچا سکے"...

اس نے آہستہ سے سر موڑا... دروازے کی طرف دیکھا...

جہاں اب خاموشی تھی... مکمل خاموشی...

اندر وہی کمرہ تھا... مگر اب وہاں "بابا" نہیں تھے...

صرف ایک جسم تھا... اور مشینوں کی بند ہوتی آوازیں۔

سلمٰی جٹ کا رونا اب بھی گونج رہا تھا...

داؤد کی سسکیاں...

خالہ سلوٰی کی دبی ہوئی آواز...

دانش کی تسلیاں...

سب کچھ ہو رہا تھا...

مگر سکندر کے لیے...

جیسے آوازیں آ ہی نہیں رہیں۔

اس کی آنکھیں خشک تھیں... ایک بھی آنسو نہیں...

بس ایک خالی پن...

ایسا خالی پن...

جیسے کسی نے اس کے اندر سے سب کچھ نکال لیا ہو...

وہ آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہوا... پھر دیوار سے ٹیک لگا لی...

اور پہلی بار... اس نے نظریں نیچے کر لیں...

مگر آنکھوں میں اب بھی کچھ نہیں تھا...

نہ آنسو...

نہ چیخ...

بس... ایک خاموشی...

جو شاید بہت دیر تک ٹوٹنے والی نہیں تھی...

سکندر کے لیے وقت جیسے وہیں رک گیا تھا۔

اسے اپنے ارد گرد سب کچھ بہت ہلکا، بہت دور سا محسوس ہو رہا تھا... جیسے کوئی پردہ سا آ گیا ہو۔ آوازیں آ تو رہی تھیں امی کا رونا، لوگوں کی سرگوشیاں، کسی کے قدموں کی چاپ مگر سب مدھم... دھندلی...

اس کی نظر بار بار دروازے کی طرف جاتی... مگر اب وہ صاف دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ سب کچھ جیسے دھند میں لپٹ گیا ہو۔

اس نے خود کو سیدھا کھڑا رکھنے کی کوشش کی۔

پاؤں زمین پر تھے... مگر جیسے وزن ختم ہو گیا ہو۔

ایک لمحے کو اس نے دیوار کا سہارا لیا... انگلیاں دیوار پر پھسل گئیں... اس نے دوبارہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"نہیں... میں ٹھیک ہوں..." وہ شاید خود سے ہی کہہ رہا تھا، بہت آہستہ۔

مگر جسم ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

اس کے گھٹنے ہلکے ہلکے کانپ رہے تھے... سانس بے ترتیب ہو رہی تھی... آنکھوں کے سامنے سب کچھ گھومنے لگا۔

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا... مگر قدم ٹھیک سے زمین پر نہ پڑا۔

اور اگلے ہی لمحے...

اس کا جسم لڑکھڑا گیا۔

وہ پوری طرح گرا تو نہیں... مگر دیوار سے ٹکراتا ہوا نیچے کی طرف جھک گیا۔

سجاد ماموں نے فوراً اسے تھام لیا،

"سکندر! بیٹا... سنبھالو خود کو"...

مگر سکندر کی آنکھیں اب بھی خالی تھیں۔

وہ کچھ دیکھ نہیں رہا تھا... کچھ سن نہیں رہا تھا...

بس ایک ہی چیز بار بار اس کے اندر گونج رہی تھی

"ہم انہیں نہیں بچا سکے"...

اور اس جملے کے ساتھ...

وہ اپنے پاؤں پر کھڑا رہنے کی طاقت بھی کھو رہا تھا...

یعقوب جٹ کی وفات کو پورا ایک گھنٹہ گزر چکا تھا... مگر سکندر کے لیے وقت اب بھی وہیں رکا ہوا تھا، اسی لمحے میں، اسی ایک جملے میں۔

ہسپتال کی راہداری میں اب پہلے جیسی بھاگ دوڑ نہیں تھی۔ لوگ آہستہ آہستہ کم ہو رہے تھے، مگر جو باقی تھے، ان کے چہروں پر وہی صدمہ جما ہوا تھا۔ کچھ رشتے دار آ چکے تھے، کوئی سر جھکا کر بیٹھا تھا، کوئی آہستہ آہستہ تسبیح پڑھ رہا تھا، اور کہیں کہیں دبی دبی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔

سلمٰی جٹ ایک طرف بیٹھی تھیں، آنکھیں سوجھی ہوئی، آنسو اب بھی رُک رُک کر بہہ رہے تھے۔ خالہ سلوٰی ان کے ساتھ بیٹھی تھیں، بار بار ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتیں، کبھی پانی پلاتیں، کبھی خود بھی چپکے سے آنسو پونچھ لیتیں۔

داؤد چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھا تھا، دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھامے... جیسے وہ ابھی بھی یقین نہیں کر پا رہا ہو۔ دانش اس کے پاس کھڑا تھا، مگر اب وہ بھی خاموش ہو چکا تھا کچھ تسلیاں ایسے لمحوں میں بے معنی لگتی ہیں۔

سجاد ماموں نے ارد گرد ایک نظر ڈالی... پھر خود کو سنبھال کر آگے بڑھے۔

"سب لوگ سن لیں... اب ہمیں گھر جا کر جنازے کا انتظام کرنا ہے... اپنے اپنے لوگوں کو اطلاع کر دیں"...

ان کی آواز میں دکھ بھی تھا، مگر ایک ذمہ داری بھی جو اب ان کے کندھوں پر آگئی تھی۔

پھر وہ سکندر کی طرف آئے۔

"سکندر بیٹا..." انہوں نے نرمی سے کہا، "اپنے دوستوں کو بھی بتا دو"...

سکندر بالکل قریب ہی کھڑا تھا... مگر جیسے وہ سن ہی نہ رہا ہو۔

نہ اس نے سر اٹھایا... نہ آنکھیں جھپکیں...

بس سامنے کہیں دیکھتا رہا، جہاں اب کچھ تھا ہی نہیں۔

اسی لمحے اس کے ہاتھ میں پکڑا فون بجنے لگا۔

اسکرین روشن ہوئی

"مومنہ"

فون بجتا رہا... ایک بار... دو بار... تین بار...

مگر سکندر کی انگلیاں حرکت نہ کر سکیں۔

سجاد ماموں نے اس کے ہاتھ سے آہستہ سے فون لیا اور کال اٹھالی۔

"السلام علیکم بیٹا"...

مومنہ سجاد ماموں کی بھاری آواز سن کے حیران ہوئی دوسری طرف سے

مومنہ کی آواز فوراً آئی، تیز اور بے چین،

"وعلیکم السلام... کیا ہوا؟ سکندر بات کیوں نہیں کر رہا؟ سب ٹھیک ہے نا؟"

سجاد ماموں نے ایک لمحہ آنکھیں بند کیں... جیسے الفاظ جمع کر رہے ہوں...

پھر بہت آہستہ، بہت سنبھل کر کہا،

"بیٹا... سکندر کے بابا... اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں"...

دوسری طرف مکمل خاموشی چھا گئی۔

کوئی سانس تک سنائی نہیں دی۔

پھر مومنہ کی ٹوٹی ہوئی آواز آئی،

"انا للہ وانا الیہ راجعون"...

اس کی آواز میں وہی صدمہ تھا... جیسے کسی نے اس کے اپنے دل پر بھی وار کیا ہو۔

"یہ... کب ہوا؟ ابھی تو آپریشن"...

سجاد ماموں نے آہستہ سے کہا،

"آپریشن تو ہو گیا تھا... مگر وہ بچ نہ سکے"...

پھر مومنہ نے فوراً پوچھا،

"سکندر...؟"

سجاد ماموں نے سکندر کی طرف دیکھا

وہ اب بھی وہیں کھڑا تھا... ہاتھ ڈھیلے... آنکھیں خالی... جیسے وہ اس دنیا میں موجود ہو کر بھی موجود نہ ہو۔

"کیسا ہے وہ؟" مومنہ کی آواز اور نرم ہو گئی، مگر اس میں فکر گہری تھی۔

سجاد ماموں نے دھیرے سے جواب دیا،

"کوشش کر رہا ہے ٹھیک رہنے کی"...

چند لمحے پھر خاموشی رہی...

پھر مومنہ نے آہستہ سے کہا،

"آپ... اس کا خیال رکھیں... وہ خود کو نہیں سنبھال پائے گا اس وقت"...

"ہاں بیٹا..." سجاد ماموں نے نرمی سے کہا۔

کال ختم ہو گئی۔

انہوں نے فون واپس سکندر کے ہاتھ میں رکھ دیا... مگر اس کی انگلیاں جیسے بے جان تھیں، فون بمشکل اس کے ہاتھ میں ٹھہرا ہوا تھا۔

سجاد ماموں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا،

"سکندر... بیٹا"...

کوئی جواب نہیں۔

سکندر نے آہستہ سے ایک پلک جھپکی...

پھر نظریں دوبارہ خالی خلا میں جما دیں۔

اس کے ارد گرد سب کچھ چل رہا تھا — لوگ، آوازیں، رونا، باتیں...

مگر اس کے اندر...

اب بھی مکمل خاموشی تھی۔

سجاد ماموں آہستہ آہستہ سکندر کے قریب آئے۔ ان کے چہرے پر تھکن بھی تھی اور ایک ذمہ داری کا بوجھ بھی جو اب اچانک ان کے کندھوں پر آ گیا تھا۔ انہوں نے سکندر کے کندھے پر ہاتھ رکھا، تھوڑا سا دبایا... جیسے اسے حقیقت کی طرف واپس لانا چاہتے ہوں۔

"بیٹا..." انہوں نے نرم مگر سنجیدہ لہجے میں کہا،

"اب تم گھر کے بڑے مرد ہو... سب کا دھیان رکھنا ہے تم نے"...

یہ جملہ عام حالات میں شاید سکندر کے اندر کچھ ہلا دیتا... مگر اس وقت...

وہ بس ان کی طرف دیکھتا رہا۔

چند لمحے گزرے... پھر اس نے آہستہ سے سر ہلایا،

"اچھا... ٹھیک ہے"...

آواز سیدھی تھی... بے اثر... جیسے وہ کوئی عام سی بات مان رہا ہو، نہ کہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی ذمہ داری۔

سجاد ماموں نے ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا... پھر خاموشی سے پیچھے ہٹ گئے۔

ادھر ہسپتال کا ماحول اب بدل چکا تھا۔ جہاں کچھ دیر پہلے بے بسی اور انتظار تھا، اب وہاں ایک مصروفیت آ گئی تھی۔ لوگ مختلف کاموں میں لگ گئے تھے۔

کوئی کاغذات مکمل کروا رہا تھا...

کوئی ایمبولینس کے لیے کال کر رہا تھا...

کوئی کفن دفن کے انتظامات کی بات کر رہا تھا...

کوئی رشتہ داروں کو اطلاع دے رہا تھا...

ہر طرف آوازیں تھیں... مگر ہر آواز کے پیچھے دکھ صاف سنائی دے رہا تھا۔

سلمٰی جٹ کو دو عورتوں نے سنبھال رکھا تھا۔ وہ بار بار بے قابو ہو کر روتیں،

"مجھے میرے یعقوب کے پاس لے جاؤ... مجھے ان کو دیکھنا ہے"...

خالہ سلوٰی انہیں گلے لگائے رکھتیں،

"باجی... خود کو سنبھالیں... ابھی سب کرنا ہے"...

ان کی اپنی آنکھیں بھی نم تھیں، مگر وہ خود کو مضبوط بنا کر دوسروں کو سنبھال رہی تھیں۔

داؤد ادھر ادھر گھوم رہا تھا، جیسے اسے سمجھ نہ آ رہا ہو کیا کرے۔ کبھی کسی کے ساتھ بات کرتا، کبھی خاموش ہو کر کھڑا ہو جاتا... اور ہر چند لمحوں بعد اس کی آنکھیں بھر آتیں۔

"یار... بابا ایسے کیسے جا سکتے ہیں..." وہ خود سے ہی بڑبڑاتا۔

دانش اس کے ساتھ ہی تھا، ہر بار اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا،

"بھائی... صبر کرو"...

اور ان سب کے درمیان...

سکندر کھڑا تھا۔

لوگ اس کے پاس آتے،

"سکندر یہ سائن کر دو"...

"بیٹا یہ فارم جمع کروانا ہے"...

"ایمبولینس آ گئی ہے، ادھر آؤ"...

وہ سب کچھ کر رہا تھا۔

خاموشی سے...

اس نے کاغذات پر سائن کیے...

سر ہلا کر باتیں سنیں...

جہاں کہا گیا وہاں گیا...

مگر اس کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

نہ آنکھوں میں نمی...

نہ آواز میں لرزش...

نہ کسی حرکت میں بے چینی...

بس ایک عجیب سا سکون... جو اصل میں سکون نہیں تھا... بلکہ ایک گہرا خالی پن تھا۔

جب میت کو سٹریچر پر لایا گیا تو ایک لمحے کے لیے سب لوگ رک گئے۔

سفید چادر میں لپٹا ہوا جسم... جس کے گرد کھڑے ہر انسان کے دل میں ایک کہرام برپا تھا۔

کسی نے چادر کا کونہ اٹھا کر آخری بار چہرہ دیکھا... اور پھر رونے کی آواز بلند ہو گئی۔

سلمیٰ جٹ دوبارہ بے قابو ہو گئیں،

"میرے یعقوب"!...

داؤد نے بھی چہرہ موڑ لیا، آنسو روک نہ سکا۔

مگر سکندر...

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

اس نے سٹریچر کے قریب جا کر ایک لمحے کے لیے اس سفید چادر کو دیکھا۔

بس دیکھا...

نہ اس نے ہاتھ بڑھایا...

نہ چہرہ کھولا...

نہ کوئی لفظ کہا...

جیسے وہ یقین ہی نہ کر پا رہا ہو کہ اس چادر کے نیچے واقعی اس کے بابا ہیں۔

ایمبولینس کے دروازے بند ہوئے۔

ایک دھیمی سی آواز کے ساتھ گاڑی چل پڑی۔

سب لوگ اپنے اپنے سواریوں میں بیٹھ گئے... کوئی روتا ہوا، کوئی خاموش... کوئی دعا کرتا ہوا...

گھر پہنچنے تک فضا اور بھاری ہو چکی تھی۔

گھر کے دروازے پر جیسے ہی ایمبولینس رکی، محلے کے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ عورتوں کے رونے کی آوازیں، مردوں کی دبی دبی باتیں... ہر طرف ایک سوگ کا منظر تھا۔

میت کو گھر کے اندر لایا گیا... کمرے کے بیچ میں رکھا گیا... سفید چادر اب بھی ویسے ہی تھی... مگر اب اس کے گرد لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔

کوئی قرآن پڑھ رہا تھا...

کوئی دعا کر رہا تھا...

کوئی آکر سلمٰی جٹ کو تسلی دے رہا تھا...

کوئی داؤد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر صبر کی تلقین کر رہا تھا...

اور سکندر...

وہ دروازے کے قریب کھڑا تھا۔

لوگ اس کے پاس آ کر کہتے،

"بیٹا صبر کرو"...

"اللہ ہمت دے"...

وہ بس سر ہلا دیتا۔

اس کے چہرے پر اب بھی کوئی اثر نہیں تھا۔

جیسے اس کے اندر کا درد اتنا گہرا ہو چکا تھا... کہ اب آنسوؤں کی شکل میں باہر آ ہی نہیں رہا تھا۔

وہ کبھی کمرے کے اندر میت کو دیکھتا...

کبھی باہر کھڑے لوگوں کو...

مگر اس کی آنکھوں میں کچھ نہیں تھا۔

نہ سوال...

نہ احتجاج...

نہ انکار...

بس ایک خاموشی...

ایسی خاموشی...

جو چیخوں سے بھی زیادہ دردناک ہوتی ہے...

سجاد ماموں کمرے کے ایک کونے میں کھڑے تھے، اردگرد کا شور، قرآن کی تلاوت، رونے کی آوازیں—سب ایک ساتھ چل رہا تھا۔ انہوں نے تھکے ہوئے لہجے میں سکندر کو دیکھا اور آہستہ سے کہا،

"اپنے دوستوں کو بھی بلالو بیٹا... اطلاع دینا ضروری ہے"...

سکندر نے ایک لمحے کے لیے ان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں خالی تھیں، چہرہ سپاٹ... جیسے وہ بات سن رہا ہو مگر اس تک پہنچ نہیں رہی۔

پھر اس نے بالکل سیدھا سا جواب دیا،

"نہیں... کوئی ضرورت نہیں۔ میں خود دیکھ لوں گا سب کو"...

بس اتنا کہا... اور نظریں دوبارہ کمرے کے اندر میت کی طرف کر دیں۔

وہاں موجود سب لوگ اس کے لہجے اور اس کے انداز کو دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ کسی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ مضبوطی ہے یا کوئی اور کیفیت۔ وہ نہ رو رہا تھا، نہ ٹوٹ رہا تھا، نہ چیخ رہا تھا... بس چل رہا تھا، کام کر رہا تھا، اور باتیں کر رہا تھا جیسے سب کچھ اس کے اندر کہیں بند ہو چکا ہو۔

داؤد ایک کونے میں بیٹھا رو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، آنکھیں سرخ تھیں، آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ مگر سکندر...

وہ کھڑا تھا۔

بالکل سیدھا۔

نہ اس کی آنکھیں بھریں، نہ آواز ٹوٹی۔

وہ کبھی کسی کو جواب دے رہا تھا، کبھی کسی کے کہنے پر ہلکا سا سر ہلا دیتا، کبھی میت کے قریب جا کر ایک لمحہ کھڑا ہو جاتا... پھر واپس آ جاتا۔

لوگ اس کی طرف دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

"اتنا صدمہ... اور یہ ایسے کیسے ہے؟"

"نہ آنسو، نہ کچھ"...

"بہت مضبوط ہے"...

مگر سچ یہ تھا کہ وہ مضبوط نہیں لگ رہا تھا... وہ بس کہیں اندر سے خالی تھا۔

داؤد بار بار اس کی طرف دیکھتا،

"بھائی..." اس کی آواز رندھی ہوئی تھی، "تم ٹھیک ہو؟"

سکندر نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا، پھر آہستہ سے کہا،

"ہوں"...

بس۔

ایک لفظ۔

نہ تسلی، نہ شکایت، نہ درد کا اظہار۔

اور پھر وہی خاموشی۔

جیسے اس کے اندر سب کچھ ایک ساتھ بند ہو گیا ہو... اور باہر صرف ایک چلتا پھرتا انسان رہ گیا ہو۔

وہ ایسا مرد تھا جو اپنے باپ کی موت پر بھی نہیں رویا تھا۔

2 فروری کو یعقوب جٹ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے... اور اس کے بعد جیسے ہر چیز اپنی جگہ سے ہل گئی تھی۔

گھر کا سکون، روز مرہ کی روٹین، سب کچھ بدل گیا تھا۔

9 فروری سے طارق انور ہسپتال میں داخل تھے، ایک اور پریشانی نے سر اٹھا لیا تھا... اور حالات جیسے رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

ادھر 14 فروری کو ارمان نے مومنہ کو پروپوز کر دیا تھا۔ مومنہ کبھی بھی کسی قسم کے رشتے میں پڑنا نہیں چاہتی تھی... وہ ہمیشہ خود کو ان چیزوں سے دور رکھتی آئی تھی... مگر اب وہ جانے انجانے میں اسی راستے پر آچکی تھی، جہاں سے وہ ہمیشہ بچنا چاہتی تھی۔

اور سکندر...

وہ یونیورسٹی آنا چھوڑ چکا تھا۔

یعقوب جٹ کے جانے کے بعد اس کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا تھا۔ اب اس کے پاس نہ وقت تھا، نہ وہ ذہنی حالت... کہ وہ کلاسز، دوستوں یا عام زندگی کے بارے میں سوچ سکے۔

وہ اپنی ایک الگ جنگ لڑ رہا تھا۔

قرضے تھے... جنہیں ادا کرنا تھا۔

گھر تھا... جسے سنبھالنا تھا۔

اور اپنے باپ کا کام... جو اب اس کے کندھوں پر آ چکا تھا۔

ہر دن ایک بوجھ کی طرح لگتا تھا۔

وہ صبح سے شام تک کام میں لگا رہتا، لوگوں سے باتیں کرتا، حساب کتاب دیکھتا... مگر اندر سے وہ وہی خالی سا انسان تھا۔

کئی بار وہ خود سے پوچھتا بھی نہیں تھا کہ وہ کیسا ہے...

کیونکہ شاید اس کے پاس اس سوال کا جواب ہی نہیں تھا۔

اس کے لیے اب سب کچھ بہت مشکل ہو چکا تھا...

مگر پھر بھی وہ رک نہیں سکتا تھا... کیونکہ اب رکنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

سکندر نے آخر کار ایک ریسٹورنٹ میں نوکری کر لی۔ اب اس کی زندگی ایک نئے معمول میں بندھ گئی تھی صبح سے رات تک کام... برتنوں کی آوازیں، آرڈرز کی چیخ پکار، لوگوں کا آنا جانا... اور وہ ان سب کے بیچ ایک خاموش سا وجود بن کر رہ گیا تھا۔

وہ وہاں کام کرتا تھا... مگر جیتا نہیں تھا۔

فون اکثر اس کی جیب میں پڑا رہتا... بار بار بجتا... پھر خاموش ہو جاتا۔

نادیہ کی کالز...

رِمشا کے میسجز...

دوستوں کے بار بار آنے والے کالز...

مگر سکندر نے سب سے جیسے خود کو کاٹ لیا تھا۔

وہ کسی کی کال نہیں اٹھاتا تھا... نہ جواب دیتا تھا... نہ وضاحت... نہ کوئی بہانہ...

جیسے اس نے فیصلہ کر لیا ہو کہ اب اسے اکیلے ہی سب کچھ جھیلنا ہے۔

کئی بار وہ بریک کے دوران فون نکالتا... سکرین پر مسڈ کالز دیکھتا... کچھ لمحے رکتا... پھر فون واپس جیب میں رکھ دیتا۔

نہ اس میں بات کرنے کی ہمت تھی...

نہ کسی کو کچھ سمجھانے کی طاقت...

اس کے لیے اب ہر رشتہ ایک اضافی بوجھ لگنے لگا تھا... اور وہ پہلے ہی کافی بوجھ اٹھا رہا تھا۔

وہ اپنی ایک خاموش جنگ لڑ رہا تھا...

ایسی جنگ... جس میں نہ کوئی اس کے ساتھ تھا... نہ وہ کسی کو ساتھ آنے دے رہا تھا۔

اور شاید سب سے مشکل بات یہی تھی...

کہ وہ واقعی اکیلا لڑ رہا تھا۔

سکندر نے کئی راتیں جاگ کر گزاری تھیں۔ کام، قرضے، گھر... سب کچھ سنبھالتے سنبھالتے وہ اندر سے مزید خالی ہوتا جا رہا تھا۔ ایک دن اس کے ذہن میں خیال آیا...

"کیوں نہ خالہ سلوٰی کے ہاں شفٹ ہو جاؤں"...

وہ جانتا تھا کہ خالہ اکیلی ہیں... اور اب اس کی اپنی ماں سلمٰی جٹ بھی اکیلی ہو چکی تھیں۔

جب اس نے یہ بات اپنی ماں کے سامنے رکھی تو سلمٰی جٹ فوراً ماننے کو تیار نہیں ہوئیں۔

"نہیں... مجھے اپنا گھر نہیں چھوڑنا..." ان کی آواز میں درد بھی تھا اور ضد بھی۔

یہ گھر صرف اینٹوں کا نہیں تھا... یہ یادوں کا تھا۔ ہر کمرہ، ہر دیوار... یعقوب جٹ کی موجودگی کا احساس دلاتی تھی۔

سکندر خاموش رہا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ فیصلہ آسان نہیں ہے۔

مگر وقت کے ساتھ ساتھ حقیقت خود سامنے آگئی۔

سلمٰی جٹ دن بھر خاموش رہنے لگیں... راتوں کو جاگتی رہتیں... کبھی اچانک رونے لگتیں۔ گھر کی وہ خاموشی جو پہلے سکون دیتی تھی، اب کاٹنے کو دوڑتی تھی۔

آخر کار... ایک دن انہوں نے خود ہی آہستہ سے کہا،

"شاید... اکیلے رہنا مشکل ہو جائے گا"...

یہ وہ لمحہ تھا جب سکندر نے بغیر کچھ کہے ان کی طرف دیکھا... اور بس ہلکا سا سر ہلا دیا۔

چند دنوں میں سامان سمیٹا گیا۔ ہر چیز اٹھاتے ہوئے جیسے ایک ایک یاد بھی ساتھ اٹھ رہی تھی۔ دروازہ بند کرتے وقت سلمٰی جٹ نے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا... آنکھیں بھر آئیں... مگر انہوں نے کچھ نہیں کہا۔

اور پھر...

تینوں ماں بیٹے خالہ سلوٰی کے گھر آ گئے۔

اب ایک ہی چھت کے نیچے دو بہنیں تھیں... دونوں نے ایک ہی طرح کا دکھ جھیلا تھا... اور دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔

خالہ سلوٰی نے دروازہ کھولا تو سلمٰی جٹ کو گلے لگا لیا...

کچھ لمحے دونوں بہنیں کچھ نہ بول سکیں... بس ایک دوسرے کے کندھے پر سر رکھے کھڑی رہیں۔

یہ وہ رشتہ تھا جسے الفاظ کی ضرورت نہیں تھی۔

گھر میں اب تھوڑی سی رونق آ گئی تھی... دانش بھی تھا... سکندر بھی... اور داؤد بھی مگر اس رونق کے پیچھے ایک مشترکہ دکھ تھا جو سب کو جوڑے ہوئے تھا۔

سکندر نے ایک نظر اپنی ماں کو دیکھا... پھر خالہ کو...

اور شاید پہلی بار اسے لگا کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔

مگر اس کے باوجود...

اس کی اپنی جنگ اب بھی جاری تھی...

بس اب اس جنگ کے درمیان... اسے ایک چھت مل گئی تھی۔

ایک دن دانش نے سکندر کو کمرے کے باہر بیٹھا دیکھا۔ وہ خاموشی سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کچھ سوچ رہا تھا۔ دانش آہستہ سے اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"سکندر..." اس نے نرمی سے کہا، "اب تمہیں یونیورسٹی واپس چلے جانا چاہیے... بہت دن ہو گئے ہیں۔ تمہاری پڑھائی کا نقصان ہو رہا ہے۔"

سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

دانش نے بات جاری رکھی،

"گھر کی فکر مت کرو... میں ہوں نا۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ اپنی ماں کی جدائی میں بھی میں نے سب سنبھالا تھا... تم بس اپنی زندگی خراب مت کرو"...

سکندر نے ہلکا سا سر جھکایا، جیسے وہ سن رہا ہو... مگر مان نہیں رہا۔

"نہیں دانش..." اس نے آہستہ سے کہا، "میری پڑھائی پوری ہو چکی ہے اب"...

دانش فوراً بولا،

"یہ کیا بات ہوئی؟ ابھی تمہاری ڈگری".....

"میں نے کہانا..." سکندر نے اس کی بات کاٹ دی، مگر آواز میں غصہ نہیں تھا... بس ایک سختی تھی، "اب مجھے صرف کام کرنا ہے... اور اپنی فیملی کے لیے جینا ہے"...

چند لمحے خاموشی رہی۔

پھر سکندر نے گہری سانس لی، نظریں کہیں دور جما دیں،

"میں باہر کی دنیا میں اتنا مصروف رہا... کہ اپنے ہی گھر کو نظر انداز کر دیا"...

اس کی آواز اب پہلے سے آہستہ ہو گئی تھی،

"مجھے یہ تک نہیں پتا چلا کہ بابا کو لنگ کینسر ہے"...

وہ رکا... جیسے یہ جملہ خود اس کے لیے بھی بھاری ہو۔

"انہوں نے مجھے کبھی بتایا ہی نہیں... اور میں نے کبھی پوچھا ہی نہیں"...

دانش خاموش ہو گیا۔

سکندر نے اپنی بات جاری رکھی،

"میں اپنی فیملی کی طرف دھیان ہی نہیں دے سکا... اور جب سمجھ آیا... تب بہت دیر ہو چکی تھی"...

اس نے مٹھی ہلکی سی بند کی،

"اب مجھے موقع ملا ہے... کہ میں ان کا خیال رکھوں"...

وہ سیدھا ہو کر بیٹھا،

"بابا یہی چاہتے تھے نا... کہ میں مرد بنوں... گھر کی ذمہ داری اٹھاؤں"...

اس کی آواز میں اب ایک عجیب سا یقین تھا... مگر اس یقین کے پیچھے درد چھپا ہوا تھا۔

"اور میں اب وہی کر رہا ہوں"...

دانش اسے دیکھتا رہا... کچھ کہنا چاہتا تھا... مگر الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

سکندر نے آہستہ سے کہا،

"بس اب مجھے یہی کرنا ہے"...

اور پھر وہ خاموش ہو گیا...

جیسے اس نے اپنے لیے ایک راستہ چن لیا ہو

چاہے وہ کتنا ہی بھاری کیوں نہ ہو۔

دانش نے اس کی بات غور سے سنی، پھر تھوڑا سا آگے جھک کر سنجیدگی سے بولا،

"وہ تو ٹھیک ہے سکندر... لیکن اگر تم اپنی پڑھائی مکمل کرو گے تو اپنے گھر والوں کی ذمہ داری اور اچھے طریقے سے لے سکو گے۔ تمہیں اب ٹاپ کرنے کے لیے نہیں پڑھنا... بس پاس ہو جاؤ، اتنا ہی کافی ہے۔"

وہ رکا، پھر نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولا،

"اتنے سال جو تم نے اپنی پڑھائی کو دیے ہیں... وہ ایسے ضائع ہو جائیں گے؟ ایسا کرو... روز نہیں، کبھی کبھی یونیورسٹی چلے جایا کرو۔ ہفتے میں ایک یا دو دن... اپنے پروفیسرز سے بات کرو، وہ سمجھ جائیں گے تمہیں"...

سکندر ہلکا سا مسکرایا... مگر وہ مسکراہٹ خالی تھی۔

اس نے آہستہ سے سر ہلایا،

"کوئی نہیں سمجھے گا دانش... کوئی نہیں"...

اس کی آواز میں پہلی بار ایک تھکن سی محسوس ہوئی۔

"ان کو بس اپنی حاضریاں پوری کروانی ہیں... یہی سسٹم ہے... اور یہ سسٹم خراب ہے"...

وہ تھوڑا سا رک کر بولا،

"میں اس سے ڈیل نہیں کر پاؤں گا"...

یہ کہتے ہوئے اس نے نظریں ہٹا لیں... جیسے وہ اس بات کو مزید بڑھانا نہیں چاہتا۔

دانش اسے دیکھتا رہ گیا۔

یہ وہی سکندر تھا... مگر پھر بھی وہی نہیں تھا۔

پہلی بار... اس نے سکندر کو اتنا بے بس دیکھا تھا۔

وہ لڑکا جو ہر مسئلے کا حل نکال لیتا تھا... جو کبھی ہار ماننے کی بات نہیں کرتا تھا... آج خود ایک ایسی دیوار کے سامنے کھڑا تھا جسے وہ پار کرنے کا سوچ بھی نہیں پا رہا تھا۔

دانش نے آہستہ سے کہا،

"سکندر... تم! ہار مان رہے ہو؟"

سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بس خاموش بیٹھا رہا...

اور اس کی یہی خاموشی... سب سے بھاری جواب تھی۔

دانش کچھ لمحے اور وہیں کھڑا رہا... جیسے وہ آخری بار سکندر سے کوئی جواب سننا چاہتا ہو۔ مگر جب سکندر کی طرف سے پھر بھی خاموشی ہی ملی، تو اس کے چہرے پر ہلکی سی جھنجھلاہٹ آ گئی۔

وہ ایک دم سے کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے پھر..." اس نے قدرے سخت لہجے میں کہا،

"کرتے رہنا یہی سب... یہی فضول مزدوری"...

سکندر نے سر نہیں اٹھایا۔

دانش نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بات جاری رکھی،

"کبھی آگے نہ بڑھنا... بس یہی رہنا... مختلف ریسٹورنٹس میں پلیٹیں صاف کرتے ہوئے"...

یہ جملہ جیسے ہوا میں تیر کی طرح لٹک گیا۔

ایک لمحہ کو لگا شاید سکندر کچھ کہے گا... اسے روکے گا... یا کم از کم کوئی رد عمل دے گا...

مگر کچھ نہیں ہوا۔

دروازہ کھلا... پھر بند ہو گیا۔

کمرے میں دوبارہ خاموشی پھیل گئی۔

سکندر وہیں بیٹھا رہا۔

اسی حالت میں... اسی جگہ...

اس نے آہستہ سے ایک گہری سانس لی... مگر نظریں اب بھی نیچے جمی تھیں۔

دانش کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے...

"فضول مزدوری"...

"پلیٹیں صاف کرتے ہوئے"...

مگر اس کے باوجود...

اس نے نہ غصہ دکھایا...

نہ صفائی دی...

نہ خود کو درست ثابت کرنے کی کوشش کی...

جیسے وہ جانتا ہو... کہ یہ سب سننا بھی اس کی اس جنگ کا حصہ ہے۔

یا شاید...

اس کے پاس اب جواب دینے کی طاقت ہی نہیں بچی تھی۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ گھر کے سب دروازے بند تھے، کمروں کی بتیاں بجھ چکی تھیں... مگر سکندر کے اندر ایک بھی چراغ نہیں جل رہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آیا۔ ٹھنڈی ہوا چہرے سے ٹکرا رہی تھی، مگر اسے کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ آسمان صاف تھا... تارے ویسے ہی چمک رہے تھے جیسے ہر رات چمکتے ہیں... جیسے دنیا میں کچھ بدلا ہی نہ ہو۔

مگر اس کی دنیا تو بدل چکی تھی۔

وہ چھت کے بیچ میں جا کر رک گیا۔ کافی دیر تک بس کھڑا رہا... اوپر دیکھتا ہوا... جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہو۔

پھر اس نے آنکھیں بند کیں... گہری سانس لی...

"رو لے..." اس نے خود سے کہا، بہت آہستہ...

"بس رو لے سکندر"...

اس نے زور سے آنکھیں بھینچ لیں... جیسے آنسوؤں کو زبردستی نکالنا چاہتا ہو...

مگر...

کچھ نہیں۔

نہ ایک قطرہ...

نہ کوئی لرزش...

بس سینے میں ایک بوجھ... اتنا بھاری کہ سانس لینا مشکل ہو جائے۔

وہ ایک دم سے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

"کیوں...؟" اس کی آواز کانپی،

"میں رو کیوں نہیں سکتا...؟"

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ تھام لیا... انگلیاں بالوں میں الجھ گئیں... جیسے وہ خود کو ہی جھنجھوڑ رہا ہو۔

"سب رو رہے ہیں... سب"...

"میں ہی کیوں نہیں...؟"

اس کی سانس تیز ہو گئی... گلا بند ہونے لگا...

وہ گھسٹتا ہوا چھت کے کنارے تک آیا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

چند لمحے وہ بس خاموش بیٹھا رہا... پھر آہستہ سے اس کے ہونٹ ہلے

"بابا"...

یہ لفظ نکلتے ہی اس کی آواز ٹوٹ گئی۔

اس نے سر جھکا لیا... جیسے اس ایک لفظ میں ہی اس کی ساری طاقت ختم ہو گئی ہو۔

"میں... میں آپ کو بہت مس کر رہا ہوں"...

اس کے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

"آپ کے بغیر... کچھ بھی ٹھیک نہیں لگ رہا"...

"گھر... وہ گھر نہیں رہا"...

اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا... جیسے وہاں درد بڑھ گیا ہو۔

"میں اکیلا یہ سب نہیں کر پا رہا"...

"مجھے نہیں آتا یہ سب... میں ڈر رہا ہوں بابا"...

اس کی آواز اب واضح طور پر کانپ رہی تھی... سانسیں بے ترتیب ہو چکی تھیں...

"آپ نے... آپ نے کیوں نہیں بتایا مجھے...؟"

"کیوں نہیں بتایا کہ آپ اتنے بیمار ہیں...؟"

وہ ایک لمحے کو رکا... آنکھیں بند کیں...

"یا شاید... قصور میرا ہے"...

اس کے ہونٹ کپکپائے...

"میں نے کبھی پوچھا ہی نہیں"...

"میں تو بس... اپنی ہی دنیا میں مصروف رہا"...

اس نے مٹھی زور سے بھینچ لی، جیسے خود کو سزا دے رہا ہو۔

"میں اچھا بیٹا نہیں تھا نا...؟"

یہ جملہ کہتے ہوئے اس کی آواز اتنی دھیمی ہو گئی... جیسے وہ خود بھی اسے سننے سے ڈر رہا ہو۔

ہوا نے اس کے بالوں کو ہلکا سا ہلایا... مگر جواب کہیں سے نہیں آیا۔

وہ آہستہ سے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا...

"بابا... آپ نے کہا تھا نا... مرد بنو"...

"میں بن رہا ہوں"...

"میں سب سنبھال رہا ہوں"...

اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی...

"مگر... یہ اتنا مشکل کیوں ہے...؟"

اس کی سانس ایک لمحے کے لیے رک سی گئی...

"میں تھک گیا ہوں بابا"...

چند لمحے خاموشی رہی...

پھر اس نے بہت آہستہ سے کہا،

"بس ایک بار آ جائیں... ایک بار... میں کچھ نہیں کہوں گا"...

اس کے ہونٹ لرزے...

"بس... میرے ساتھ بیٹھ جائیں"...

یہ کہتے ہی اس کی آواز بالکل بیٹھ گئی۔

آنکھیں اب بھی خشک تھیں...

مگر اس کے چہرے پر درد صاف لکھا تھا۔

وہ وہیں دیوار کے ساتھ لگا بیٹھا رہا... گھٹنوں کو اپنے قریب کیے... سر ان پر ٹکائے...

اکیلا...

اتنا اکیلا... کہ اس کے پاس اپنے آنسو بھی نہیں تھے۔

اور شاید یہی اس کی سب سے بڑی تکلیف تھی...

کہ وہ ٹوٹ تو چکا تھا... مگر بکھر بھی نہیں پا رہا تھا۔

چھت پر وہ لمحہ جیسے وقت میں جم گیا تھا۔ رات کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، مگر فضا میں ایک عجیب سی خاموشی تھی جو ہوا سے بھی زیادہ بھاری لگ رہی تھی۔ سکندر ابھی بھی نیم بے ہوشی کے عالم میں بیٹھا تھا—سر دیوار کے ساتھ ٹکا ہوا، آنکھیں بند، سانسیں بھاری اور بے ترتیب۔

اس کے چہرے پر کئی دنوں کی تھکن صاف لکھی ہوئی تھی۔ نیند آئی بھی تھی تو وہ سکون نہیں لائی تھی... بس جسم کو کچھ لمحوں کے لیے روک دیا تھا، دل کو نہیں۔

سلمیٰ جٹ کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں وہی ماں والا درد تھا جو چیخ بن کر باہر نہیں آتا، بس اندر ہی اندر انسان کو توڑ دیتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھیں، اس کے قریب بیٹھ گئیں اور نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"سکندر... اٹھو بیٹا"...

اس نے ہلکی سی حرکت کی، پلکیں کانپیں... پھر آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ کچھ لمحے وہ انہیں پہچان بھی نہ پایا، جیسے ابھی بھی کسی اور دنیا میں ہو، جہاں صرف یادیں اور دھند ہے۔

"چلو نیچے..." سلمیٰ جٹ نے دوبارہ آہستہ سے کہا۔

وہ خاموشی سے اٹھ گیا۔ نہ سوال، نہ انکار... بس جسم چل پڑا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کے قدم بھاری تھے، ہر قدم جیسے زبردستی اٹھایا جا رہا ہو۔ گھر کے اندر داخل ہوا تو وہی سوگ کا ماحول تھا کسی کونے سے قرآن کی آواز آ رہی تھی، کہیں دبے دبے رونے کی آوازیں، اور ہر چہرے پر ایک تھکن بھرا دکھ۔

سکندر کو چارپائی پر بٹھایا گیا۔ وہ بیٹھ گیا، سر جھکا ہوا، ہاتھ گھٹنوں پر رکھے ہوئے۔ اس کی آنکھیں زمین پر جمی تھیں جیسے وہاں کوئی جواب ہو۔

چند لمحے گزرے... پھر سلمیٰ جٹ نے گہری سانس لی اور بات شروع کی،

"کل سے تم یونیورسٹی جاؤ گے"...

سکندر کے اندر جیسے کچھ ہل گیا۔ اس نے فوراً سر اٹھایا۔

"نہیں..." اس کی آواز کمزور تھی مگر صاف۔

سلمیٰ جٹ نے اس کی طرف دیکھا،

"کیوں نہیں جاؤ گے؟"

سکندر نے نظریں ہٹالیں،

"میرا دل نہیں کرتا... میں تھک گیا ہوں... مجھے صرف کام کرنا ہے"...

اس کی آواز میں ضد نہیں تھی... صرف بے بسی تھی۔

"کام بھی ہو گا..." سلمیٰ جٹ نے نرمی سے کہا، "مگر تم اپنی پڑھائی نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ بھی تمہاری ذمہ داری ہے"...

سکندر نے آہستہ سے سر ہلایا،

"میں نہیں کر سکتا"...

یہ جملہ اس نے پہلی بار ٹوٹ کر کہا تھا۔

"سب اکٹھا ہو گیا ہے... سمجھ نہیں آرہا میں کہاں جاؤں"...

اس کی آواز میں اب دبے ہوئے جذبات تھے، جو باہر آنے سے ڈر رہے تھے۔

سلمیٰ جٹ کچھ لمحے خاموش رہیں۔ پھر اچانک ان کا لہجہ بدل گیا،

"سکندر"!

وہ چونک گیا۔

"تم بھاگ رہے ہو!" ان کی آواز تھوڑی اونچی ہو گئی، "زندگی سے نہیں بھاگا جاتا"!

سکندر نے جواب نہیں دیا۔

"میں نے کہا تم جاؤ گے!" ان کے الفاظ سخت تھے، مگر آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔

"نہیں جاؤں گا..." سکندر نے پہلی بار ہلکی سی سختی دکھائی۔

یہ سنتے ہی فضا بدل گئی۔

سلمیٰ جٹ کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکا... پھر انہوں نے تیزی سے ہاتھ اٹھایا

چٹاخ

ایک زوردار تھپڑ سکندر کے گال پر پڑا۔

آواز چھت کی خاموشی میں گونج گئی۔

سکندر کا سر تھوڑا سا ایک طرف ہوا... مگر وہ فوراً سیدھا ہو گیا۔ اس نے نہ گال پکڑا، نہ آنکھیں بند کیں، نہ کوئی رد عمل دیا۔ بس خاموش رہا۔

سلمٰی جٹ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے،

"جو شروع کیا ہے نا تم نے... اسے مکمل کرو گے"!

ان کی آواز اب کانپ رہی تھی،

"تمہارے بابا نے تمہیں کمزور نہیں بنایا تھا"...

وہ رکی... سانس لی...

"انہوں نے تمہیں ذمہ دار بنایا تھا"...

چند لمحے خاموشی رہی۔

سکندر نے آہستہ سے سانس لی۔ اس کی آنکھیں ابھی بھی زمین پر تھیں، مگر اندر کچھ بدل رہا تھا... شاید مزاحمت ختم ہو رہی تھی، یا شاید صرف تھکن غالب آ رہی تھی۔

پھر اس نے بہت آہستہ کہا،

"ٹھیک ہے"...

بس ایک لفظ۔

نہ خوشی... نہ قبولیت... نہ انکار۔

سلمیٰ جٹ نے اس کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر سختی ابھی بھی تھی، مگر اندر سے وہ ٹوٹ چکی تھیں۔ انہوں نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اس کے سر پر رکھ دیا، جیسے معافی بھی ہو اور دعا بھی۔

سکندر وہیں بیٹھا رہا۔

اس نے نہ کچھ کہا... نہ کچھ پوچھا...

باہر سے وہ مان گیا تھا... مگر اندر...

ابھی بھی وہی خالی پن تھا، جو نہ تھپڑ سے بھرتا ہے... نہ حکم سے... اور نہ وقت سے۔

---

22 فروری کو سکندر نے دوبارہ یونیورسٹی جانا شروع کیا۔ تقریباً بیس دن بعد وہ وہاں واپس آیا تھا، مگر وہ پہلے والا سکندر نہیں تھا۔

گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی اس کے قدم تھوڑی دیر کے لیے ہلکے سے رک گئے۔ وہی کیمپس، وہی راستے، وہی ہجوم... مگر اس کے لیے سب کچھ بدل چکا تھا۔ لوگوں کی آوازیں، ہنسی، باتیں... سب کچھ دور دور سا لگ رہا تھا، جیسے وہ ان کے بیچ موجود تو ہو مگر ان کا حصہ نہ ہو۔

جیسے ہی وہ آگے بڑھا، کئی نظروں نے اسے فوراً محسوس کر لیا۔

کچھ طلبہ آہستہ آہستہ اسے دیکھنے لگے...

کچھ نے سرگوشیاں شروع کر دیں...

"یہی ہے نا"...

"کافی دنوں بعد آیا ہے"...

مگر سکندر نے کسی کی طرف نہیں دیکھا۔

اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ نہ کسی سوال کا جواب، نہ کسی نظر کا اثر۔ وہ بس سیدھا چل رہا تھا، جیسے اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ ہی نہ ہو۔

اس کے قدم تیز بھی نہیں تھے اور سست بھی نہیں... بس ایک مستقل رفتار تھی، جیسے وہ جذبات کے بغیر چل رہا ہو۔

ایک دو لوگ اس کے قریب آئے بھی، شاید حال پوچھنے یا کچھ کہنے کے لیے... مگر وہ ان کے قریب سے بھی اسی طرح گزر گیا، جیسے اس نے سنا ہی نہ ہو۔

کلاس روم کے دروازے پر پہنچ کر اس نے ایک لمحے کے لیے اندر جھانکا... پھر خاموشی سے اندر داخل ہو گیا۔

سب کی نظریں اس پر تھیں۔

مگر اس نے نہ کسی کو سلام کیا، نہ کسی کو دیکھا، نہ کسی سے کچھ کہا۔

بس جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

اور اس لمحے...

کلاس میں پھیلی ہوئی وہ سرگوشیاں مزید واضح ہو گئیں۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ کلاس روم کی فضا ایک بار پھر بدل گئی۔ دروازہ کھلا اور تین جانے پہچانے چہرے اندر داخل ہوئے ارمان، دانیال اور شاہ ویر۔

ان کے قدم جیسے ہی اندر آئے، چند لمحوں کے لیے ہلکی سی سرگوشیاں رک گئیں۔ کچھ طلبہ نے فوراً ان کی طرف دیکھا، اور پھر نظریں خود بخود سکندر پر چلی گئیں جو خاموشی سے اپنی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔

وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسے کچھ دیر پہلے تھا— سر ہلکا سا جھکا ہوا، ایک ہاتھ میز پر رکھا ہوا، اور آنکھیں کسی غیر واضح نقطے پر جمی ہوئی۔

ارمان کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی، اس کے قدم خود بخود تیز ہو گئے۔

"سکندر"!

اس نے تقریباً بھاگ کر اس تک پہنچ کر اسے زور سے گلے لگا لیا۔ یہ گلے ملنا عام نہیں تھا اس میں ایک درد تھا، ایک افسوس تھا، اور ایک بے بسی بھی۔

کلاس میں بیٹھے کچھ لوگ خاموش ہو گئے۔

ارمان نے اسے کچھ لمحے اپنے ساتھ لگائے رکھا، پھر آہستہ سے پیچھے ہٹا، مگر اس کے کندھوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے رکھا جیسے یقین کرنا چاہتا ہو کہ وہ واقعی وہاں ہے۔

"یار..." اس کی آواز بھاری تھی، "بہت افسوس ہوا... ہم سب کو... ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ سب"...

اس کے الفاظ درمیان میں ٹوٹ گئے۔

دانیال بھی قریب آ گیا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی،

"بھائی... تم نے ہمیں بتایا کیوں نہیں؟ ہم آ جاتے"...

شاہ ویر نے کچھ نہیں کہا، بس خاموشی سے سکندر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی وہی خاموش ہمدردی تھی جو لفظوں سے زیادہ بھاری ہوتی ہے۔

سکندر نے تینوں کو ایک ایک کر کے دیکھا۔

اس کے چہرے پر نہ کوئی جذباتی ردِ عمل تھا، نہ آنکھوں میں نمی۔ وہ ویسے ہی بیٹھا رہا، جیسے اس سب کا اثر اس کے اندر کسی بہت دور جگہ پر جا کر رک گیا ہو۔

ارمان نے دوبارہ پوچھا،

"تم ٹھیک تو ہو نا؟"

سکندر نے ہلکا سا سر ہلایا،

"ہاں"...

بس ایک لفظ۔

دانیال نے تھوڑا سا آگے جھک کر کہا،

"ہم جانتے ہیں تم نے بہت کچھ برداشت کیا ہے... مگر تم اکیلے نہیں ہو سکندر"...

اس پر بھی سکندر خاموش رہا۔

کلاس روم میں اب سب کی نظریں ان پر تھیں۔ کچھ طلبہ سرگوشیوں میں مصروف تھے، کچھ خاموشی سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ مگر سکندر کے لیے جیسے یہ سب وہاں تھا ہی نہیں۔

ارمان نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا،

"یار... تم بدل گئے ہو"...

یہ جملہ ہلکے سے نکلا، مگر اس میں تشویش واضح تھی۔

سکندر نے اس بار نظریں تھوڑی سی نیچے کر لیں،

"بس... وقت بدل گیا ہے"...

اس کا جواب مختصر تھا، مگر اس میں ایک عجیب سی تھکن چھپی ہوئی تھی۔

شاہ ویر نے آہستہ سے کہا،

"ہم تمہارے ساتھ ہیں"...

سکندر نے اس کی طرف دیکھا، پھر ایک ہلکی سی سر جنبانی کی،

"پتہ ہے"...

مگر اس کے لہجے میں وہ پرانی گرمی نہیں تھی۔

ارمان نے ایک بار پھر اس کے کندھے کو ہلایا،

"یار، ہم سب وہی ہیں... بس تم واپس آ جاؤ جیسے پہلے تھے"...

سکندر نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں... پھر کھولیں۔

"پہلے والا سکندر..." اس نے آہستہ سے کہا،

"اب شاید رہ ہی نہیں گیا"...

یہ جملہ اتنا ہلکا تھا کہ صرف وہی سن سکتے تھے جو اس کے قریب تھے۔

کلاس روم میں خاموشی مزید گہری ہو گئی۔

ارمان، دانیال اور شاہ ویر تینوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ان کے پاس تسلی کے لیے الفاظ تھے... مگر وہ الفاظ اب بے وزن لگ رہے تھے۔

سکندر پھر خاموش ہو گیا۔

نہ کوئی شکوہ، نہ کوئی وضاحت، نہ کوئی جذباتی اظہار۔

بس ایک انسان تھا...

جو سب کے درمیان بیٹھا تھا... مگر اپنے اندر کہیں اور کھو چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کلاس روم کا دروازہ دوبارہ کھلا۔

سر عادل اندر داخل ہوئے۔

ان کے چہرے پر معمول کی سختی نہیں تھی... اس بار ایک سنجیدگی تھی، اور ساتھ ہی ایک واضح افسوس بھی۔ جیسے وہ پہلے ہی سب کچھ جان چکے ہوں۔

کلاس میں فوراً خاموشی چھا گئی۔ چند طلبہ اپنی جگہ سیدھے ہو گئے۔

سر عادل نے ایک نظر پورے کمرے پر ڈالی... پھر ان کی نظر سکندر پر جا رکی۔ وہ ویسے ہی بیٹھا تھا خاموش، الگ سا، جیسے باقی سب سے کٹا ہوا۔

سر آہستہ آہستہ اس کے قریب آئے۔

"سکندر..." انہوں نے نرمی سے کہا، "مجھے افسوس ہے بیٹا"...

ان کی آواز میں استاد والی سختی نہیں تھی، ایک انسان والا احساس تھا۔

کلاس میں کچھ لمحوں کے لیے بالکل خاموشی رہی۔

سکندر نے سر اٹھایا۔

اس کی آنکھوں میں نہ حیرت تھی، نہ جذبات کا طوفان... بس ایک تھکی ہوئی سی خاموشی۔

"ٹھیک ہوں سر..." اس نے بہت مختصر جواب دیا۔

بس اتنا۔

نہ وضاحت، نہ شکایت، نہ کوئی اور لفظ۔

سر عادل نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ "ٹھیک ہوں" اصل میں ٹھیک ہونے کا مطلب نہیں رکھتا۔

انہوں نے آہستہ سے سر ہلایا،

"اگر کبھی بات کرنی ہو... یا کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا"...

سکندر نے دوبارہ ہلکا سا سر ہلا دیا،

"جی سر"...

اس کے بعد وہ پھر خاموش ہو گیا۔

سر عادل کچھ لمحے وہیں کھڑے رہے... جیسے کچھ اور کہنا چاہتے ہوں، مگر الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ پھر آہستہ سے پیچھے ہٹ گئے۔

کلاس میں دوبارہ وہی معمولی شور شروع ہو گیا... مگر سکندر کے گرد اب بھی ایک الگ سا سناٹا تھا۔

وہ بیٹھا رہا...

خاموش...

اور اسی خاموشی میں جیسے اس نے خود کو باقی سب سے اور دور کر لیا ہو۔

کلاس ختم ہوئی تو ہلکی ہلکی شام اتر رہی تھی۔ کیمپس کے لان میں ہلکی ہوا چل رہی تھی، درختوں کے پتے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے، اور طلبہ گروپس میں بکھرے ہوئے تھے۔

سکندر اکیلا ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ ہاتھ جیبوں میں، نظریں کہیں دور... جیسے وہ وہاں موجود ہو کر بھی وہاں نہیں تھا۔

تبھی پیچھے سے قدموں کی آواز آئی۔

"سکندر"...

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ مومنہ تھی۔

وہ اس کے قریب آ کر رک گئی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ تھی، مگر ساتھ ہی ایک عجیب سا فیصلہ بھی جھلک رہا تھا۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے"...

سکندر نے ہلکا سا سر ہلایا،

"ہاں"...

مومنہ نے ایک لمحہ لیا، پھر سیدھا بولی،

"ارمان نے مجھے پوری کلاس کے سامنے propose کیا ہے"...

یہ سنتے ہی سکندر کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے حیرت آئی۔

"کیا؟ پوری کلاس کے سامنے؟"

"ہاں..." مومنہ نے فوراً کہا، جیسے خود کو justify کر رہی ہو،

"ہاں سکندر... جو ہونا تھا ہو گیا۔"

سکندر خاموش ہو گیا۔

مومنہ نے اپنی بات جاری رکھی،

"میں نے سوچ لیا ہے... میں اسے پسند کرتی ہوں... بس یہی کافی ہے میرے لیے"...

وہ تھوڑا رکی، پھر آہستہ سے کہا،

"بابا ہسپتال میں ہیں... مجھے کسی سہارے کی ضرورت ہے... اور ارمان... وہ سب سے بہتر ہے میرے لیے"...

یہ جملہ سنتے ہی سکندر نے نظریں نیچی کر لیں۔

نہ کوئی سوال، نہ کوئی اعتراض، نہ کوئی جذباتی رد عمل۔

مومنہ نے اس کے چہرے کو دیکھا،

"سکندر... تم کچھ کہو گے نہیں؟"

سکندر نے آہستہ سے سانس لی، پھر بہت سادہ لہجے میں بولا،

"ٹھیک ہے"...

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔

مومنہ تھوڑا سا چونکی، جیسے اسے زیادہ ردعمل کی امید تھی،

"بس... اتنا ہی؟"

سکندر نے اس کی طرف دیکھا... پھر ہلکا سا سر ہلایا،

"ہاں... بس اتنا ہی"...

اس کی آواز میں نہ ناراضگی تھی، نہ دکھ کا شور... بس ایک خاموش قبولیت تھی۔

"تم خوش رہو"...

یہ جملہ اس نے بہت آہستہ کہا، جیسے خود سے زیادہ اسے کہہ رہا ہو۔

مومنہ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی... پھر آہستہ سے سر ہلا کر وہاں سے چلی گئی۔

سکندر وہیں کھڑا رہا۔

ہوا چل رہی تھی، پتے ہل رہے تھے...

مگر اس کے اندر جیسے ایک اور چیز خاموش ہو گئی تھی۔

کچھ دیر وہ اسی جگہ کھڑا رہا، جیسے لان کی ہوا بھی اس کے اندر کی خاموشی کو نہیں توڑ پا رہی تھی۔ مومنا جا چکی تھی، مگر اس کی باتیں ابھی بھی فضا میں کہیں لٹکی ہوئی تھیں۔

سکندر نے آہستہ سے اپنی جیب سے فون نکالا۔

اسکرین روشن ہوئی تو ایک لمحے کے لیے اس کی انگلی رک گئی۔

نادیہ...

1000 سے زیادہ میسیجز اور کالز۔

اس کے ساتھ ہی رِمشا کے بھی مسلسل مسڈ کالز اور پیغامات۔

اس نے ایک نظر اسکرین پر ڈالی۔

کچھ لمحے بس دیکھتا رہا... بغیر کسی ردِ عمل کے۔

نہ حیرت، نہ جلدی، نہ کوئی بے چینی۔

بس ایک لمبی سانس...

جیسے اندر کچھ اور بھاری ہو گیا ہو۔

پھر اس نے آہستہ سے اسکرین بند کی اور فون واپس جیب میں رکھ دیا۔

اس نے ایک لمحے کو سر جھکایا... پھر قدم آگے بڑھا دیے۔

وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

نہ کسی کی طرف، نہ کسی پیغام کی طرف، نہ کسی آواز کی طرف۔

بس سیدھا... لائبریری کی طرف۔

اس کے قدم بھاری تھے، مگر رفتار مستقل تھی۔ راستے میں لوگ اسے دیکھ رہے تھے، کچھ پہچان کر نظریں ہٹا لیتے، کچھ سرگوشی کرتے، مگر وہ کسی کو نہیں دیکھ رہا تھا۔

لائبریری کے دروازے تک پہنچ کر اس نے ایک لمحہ روکا۔

گہری سانس لی۔

اور پھر اندر داخل ہو گیا۔

خاموشی اس کا انتظار کر رہی تھی...

اور وہ... شاید اسی خاموشی میں خود کو ڈھونڈنے آیا تھا۔

سکندر لائبریری کے ایک خاموش سے کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے کھلی کتاب تھی، مگر اس کی نظریں الفاظ پر نہیں تھیں۔ صفحے پلٹتے ضرور تھے، مگر ذہن کہیں اور بھٹکا ہوا تھا کبھی ہسپتال کے کمروں میں، کبھی گھر کی خاموش دیواروں میں، کبھی اپنے بابا کی آواز میں۔

لائبریری کی فضا پرسکون تھی۔ صرف صفحات کی ہلکی سی سرسراہٹ، کبھی کسی کرسی کے ہلنے کی آواز، اور دور کسی کی ہلکی سی کھانسی... سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ مگر سکندر کے اندر کچھ بھی معمول کا نہیں رہا تھا۔

وہ اپنے آپ میں گم تھا... جب اچانک دروازہ کھلا۔

نادیا اندر آئی۔

اس کی نظر جیسے ہی اندر پھیلی، وہ کسی کو تلاش کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک بے چینی تھی جو پچھلے کئی دنوں سے جمع ہو رہی تھی۔ وہ روز مومنا سے پوچھتی تھی،

"سکندر آیا؟"

"اس نے کچھ بتایا؟"

اور ہر بار جواب وہی ملتا تھا... نہیں۔

آج جب مومنا نے اسے بتایا کہ شاید وہ لائبریری میں ہے، تو وہ فوراً وہاں آ گئی تھی۔

اور پھر... وہ اسے نظر آ گیا۔

سکندر۔

وہ فوراً رک گئی۔ جیسے ایک لمحے کو یقین نہ آیا ہو۔ پھر اس کے قدم خود بخود تیز ہو گئے۔

"سکندر"!

اس کی آواز میں حیرت بھی تھی، خوشی بھی... اور ایک دبے ہوئے درد کی جھلک بھی۔

سکندر نے سر اٹھایا۔

نادیا کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے ہلکی سی جنبش آئی... جیسے کوئی پرانی یاد جاگ گئی ہو۔ مگر وہ احساس فوراً ہی ختم ہو گیا، اور وہی خالی پن واپس آ گیا۔

نادیا اس تک پہنچ چکی تھی۔

اور بغیر کسی سوچ کے... بغیر کسی جھجک کے... اس نے اسے زور سے گلے لگا لیا۔

"تم کہاں تھے؟" اس کی آواز لرز رہی تھی، "تمہیں پتا ہے میں کتنے دنوں سے"...

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

وہ سکندر کے ماتھے پر ہاتھ رکھتی رہی، جیسے یقین کرنا چاہ رہی ہو کہ وہ واقعی زندہ ہے، واقعی وہاں ہے۔

"تم بدل گئے ہو..." اس نے دھیمی آواز میں کہا، "تم ایسے نہیں تھے"...

سکندر ساکت بیٹھا رہا۔

اس کے ہاتھ ہلکے سے اٹھے… اور اس نے اپنے گرد ایک طرح کا فاصلہ بنا لیا، جیسے وہ کسی اور کو محسوس نہیں کرنا چاہتا۔

لائبریری میں چند طلبہ نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ کچھ نے سرگوشیاں شروع کر دیں۔ کسی نے کتاب بند کر دی۔

سکندر نے فوراً آس پاس دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں پہلی بار ہلکی سی بے چینی آئی۔

"نادیا…" اس نے بہت آہستہ کہا، "یہ لائبریری ہے…"

نادیا جیسے اس کی بات سن ہی نہ سکی ہو۔

وہ ابھی بھی اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی، اس کی خاموشی کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تم نے کسی کو بتایا بھی نہیں…" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا، "میں روز مومنا سے پوچھتی رہی… ہر روز…"

سکندر نے نظریں نیچے کر لیں۔

اس کی انگلیاں کتاب کے کنارے پر ہلکی سی حرکت کر رہی تھیں، جیسے وہ کسی چیز کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو... مگر حقیقت میں وہ کچھ بھی نہیں پکڑ رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں..." اس نے بہت مختصر کہا۔

بس۔

یہی جواب تھا۔

نادیا نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے "ٹھیک ہوں" میں اسے کچھ بھی ٹھیک محسوس نہیں ہوا۔

"سکندر..." اس نے نرم لہجے میں کہا، "تم جھوٹ بول رہے ہو"...

سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ بس خاموش بیٹھا رہا۔

نادیا نے اس کے سامنے والی کرسی کھینچی اور بیٹھ گئی۔ اس نے اس کے ہاتھ کو پکڑنے کی کوشش کی، مگر سکندر نے ہلکی سی حرکت سے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا—ناراضی سے نہیں... بس بے حسی سے۔

یہ دیکھ کر نادیا کا دل مزید بیٹھ گیا۔

"تم ایسے کیوں ہو گئے ہو؟" اس کی آواز دھیمی تھی، "ہم سب تمہیں ڈھونڈ رہے تھے"...

سکندر نے آہستہ سے سانس لی۔

"مجھے ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں..." اس نے بالکل سادہ لہجے میں کہا، "میں یہیں ہوں"...

اس جملے میں عجیب سا خلا تھا۔

نادیا کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی۔

پھر آہستہ سے بولی،

"تم یہاں ہو... مگر ہمارے ساتھ نہیں ہو"...

یہ بات سکندر کے دل تک پہنچی... مگر اس کے چہرے پر پھر بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

وہ دوبارہ اپنی کتاب کی طرف دیکھنے لگا۔

نادیا خاموش ہو گئی۔

لائبریری میں اب بھی وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے... مگر درمیان میں ایک ایسی خاموش دیوار کھڑی تھی جسے کوئی چھو بھی نہیں پا رہا تھا۔

سکندر وہیں بیٹھا تھا...

مگر حقیقت میں...

وہ کہیں اور تھا۔

نادیا کی آنکھیں اب بھی نم تھیں۔ اس نے آہستہ سے ایک اور کوشش کی، جیسے وہ سکندر کو واپس لانا چاہتی ہو اُس جگہ سے جہاں وہ خود کو بند کر چکا تھا۔

"سکندر..." اس نے دھیرے سے کہا، "اس طرح سب سے دور ہو کر... سب کچھ ٹھیک نہیں ہو گا"...

سکندر کے ہاتھ رک گئے۔

ایک لمحے کے لیے لگا جیسے وہ سن ہی نہیں رہا... مگر پھر نادیا کے اگلے لفظ نے ہوا بدل دی۔

"ایسے کرنے سے تمہارے بابا واپس نہیں آئیں گے"...

بس۔

یہ جملہ۔

سکندر کا چہرہ ایک دم سخت ہو گیا۔

اس کی آنکھوں میں وہی خاموشی تھی... جو اب تک سب کو عجیب لگ رہی تھی، مگر اس بار اس کے اندر کچھ ٹوٹا نہیں تھا... کچھ بھڑک اٹھا تھا۔

اس نے آہستہ سے سر اٹھایا۔

نادیا کی طرف دیکھا۔

اور پھر ایک دم اس کی آواز بھاری ہو گئی

"خبردار"...

پورا کمرہ جیسے ساکت ہو گیا۔

"اگر میرے بابا کا..." اس نے دانت بھینچ کر کہا، "میرے سامنے دوبارہ ایسے نام لیا"...

نادیا ایک لمحے کے لیے پیچھے ہٹ گئی۔

سکندر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی سانسیں تیز تھیں، آنکھیں سرخ نہیں تھیں... مگر اندر کا غصہ واضح تھا۔

کتابیں میز پر ہلکی سی ہل گئیں۔

لائبریری میں موجود سب لوگ اب سیدھا ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

سکندر نے ایک نظر نادیا پر ڈالی... پھر بغیر کچھ کہے، تیزی سے چلتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

اس کے قدم تیز تھے... مگر منزل واضح نہیں تھی۔

نادیا وہیں کھڑی رہ گئی...

اور اس بار... اس کے پاس کوئی لفظ نہیں تھا۔

سکندر دروازے سے باہر نکلا...

---

6 مارچ کو یونیورسٹی میں ایک بڑی ریٹائرمنٹ پارٹی رکھی گئی تھی کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ عاطف اصغر کی۔ جگہ بھی کوئی عام نہیں تھی... یونیورسٹی

کے قریب ایک مشہور ہوٹل، جہاں روشنیوں، میوزک اور ہجوم کا ایک الگ ہی ماحول بننے والا تھا۔

6 مارچ قریب آرہا تھا، یونیورسٹی کا ماحول دن بدن بدلتا جارہا تھا۔ عام دنوں کی سنجیدگی کی جگہ اب ایک عجیب سی ہلچل نے لے لی تھی۔ کیمپس کے ہر کونے میں اسی ریٹائرمنٹ پارٹی کی بات ہو رہی تھی کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ کے لیے ایک بڑی تقریب۔

صبح سے لے کر شام تک بس ایک ہی موضوع...

پورے کیمپس میں اسی بات کا چرچا تھا۔

"یار میں بلیک سوٹ پہنوں گا"...

"نہیں نہیں، تھوڑا لائٹ کلر رکھو"...

"ساری کلاس جارہی ہے، مزہ آئے گا"...

کچھ لڑکیاں گروپ بنا کر بیٹھتیں اور اپنے ڈریسز ڈسکس کرتیں، کچھ لڑکے آئینے میں کھڑے ہو کر اپنے بال سیٹ کرنے کے انداز پر بحث کرتے۔ ہر

طرف ایک الگ ہی رونق تھی جیسے سب لوگ کسی ایک دن کے لیے جینا چاہتے ہوں۔

کلاسز میں بھی دھیان کم اور باتیں زیادہ تھیں۔

سر عادل پڑھا رہے ہوتے، مگر پیچھے بیٹھے چند طلبہ آہستہ آہستہ پارٹی کی پلاننگ کر رہے ہوتے۔ کبھی ہنسی دبانے کی کوشش، کبھی سرگوشیاں... اور پھر ایک دم خاموشی جب سر کی نظر ادھر پڑتی۔

ادھر ارمان، دانیال اور شاہ ویر بھی اپنے اپنے پلان بنا رہے تھے۔

"یار ہم سب ایک ساتھ جائیں گے..." ارمان نے کہا، "اور واپسی پر بھی ساتھ ہی نکلیں گے"...

"اور فوٹوز؟" شاہ ویر نے ہنستے ہوئے کہا، "اس بار کوئی رہ نہ جائے"...

دانیال نے مسکرا کر کہا،

"اس بار سب کچھ پرفیکٹ ہو گا"...

مومنہ بھی اس بار جانے کا ارادہ کر چکی تھی۔ اگرچہ وہ پہلے ایسی تقریبات سے دور رہتی تھی، مگر اب حالات کچھ اور تھے... شاید وہ خود کو مصروف رکھنا چاہتی تھی، یا شاید ارمان کے ساتھ ایک نیا آغاز محسوس کر رہی تھی۔

نادیہ نے بھی کافی سوچنے کے بعد جانے کا فیصلہ کیا۔

اس کا دل اب بھی الجھا ہوا تھا... خاص طور پر سکندر کے رویے کے بعد... مگر وہ خود کو اس سب سے نکالنا چاہتی تھی۔

"میں نہیں جاؤں گی تو اور بھی سوچوں گی..." اس نے خود سے کہا، "شاید تھوڑا مصروف رہنا بہتر ہے"...

مگر ان سب کے بیچ...

سکندر بالکل الگ تھا۔

وہ انہی دنوں یونیورسٹی آتو رہا تھا... مگر صرف جسمانی طور پر۔ کلاس میں بیٹھتا، لیکچر سنتا بھی یا نہیں... کسی کو نہیں پتا... پھر خاموشی سے اٹھ کر نکل جاتا۔

نہ کسی گروپ میں شامل، نہ کسی بات چیت میں۔

پارٹی کا ذکر اس کے سامنے بھی کئی بار آیا۔

ایک دن ارمان نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا،

"سکندر، 6 مارچ کو آنا ہے تم نے... کوئی بہانہ نہیں چلے گا اس بار"...

سکندر نے بغیر اس کی طرف دیکھے کہا،

"نہیں آؤں گا"...

"کیوں یار؟" دانیال بھی شامل ہو گیا، "اتنے دنوں بعد تو کوئی ایونٹ آیا ہے... سب ہوں گے وہاں"...

سکندر نے ہلکا سا سر جھکایا،

"دل نہیں کرتا"...

"بس یہی وجہ ہے؟" شاہ ویر نے حیرانی سے کہا۔

سکندر رک گیا... ایک لمحے کے لیے۔

پھر آہستہ سے بولا،

"ہاں... بس یہی"...

اس کے لہجے میں نہ کوئی وضاحت تھی، نہ کوئی بحث کی گنجائش۔

ارمان نے کچھ کہنا چاہا... مگر رک گیا۔

وہ جانتے تھے کہ اب سکندر کو زبردستی کسی چیز میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے لیے شور اب شور نہیں تھا... بوجھ تھا۔

لوگ اب لوگ نہیں تھے... فاصلے تھے۔

6 مارچ کا وہ دن...

جو سب کے لیے ایک خوشی، ایک یاد، ایک موقع بننے والی تھی...

سکندر کے لیے بس ایک اور دن تھا۔

یا شاید...

ایک اور ٹائم پاس...

جس میں وہ خود سے بھی نظریں چرانے کی کوشش کرے گا۔

سکندر یونیورسٹی سے واپس گھر آیا تو سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کمرہ ویسا ہی تھا سادہ، خاموش، اور کسی حد تک بکھرا ہوا... جیسے اس کے اندر کی حالت ہو۔

اس نے آہستہ سے بیگ ایک طرف رکھا، جوتے اتارے اور بغیر کچھ کہے الماری کھولی۔ اندر لٹکا ہوا ریسٹورنٹ کا یونیفارم جیسے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا... پھر خاموشی سے کپڑے بدلنے لگا۔

اسی دوران اس کا فون بجا۔

اس نے ایک نظر اسکرین پر ڈالی...

رِمشا۔

اس کی انگلی ایک لمحے کے لیے رک گئی۔

پھر اس نے بغیر کچھ سوچے فون سائڈ پر کیا... اور نظر ہٹا لی۔

کمرے میں دوبارہ خاموشی پھیل گئی۔

وہ شیشے کے سامنے کھڑا اپنا یونیفارم ٹھیک کر رہا تھا کہ فون دوبارہ بج اٹھا۔

اس بار آواز تھوڑی زیادہ نمایاں لگی۔

دروازے کے پاس بیٹھی سلمیٰ جٹ نے بھی سن لیا۔

"بیٹا... فون اٹھا لو..." انہوں نے نرمی سے کہا، "شاید کوئی ضروری بات ہو..."

سکندر نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں... جیسے وہ خود کو سمجھا رہا ہو۔

پھر آہستہ سے بولا،

"ضروری ہوتا... تو میں اٹھالیتا"...

اس کا لہجہ نہ سخت تھا، نہ نرم... بس خالی۔

فون اب بھی بج رہا تھا۔

اس نے جا کر فون اٹھایا... ایک لمحے کو اسکرین کو دیکھا...

پھر کال کٹ ہونے دی۔

کوئی ردعمل نہیں۔

وہ واپس آیا، یونیفارم کے بٹن بند کیے، آستین سیدھی کیں، اور جوتے پہنے۔

سلمیٰ جٹ اسے دیکھتی رہیں... کچھ کہنا چاہتی تھیں... مگر انہوں نے کچھ نہیں کہا۔

سکندر نے جیب سے چابی نکالی، دروازے کی طرف بڑھا۔

ایک لمحے کو رکا بھی نہیں۔

بس سیدھا باہر نکل گیا۔

گھر کے اندر پھر وہی خاموشی رہ گئی...

اور باہر...

سکندر ایک اور دن گزارنے جا رہا تھا

لوگوں کے درمیان... مگر اپنے اندر اکیلا۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ ریسٹورنٹ اپنے عروج پر تھا آرڈرز کی آوازیں، پلیٹوں کی کھنکھناہٹ، ویٹرز کی جلدی جلدی چلتی قدموں کی چاپ... اور اس سب کے بیچ سکندر سنک کے سامنے کھڑا برتن دھو رہا تھا۔

ٹھنڈا پانی مسلسل اس کے ہاتھوں پر گر رہا تھا، جھاگ بنتا اور بہہ جاتا... جیسے وقت گزر رہا ہو، بغیر کسی نشان کے۔

وہ خاموشی سے کام میں لگا ہوا تھا کہ اس کے قریب کھڑے دو لڑکوں کی باتیں اس کے کانوں میں پڑنے لگیں۔

"یار... کبھی کبھی لگتا ہے اگر پڑھائی جاری رکھ پاتے نا..." ایک لڑکا بولا،

"تو شاید آج یہاں نہ ہوتے"...

دوسرا اہلکار ہنسا، مگر اس ہنسی میں اداسی تھی،

"اور اگر اچھے دوست مل جاتے... جو واقعی ہماری فکر کرتے... تو شاید سب کچھ مختلف ہوتا"...

"ہاں... کوئی ایسا جو روکے، سمجھائے... چھوڑنے نہ دے"...

یہ جملے سکندر کے ہاتھوں کی حرکت سست کر گئے۔

پانی اب بھی بہہ رہا تھا... مگر اس کا دھیان کہیں اور چلا گیا تھا۔

اچھے دوست... جو فکر کرتے ہیں...

اس کے ذہن میں ایک ایک چہرہ ابھرنے لگا ارمان، دانیال، شاہ ویر....

مومنہ...

یہاں تک کہ نادیا اور رمشا بھی...

سب کی آوازیں، سب کے الفاظ... جیسے ایک ساتھ واپس آ گئے ہوں۔

"تم اکیلے نہیں ہو"...

"ہم تمہارے ساتھ ہیں"...

"یونیورسٹی آجاؤ"...

وہ کچھ لمحوں کے لیے ساکت ہو گیا۔

تبھی ایک لڑکا اس کے پاس آیا اور ہلکے سے اس کے کندھے کو چھوا،

"اوئے... کیا ہوا؟ ہاتھ کیوں روک لیے؟"

سکندر چونکا... جیسے نیند سے جاگا ہو۔

"ہاں... کچھ نہیں..." اس نے جلدی سے کہا اور دوبارہ برتن دھونے لگا۔

مگر اس بار اس کے ہاتھوں کی حرکت مختلف تھی... جیسے وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا ہو۔

وہ آہستہ سے بولا،

"بس... یہ سوچ رہا تھا"...

لڑکے نے حیرانی سے دیکھا،

"کیا؟"

سکندر نے ایک لمحہ لیا... پھر نظریں نیچے کرتے ہوئے کہا،

"کہ شاید... مجھے خود پر ظلم نہیں کرنا چاہیے"...

لڑکا کچھ سمجھ نہ پایا،

"کیا مطلب؟"

سکندر نے ہلکی سی سانس لی،

"جو ہونا ہوتا ہے... وہ ہو کر رہتا ہے"...

"لیکن اگر میں خود ہی اپنے ساتھ بُرا کرنے لگ جاؤں... تو وہ غلط ہو گا"...

وہ رکا... پھر آہستہ سے بولا،

"خاص طور پر... ایسے دوستوں کے ہوتے ہوئے... جو واقعی میری فکر کر رہے ہیں"...

لڑکا اب بھی اسے دیکھ رہا تھا... جیسے اسے آدھی بات بھی سمجھ نہ آئی ہو۔

"تو ٹھیک ہے نا؟" اس نے آخر کار پوچھا۔

سکندر نے پہلی بار ہلکا سا مسکرانے کی کوشش کی... بہت ہلکی سی۔

"ہاں..." اس نے کہا،

"اب شاید... ٹھیک ہو جاؤں گا"...

لڑکا کچھ نہ سمجھ سکا... بس کندھے اچکا کر واپس اپنے کام میں لگ گیا۔

مگر سکندر...

اس کے اندر کچھ بدل چکا تھا۔

پانی اب بھی بہہ رہا تھا...

برتن اب بھی دھل رہے تھے...

مگر اس بار...

وہ صرف کام نہیں کر رہا تھا۔

وہ سمجھ چکا تھا۔

رات کافی ہو چکی تھی جب سکندر گھر واپس آیا۔ دروازہ کھولا تو اندر وہی خاموشی تھی... مگر آج اس کے قدم پہلے جیسے بھاری نہیں تھے۔

وہ سیدھا اندر آیا۔ سلمٰی جٹ ابھی جاگ رہی تھیں، جیسے اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی، مگر نظریں دروازے پر۔

"آ گئے بیٹا...؟" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

سکندر نے ہلکا سا سر ہلایا،

"جی"...

وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا... جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو مگر الفاظ ترتیب دے رہا ہو۔

پھر آہستہ سے بولا،

"ماما... 6 مارچ کو یونیورسٹی کے پاس ایک پارٹی ہے"...

سلمٰی جٹ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

سکندر نے بات جاری رکھی،

"کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ کی ریٹائرمنٹ ہے... سب جا رہے ہیں"...

وہ تھوڑا سا رکا... پھر جیسے فیصلہ کر کے بولا،

"میں بھی جانا چاہتا ہوں"...

کمرے میں ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔

سلمٰی جٹ اسے دیکھتی رہ گئیں... جیسے انہوں نے صحیح سنا نہ ہو۔

"تم... جانا چاہتے ہو؟" انہوں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

سکندر نے ہلکا سا سر ہلایا،

"جی... میرے سب دوست مجھے بلا رہے ہیں"...

یہ وہی سکندر تھا... مگر پھر بھی کچھ بدلا ہوا۔

سلمٰی جٹ کے چہرے پر آہستہ آہستہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ ان کی آنکھوں میں نمی بھی تھی... مگر اس بار وہ دکھ کی نہیں، سکون کی تھی۔

"ضرور جاؤ بیٹا..." انہوں نے فوراً کہا، "کیوں نہیں جاؤ گے"...

انہوں نے تسبیح ایک طرف رکھی اور اس کے قریب آئیں،

"اچھا لگے گا تمہیں... تھوڑا باہر نکلو گے"...

ان کی آواز میں ایک ماں کی وہ چھپی ہوئی دعا تھی... جو اپنے بچے کو دوبارہ جیتا ہوا دیکھنا چاہتی ہے۔

سکندر خاموشی سے کھڑا رہا... مگر اس کے چہرے پر پہلی بار ہلکی سی نرمی آئی۔

سلمٰی جٹ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا،

"اللہ تمہیں خوش رکھے"...

یہ جملہ سن کر سکندر نے آہستہ سے آنکھیں بند کیں... جیسے وہ اس لمحے کو محسوس کرنا چاہتا ہو۔

وہ مکمل ٹھیک تو نہیں ہوا تھا...

مگر شاید...

وہ واپس آنے لگا تھا۔

---

6 مارچ آخر کار آ ہی گیا۔

وہی دن جس کا سب کئی دنوں سے انتظار کر رہے تھے۔

شام ہوتے ہی یونیورسٹی کے قریب وہ مشہور ہوٹل روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔

داخلی دروازے پر سجاوٹ، اندر ہال میں ہلکی ہلکی موسیقی، اور ہر طرف تیار ہو کر آئے ہوئے طلبہ اور اساتذہ... جیسے ایک الگ ہی دنیا بس گئی ہو۔

لڑکے سوٹ میں، لڑکیاں خوبصورت ڈریسز میں... سب اپنے اپنے گروپس میں مصروف، ہنسی مذاق، تصاویر، شور...

ہر طرف زندگی تھی۔

ہال کے اندر اسٹیج سجا ہوا تھا۔ مائیک پر ایک کے بعد ایک لوگ آ رہے تھے اور کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ، عاطف اصغر، کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے۔

"سر نے ہمیں بہت کچھ سکھایا"...

"ان کی رہنمائی ہمیشہ یاد رہے گی"...

"ایسے اساتذہ کم ملتے ہیں"...

تالیاں بج رہی تھیں... مسکراہٹیں بکھر رہی تھیں...

مگر طلبہ کی اپنی دنیا الگ تھی۔

کچھ ایک طرف کھڑے ہنس رہے تھے،

"یار یہ سب formal باتیں ہیں"...

"اصل میں کسی کو اتنا فرق نہیں پڑتا"...

"ہاں بس speech دے دو، photo لے لو، اور نکل جاؤ... ان ٹیچرز کے ٹوپی ڈرامے نہیں ختم ہوتے"

وہ جانتے تھے کہ ان تعریفوں میں کتنا سچ ہے اور کتنا رسم و رواج...

مگر انہیں اس سے کیا؟

وہ یہاں enjoy کرنے آئے تھے۔

ادھر ارمان، دانیال اور شاہ ویر ایک ساتھ کھڑے تھے،

"سکندر آیا؟" دانیال نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تک نہیں..." ارمان نے جواب دیا، مگر اس کی نظر بار بار دروازے کی طرف جا رہی تھی۔

مومنہ بھی قریب ہی تھی، وہ بھی کبھی کبھار دروازے کی طرف دیکھ لیتی۔

نادیا ایک کونے میں کھڑی تھی، ہاتھوں میں فون... مگر نظریں کہیں اور۔

رمشا ایک جگہ پر بیٹھی اس سے بڑے غور سے دیکھی جا رہی تھی۔

ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں مصروف تھا...

مگر کہیں نہ کہیں سب کو ایک ہی انتظار تھا۔

ہال کے اندر روشنی، میوزک اور لوگوں کی آوازیں گونج رہی تھیں... مگر اس سب کے بیچ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اپنے ہی خیالوں میں گم تھے۔

نادیا ایک سائیڈ پر کھڑی تھی۔ ہاتھ میں فون تھا، مگر وہ اسکرین نہیں دیکھ رہی تھی... نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

تبھی ایک لڑکی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب آ کر رکی۔

رِمشا۔

نادیا اسے نہیں جانتی تھی... مگر رِمشا اسے پہچانتی تھی۔

وہ چند لمحے خاموشی سے نادیا کو دیکھتی رہی... پھر ہلکے سے مسکرا کر بولی،

"کسی کا انتظار ہے؟"

نادیا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا... پھر ہلکا سا سر ہلا دیا،

"ہاں"...

رِمشا نے ذرا قریب آ کر پوچھا،

"کس کا؟"

نادیا نے ایک لمحہ لیا... جیسے وہ سوچ رہی ہو کہ بتائے یا نہ بتائے... پھر آہستہ سے بولی،

"ایک لڑکا ہے"...

رِمشا کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آئی... مگر وہ خاموش رہی۔

نادیا نے بات جاری رکھی،

"جس کی زندگی... بہت مشکل ہوگئی ہے"...

اس کی آواز میں ہمدردی تھی،

"لیکن پھر بھی... وہ ہمت نہیں ہار رہا... سب کے ساتھ اچھا بن رہا ہے"...

رِمشا کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔

وہ ہلکا سا مسکرائی... مگر اس مسکراہٹ میں مٹھاس نہیں تھی۔

"بس..." اس نے دھیمی مگر کڑوی آواز میں کہا،

"اسی میں تو اس کا مسئلہ ہے"...

نادیا نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا،

"کیا مطلب؟"

رِمشا نے نظریں ہٹا لیں،

"وہ سب کے ساتھ اچھا ہے... اسی لیے سب اسے پسند کرتے ہیں"...

اس کے لہجے میں ایک عجیب سی جلن تھی... جیسے وہ کچھ چھپا بھی رہی ہو اور کچھ ظاہر بھی کر رہی ہو۔

نادیا کو اس کی بات سمجھ نہیں آئی۔

"اچھا ہونا مسئلہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے سادہ لہجے میں کہا۔

رِمشا ہلکا سا ہنسی...

"تمہیں نہیں سمجھ آئے گا"...

وہ چند لمحے خاموش رہی... پھر آہستہ سے بولی،

"کبھی کبھی... جو سب کا ہوتا ہے نا... وہ کسی ایک کا نہیں رہتا"...

یہ جملہ سن کر نادیا کے دل میں ایک ہلکی سی چبھن ہوئی۔

اس نے پہلی بار غور سے رِمشا کو دیکھا... جیسے وہ اسے پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"تم اسے جانتی ہو...؟" نادیا نے پوچھا۔

رِمشا نے سیدھا جواب نہیں دیا۔

بس ہلکا سا کہا،

"اتنا... کہ وہ مجھے نظر انداز نہیں کر سکتا"...

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا یقین تھا... اور ساتھ ہی بے چینی بھی۔

نادیا خاموش ہو گئی۔

اس کے دل میں بھی وہی نام گونج رہا تھا...

سکندر...

وہ خود بھی اسے پسند کرتی تھی... مگر اس کا انداز مختلف تھا خاموش، سنبھلا ہوا، چھپا ہوا۔

اور رِمشا...

وہ تو شاید اس کے پیار میں پوری طرح ڈوب چکی تھی۔

دونوں ایک دوسرے کے پاس کھڑی تھیں...

مگر ان کے درمیان ایک ان دیکھا مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔

اور دونوں کو ابھی تک پوری طرح اندازہ بھی نہیں تھا...

کہ وہ ایک ہی انسان کا انتظار کر رہی ہیں۔

ہال کے ایک دوسرے کونے میں روشنی کچھ مدھم تھی۔ لوگ گروپس میں کھڑے باتیں کر رہے تھے، کہیں قہقہے، کہیں تصویریں... مگر مومنا ان سب سے تھوڑی ہٹ کر کھڑی تھی۔

اس کی توجہ ادھر نہیں تھی۔

تبھی ارمان اس کے پاس آیا۔

"مومنہ جی..." اس نے نرم آواز میں کہا۔

وہ چونکی، پھر ہلکا سا مسکرانے کی کوشش کی،

"ہاں...؟"

ارمان نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا،

"انکل کیسے ہیں؟"

مومنہ کی مسکراہٹ فوراً ہلکی پڑ گئی۔ اس نے نظریں نیچی کر لیں،

"بابا... اب ہسپتال سے گھر شفٹ ہو گئے ہیں"...

وہ رکی... پھر آہستہ سے بولی،

"لیکن طبیعت ابھی بھی بہت خراب ہے"...

اس کی آواز میں وہی دباؤ تھا جو کوئی چھپا تو رہا ہو مگر ختم نہ ہو رہا ہو۔

ارمان نے سنجیدگی سے سر ہلایا،

"ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے"...

چند لمحے دونوں خاموش رہے۔ ارد گرد شور تھا، مگر ان کے درمیان ایک الگ سی سنجیدگی آ گئی تھی۔

پھر ارمان نے ہلکے سے کہا،

"پارٹی کے بعد... ہم باہر چلتے ہیں"...

مومنہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا،

"کہاں؟"

"بس... کہیں بھی..." ارمان نے مسکرا کر کہا،

"تھوڑا سا باہر... آپ کو بھی change مل جائے گا"...

مومنہ خاموش ہو گئی۔

اس کے ذہن میں ایک ساتھ کئی باتیں آئیں گھر، بابا، ذمہ داریاں... اور پھر یہ لمحہ۔

وہ چند سیکنڈ کچھ سوچتی رہی۔

ارمان اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اگر آپ comfortable نہ ہو تو..." وہ کہنے ہی لگا تھا کہ

"نہیں..." مومنہ نے آہستہ سے کہا۔

ارمان رک گیا۔

مومنہ نے ہلکا سا سر اٹھایا،

"ٹھیک ہے... چل لیں گے"...

اس کے لہجے میں مکمل خوشی نہیں تھی... مگر ایک ہلکی سی آمادگی تھی، جیسے وہ خود کو تھوڑا سا موقع دینا چاہتی ہو۔

ارمان کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی،

"ٹھیک ہے پھر... میں wait کروں گا"...

مومنہ نے ہلکا سا سر ہلا دیا۔

وہ دونوں وہیں کھڑے رہے...

اردگرد شور بڑھتا جارہا تھا...

مگر ان دونوں کے بیچ ایک نیا مرحلہ آہستہ آہستہ شروع ہو رہا تھا۔

اب وہ دونوں جان بوجھ کر ایک حد برقرار رکھنے لگے تھے۔

ارمان اور مومنہ ایک ہی ہال میں موجود تھے... ایک ہی محفل کا حصہ... مگر ایک دوسرے سے تھوڑا فاصلہ رکھے ہوئے۔

طلبہ کو تو پہلے ہی ان کے رشتے کا اندازہ ہو چکا تھا

کلاس میں ہونے والی وہ بات اب چھپی ہوئی نہیں تھی۔ مگر اساتذہ کے سامنے وہ کسی بھی قسم کی توجہ نہیں چاہتے تھے۔

ارمان کبھی اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑا ہو جاتا، ہنسی مذاق میں شامل ہو جاتا... مگر اس کی نظریں وقفے وقفے سے مومنہ کی طرف اٹھ جاتیں۔

ادھر مومنہ بھی لڑکیوں کے گروپ میں کھڑی تھی، کبھی کسی بات پر ہلکا سا مسکرا دیتی... مگر اس کا دھیان مکمل طور پر وہاں نہیں تھا۔

دونوں کے درمیان ایک ان دیکھا رابطہ تھا

نظروں کا۔

ارمان نے دور سے ہلکا سا اشارہ کیا، جیسے پوچھ رہا ہو "آپ ٹھیک ہو؟"

مومنہ نے بھی بہت ہلکے سے سر ہلا دیا۔۔۔ "ہاں"...

کوئی اور شاید اس خاموش گفتگو کو نہ سمجھ پاتا... مگر ان کے لیے یہ کافی تھا۔

وہ قریب آسکتے تھے... بات کر سکتے تھے...

مگر وہ نہیں کر رہے تھے۔

کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایک لمحے کی بے احتیاطی... بہت سی باتوں کو جنم دے سکتی ہے۔

اور ابھی...

وہ دونوں اس سب کے لیے تیار نہیں تھے۔

اس لیے وہ اسی طرح ایک ہی جگہ، مگر تھوڑا فاصلے پر کھڑے رہے۔

جیسے دو لوگ ایک ہی کہانی میں ہوں ...

مگر مختلف لائنز پر چل رہے ہوں۔

اور پھر...

وہ لمحہ آ ہی گیا جس کا سب کو بے شعوری میں انتظار تھا۔

ہوٹل کے داخلی دروازے پر ایک سایہ رکا... پھر آہستہ آہستہ اندر داخل ہوا۔

ابراہیم جٹ... عرف سکندر۔

اس کے قدم پہلے جیسے تیز نہیں تھے... مگر رک بھی نہیں رہے تھے۔ وہ سیدھا سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ ہر قدم ناپ تول کر رکھا جا رہا تھا... جیسے وہ خود کو سنبھال کر چل رہا ہو۔

نیچے کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی... اور اوپر ہال کی چمک اس کا انتظار کر رہی تھی۔

وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

ہر قدم کے ساتھ اس کے جوتوں کی ہلکی سی آواز گونج رہی تھی... اور نہ جانے کیوں، جیسے وہ آواز اس کے اپنے دل کی دھڑکن سے مل رہی تھی۔

اوپر ہال کے دروازے تک پہنچ کر وہ ایک لمحے کو رکا۔

گہری سانس لی۔

اور پھر...

اندر داخل ہو گیا۔

جیسے ہی وہ اندر آیا،

ہال کی فضا ایک لمحے کے لیے بدل گئی۔

قہقہے آہستہ ہو گئے... سرگوشیاں رک گئیں... اور کئی نظریں ایک ساتھ اس کی طرف اٹھ گئیں۔

اساتذہ بھی... طلبہ بھی...

سب کی نظریں اسی پر تھیں۔

کچھ کے چہروں پر ہمدردی تھی...

کچھ کے چہروں پر حیرت...

اور کچھ بس خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

یہ اس کے باپ کی وفات کے بعد پہلی محفل تھی... جہاں وہ خود آیا تھا۔

سکندر نے ایک نظر پورے ہال پر ڈالی۔

روشنی، موسیقی، لوگ... سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا پہلے ہوا کرتا تھا...

مگر وہ خود ویسا نہیں رہا تھا۔

اس کے چہرے پر نہ مسکراہٹ تھی... نہ دکھ کا اظہار۔

بس ایک ٹھہراؤ...

ایک خاموشی...

جو شاید سب سے زیادہ نمایاں تھی۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

ہر نظر اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

اور اسی لمحے

کسی ایک کونے میں کھڑی دو آنکھیں...

ایک ساتھ اس پر ٹھہر گئیں۔

سکندر ابھی ہال کے اندر چند قدم ہی بڑھا تھا کہ ارمان نے اسے دیکھ لیا۔

"سکندر"!

وہ تقریباً فوراً اس کی طرف آیا اور بغیر کسی جھجک کے اسے گلے لگا لیا۔

یہ گلے ملنا عام نہیں تھا... اس میں ایک سکون بھی تھا اور ایک تسلی بھی، جیسے وہ خود کو یقین دلا رہا ہو کہ وہ واقعی آ گیا ہے۔

"السلام علیکم یار..." ارمان نے آہستہ سے کہا۔

"وعلیکم السلام..." سکندر کا جواب مختصر تھا، مگر پہلے جیسا بالکل بے جان بھی نہیں۔

ارمان نے تھوڑا پیچھے ہو کر اسے دیکھا،

"مجھے لگا تھا تم نہیں آؤ گے"...

سکندر نے ہلکی سی سانس لی،

"میں نے بھی یہی سوچا تھا"...

ارمان ہلکا سا مسکرایا،

"اچھا کیا آ گئے... سب تمہیں دیکھ رہے تھے"...

سکندر نے گردن گھما کر ایک نظر ہال پر ڈالی...

"دیکھنے دو"...

اس کے لہجے میں اب وہ پہلے والی سختی نہیں تھی، مگر ایک فاصلہ اب بھی موجود تھا۔

دونوں ایک طرف کھڑے ہو کر بات کرنے لگے۔

ارمان نے ہلکے انداز میں پوچھا،

"اور سناؤ... کیسا چل رہا ہے سب؟"

سکندر نے سیدھا جواب دیا،

"چل رہا ہے"...

پھر اس نے خود ہی پوچھ لیا،

"تمہارا اور مومنہ کا... کیسا جا رہا ہے؟"

ارمان نے ایک لمحے کے لیے چونک کر اسے دیکھا... پھر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی،

"الحمدللہ... سب ٹھیک ہے"...

سکندر نے بس سر ہلا دیا،

"اچھا ہے"...

اسی دوران اس کی نظر ہال کے ایک کونے کی طرف گئی۔

رِمشا...

اور نادیا۔

دونوں تقریباً ایک ہی جگہ کھڑی تھیں... اور دونوں کی نظریں اسی پر تھیں۔

ایک لمحے کے لیے سکندر کی نظر ان سے ملی...

پھر اس نے فوراً نظریں ہٹا لیں۔

کوئی ردِ عمل نہیں۔

کوئی اشارہ نہیں۔

جیسے وہ انہیں پہچانتا ہی نہ ہو۔

ارمان نے بھی اس کی نظر کا رخ محسوس کیا، مگر کچھ کہا نہیں۔

سکندر نے بات بدل دی،

"دانیال اور شاہ ویر کہاں ہیں؟"

"وہیں ہیں..." ارمان نے اشارہ کیا، "چلو چلتے ہیں"...

دونوں ان کی طرف بڑھ گئے۔

شاہ ویر اور دانیال نے اسے آتے دیکھا تو فوراً کھڑے ہو گئے۔

"اوئے سکندر!" دانیال نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا،

"آخر کار آہی گئے"...

شاہ ویر نے بھی مسکرا کر ہاتھ ملایا،

"Welcome back..."

سکندر نے ہلکا سا سر ہلایا،

"ہاں"...

وہ سب ایک ساتھ بیٹھ گئے۔

باتیں شروع ہو گئیں عام، ہلکی پھلکی، جیسے کچھ بھی بدلا نہ ہو... مگر پھر بھی سب کو احساس تھا کہ بہت کچھ بدل چکا ہے۔

ادھر...

نادیا اور رِمشا دونوں وہیں کھڑی تھیں۔

دونوں نے اسے دیکھا تھا...

دونوں اس سے ملنا چاہتی تھیں...

مگر دونوں نہیں جا سکتی تھیں۔

لوگوں کے درمیان... اس ہجوم میں...

وہ بس دور سے ہی اسے دیکھ سکتی تھیں۔

اور یہی فاصلہ...

ان دونوں کے دلوں میں اور بھی کچھ بڑھا رہا تھا۔

اب چاروں ایک ساتھ بیٹھ چکے تھے۔ میز پر کولڈ ڈرنکس رکھی تھیں، برگر رکھے تھے، آس پاس شور تھا، میوزک ہلکا سا چل رہا تھا... اور ان کے درمیان ایک عجیب سی خاموشی بھی، جو ہر بات کے بیچ بیچ میں آ جاتی تھی۔

ارمان کوئی ہلکی سی بات کر رہا تھا، شاہ ویر کبھی کبھار ہنس دیتا، مگر سکندر...

وہ پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔

اس کے بولنے کا انداز بدل چکا تھا۔

الفاظ کم... مگر سیدھے۔

لہجہ نرم... مگر کہیں نہ کہیں سختی لیے ہوئے۔

"کام کیسا جا رہا ہے؟" شاہ ویر نے پوچھا۔

"ٹھیک..." سکندر نے مختصر جواب دیا، پھر خود ہی بولا،

"عادت ہو گئی ہے"...

"اور یونیورسٹی؟ manage ہو رہی ہے؟" ارمان نے پوچھا۔

سکندر نے ہلکا سا سر ہلایا،

"ہو جائے گی"...

وہ اب ہر بات کو گھما کر نہیں، سیدھا جواب دے رہا تھا... جیسے اس کے پاس فضول باتوں کے لیے وقت ہی نہ ہو۔

دانیال خاموش بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

اس کی نظریں بار بار سکندر پر رک جاتیں... جیسے وہ اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

آخرکار سکندر نے محسوس کیا۔

اس نے ہلکا سا سر موڑا اور دانیال کی طرف دیکھا،

"کیا ہوا؟"

دانیال تھوڑا سا چونکا، پھر فوراً نظریں ہٹا لیں،

"کچھ نہیں"...

مگر اس کے چہرے پر اب بھی وہی حیرت تھی۔

"نہیں... کچھ تو ہے..." سکندر نے سیدھا کہا۔

دانیال نے ایک لمحہ لیا... پھر آہستہ سے بولا،

"بس... تم... بدل گئے ہو یار"...

میز پر ایک لمحے کو خاموشی چھا گئی۔

ارمان اور شاہ ویر بھی دانیال کی طرف دیکھنے لگے۔

سکندر نے چند سیکنڈ اس کی طرف دیکھا... پھر ہلکا سا سر ہلایا،

"ہونا ہی تھا"...

اس کا جواب سادہ تھا... مگر اس میں وزن تھا۔

دانیال نے دھیرے سے کہا،

"پہلے تم... ہر بات پر ہنستے تھے... میرا مذاق بنائیں بغیر نہیں رہتے تھے لیکن اب"...

"اب ہنسنے کی وجہ کم رہ گئی ہے..." سکندر نے بات مکمل کر دی۔

کوئی بھی اس پر ہنسا نہیں۔

چند لمحے سب خاموش رہے۔

پھر سکندر نے خود ہی بات بدلی،

"چھوڑو... بتاؤ تم لوگ کیا کر رہے ہو آج کل"...

بات پھر چل پڑی... مگر اب انداز مختلف تھا۔

دانیال اب بھی کبھی کبھار اسے دیکھ لیتا...

جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو کہ یہ وہی سکندر ہے۔

اور سکندر...

اس نے وہ سب محسوس کیا...

مگر اس بار اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔

شاید اب وہ ہر نظر کا جواب دینا چھوڑ چکا تھا۔

سکندر کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا... پھر اچانک جیسے اس کے ذہن میں کوئی بات آئی ہو، اس نے سیدھا ارمان کی طرف دیکھا۔

"میں سوچ رہا ہوں..." اس نے آہستہ سے کہا،

"یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ کوئی بزنس بھی شروع کر لوں"...

ارمان فوراً متوجہ ہوا،

"کیسا بزنس؟"

سکندر نے گلاس ٹیبل پر رکھا،

"ایسا... کہ جب تک ڈگری مکمل ہو... تب تک کچھ نہ کچھ سیٹ ہو جائے"...

دانیال اور شاہ ویر بھی اب پوری طرح اس کی بات سن رہے تھے۔

"مثلاً؟" شاہ ویر نے پوچھا۔

سکندر نے تھوڑا سا جھک کر کہا،

"شرٹس کا کام"...

"Clothing?" ارمان کی آنکھوں میں چمک آئی،

"یہ تو اچھا آئیڈیا ہے"!

سکندر نے سر ہلایا،

"ہاں simple بھی ہے اور demand بھی ہے"...

ارمان فوراً جوش میں آ گیا،

"یار ہم casual shirts سے start کر سکتے ہیں... university crowd کو target کریں"...

"ہاں..." سکندر نے بات آگے بڑھائی،

"پہلے limited designs رکھیں quality اچھی ہو... پھر آہستہ آہستہ scale کریں"...

دانیال نے ہلکے سے کہا،

"Investment کہاں سے آئے گی؟"

سکندر نے فوراً جواب دیا،

"تھوڑی میں ڈالوں گا... تھوڑی arrange کرلیں گے... شروع چھوٹا کریں گے"...

ارمان نے ہاتھ میز پر مارا،

"یار online بھی ڈال سکتے ہیں Instagram page ...بنا لیتے ہیں"...

"اور نام؟" شاہویر نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

ارمان نے فوراً کہا،

"کوئی classy سا ...simple ...یاد رہنے والا"...

سکندر نے پہلی بار ہلکی سی دلچسپی سے کہا،

"نام بعد میں... پہلے کام clear کریں"...

اب وہ دونوں پوری طرح اس بات میں لگ گئے تھے۔

Supplier "کہاں سے لیں گے؟" ارمان نے پوچھا۔

"لاہور میں options ہیں..." سکندر نے سوچتے ہوئے کہا،

ready made "بھی لے سکتے ہیں... یا stitching خود کروا سکتے ہیں"...

"Custom branding کریں گے..." ارمان نے مزید جوش سے کہا،

"اپنا tag، اپنی packing..."

"ہاں..." سکندر نے سر ہلایا،

"اور pricing ایسی رکھیں گے کہ student afford کر سکے"...

دانیال اور شاہ ویر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

یہ وہی سکندر تھا... مگر پھر بھی نہیں۔

اب وہ ہنسی مذاق میں نہیں... بلکہ planning میں بات کر رہا تھا۔

اس کی باتوں میں direction تھی ... seriousness تھی...

اور سب سے بڑھ کر...

ایک مقصد تھا۔

ارمان نے مسکرا کر کہا،

"یار... یہ کام ہو سکتا ہے واقعی"...

سکندر نے ہلکا سا سر ہلایا،

"ہونا ہی چاہیے"...

اس کے لہجے میں اس بار ایک عجیب سا یقین تھا۔

جیسے وہ صرف بات نہیں کر رہا تھا...

بلکہ واقعی کچھ شروع کرنے والا تھا۔

اس کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ اچانک اسٹیج پر مائیک کی ہلکی سی آواز گونجی۔

سر عادل مائیک کے سامنے کھڑے تھے۔

ہال میں موجود شور آہستہ آہستہ کم ہونے لگا... سب کی نظریں اسٹیج کی طرف اٹھ گئیں۔

"اب میں چاہوں گا..." سر عادل نے مسکرا کر کہا،

"کہ ابراہیم جٹ... جنہیں ہم سب سکندر کے نام سے بھی جانتے ہیں"...

یہ سنتے ہی سکندر کے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس ہلکا سا رک گیا۔

اس نے سر اٹھایا۔

"سر عاطف کے لیے کچھ باتیں کہیں"...

پورے ہال میں ایک لمحے کو خاموشی چھا گئی۔

سکندر کا دل جیسے ایک دم بھاری ہو گیا۔

میں؟

اس نے فوراً ارد گرد دیکھا... جیسے یقین کرنا چاہ رہا ہو کہ واقعی اسی کو بلایا گیا ہے۔

اس کے ذہن میں ایک ہی بات چل رہی تھی

میں نے تو کچھ تیار ہی نہیں کیا...

اس کا سانس ہلکا سا تیز ہو گیا۔

ارمان فوراً اس کی طرف جھکا،

"جا یار... تم کر لو گے"...

سکندر نے اسے ایک نظر دیکھا۔

ارمان ہنسا،

"تم باتوں کے شیر ہو"...

یہ جملہ عام حالات میں شاید اسے حوصلہ دیتا... مگر اس وقت سکندر کے اندر ایک عجیب سا خلا تھا۔

وہ آہستہ سے کرسی پر سیدھا بیٹھ گیا۔

اس کے سامنے اسٹیج تھا... اور اسٹیج پر وہ سب لوگ جو اسے دیکھ رہے تھے۔

ہزاروں نہیں تو سینکڑوں نظریں اس پر تھیں۔

اس کے ہاتھ ہلکے سے ٹھنڈے ہو گئے۔

وہ کھڑا ہوا۔

ایک لمحہ...

پھر دوسرا...

اس نے مائیک کی طرف قدم بڑھایا۔

ہر قدم کے ساتھ ہال کی خاموشی مزید گہری ہو رہی تھی۔

ارمان، دانیال، شاہ ویر... سب اسے دیکھ رہے تھے۔

اور پھر...

سکندر اسٹیج پر پہنچ گیا۔

مائیک کے سامنے کھڑا ہوا۔

اس نے ایک نظر پورے ہال پر ڈالی...

اور پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ بولنا اتنا آسان نہیں جتنا وہ سمجھتا تھا۔

اس نے ہلکی سی سانس لی...

اور مائیک کے قریب آیا۔

لیکن اس کی آواز...

ابھی خاموشی کے پیچھے کہیں کھڑی تھی۔

سکندر مائیک کے سامنے کھڑا تھا۔ پہلے چند لمحے اس نے صرف ہال کو دیکھا روشنیوں سے بھرا ہوا کمرہ، سامنے بیٹھے لوگ، اور وہ خاموش سی توقع جو اس کی طرف لگی ہوئی تھی۔

اس نے ہلکی سی سانس لی اور پھر بولا،

"السلام علیکم کیسے ہیں آپ سب سب سے پہلے تو تمام طلبہ اساتذہ کو خوش امدید اگر میں سچ بولوں تو... میں نے کوئی speech وغیرہ prepare نہیں کی تھی۔ میں تو اس پارٹی میں آنے والا بھی نہیں تھا۔"

ہال میں ہلکی سی ہنسی پھیل گئی۔

وہ رکا نہیں، اس کی آواز اب تھوڑی سی steady ہو گئی تھی۔

"لیکن میرے دوستوں نے اتنا insist کیا کہ میں آگیا... ان کے لیے آیا ہوں میں یہاں۔"

اس نے ایک لمحہ لیا، پھر کہا،

"مجھے لگتا ہے میری زندگی میں لوگ برے نہیں آئے... حالات برے آ جاتے ہیں۔"

ہال آہستہ آہستہ خاموش ہو گیا۔

"سر عاطف اصغر..." اس نے ہلکا سا سر اسٹیج کی طرف جھکایا،

"میں انہیں زیادہ نہیں جانتا... وہ اچھے ہی ہوں گے"...

پھر اس نے پورے ہال کی طرف دیکھا،

"لیکن ایک بات میں ضرور جانتا ہوں... یہاں موجود ہر teacher اور ہر student واقعی بہت اچھا ہے۔"

کچھ لوگ ہلکے سے مسکرائے، کچھ نے سر ہلایا۔

"ہم سب نے اپنی اپنی زندگی میں کافی کچھ برداشت کیا ہے... اور پھر یہاں تک پہنچے ہیں۔"

اس کی آواز اب زیادہ واضح ہو گئی تھی۔

"ایک مہینہ پہلے میرے بابا کا انتقال ہوا... مجھے لگا تھا میں شاید سنبھل نہیں پاؤں گا"...

ہال میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔

"لیکن دیکھیں..." اس نے ہلکے سے مسکرا کر کہا،

"میں آج یہاں کھڑا ہوں... اور کوشش کر رہا ہوں کہ آگے بھی ایسے ہی کھڑا رہوں۔"

اس نے تھوڑا سا توقف کیا، پھر کہا،

"کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا... لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ آسان ہوتا ہے۔"

وہ اب سیدھا کھڑا تھا۔

"اگر آپ کوئی چیز حاصل کرنا چاہتے ہیں... تو کم از کم کوشش ضرور کریں... تاکہ کل کو یہ guilt نہ رہے کہ موقع تھا اور ہم نے کچھ کیا نہیں۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے آخری جملہ کہا،

"بس... یہی میری unprepared speech تھی۔"

جیسے ہی اس نے مائیک ہلکا سا پیچھے کیا...

ہال میں پہلے ایک سیکنڈ کی خاموشی رہی...

اور پھر

تالیاں بجنے لگیں۔

ہلکی ہنسی بھی، تعریف بھی، اور ایک عجیب سا احترام بھی۔

ارمان نے مسکرا کر سیٹی ماری، دانیال نے خوشی سے سر ہلایا، شاہ ویر بھی ہنس پڑا۔

سکندر نے ہلکا سا سر جھکا دیا...

اور اس لمحے پہلی بار اسے محسوس ہوا

کہ وہ صرف survive نہیں کر رہا...

بلکہ لوگ اسے سن بھی رہے ہیں۔

سکندر اسٹیج سے واپس آیا تو جیسے ہی وہ اپنی جگہ پر بیٹھا، ارد گرد کا ماحول دوبارہ ہلکا پھلکا ہو گیا۔ کچھ لوگ ابھی بھی اس کی speech کے اثر میں تھے، کچھ تالیاں بجا کر واپس اپنی باتوں میں لگ گئے، اور ہال کا وہ سنجیدہ لمحہ آہستہ آہستہ شور میں بدلنے لگا۔

ارمان، دانیال اور شاہ ویر فوراً اس کے قریب ہو گئے۔

"یار سکندر..." ارمان نے مسکرا کر کہا، "تم نے تو سب کا دل جیت لیا آج"!

دانیال نے بھی ہنستے ہوئے کہا،

"ہمیں تو پتہ ہی نہیں تھا تم اتنا اچھا بول بھی سکتے ہو"!

شاہ ویر نے کندھے پر ہلکا سا مکا مارا،

"باتوں کے شیر واقعی ہو تم"!

سکندر نے ہلکا سا مسکرا دیا، مگر اس کی آنکھوں میں وہی خاموشی تھی جو اب اس کا حصہ بن چکی تھی۔

وہ بس سر ہلا کر رہ گیا،

"بس... ویسے ہی"...

تھوڑی دیر سب پھر اپنی اپنی باتوں میں لگ گئے۔ کسی نے کیمپس کی بات کی، کسی نے کام کی، کسی نے مذاق شروع کر دیا۔ ماحول دوبارہ نارمل ہو گیا تھا۔

ارمان نے اچانک سکندر کی طرف دیکھا،

"یار ایک بات بتا"...

سکندر نے اس کی طرف دیکھا،

"ہاں؟"

ارمان نے ہلکے انداز میں پوچھا،

"کوئی لڑکی نہیں پسند تمہیں؟"

یہ سوال آتے ہی سکندر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔

اس نے نظریں ہٹائیں، ہلکا سا مسکرایا... جیسے سوال کو ہلکا لے رہا ہو۔

"پتہ نہیں..." اس نے سادہ سا جواب دیا۔

مگر اس سادگی کے پیچھے ایک مکمل دیوار تھی۔

ارمان نے اسے غور سے دیکھا۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ سکندر ہمیشہ ایسے ہی جواب دیتا تھا نہ ہاں، نہ نہیں...
بس "پتہ نہیں"، "دیکھیں گے"، "ابھی سوچا نہیں..."

اور یہی بات ارمان کو ہمیشہ کھٹکتی تھی۔

"یار تم ہر بار یہ بات ایسے ہی ٹال دیتے ہو..." ارمان نے آہستہ سے کہا۔

سکندر نے اس کی طرف دیکھا، پھر ہلکا سا کندھے اچکائے،

"ٹال نہیں رہا... بس اس بات کو اتنا اہم نہیں سمجھتا"...

ارمان نے کچھ کہنا چاہا، مگر رک گیا۔

وہ جانتا تھا... سکندر کے ساتھ بحث آسان نہیں تھی۔

سکندر پھر واپس بیٹھ گیا اور بات بدل دی۔

اور ارمان... اسے بس یہی لگتا رہا کہ سکندر ہر چیز کو کہہ کر بھی کہیں نہ کہیں

چھپا جاتا ہے۔

جیسے وہ کھل کر جینا جانتا ہی نہیں... یا شاید جینا چاہتا ہی نہیں۔

پارٹی آہستہ آہستہ اپنے اختتام کی طرف جا رہی تھی۔

ہال میں شور کم ہو گیا تھا، موسیقی مدھم ہو چکی تھی، اور لوگ گروپس کی صورت میں کھڑے تصویریں بنا رہے تھے۔ کچھ اساتذہ کے ساتھ سیلفیاں لے رہے تھے، کچھ سر عاطف اصغر کو الوداع کہہ رہے تھے، اور کچھ بس تھکے ہوئے انداز میں ہنستے ہوئے باہر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ارمان مومنہ کے ساتھ پہلے ہی نکل چکا تھا۔ دونوں نے جلدی میں بائیک کی طرف رخ کیا، جیسے وہ بھیڑ اور شور سے کچھ لمحے دور جانا چاہتے ہوں۔

دانیال اور شاہ ویر بھی کسی اور گروپ کے ساتھ نکلنے کی تیاری میں تھے۔

اور سکندر...

وہ دروازے کی طرف بڑھ ہی رہا تھا۔

اس کے قدم معمول کے مطابق تھے، نہ جلدی نہ تاخیر... بس ایک خاموش روانی کے ساتھ۔

تبھی

اس کے راستے میں دو سائے آ کر رک گئے۔

نادیا اور رِمشا۔

سکندر فوراً رک گیا۔

اس نے سر اٹھایا...

اور دونوں کو دیکھا۔

ایک لمحے کے لیے سب کچھ جیسے ساکت ہو گیا۔ پیچھے شور تھا، لوگ تھے، حرکت تھی... مگر ان کے درمیان ایک خاموش دائرہ بن گیا تھا۔

نادیا نے ہلکے سے لب کھولے، مگر الفاظ رک گئے۔

رِمشا اس کے مقابلے میں تھوڑی زیادہ سیدھی کھڑی تھی... اس کی آنکھوں میں ایک الگ ہی کیفیت تھی، جیسے وہ اس لمحے کا کافی دیر سے انتظار کر رہی ہو۔

سکندر خاموش رہا۔

نہ اس نے پہل کی، نہ پیچھے ہٹا۔

بس وہیں کھڑا رہا... ان دونوں کو دیکھتا ہوا۔

نادیا نے آخرکار آہستہ سے کہا،

"تم جا رہے ہو؟"

سکندر نے ہلکا سا سر ہلایا،

"ہاں"...

رِمشا نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا... جیسے وہ لفظوں کے پیچھے کچھ اور تلاش کر رہی ہو۔

نادیا نے چند لمحے ہچکچاتے ہوئے اسے دیکھا، پھر آہستہ سے پوچھ لیا،

"کیا تمہیں کبھی محبت ہوئی ہے، سکندر؟"

یہ سوال آتے ہی سکندر کے قدم جیسے ایک لمحے کو اندر ہی رک گئے۔

اس نے سر اٹھایا...

نادیا کی آنکھوں میں سوال تھا... اور رِمشا کی آنکھوں میں ایک اور طرح کی بے چینی۔ وہ یہ جواب سننا چاہتی تھی، مگر بول نہیں پا رہی تھی۔

سکندر خاموش رہا۔

کچھ دیر... بس ہال کی دور کی آوازیں ان کے درمیان بہتی رہیں۔

پھر اس نے آہستہ سے کہا،

"میں اتنا امیر نہیں ہوں کہ محبت کر سکوں"...

وہ رکا، پھر ہلکا سا طنزیہ سا مسکرایا،

"ذمہ داریاں بہت ہیں... اب ان کو سنبھالوں یا محبت کروں؟"

یہ جملہ سن کر رِمشا کے چہرے پر فوراً سختی آ گئی۔

اس نے بے اختیار کہا،

"دنیا ختم نہیں ہوئی سکندر"!

اس کی آواز میں غصہ بھی تھا اور درد بھی،

"جینا تو شروع کرو... اتنے مایوس کیوں ہو رہے ہو؟"

نادیا خاموش کھڑی تھی، بس اسے دیکھ رہی تھی۔

سکندر نے دونوں کو دیکھا...

پھر ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ گئی مگر وہ مسکراہٹ آنکھوں تک نہیں پہنچی۔

"تمہیں محبت ہے..." اس نے سیدھا رِمشا کی طرف دیکھ کر کہا، پھر نادیا کی طرف نظر کی،

"اور تمہیں بھی ہے"...

دونوں ایک دم خاموش ہو گئیں۔

سکندر نے آہستہ سے سر ہلایا،

"لیکن کس سے ہے... یہ محبت نہیں ہوتی"...

وہ رکا، پھر اس کی آواز تھوڑی بھاری ہو گئی،

"یہ وقتی attachment ہے"...

اس نے دونوں کو ایک ایک لمحہ دیکھا،

"محبت ہوتی تو میری باتیں سمجھ آجاتیں"...

ایک لمحہ خاموشی...

اس کے بعد اس نے دھیرے سے کہا،

"اور مجھے کوئی نہیں سمجھ سکتا"...

رِمشا کے ہاتھ مٹھی میں بند ہو گئے، نادیا کی نظریں جھک گئیں۔

سکندر نے بس اتنا کہا،

"آپ دونوں خوش رہو"...

اور بغیر کسی اور لفظ کے...

وہ وہاں سے چل دیا۔

اس بار بھی...

نہ پیچھے مڑ کر دیکھا...

نہ رکا۔

سکندر چلتا ہوا چند قدم آگے گیا، پھر رک کر آہستہ سا مڑا۔ اس کی آواز اب پہلے سے زیادہ سنبھلی ہوئی تھی، مگر اندر کہیں نہ کہیں تھکن تھی۔

"مجھے خوشی اور حیرانی اس بات پر ہے..." اس نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

"کہ آپ دونوں ایک دوسرے سے لڑ نہیں رہیں"...

وہ ہلکا سا رکا، پھر سیدھا جملہ بولا،

"کیونکہ میں نے کسی سے دل نہیں لگایا... نہ کسی کو دل سے امید دی ہے"...

اس کی بات ہال کے شور سے الگ، سیدھی ان دونوں کے درمیان گر رہی تھی۔

نادیا اور رِمشا دونوں خاموش رہیں۔

سکندر نے ایک لمحہ دونوں کو دیکھا، پھر اپنی بات واضح کی،

"میں نے آپ میں سے کسی کو نہیں کہا تھا کہ آپ مجھ سے محبت کرو"...

وہ رکا، جیسے لفظوں کو ترتیب دے رہا ہو،

"آپ دونوں خود ہی... مجھ سے attach ہوئیں"...

اس کے لہجے میں نہ الزام تھا، نہ طنز... بس ایک حقیقت تھی، جو وہ صاف صاف رکھ دینا چاہتا تھا۔

رِمشا نے ہونٹ بھینچ لیے، مگر بولی نہیں۔

نادیا کی نظریں زمین پر تھیں۔

سکندر نے آہستہ سے سانس لیا اور آخری بات کہی،

"اور اب... میں نے بس ایک boundary set کر دی ہے"...

وہ دونوں کی طرف دیکھ کر بولا،

"اپنے آپ کو مجھ سے دور کر لیں" I am not the best...

ایک لمحہ خاموشی چھا گئی۔

پھر اس نے آہستہ سے سر ہلایا،

"یہی بہتر ہے"...

اور وہ پلٹ گیا۔

اس بار بھی وہ رکا نہیں...

نہ اس نے پیچھے دیکھا، نہ کسی ردِ عمل کا انتظار کیا۔

بس سیدھا چلتا رہا...

اور اس کے پیچھے دو دل ایسے کھڑے رہ گئے جنہیں پہلی بار حقیقت کا سامنا ہوا تھا خاموش، الجھے ہوئے، اور خود سے بھی لڑتے ہوئے۔

آہستہ سے باہر نکل آیا۔

ہوا ٹھنڈی تھی اور شہر کی روشنیاں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

سکندر نے جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور چند قدم چلنے کے بعد آہستہ سے سانس لی۔

اس دن اس نے کسی کو روکا نہیں تھا۔

نہ نادیا کو، نہ رِمشا کو، نہ اپنے ماضی کے کسی احساس کو۔

اس نے بس ایک چیز کی اجازت دی تھی

سب کو آزاد ہونے کی۔

اپنے آپ کو بھی... اور ان سب کو بھی جو کسی نہ کسی طرح اس سے جڑ گئے تھے۔

مگر اس آزادی کے ساتھ ایک خاموش سا بوجھ بھی تھا... جو وہ اکیلا اٹھا کر چل رہا تھا۔

اور وہ جانتا تھا

آج کے بعد کوئی بھی اسے پہلے جیسا نہیں دیکھے گا۔

نہ وہ خود... نہ کوئی اور۔

دوپہر کا وقت تھا۔ جِناح باغ میں دھوپ نرم مگر واضح تھی۔ درختوں کے سائے لمبے نہیں تھے، بس ہلکے ہلکے زمین پر پھیلے ہوئے تھے۔ ہوا میں ہلکی سی گرمی کے ساتھ ایک سکون بھی تھا۔

ارمان اور مومنہ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ اردگرد لوگ اپنے اپنے انداز میں مصروف تھے کچھ فیملیز بیٹھ کر کھانا کھا رہی تھیں، کچھ بچے دوڑ رہے تھے، اور کچھ لوگ خاموشی سے بیٹھے درختوں کے سائے میں وقت گزار رہے تھے۔

مومنہ کافی دیر سے خاموش تھی، مگر اس کی خاموشی بھاری نہیں تھی... بس سوچوں میں ڈوبی ہوئی۔

پھر اچانک وہ رکی۔

ارمان نے فوراً اس کی طرف دیکھا،

"کیا ہوا؟"

مومنہ نے بغیر جواب دیے اپنے سینڈلز اتارے۔

ارمان ایک لمحے کو چونک گیا،

"مومنہ جی... یہ کیا کر رہی ہیں؟ لوگ دیکھ رہے ہیں"...

مگر مومنہ نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

اس نے سینڈلز ہاتھ میں پکڑے اور ننگے پاؤں گھاس پر قدم رکھ دیا۔

گرم دھوپ میں گھاس کی ٹھنڈک جیسے اسے فوراً محسوس ہوئی۔ اس کے چہرے پر ایک دم ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

اور پھر وہ بھاگ پڑی۔

آہستہ نہیں... ہلکی سی بے فکری کے ساتھ۔

کبھی وہ رک کر گھومتی، کبھی ہاتھ پھیلا کر ہوا کو محسوس کرتی، اور کبھی بے اختیار ہنس پڑتی۔

ارمان چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔

اس کے چہرے پر پہلے شرمندگی آئی آس پاس لوگوں کی نظریں واقعی ان کی طرف تھیں۔ کچھ حیران، کچھ مسکراتے ہوئے۔

"یہ کیا سوچ رہے ہوں گے لوگ..." اس نے آہستہ سے خود سے کہا۔

مگر پھر اس کی نظر مومنہ پر گئی۔

وہ دھوپ میں ننگے پاؤں گھوم رہی تھی... جیسے اس لمحے میں وہ ہر بوجھ اتار چکی ہو۔

ارمان کی شرمندگی آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔

اور اس کی جگہ ایک سادہ سی مسکراہٹ آگئی۔

وہ آہستہ سے چلتا ہوا اس کے پیچھے گیا۔

"پاگل ہو آپ..." اس نے ہلکے سے کہا۔

مومنہ نے مڑ کر ہنستے ہوئے جواب دیا،

"آج مجھے ہونے دو"...

ارمان نے اسے دیکھا...

اور پھر خود بھی ہنس دیا۔

کیونکہ کبھی کبھی...

خوشی کو سمجھانے کی ضرورت نہیں ہوتی... بس محسوس کرنے کی ہوتی ہے۔

اور کبھی کبھی محبت "perfect" ہونے سے نہیں...

بس خوش ہونے سے خوبصورت لگتی ہے۔

وہ دونوں تھوڑی دیر بعد چلتے چلتے ایک پرسکون سے حصے میں آ کر بیٹھ گئے۔

درختوں کے نیچے ہلکا سا سایہ تھا، اور قریب ہی دو تین اور جوڑے بھی بیٹھے ہوئے تھے کوئی خاموش باتیں کر رہا تھا، کوئی ہنس رہا تھا، اور کوئی بس ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزار رہا تھا۔

مومنہ کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی۔

پھر اچانک اس نے آہستہ سے ارمان کی طرف جھک کر کہا،

"میرا دل کر رہا ہے میں ان کو تنگ کروں"...

ارمان ایک دم چونک گیا،

"کیا؟ آپ کیا کہہ رہی ہیں مومنہ جی؟"

مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور سمجھ پاتا، مومنہ نے زمین سے ایک چھوٹا سا کنکر اٹھایا۔

ارمان کی آنکھیں فوراً پھیل گئیں،

"مومنہ جی... نہیں"!!

لیکن وہ رکنے کے لیے نہیں تھی۔

اس نے وہ کنکر ہلکے سے دور بیٹھے ایک جوڑے کی طرف پھینک دیا۔

کنکر جا کر لڑکی کے قریب گرا... اور پھر اس کے بازو کو ہلکا سا چھو کر گزر گیا۔

لڑکی چونک گئی، اس نے فوراً اردگرد دیکھا۔

ارمان تو جیسے ساکت ہو گیا۔

اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا،

"یہ آپ نے کیا کر دیا ہے؟"

اس نے جلدی سے مومنا کی طرف دیکھا،

"آپ پاگل ہو گئی ہیں؟ لوگ کیا سوچیں گے؟"!

مومنہ نے بے فکری سے کندھے اچکا دیے، جیسے اسے کوئی فرق ہی نہ پڑا ہو،

"بس ویسے ہی... مزہ آ رہا تھا"...

ارمان نے فوراً اٹھ کر آس پاس دیکھا۔ خوش قسمتی سے زیادہ لوگ اس طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے، مگر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی۔

وہ دوبارہ بیٹھا تو سر تھام لیا،

"مومنہ جی... یہ کوئی بچگانہ حرکت نہیں ہے... یہ غلط ہے"...

مومنہ نے اس کی طرف دیکھا، اس بار اس کے چہرے پر ہلکی سی شرارت کے ساتھ ایک ضد بھی تھی،

"اتنا سنجیدہ کیوں ہو جاتے ہو ہر چیز پر؟"

ارمان نے گہرا سانس لیا،

"کیونکہ ہر چیز کھیل نہیں ہوتی"...

کچھ لمحے خاموشی رہی۔

ہوا ہلکی سی چل رہی تھی، مگر ان دونوں کے درمیان ایک عجیب سا وقفہ آ گیا تھا۔

پھر ارمان نے نرم لہجے میں کہا،

"مومنہ جی... ایسے نہیں کرتے"...

اس کی آواز میں غصہ کم اور فکر زیادہ تھی۔

مومنہ نے اس بار نظریں جھکا لیں...

اور پہلی بار اس کے چہرے پر ہلکی سی شرمندگی آ گئی۔

ارمان ابھی مومنہ کو سمجھانے ہی لگا تھا کہ اچانک مومنہ نے دوبارہ زمین سے ایک کنکر اٹھایا اور اس بار تیزی سے وہ دور بیٹھے لڑکے کی طرف پھینک دیا۔

کنکر اس بار واضح طور پر لڑکے کو لگا۔

وہ لڑکا فوراً چونک گیا، اس نے ارد گرد دیکھا، پھر سیدھا ان کی طرف اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوئے! کون تھا یہ؟" اس کی آواز تیز تھی۔

مومنہ ایک لمحے کو ساکت ہوئی... پھر اچانک اس نے ارمان کا ہاتھ پکڑا اور بھاگ پڑی۔

ارمان بھی ایک دم ہڑبڑا گیا۔

"مومنہ جی! بھاگ کیوں رہی ہیں؟ پاگل ہو گئی ہیں؟" وہ بھاگتے ہوئے بولا، مگر اس کے قدم خود بخود اس کے ساتھ چل پڑے۔

پیچھے سے وہ لڑکا تیزی سے ان کی طرف آرہا تھا۔

ارمان نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا،

"مومنہ جی... وہ واقعی آرہا ہے"!

اب مومنہ کی ہنسی کہیں غائب ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ ہلکی سی گھبراہٹ نے لے لی تھی۔

"میں نے سوچا تھا وہ ignore کر دے گا..." اس نے بھاگتے ہوئے کہا۔

ارمان نے سانس پھولتے ہوئے جواب دیا،

"آپ نے سوچا تھا؟ آپ نے اسے وٹا مارا ہے! مارنے سے پہلے سوچنا تھا"

دونوں تیزی سے درختوں اور بینچز کے درمیان سے نکلتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ارد گرد لوگ حیرانی سے انہیں دیکھ رہے تھے کوئی ہنس رہا تھا، کوئی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔

پیچھے سے آواز آئی،

"رکو! کون ہو تم لوگ؟"

ارمان نے ایک بار پھر پیچھے دیکھا،

"مومنہ جی! یہ مزاق نہیں ہے اب"!

مگر مومنہ اب بھی بھاگ رہی تھی... اور ارمان، چاہ کر بھی رک نہیں سکا۔

کیونکہ اب معاملہ صرف شرارت کا نہیں رہا تھا...

اب یہ واقعی "پکڑے جانے" والا ہو چکا تھا۔

جب وہ دونوں کافی دور آ گئے تو مومنہ نے ایک بینچ کے پاس آ کر رک کر اپنے گھٹنے تھام لیے۔ سانس اس کی بھی تیز تھی اور ارمان کی بھی۔ دونوں کچھ لمحے بس سانس ہی لے رہے تھے۔

مومنہ نے آہستہ آہستہ سیدھا ہو کر ارمان کی طرف دیکھا، پھر ہلکی سی شرارت کے ساتھ بولی،

"آپ تو ڈر گئے تھے"!

یہ کہتے ہی وہ زور زور سے ہنس پڑی، جیسے سارا منظر دوبارہ اس کے ذہن میں چل گیا ہو۔

ارمان پہلے تو ایک لمحے کو اسے گھورتا رہ گیا سانس ابھی بھی تیز تھی، اور چہرے پر تھوڑی سی شرمندگی بھی تھی۔

"میں... ڈرا نہیں تھا..." اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا، "میں بس situation سمجھ رہا تھا"!

مومنہ نے ہنستے ہوئے سر ہلایا،

"ہاں ہاں... سمجھ رہے تھے"!

اس کی ہنسی رک ہی نہیں رہی تھی۔

ارمان نے پہلے ہلکا سا منہ بنایا، پھر خود بھی ہنس پڑا۔

"آپ پاگل ہو مکمل"...

مومنہ نے ہنستے ہوئے کندھے اچکا دیے،

"اور آپ بہت بہادر ہیں نا"!

ارمان نے سر ہلا کر مسکراتے ہوئے کہا،

"اچھا بس... اب نہ کچھ پھینکنا دوبارہ"...

دونوں چند لمحے اسی طرح ہنستے رہے۔

وہ بھاگنے کا ڈر، وہ گھبراہٹ، وہ دل کی تیز دھڑکن... سب اب ایک ہلکی سی یاد بن چکا تھا۔

اور اس لمحے میں دونوں کو بس یہی لگ رہا تھا

کہ کبھی کبھی غلطی بھی... ایک اچھی یاد بن جاتی ہے۔

وہ دونوں ابھی بھی بینچ پر بیٹھے ہنس ہی رہے تھے، سانس تھوڑی نارمل ہو رہی تھی اور دل کی دھڑکن بھی آہستہ ہو چکی تھی۔

تبھی مومنہ نے اپنے بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

ارمان نے چونک کر دیکھا،

"اب کیا کرنے لگی ہیں؟"

مومنہ نے ایک چھوٹا سا پیکٹ نکالا... اور اس میں سے ایک برگر باہر آگیا۔

ارمان نے فوراً آنکھیں پھیلا دیں،

"یہ کہاں سے آیا؟"

مومنہ نے بالکل بے فکری سے جواب دیا،

"سر عادل کا ہے"...

ارمان ایک دم حیران رہ گیا،

"کیا مطلب سر عادل کا؟"

مومنہ نے ہلکے سے کندھے اچکائے،

"وہ کھا نہیں رہے تھے... تو میں نے لے لیا"...

یہ سن کر ارمان چند سیکنڈ ساکت رہا۔

اس کے چہرے پر حیرت، بے یقینی اور ہنسی سب ایک ساتھ آ گئے۔

"آپ نے... کیا کیا ہے؟" اس نے آہستہ سے کہا، جیسے یقین نہ آ رہا ہو۔

مومنہ نے بہت سادہ لہجے میں کہا،

"انہوں نے رکھا تھا... میں نے اٹھا لیا"...

ارمان کچھ بولنے ہی لگا تھا کہ اچانک اس کے اندر سے ہنسی پھوٹ پڑی۔

وہ سر جھکا کر ہنسنے لگا،

"مومنہ جی... آپ واقعی خطرناک ہو"!

مومنہ بھی اس کی ہنسی دیکھ کر ہنس پڑی،

"اب کیا کروں... بھوک لگی تھی"!

ارمان نے سر ہلاتے ہوئے برگر پکڑا،

"سر عادل اگر پوچھیں گے تو میں کیا جواب دوں گا؟"

مومنہ نے معصومیت سے کہا،

"ان کو بتائے گا کون کہ ان کا برگر ہم نے غائب کیا ہے"

ارمان سے حیرت سے دیکھا پھر بولا،

"میں بتادوں گا ان کو ان کو یہ جاننے کا حق ہے کہ ان کا برگر کہاں گیا؟"

مومنہ نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا،

"پھر میں آپ کا قتل کر دوں گی"

ارمان حیران ہو گیا،

"ایک برگر کے پیچھے میرا قتل کرو گی"

مومنہ نے برگر کی بائٹ لی،

"ہاں کیوں نہیں برگر مجھے بہت عزیز ہے "

ارمان تھوڑا پریشان ہوا پھر بولا،

"برگر سے لوئل ہے میرے ساتھ بھی لوئل رہے گی"

یہ سن کر مومنہ کی ہنسی مزید بڑھ گئی۔

وہ دونوں چند لمحے اسی طرح ہنستے رہے ایک برگر، ایک شرارت، اور ایک ایسا دن جو غلطیوں سے شروع ہو کر یادوں پر ختم ہو رہا تھا۔

مومنہ نے ہنستے ہوئے برگر ارمان کی طرف کیا۔ ارمان نے بھی بغیر جھجک اسی سائیڈ سے بائٹ لیا جہاں سے مومنہ نے پہلے کھایا تھا۔ پھر مومنہ نے بھی دوبارہ وہیں سے کھانا شروع کر دیا۔ دونوں آرام سے بیٹھ کر برگر کھا رہے تھے، مگر مومنہ کی بائٹس بڑی اور جلدی جلدی تھیں جبکہ ارمان کے چھوٹے اور سنبھلے ہوئے۔

ارمان نے اسے دیکھ کر ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا،

"آپ کا اتنا بڑا منہ نہیں ہے جتنی آپ بائٹ لیتی ہیں"...

مومنہ ایک لمحے کو رک گئی، پھر فوراً ہنس پڑی،

"اچھا؟ آپ کا منہ چھوٹا تو میں کیا کروں"

ارمان بھی ہنسنے لگا، اور دونوں دوبارہ برگر کھانے لگے، اس چھوٹی سی بات پر بھی ماحول ہلکا اور خوشگوار ہو گیا۔

برگر تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ دونوں ابھی بھی بینچ پر بیٹھے تھے، ہنسی مذاق ہلکا سا تھم گیا تھا اور ایک آرام سا لمحہ آ گیا تھا۔

مومنہ نے آخری بائٹ ختم کی، پھر آہستہ سے اپنی انگلیوں سے ہونٹ صاف کیے... اور اچانک بغیر کسی وارننگ کے اس نے جھک کر ارمان کے ہونٹوں پر ہلکا سا لمس کر دیا۔

ارمان ایک دم ساکت رہ گیا۔

اس کی آنکھیں فوراً مومنہ پر جم گئیں، جیسے اسے یقین نہ آیا ہو کہ ابھی کیا ہوا ہے۔

مومنہ خود بھی ایک لمحے کے لیے ٹھہر گئی... پھر فوراً سیدھی ہو کر ہلکی سی شرارتی مسکراہٹ دے دی، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ارمان نے سانس تھام کر آہستہ سے کہا،

"مومنہ جی... یہ کیا تھا؟"

مومنہ نے کندھے اچکا دیے،

"برگر کا ٹیسٹ"...

ارمان ایک لمحے کو اسے گھورتا رہا... پھر بے اختیار ہنس پڑا،

"آپ واقعی نارمل نہیں ہو"!

مومنہ بھی ہنسنے لگی، اور دونوں کے درمیان وہ لمحہ ہلکی سی شرارت اور سادگی میں بدل گیا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں خاموش بیٹھ گئے... مگر اب خاموشی پہلے جیسی نہیں تھی اس میں ایک نیا پن تھا، جسے دونوں ہی محسوس کر رہے تھے، مگر نام کوئی نہیں دے رہا تھا۔

—

موجودہ وقت:

مومنہ نے جب سے فلک شبیر سے شادی کی تھی، اس کی زندگی جیسے آہستہ آہستہ اپنے رنگ کھو رہی تھی۔ جس لڑکی نے کبھی اپنی ڈگری ہاتھ میں لے

کر بہتر مستقبل کے خواب دیکھے تھے، جو سمجھتی تھی تعلیم اسے خود مختاری دے گی، عزت دے گی، وہی تعلیم اب اسے ایک طنز لگنے لگی تھی۔ گریجویشن کی وہ ڈگری جو کبھی فخر تھی، اب دیوار پر لگی ایک بے معنی فریم محسوس ہوتی تھی، جیسے کسی اور زندگی کی نشانی ہو۔

فلک شبیر باون سال کا شخص تھا۔ عمر کا فرق صرف عدد نہ تھا، مزاج، طاقت اور اختیار کا فرق بھی تھا۔ باہر کی دنیا کے لیے وہ ایک معزز نام تھا کاروباری، خیرات دینے والا، مسجد میں چندہ دینے والا، لوگوں کی مدد کرنے والا۔ لوگ کہتے، "بہت نیک آدمی ہے..."، "کتنا بڑا دل ہے..."، "مومنہ خوش نصیب ہے..."، "مومنہ نے اس سے پیسوں کے لیے شادی کی ہے"
مومنہ کبھی کبھی سوچتی

کاش لوگ بند دروازوں کے پیچھے بھی دیکھ سکتے۔

کیونکہ جو شخص باہر سخی نظر آتا تھا، اندر وہی شخص ظالم تھا۔

شادی کے پہلے چند دنوں میں ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ ایک رشتے میں نہیں، ایک نگرانی میں داخل ہوئی ہے۔

فلک شبیر ہر چیز پر حکم دیتا۔

کیا پہننا ہے۔

کس سے بات کرنی ہے۔

فون کس وقت استعمال کرنا ہے۔

ہنسنا بھی حد میں۔

بولنا بھی اجازت سے۔

اگر مومنہ کوئی رائے دیتی تو وہ طنز سے ہنس پڑتا۔

"یہ یونیورسٹی کی باتیں یہاں مت لایا کرو"...

"کتابیں پڑھ لینے سے عورت عقل مند نہیں ہو جاتی"...

ہر جملہ اس کے وقار پر ضرب تھا۔

پھر باتیں تحقیر سے آگے بڑھیں۔

ایک رات صرف اس لیے جھگڑا ہوا کہ چائے میں چینی کم تھی۔

فلک شبیر نے کپ زور سے میز پر مارا۔

مومنہ سہم گئی۔

اگلے لمحے اس کے گال پر پہلا تھپڑ پڑا۔

اتنا اچانک کہ وہ سمجھ ہی نہ سکی۔

اسے لگا شاید یہ ایک بار ہے۔

غلط فہمی تھی۔

یہ آغاز تھا۔

پھر دھکے شروع ہوئے۔

بازو پکڑ کر جھنجھوڑنا۔

دیوار سے لگا دینا۔

کلائی پر انگلیوں کے نشان چھوڑ دینا۔

اور پھر مار۔

کبھی غصے میں۔

کبھی شراب کے نشے میں۔

وہ شراب پیتا تھا، اور نشہ اسے اور بھی بے رحم بنا دیتا۔

نشے میں اس کی آواز بدل جاتی۔

آنکھیں بدل جاتیں۔

اور مومنہ کے لیے رات ایک دہشت بن جاتی۔

ایک دفعہ اس نے آئینے میں اپنے چہرے پر نیل دیکھا۔

لب کے پاس سوجن تھی۔

گال پر سرخی۔

اس نے دوپٹہ درست کیا، نشان چھپائے۔

مگر خود سے کیا چھپاتی۔

ایک ہفتہ...

صرف ایک ہفتے کی شادی میں...

وہ اتنا کچھ جھیل چکی تھی جتنا بعض عورتیں برسوں میں سہتی ہیں۔

رات کو اکثر وہ خاموش بستر کے کنارے بیٹھ جاتی۔

فلک سو رہا ہوتا۔

اور وہ جاگ رہی ہوتی۔

دل میں ایک ہی سوال

یہی زندگی ہے اب؟

کبھی اسے اپنی یونیورسٹی یاد آتی۔

کیمپس کے لان۔

لائبریری۔

دوست۔

ہنسی۔

اور خاص طور پر ارمان۔

وہ آزادی جس کی قدر تب معلوم نہ تھی۔

اب وہ سب خواب لگتا تھا۔

کبھی اسے ارمان کی باتیں یاد آتیں... وہ سخت مگر سچی باتیں... جنہیں وہ تب شاید پوری طرح سمجھ نہ سکی تھی۔

اب زندگی خود سمجھا رہی تھی۔

فلک شبیر عجیب قسم کا آدمی تھا۔

باہر غریبوں کو راشن دیتا۔

گھر آکر بیوی کی تذلیل کرتا۔

لوگوں کے سامنے نرم لہجہ۔

اندر زہر۔

یہ تضاد مومنہ کو اندر سے توڑ رہا تھا۔

سب سے زیادہ اذیت صرف مار نہیں تھی۔

یہ تھی کہ کوئی یقین نہیں کرے گا۔

اگر وہ بتائے بھی...

لوگ کہیں گے،

"اتنا معزز آدمی ایسا نہیں ہو سکتا"...

"شادی میں سمجھوتا کرنا پڑتا ہے"...

"مرد غصے میں ہاتھ اٹھا بھی دے تو"...

یہ جملے اسے پہلے سے سنائی دینے لگے تھے۔

اسی لیے وہ خاموش تھی۔

اور خاموشی بھی ایک قید ہوتی ہے۔

ایک دن مومنہ دل کیا کہ وہ باہر جا کر کوئی شاپنگ کر آئے

اس نے اس بارے میں فلک شبیر سے کہا،

" سنیے بہت دن ہو گئے باہر نکلے ہوئے میں باہر بازار تک جانا چاہتی ہوں"

فلک نے نشے میں اس سے کہا،

"حرامی بازارو عورت تم میری مرضی سے جیو گی...باہر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"

یہ جملہ مومنہ کے اندر کہیں گہرائی میں جا لگا۔

کیونکہ اسے پہلی بار لگا

وہ بیوی نہیں...

ملکیت بنادی گئی ہے۔

وہ کبھی اپنے گریجویشن کے سرٹیفکیٹ کو دیکھتی اور سوچتی

میں نے اتنا پڑھا کس لیے؟

اگر آخر میں یہی سہنا تھا؟

ایک ہفتے میں ہی اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے آ گئے تھے۔

چہرے کی تازگی مرجھا گئی تھی۔

ہنسی کم ہو گئی تھی۔

اور دل میں خوف نے گھر بنا لیا تھا۔

کبھی کبھی وہ وضو کر کے دعا کرتی،

"یا اللہ... یہ آزمائش ہے یا سزا؟"

اور جواب میں صرف خاموشی ملتی۔

شادی کو صرف سات دن ہوئے تھے۔

مگر مومنہ کو لگتا تھا جیسے برسوں سے قید میں ہو۔

اور اسے پہلی بار سمجھ آیا

کبھی کبھی عورت شوہر کے گھر نہیں جاتی...

آہستہ آہستہ اپنے آپ سے دور چلی جاتی ہے۔

——

رحمان شیخ سے کی گئی گفتگو کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔

انہوں نے خون دینا تو دور، آخری لمحوں میں اپنے بیٹے کو دیکھنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

یہ سننے کے بعد سکندر کے اندر کچھ ٹوٹا نہیں تھا...

کچھ جل اٹھا تھا۔

رات کافی گزر چکی تھی۔

سکندر سڑک پر اکیلا چل رہا تھا۔

سڑک تقریباً سنسان تھی۔ دور دور سٹریٹ لائٹس کی پیلی روشنی زمین پر ٹکڑوں کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ کہیں آوارہ کتے بھونک رہے تھے، کہیں دور سے گزرتی کسی گاڑی کی آواز خاموشی کو چیر کر نکل جاتی۔

اس کے قدم تیز بھی نہیں تھے...

آہستہ بھی نہیں۔

بس بے مقصد چلتے جا رہے تھے۔

جیسے جسم سڑک پر ہو...

اور ذہن کہیں اور۔

اس کے ہاتھ جیبوں میں تھے، جبڑا بھنچا ہوا، آنکھیں خالی۔

بار بار رحمان شیخ کے الفاظ ذہن میں گونج رہے تھے۔

وہ نہیں آئیں گے۔

وہ خون نہیں دیں گے۔

وہ دیکھنا نہیں چاہتے۔

ہر جملہ جیسے اندر زخم چھیڑ رہا تھا۔

سکندر نے چلتے چلتے اچانک ایک پتھر کو زور سے ٹھوکر ماری۔

وہ دور جا کر اندھیرے میں گم ہو گیا۔

"لعنت..." اس نے دبی آواز میں کہا۔

وہ غصے میں تھا۔

مگر اس غصے میں بے بسی شامل تھی۔

یہی چیز اسے اور اذیت دے رہی تھی۔

وہ سڑک کنارے رکا، دونوں ہاتھ سر پر پھیرے، لمبی سانس لی۔

آسمان کی طرف دیکھا۔

کچھ کہنا چاہا...

مگر لفظ نہ بنے۔

صرف خاموش غصہ۔

صرف تھکن۔

صرف سوال۔

کوئی باپ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟

وہ پھر چلنے لگا۔

اسے یعقوب جٹ یاد آئے۔

اگر وہ ہوتے تو؟

کبھی ایسا نہ کرتے۔

یہ خیال آتے ہی اس کا غصہ اور کڑوا ہو گیا۔

"کچھ لوگ باپ کہلانے کے لائق نہیں ہوتے..." اس نے خود سے کہا۔

ایک بند دکان کے شٹر کے پاس رکا۔
مٹھی بھینچی۔

زور سے لوہے پر ماری۔

ٹھنک کی آواز رات میں گونجی۔

ہاتھ میں درد ہوا۔

مگر شاید اندر کے درد سے کم۔

وہ پھر چلتا رہا۔

رات جتنی خاموش تھی...

اس کے اندر اتنا ہی شور تھا۔

سڑک لمبی تھی۔

اور سکندر کو لگ رہا تھا جیسے وہ صرف راستہ نہیں ناپ رہا...

اپنے غصے کو گھسیٹ رہا ہے۔

کسی موڑ پر پہنچ کر وہ رکا۔

پیچھے خالی سڑک تھی۔

آگے بھی۔

اور اسے پہلی بار شدت سے محسوس ہوا

آدمی بعض راتیں اکیلا نہیں چلتا...

اپنے اندر کے اندھیروں کے ساتھ چلتا ہے۔

اور آج سکندر...

انہی اندھیروں کے ساتھ چل رہا تھا۔

رات کی سنسان سڑک پر سکندر ابھی چل ہی رہا تھا کہ جیب میں رکھا فون بج اٹھا۔

اس نے رک کر فون نکالا۔

نعمان کی کال تھی۔

چند لمحے وہ اسکرین دیکھتا رہا... پھر کال اٹھالی۔

"ہاں نعمان"...

دوسری طرف بے چینی تھی۔

"کیا بابا مان گئے؟ خون دیں گے؟ آئیں گے؟"

یہ سوال سنتے ہی سکندر کے قدم جیسے وہیں رک گئے۔

کچھ لمحے وہ خاموش رہا۔

پھر بہت تھکی ہوئی آواز میں بولا،

"نہیں"...

صرف ایک لفظ۔

مگر اس میں پوری شکست تھی۔

نعمان چند لمحے خاموش رہا، پھر آہستہ بولا،

"انہوں نے... بالکل انکار کر دیا؟"

سکندر نے تلخی سے ہنسنے کی کوشش کی،

"خون دینا تو دور... دیکھنے بھی نہیں آنا چاہتے"...

دوسری طرف خاموشی۔

ایسی خاموشی جس میں صدمہ تھا۔

"سکندر"...

نعمان کچھ کہنا چاہتا تھا مگر الفاظ نہ ملے۔

سکندر نے لمبی سانس لی، سڑک کنارے کھڑے ہو کر آسمان کی طرف دیکھا۔

مایوسی اس کے لہجے سے ٹپک رہی تھی۔

"میں نے پوری کوشش کی"...

"مجھے لگا شاید مان جائیں"...

"لیکن نہیں"...

اس نے آنکھیں بند کیں۔

پھر اچانک جیسے ذہن میں کوئی چنگاری سی لگی۔

وہ سیدھا ہوا۔

"ایک منٹ"...

نعمان نے پوچھا،

"کیا ہوا؟"

سکندر کے چہرے پر پہلی بار سوچ ابھری۔

"مجھے... کسی کو کال کرنی ہے"...

"کسے؟"

وہ چند لمحے سوچتا رہا۔

پھر جیسے نام یاد آیا۔

ایک دوست۔

ایک ایسا شخص جس کا خیال اب تک ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔

سکندر نے فوراً کہا،

"شاید ایک راستہ ابھی باقی ہے"…

نعمان چونکا،

"کون؟"

سکندر نے فون مضبوطی سے پکڑا۔

ابھی چند لمحے پہلے جو غصہ اور بے بسی تھی، اس میں پہلی بار ہلکی سی حرکت آئی تھی۔

"میں اسے کال کرتا ہوں"…

"شاید وہ مدد کر سکے"…

اس نے فوراً کال ختم نہیں کی، بس آہستہ کہا،

"دعا کرنا"...

اور فون نیچے کرتے ہوئے اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا

شاید ابھی سب ختم نہیں ہوا۔

رات کے سناٹے میں سکندر نے فوراً فون نکالا اور نمبر ملایا۔

کال چند بار بجی۔

پھر اٹھ گئی۔

ادھر سے آواز آئی

"ہاں؟"

لہجے میں پہلے ہی بیزاری تھی۔

سکندر نے جلدی سے کہا،

"شانی سن"....

شانی نے پہچانتے ہی کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا،

"جا دفع ہو۔"

سکندر خاموش رہ گیا۔

شانی پھر بولا،

"میں تجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔"

ماضی کی کوئی تلخی ابھی بھی دونوں کے درمیان زندہ تھی۔

مگر سکندر کے پاس وقت نہیں تھا۔

"شانی، سن تو..... ارمان کو خون چاہیے"...

شانی نے فوراً سرد لہجے میں کہا،

"تیرا دوست ہے... مجھے کیا؟"

یہ سن کر سکندر کے اندر کچھ کھول گیا۔

پہلے رحمان شیخ...

اب یہ۔

اس کا دماغ گھوم گیا۔

اس نے فوراً لہجہ بدلا۔

"مجھے پتا چلا ہے تو نے ایک MLA کی بیٹی سے شادی کی ہے"...

ادھر چند لمحے خاموشی۔

پھر شانی نے تیکھے لہجے میں کہا،

"ہاں تو؟ تجھے کیا مسئلہ ہے؟ تو نے اپنی بہن سے کروانی تھی؟"

سکندر پہلے تو ہنسنے لگا پھر اس کی آواز خطرناک حد تک پر سکون ہو گئی۔

"اگر تیری بیوی کے پاس کوئی ویڈیو چلی جائے تو...؟"

ادھر اچانک سناٹا۔

پھر شانی کی آواز بدلی۔

"ک... کون سی ویڈیو؟"

سکندر نے سرد لہجے میں کہا،

"تجھے پتا ہے کون سی۔"

شانی کے توتے اڑ گئے۔

"سکندر... بھڑوے"!

"گیم مت کھیل"...

شانی کو غصہ بھی آیا، خوف بھی۔

"حرامی! بلیک میل کر رہا ہے؟"

اس نے گالیاں دینا شروع کر دیں۔

مگر اس بار سکندر خاموش نہ ہوا۔

اس کی آواز یکدم سنجیدہ ہو گئی۔

وہ پہلی بار واقعی ٹوٹا ہوا لگا۔

"شانی... میں مذاق نہیں کر رہا"...

خاموشی۔

صرف سانسوں کی آواز۔

پھر سکندر نے آہستہ مگر بھاری لہجے میں کہا،

"ارمان بہت بری حالت میں ہے"...

"O negative خون چاہیے"...

"کچھ بھی کر کے انتظام کر دے"...

اب آواز میں دھمکی نہیں...

التجا تھی۔

شانی خاموش ہو گیا۔

شاید پہلی بار اسے اندازہ ہوا معاملہ واقعی سنجیدہ ہے۔

سکندر نے پھر کہا،

"میں ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا ہوں"...

"یار... میرے دوست کو بچا لے"...

یہ وہ سکندر نہیں تھا جو جھکتا ہو۔

اور شاید شانی نے بھی یہ محسوس کیا۔

کافی دیر بعد شانی نے آہستہ پوچھا،

"کتنی urgent ہے؟"

سکندر نے فوراً کہا،

"ابھی۔ اسی وقت۔"

شانی نے لمبی سانس لی۔

"رک"...

"میں دیکھتا ہوں"...

کال ختم ہونے سے پہلے سکندر نے پہلی بار سڑک کے بیچ کھڑے ہو کر آنکھیں بند کیں۔

اور شاید اس رات پہلی بار اسے لگا

امید ابھی پوری مری نہیں۔

کچھ دیر بعد سڑک پر چلتے ہوئے سکندر کا فون پھر بجا۔

اس نے فوراً جیب سے موبائل نکالا۔

شانی۔

سکندر نے جلدی سے کال اٹھائی، جیسے سانس رکی ہوئی ہو۔

"ہاں شانی؟"

ادھر سے سنجیدہ آواز آئی،

"کہاں پہنچانا ہے خون؟"

یہ سنتے ہی سکندر چند لمحے خاموش رہ گیا۔

ابھی کچھ دیر پہلے جس شخص کو وہ دھمکا رہا تھا، وہ اب واقعی مدد کر رہا تھا۔

اسے جیسے یقین نہ آیا۔

"میو ہسپتال"...

اس نے فوراً کہا۔

شانی نے پوچھا،

"کون سی وارڈ؟"

"گھڑی وارڈ"... ICU ...

یہ سنتے ہی دوسری طرف ایک عجیب خاموشی چھا گئی۔

ایسی خاموشی جو خبر سے پہلے آتی ہے۔

پھر شانی بولا،

"تیرا دماغ ٹھیک ہے سکندر؟، گھڑی وارڈ؟۔۔۔۔۔۔

اوئے... گھڑی وارڈ سے کوئی مریض زندہ باہر نہیں جاتا"...

اس جملے میں مذاق نہیں تھا۔

خالص خوف تھا۔

سکندر رک گیا۔

سٹریٹ لائٹ کے نیچے کھڑا آسمان دیکھنے لگا۔

اسے یہ بات پہلے سے معلوم تھی۔

ہسپتال میں لوگوں کو کہتے سنا تھا۔

اس وارڈ کا نام ہی لوگوں میں نحوست کی طرح لیا جاتا تھا۔

وہ آہستہ سے بولا،

"میں جانتا ہوں"...

آواز میں عجیب شکست تھی۔

"لیکن اب کچھ کر نہیں سکتا...،

یہی آخری chance ہے"…

شانی پہلی بار خاموش ہو گیا۔

اس نے کوئی طنز نہ کیا۔

صرف سنا۔

سکندر نے تفصیل دینی شروع کی۔

"ارمان رحمان گھڑی وارڈ بیڈ نمبر 4..O negative blood…

ICU…

operation critical ہے"

"وقت بہت کم ہے"…

اس کی آواز کبھی تیز، کبھی ٹوٹتی ہوئی۔

جیسے وہ بول نہیں رہا…

دوڑ رہا ہو۔

شانی دوسری طرف خاموشی سے سنتا رہا۔

پھر اس نے لمبی سانس لی۔

"ٹھیک ہے...، میں بندوبست کر رہا ہوں"...

سکندر نے آنکھیں بند کر لیں۔

شاید شکر ادا کیا۔

پھر ماحول تھوڑا ہلکا ہوا تو شانی اپنی پرانی روش پر آیا۔

"بے غیرت"...

"کب تک تو مجھے ایسے بلیک میل کرتا رہے گا؟"

اس بار سکندر واقعی ہلکا سا ہنسا۔

"شانی... تو بھی میرا دوست ہے"...

"ہم یونیورسٹی میں بھائیوں کی طرح رہے ہیں"...

وہ چلتے چلتے رک گیا۔

اس بار اس کی آواز نرم تھی۔

"اگر کبھی تجھے میری ضرورت پڑے"...

"بتا دینا"...

"پہنچ جاؤں گا"...

فون کے دوسری طرف کچھ سیکنڈ خاموشی رہی۔

وہ خاموشی دوستی کی تھی۔

پھر شانی کی دبی ہنسی سنائی دی۔

"چل چل"...

"مکھن نہ لگا"...

"مجھے پتا ہے کتنا نیک ہے تو"...

پھر ہنستے ہوئے بولا،

"نون نکال کر نیکی کرتا ہے... بوسڑی کا"

سکندر کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ آئی۔

رات بھر کے غصے کے بعد پہلی۔

شانی پھر بولا،

"اور سن... جو یونیورسٹی والی ویڈیو میری بیوی کو بھیجنے کا ڈرامہ جو کیا نا تو نے... حرامی ڈرا دیا تھا تُو نے"...

سکندر نے ہنس کر کہا،

"کام نکلوانا تھا".

"طریقہ یہی آیا".

شانی نے گالی دے کر ہنسا،

"گانڈو دوست ہو تو ایسا... پہلے بلیک میل، پھر بھائی چارہ".

دونوں چند لمحے ہنستے رہے۔

یہ ہنسی معمولی تھی...

مگر بہت قیمتی۔

کیونکہ موت کے سائے میں ہنسی بھی نعمت لگتی ہے۔

پھر شانی اچانک سنجیدہ ہوا۔

"فکر نہ کر"...

"خون پہنچ جائے گا".

"میں خود دیکھ رہا ہوں".

"اور سن"...

"ارمان بچ جائے گا ان شاء اللہ".

یہ سن کر سکندر کی آنکھیں پہلی بار بھیگنے کو ہوئیں۔

وہ فوراً نظریں جھکا گیا۔

صرف اتنا کہہ سکا،

"Thanks..."

شانی فوراً بولا،

"چپ کر"...

"thanks بول کر دوستی کی توہین نہ کر".

"بس جب ملے گا تو چائے تو تُو پلائے گا".

"دو نہیں، تین".

سکندر ہنسا۔

"پکی بات".

کال بند ہو گئی۔

فون اس کے ہاتھ میں تھا۔

رات وہی تھی۔

سڑک وہی۔

ہوا وہی۔

مگر اب اندھیرا اتنا بے رحم نہیں لگ رہا تھا۔

چلتے چلتے اس نے پہلی بار محسوس کیا

ہر دروازہ بند نہیں ہوتا۔

کچھ دوست...

آخری لمحے میں خدا کی رحمت بن کر آتے ہیں۔

رات کی سنسان فضا تھی۔ سکندر بائیک کے پاس کھڑا تھا، فون ہاتھ میں تھا اور ذہن ابھی بھی ICU والے معاملے میں الجھا ہوا تھا۔

اس نے فوراً نمبر ملایا۔

نعمان کی کال ملی تو دوسری طرف فوراً آواز آئی،

"ہاں سکندر؟ کیا ہوا؟"

سکندر نے ایک گہری سانس لی، اپنی آواز کو سنبھالتے ہوئے بولا،

"سنیں... خون کا انتظام ہو گیا ہے۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی، جیسے بات کی تصدیق کی جا رہی ہو۔

سکندر نے فوراً وضاحت کی،

"کچھ دیر میں خون پہنچ جائے گا۔ ایک بندہ آ رہا ہے، وہ سیدھا Mayo Hospital میں ICU تک پہنچا دے گا۔ آپ وہاں موجود رہیں، وقت ضائع نہ ہو"...

اس کی آواز میں اب سنجیدگی بھی تھی اور ذمہ داری بھی۔

نعمان نے سکون اور شکر کے ملے جلے انداز میں کہا،

"ٹھیک ہے... میں وہاں ہی ہوں۔ بہت شکریہ آپ کا"...

سکندر نے مختصر مگر عزت سے جواب دیا،

"کوئی بات نہیں... آپ وہاں ہی رہیں، باقی میں سنبھال رہا ہوں۔"

"ویسے ایک بات کہوں اپ کو سکندر"

"جی بولو نعمان"

"اپ ہمارے بھائی جیسے آپ نے جو بھی کیا اس کا بہت بہت شکریہ"!

"شکریہ کی کوئی بات نہیں یہ میرا فرض تھا".

کال بند ہوئی۔

سکندر چند لمحے خاموش کھڑا رہا۔ رات کی ہوا اس کے چہرے سے ٹکرا رہی تھی، مگر اب اس کے اندر ایک چھوٹا سا سکون تھا کہ کم از کم ایک بڑا کام مکمل ہو چکا ہے۔

مگر اس کے ذہن میں ابھی بھی اگلا مرحلہ باقی تھا...

خون کا انتظام ہو چکا تھا اور میو ہسپتال کے ICU میں ارمان کی زندگی کے لیے امید کی ایک کرن باقی تھی، مگر سکندر کے اندر کی بے چینی ابھی ختم

نہیں ہوئی تھی۔ رات گہری ہو چکی تھی، سڑکیں تقریباً خالی تھیں اور ہوا میں ہلکی سی ٹھنڈک تھی، مگر اس کے ذہن میں دن بھر کی بھاگ دوڑ اور صدمے ابھی تک گونج رہے تھے۔

وہ کچھ دیر اکیلا کھڑا رہا۔ آنکھوں کے سامنے بار بار وہی مناظر آ رہے تھے ICU کا دروازہ، ڈاکٹر کی جلدی، خون کا بندوبست، اور وہ لمحہ جب امید اور خوف دونوں ایک ساتھ کھڑے تھے۔ اسے پہلی بار شدت سے احساس ہوا کہ ہر چیز انسان کے اختیار میں نہیں ہوتی، چاہے وہ کتنا بھی کوشش کر لے۔

اس نے آہستہ سے اپنی بائیک کی طرف دیکھا، چابی گھمائی اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔ بائیک کی آواز رات کی خاموشی میں گونج اٹھی اور وہ بغیر کسی طویل سوچ کے چل پڑا۔ راستہ سیدھا نہیں تھا، مگر اس وقت اس کے ذہن میں کوئی سیدھا راستہ بھی نہیں تھا۔

سڑک پر چلتے ہوئے اس کے اندر عجیب سا بوجھ تھا۔ ایک طرف سکون تھا کہ ارمان کے لیے خون مل گیا ہے، مگر دوسری طرف وہ احساس تھا کہ اگر آج مدد نہ ملتی تو سب کچھ ختم ہو سکتا تھا۔ یہی سوچ اسے اندر سے ہلا رہی تھی کہ زندگی کتنی نازک ہے اور انسان کتنا بے بس۔

وہ تیز رفتاری سے نہیں جا رہا تھا، بلکہ بس چل رہا تھا... جیسے جسم آگے جا رہا ہو اور دماغ کہیں پیچھے رہ گیا ہو۔ سڑک کی لائٹس اس کے چہرے پر وقفے وقفے سے روشنی ڈال رہی تھیں، اور ہر روشنی کے ساتھ اس کے چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے کبھی غصہ، کبھی خاموشی، کبھی تھکن۔

وہ بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ آج اگر سب لوگ ساتھ نہ دیتے تو شاید نتیجہ کچھ اور ہوتا۔ یہ خیال اسے ایک عجیب سی حقیقت دکھا رہا تھا کہ وہ خود کو کتنا بھی مضبوط سمجھ لے، اکیلا سب کچھ نہیں کر سکتا۔

بائیک چلتی رہی... رات گہری ہوتی رہی... اور سکندر کے اندر ایک ہی چیز واضح ہو رہی تھی وہ پہلے سے بدل چکا تھا، مگر ابھی اسے خود یہ سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ کس طرف جا رہا ہے۔

اب سکندر کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ صرف ارمان کی جان بچانا کافی نہیں تھا اب مومنہ تک پہنچنا بھی ضروری ہو گیا تھا۔ مگر راستہ آسان نہیں تھا۔

فلک شبیر کے گھر کے باہر سخت پہرا تھا، گارڈز ہر وقت موجود رہتے تھے، اور اندر کسی بھی غیر ضروری شخص کا داخلہ تقریباً ناممکن تھا۔ نہ سکندر کے پاس مومنہ کا کوئی نیا نمبر تھا، نہ کوئی سیدھا رابطہ۔ پرانا ہر راستہ بند ہو چکا تھا۔

اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر ایک ہی نام ذہن میں آیا۔

رِمشا

مگر مسئلہ یہ تھا کہ رِمشا سے اس کی بات ہوئے تقریباً دو سال ہو چکے تھے۔

ان دو سالوں میں نہ کوئی کال، نہ کوئی میسج، نہ کوئی رابطہ۔ ان کے درمیان خاموشی اتنی گہری تھی کہ اب بات کرنا بھی ایک مشکل قدم لگ رہا تھا۔

سکندر نے فون ہاتھ میں لیا، اسکرین کو کچھ لمحے دیکھا، پھر واپس جیب میں رکھ دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اسے مومنہ تک پہنچنا ہے تو یہ قدم اٹھانا ہی پڑے گا، چاہے بات تلخ ہی کیوں نہ ہو۔

رات کے ایک خاموش لمحے میں اس نے آخرکار ہمت کی اور نمبر ڈائل کیا۔

کال کی بیپ چلتی رہی...

ہر بیپ کے ساتھ اس کا دل بھاری ہوتا جا رہا تھا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ دوسری طرف جواب آئے گا بھی یا نہیں، اور اگر آیا تو بات کیسے شروع ہو گی۔

مگر اس وقت اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔

یا تو یہ کال کھلے گی...

یا پھر سب کچھ وہیں بند رہ جائے گا۔

سکندر کے لیے اصل مسئلہ محبت یا رشتوں کی سمجھ نہیں تھا...وہ "اختتام" کی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

مومنہ اور ارمان کی کہانی اس کے سامنے ایک ایسی گتھی بن چکی تھی جس کا کوئی سیدھا حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے بار بار یہی الجھن ہو رہی تھی کہ اگر ان دونوں کے درمیان اتنی strong attachment تھی تو پھر سب کچھ اتنی آسانی سے ٹوٹ کیسے گیا؟

وہ رات کو بائیک پر اکیلا چلتا ہوا یہی سوچ رہا تھا۔ ارمان کی حالت، ICU، خون، اور ان سب کے درمیان مومنہ کی خاموشی... سب کچھ اس کے ذہن میں ایک ساتھ چل رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے ہر رشتہ اچانک اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے، اور کوئی بھی اپنی اصل جگہ پر نہیں ہے۔

سکندر کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ان دونوں کی محبت اگر واقعی اتنی مضبوط تھی تو نفرت میں کیسے بدل گئی، اور اگر نفرت نہیں تھی تو پھر یہ دوری کیوں

آ گئی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے دو لوگ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی کہیں نہ کہیں کھو گئے ہیں۔

اصل میں وہ یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ بعض اوقات رشتے ختم نہیں ہوتے... بس حالات انہیں الگ راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔ کوئی ایک لمحہ نہیں ہوتا جس میں سب کچھ ٹوٹتا ہے، بلکہ چھوٹے چھوٹے فیصلے، مجبوریاں اور خاموشیاں مل کر ایک بڑی دوری بنا دیتی ہیں۔

سکندر کے لیے سب سے بڑی الجھن یہی تھی کہ وہ چیز جسے وہ "محبت کا انجام" سمجھ رہا تھا، وہ اصل میں محبت کا ختم ہونا نہیں تھا... بلکہ حالات کا اس پر غالب آ جانا تھا۔

اور وہ اسی سوال میں پھنسا ہوا تھا کہ آخر سب کچھ ختم ہوا کیسے... اور کیوں؟

رات کافی گہری ہو چکی تھی، سکندر ابھی بھی سڑک پر بائیک کے ساتھ کھڑا تھا، دماغ میں ارمان، ICU، اور مومنہ کی الجھی ہوئی کہانی بار بار گھوم رہی تھی۔ وہ خود بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ وہ کس چیز کو زیادہ سوچ رہا ہے زندگی بچانے کو یا رشتوں کے ٹوٹنے کو۔

تبھی اس کے فون کی اسکرین روشن ہوئی۔

اس نے دیکھا تو پہلے لمحے اسے لگا شاید رِمشا کی کال ہو گی... مگر نمبر دیکھ کر وہ رُک گیا۔

یہ سلمٰی جٹ تھی۔

وہ فوراً خاموش ہوا، اور کال اٹھالی۔

دوسری طرف سے آواز آئی، تھوڑی فکر مند، تھوڑی سخت

"بیٹا سکندر... تم اتنی دیر سے کہاں ہو؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟"

اس آواز میں فکر بھی تھی اور وہ پرانی عادت بھی، جو اب ان سات سالوں میں ایک مضبوط رشتہ بن چکی تھی۔ سکندر اور سلمٰی جٹ کے درمیان اب ایسا تعلق تھا کہ وہ ایک دوسرے کے لفظوں سے نہیں، خاموشی سے سمجھ لیتے تھے کہ سامنے والا کس حال میں ہے۔

سکندر نے چند لمحے خاموشی اختیار کی، جیسے جواب کو اندر ہی اندر سنبھال رہا ہو۔

پھر آہستہ سے بولا،

"سب ٹھیک ہے ماما"...

یہ اس کا پرانا جملہ تھا۔

وہی جو وہ اکثر چھپانے کے لیے بول دیتا تھا۔

مگر دوسری طرف سلمٰی جٹ رکنے والوں میں سے نہیں تھی۔

فوراً بولی،

"سکندر... صاف صاف بتاؤ، مسئلہ کیا ہے؟"

اس کی آواز میں نرمی بھی تھی اور سختی بھی۔ وہ جانتی تھی کہ "سب ٹھیک ہے" اکثر سب کچھ ٹھیک نہیں ہوتا۔

سکندر نے لمبی سانس لی۔

اس کے ہاتھ میں فون تھا مگر نظر کہیں دور تھی۔

ICU... ارمان... خون... اور وہ ساری بھاگ دوڑ۔

پھر آہستہ سے بولا،

"بہت کچھ ہو رہا ہے"...

بس اتنا۔

سلمٰی جٹ خاموش ہو گئی۔

کیونکہ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ "سب ٹھیک ہے" والا سکندر نہیں ہے۔

یہ وہ سکندر تھا جس کے اندر بہت کچھ ٹوٹ رہا تھا، مگر وہ الفاظ نہیں ڈھونڈ پا رہا تھا۔

اس نے نرم مگر سیدھی آواز میں کہا،

"میں دوبارہ نہیں پوچھ رہی تمہیں سب کچھ سناؤ…، بس یہ بتاؤ… تم اکیلے نہیں ہو بیٹے۔ تم پریشان تو نہیں ہو رہے نا؟"

یہ سوال سکندر کے اندر جا لگا۔

وہ چند لمحے خاموش رہا۔

پھر آہستہ سے بولا،

"نہیں"…

اور پہلی بار اس رات اسے واقعی احساس ہوا کہ وہ مکمل اکیلا نہیں ہے۔

سکندر کی آواز اس بار پہلے جیسی نہیں تھی۔ اس میں تھکن بھی تھی اور جلدی بھی۔

"ماما... ارمان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے... خون چاہیے تھا، میں نے انتظام کر لیا ہے۔ صبح اس کا آپریشن ہے۔ اب میں مومنہ کو لینے جا رہا ہوں تا کہ وہ اسے دیکھ لے"...

فون کے دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔

سلمٰی جٹ جیسے ساری بات ایک ساتھ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سکندر کی تیزی، اس کا بے چین لہجہ... سب کچھ بتا رہا تھا کہ معاملہ کتنا سنگین ہے۔

اس نے آہستہ سے اسے سنبھالنے کی کوشش کی،

"سکندر... آہستہ بولو... تم خود کو سنبھالو پہلے"...

مگر سکندر کی سانسیں ابھی بھی تیز تھیں۔ وہ رک نہیں پا رہا تھا۔

پھر اچانک جیسے کوئی اور بات اس کے اندر سے نکلی، اس نے کہا،

"ارمان بھی گھڑی وارڈ میں ہے"...

یہ سنتے ہی دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

یہ خاموشی عام نہیں تھی۔

یہ صدمے والی خاموشی تھی۔

کیونکہ ارمان ان کے لیے صرف سکندر کا ایک دوست نہیں تھا... وہ ایک رشتہ بن چکا تھا۔ یعقوب جٹ کے جانے کے بعد وہ اکثر سکندر کے ساتھ رہتا، اس کی مدد کرتا، اس کا سہارا بنتا۔ وقت کے ساتھ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے، جیسے خاندان ہو۔

سلمٰی جٹ کے ہاتھ میں فون تھوڑا سا کانپ گیا۔

"ارمان...؟" ان کی آواز بھاری ہو گئی۔

سکندر نے فوراً کہا،

"ہاں... اسی لیے میں کہہ رہا ہوں... سب کچھ ایک ساتھ ہو رہا ہے"...

اس کی آواز میں اب الجھن بھی تھی اور بے بسی بھی۔

سلمہ جٹ نے آنکھیں بند کر لیں۔

انھیں فوراً وہ دن یاد آئے جب ارمان نے سکندر کو سنبھالا تھا، جب وہ ٹوٹ رہا تھا، اور ارمان نے اسے اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ واقعی اس گھر کا حصہ بن چکا تھا۔

اب وہی لڑکا...

گھڑی وارڈ ICU میں پڑا تھا۔

وہ چند لمحے کچھ بول نہ سکی۔

پھر آہستہ سے کہا،

"سکندر... خود کو سنبھالو"...

مگر سکندر پہلے ہی فون تھامے کھڑا تھا۔

اس کے اندر ایک ہی چیز چل رہی تھی

ایک دوست کی زندگی بچانی ہے...

اور ایک سچ سب کے سامنے لانا ہے...

سکندر چند لمحے خاموش رہا۔ سلمٰی جٹ کی آواز میں فکر بھی تھی اور سخت حقیقت بھی، جو وہ چھپا نہیں سکتی تھیں۔

وہ آہستہ سے بولی،

"بیٹا... تم مومنہ کو کیسے واپس لاؤ گے؟ عورتیں واپس نہیں آتیں... ان کی شادی ہو جائے تو بس پھر تو کبھی نہیں"...

سکندر نے سلمیٰ جٹ کو بھی بتایا تھا کہ مومنہ کی شادی کسی اور سے ہو گئی ہے جس کا انہوں نے کافی افسوس کیا کیونکہ وہ بھی ارمان اور مومنہ کی محبت سے واقف تھی

سکندر نے فون مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی تھکن تھی، جیسے وہ ایک ساتھ کئی جنگیں لڑ رہا ہو۔

سلمہ جٹ نے بات جاری رکھی،

"تم بھی اس سوچ سے نکل آؤ... ارمان کی محبت کا تو مجھے پتا ہے... مگر تم اس میں کیوں الجھ رہے ہو؟"

اس کی آواز نرم ہو گئی، مگر بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

"اس وقت تمہارے دوست کو تمہاری ضرورت ہے۔ اور تم ہو کہ رات کے وقت سڑکوں پر پھر رہے ہو"...

سکندر نے ہلکی سانس لی۔

اس کے ذہن میں ICU کا منظر پھر آ گیا۔

ارمان... مشینوں کے درمیان... زندگی اور موت کے بیچ۔

سلمہ جٹ نے سختی سے کہا،

"ادھی رات کا وقت ضائع مت کرو۔ واپس ہسپتال جاؤ... اس کے گھر والوں کے پاس رہو... یہ وقت کسی اور چیز کا نہیں ہے، سکندر"...

فون کی دوسری طرف خاموشی ہو گئی۔

سکندر نے آہستہ سے آنکھیں بند کیں۔

اسے اچھی طرح سمجھ آ رہا تھا کہ وہ غلط جگہ کھڑا ہے... مگر دل اور دماغ دونوں ایک ساتھ ایک سمت نہیں جا رہے تھے۔

آخرکار اس نے بہت دھیمی آواز میں کہا،

"میں جا رہا ہوں"...

یہ کہتے ہوئے اس نے فون بند نہیں کیا، بس کچھ لمحے سڑک کو دیکھا... پھر بائیک کی طرف چل پڑا۔

لیکن اس کے اندر ایک بات واضح ہو چکی تھی

آج اسے جذبات نہیں، فیصلے کرنے ہیں۔

سکندر کی آواز میں اس بار ضد بھی تھی اور بے چینی بھی۔ وہ بائیک کے پاس کھڑا تھا، ہاتھ میں فون تھا اور ذہن پوری طرح الجھا ہوا۔

وہ آہستہ مگر پختہ لہجے میں بولا،

"مومنہ کو لینے جاؤں گا... اور میں اسے لے کر ہی آؤں گا۔ پھر اس سے پوچھوں گا کہ آخر ہوا کیا تھا... کہ اس نے ارمان کو چھوڑا کیوں"...

اس کے الفاظ ہوا میں گونجے، جیسے وہ خود کو بھی یقین دلا رہا ہو۔

سلمٰی جٹ نے دوسری طرف سے یہ سنا تو ایک لمحے کو خاموش ہو گئی۔ اسے سکندر کے لہجے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ صرف سوال نہیں... ایک جذباتی طوفان ہے جو اب رکنے والا نہیں۔

اس نے نرمی سے کہا،

"سکندر... ابھی تم جذبات میں ہو"...

مگر سکندر نے اس کی بات کاٹ دی۔

"نہیں ماما... میں جذبات میں نہیں ہوں...، میں صرف سچ جاننا چاہتا ہوں"...

اس کی آواز میں تھکن بھی تھی اور ایک ضد بھی، جیسے وہ خود کو کسی جواب کے قریب لے جانا چاہتا ہو، چاہے وہ جواب اسے توڑ ہی کیوں نہ دے۔

اس نے فون جیب میں رکھا، بائیک کی رفتار زیادہ کی اور تیزی سے سڑک پر نکل گیا۔

رات وہی تھی...

خاموش...

مگر سکندر کے اندر اب خاموشی نہیں رہی تھی۔

سکندر کے ذہن میں ایک ہی بات بار بار اٹکی ہوئی تھی مومنہ نے آخر ارمان کو کیوں چھوڑا؟

یہ سوال وہ کئی بار یونیورسٹی میں اس سے پوچھنے کی کوشش کر چکا تھا۔ مگر ہر بار مومنہ اسی انداز میں بات ٹال دیتی تھی۔

"چھوڑو سکندر... یہ سب مت پوچھو... ضروری نہیں ہے"...

"بس رہنے دو"...

"ہمیشہ یہی بات کیوں کرتے ہو"...

اس کی آواز میں غصہ کم اور avoidance زیادہ ہوتا تھا، جیسے وہ کسی پرانی بات کو دوبارہ زندہ نہیں کرنا چاہتی ہو۔

مگر سکندر کے لیے یہ بات ختم نہیں ہو رہی تھی۔

وہ روز یونیورسٹی میں یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا ارمان کو مومنہ کے سامنے کھڑے ہو کر بات کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، کبھی نرم لہجے میں، کبھی ٹوٹے ہوئے انداز میں۔ اس کی آنکھوں میں ایک ہی التجا ہوتی تھی کہ شاید مومنہ واپس آجائے، شاید سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔

مگر مومنہ کا رویہ ہر بار مختلف ہوتا تھا۔ کبھی خاموشی، کبھی سردی، اور کبھی مکمل دوری۔

سکندر یہ سب دیکھتا تھا، اور اندر ہی اندر الجھتا جاتا تھا۔

اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ اگر محبت اتنی سچی تھی تو پھر یہ بھیک مانگنے کی نوبت کیوں آئی۔

وہ بار بار یہی سوچتا تھا کہ کسی تعلق میں ایک شخص اگر روز گِر گر کر مانگ رہا ہو، اور دوسرا مسلسل دور جا رہا ہو، تو وہ محبت ہے یا کچھ اور...

یہی منظر اس کے ذہن میں بیٹھ گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ حقیقت جاننا چاہتا تھا۔

دو لوگ جو ایک دوسرے سے نکاح کے قریب ہوں، ان کا یوں دور ہو جانا عام طور پر ایک ہی دن یا ایک ہی وجہ سے نہیں ہوتا یہ آہستہ آہستہ ٹوٹنے والا عمل ہوتا ہے۔

مومنہ اور ارمان کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔

باہر سے لوگوں کو لگتا تھا کہ یہ "قریب" ہیں، شاید بات شادی تک پہنچ جائے، مگر اندر بہت کچھ بدل رہا تھا۔

سکندر کا فون اچانک بجا تو اس نے ایک لمحے کو سکرین پر دیکھا، اور ایک ہلکی سی جھجک کے بعد کال اٹھالی۔ اس کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ احساس تھا کہ یہ کال عام نہیں ہو گی۔

"السلام علیکم کون؟"

کال اٹھتے ہی دوسری طرف رمشا کی آواز آئی، جو تھوڑی بھاری اور بے چین تھی، جیسے وہ پہلے سے کسی دباؤ میں ہو۔

"وعلیکم السلام، رمشا، میں سکندر"

نام سنتے ہی رمشا چند لمحے خاموش رہی۔ اس خاموشی میں پرانی یادیں بھی تھیں اور وہ فاصلہ بھی جو وقت نے پیدا کر دیا تھا۔

سکندر نے فوراً بات شروع کی، جیسے وہ ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا ہو۔

"رمشا... میں جانتا ہوں جو میں نے کیا وہ غلط کیا، لیکن مجھے اس وقت مومنہ کا نمبر چاہیے... کسی بھی طرح اس سے میری بات کروا دو، بہت ضروری ہے"...

یہ سنتے ہی رمشا کا چہرہ سخت ہو گیا اور اس کی خاموشی ایک دم ٹوٹ گئی۔

"اس سے بات کرنی ضروری ہے، مجھ سے نہیں ہے؟ تم سب لڑکے بس اسی لڑکی کے پیچھے تھے، اور آج بھی تم نے میرا حال تک نہیں پوچھا، صرف اپنے مطلب کے لیے کال کی ہے سکندر"...

سکندر اس الزام پر چند لمحے خاموش رہا، جیسے الفاظ ڈھونڈ رہا ہو۔

"رمشا... میری بات سنو"...

اس کی آواز میں نرمی تھی مگر بے بسی بھی جھلک رہی تھی۔

مگر رمشا نے فوراً اس کی بات کاٹ دی، اس کی آواز اب زیادہ سخت تھی۔

"نہیں سکندر... سننے کی بات اب نہیں رہی۔ تمہیں صرف ضرورت یاد آتی ہے، رشتے نہیں"...

سکندر نے ایک گہری سانس لی، پھر تھکن بھری آواز میں اصل بات بتائی۔

"ارمان کا accident ہو گیا ہے... وہ ICU میں ہے... مجھے بس ایک بار مومنہ سے بات کرنی ہے تاکہ وہ اسے دیکھ لے"...

یہ سنتے ہی رمشا کی آواز میں ہلکا سا جھٹکا آیا، اور وہ کچھ لمحے خاموش رہی۔ اس کے غصے میں اب الجھن شامل ہو گئی تھی۔

"بھاڑ جاؤ سکندر، ارمان بھی اور مومنہ بھی"...

سکندر نے بے بسی سے دوبارہ درخواست کی، جیسے اس کے پاس اور کوئی راستہ نہ ہو۔

"مہربانی کرو... اس کا نمبر دے دو"...

رمشا کی سانس تیز ہوئی، اور اس نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

"تم سمجھتے نہیں ہو! تم اسے مشکل میں ڈال دو گے"!

سکندر نے الجھن میں کہا، جیسے وہ واقعی ہر چیز کو سمجھنا چاہ رہا ہو۔

"میں سمجھا نہیں رمشا"...

رمشا نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں، پھر حقیقت واضح کی، اس کی آواز اب سنجیدہ اور محتاط تھی۔

"دو نمبر آدمی! اب وہ شادی شدہ ہے... اگر تم نے اس سے اس وقت رابطہ کیا تو اس کے شوہر کو پتا چلا تو بات بہت آگے جا سکتی ہے... خطرہ ہو سکتا ہے... سمجھو"!

سکندر چند لمحے بالکل خاموش رہا۔ اس کے ذہن میں سب کچھ ایک ساتھ چل رہا تھا، مگر کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔

پھر اس نے آہستہ مگر واضح آواز میں کہا،

"تو پھر تم ہی اس سے بات کر لو... اسے کہو تھوڑی دیر کے لیے ہسپتال آ جائے... یا پھر تین طرفہ کال لگا دو، میں بھی بات کر لوں گا"...

رمشا نے اس بار کچھ دیر کے لیے مکمل خاموشی اختیار کی۔ وہ اس بات کے خطرے اور ضرورت دونوں کو تول رہی تھی۔ اس کی خاموشی میں فیصلہ کرنے کا بوجھ تھا۔

آخرکار اس نے آہستہ سے کہا،

"اچھا... میں دیکھتی ہوں کیا کیا جا سکتا ہے"...

سکندر نے فوراً نرم لہجے میں جواب دیا،

"تمہارا شکریہ رمشا"...

رمشا نے ایک مختصر اور سخت انداز میں کہا،

"یہ شکریہ اپنی تشریف میں رکھ لو"...

اور کال بند ہو گئی۔

سکندر کال بند ہونے کے بعد چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔ فون ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا مگر اب اس میں کوئی آواز نہیں تھی، صرف خاموشی تھی۔ اس کے چہرے پر تھکن بھی تھی اور ایک عجیب سا افسوس بھی۔

وہ آہستہ آہستہ سوچ میں ڈوب گیا کہ رمشا نے اتنا غصہ کیوں کیا۔ پہلے تو اسے لگا کہ رمشا ضرورت سے زیادہ react کر رہی ہے، مگر جیسے جیسے وہ باتوں کو ذہن میں دہراتا گیا، اسے احساس ہونے لگا کہ بات اتنی سادہ نہیں تھی۔

دو سال... کوئی معمولی وقت نہیں ہوتا۔ اس دوران نہ کوئی حال چال، نہ کوئی خبر، نہ کوئی تعلق۔ اور پھر اچانک صرف اس وقت رابطہ کرنا جب کوئی کام پڑ جائے یہ چیز واقعی تکلیف دے سکتی تھی۔ سکندر کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ رمشا کا غصہ صرف غصہ نہیں تھا، وہ پرانی نظر انداز کی ہوئی باتوں کا بوجھ تھا جو اچانک باہر آ گیا تھا۔

وہ آہستہ سے خود سے بولا، جیسے خود کو ہی سمجھا رہا ہو۔

"شاید... وہ ٹھیک کہہ رہی تھی"...

اس کے ذہن میں رمشا کے الفاظ بار بار گونج رہے تھے الزام، ناراضی، اور وہ تلخی جو اس کی آواز میں تھی۔ اب اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ شاید اس نے واقعی صرف اپنے مطلب کے لیے رابطہ کیا تھا، بغیر یہ سوچے کہ سامنے والا شخص کیا محسوس کرے گا۔

سکندر نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا غصہ کہیں نہیں تھا، بس ایک خاموش سی ندامت رہ گئی تھی۔ ایک طرف ارمان کی حالت تھی، اور دوسری طرف یہ احساس کہ اس نے رشتوں کو کیسے ہینڈل کیا۔

وہ آہستہ سے بائیک کی طرف بڑھا، مگر اس بار اس کے قدم پہلے جیسے مضبوط نہیں تھے۔ اس کے اندر ایک ہی سوال بار بار آ رہا تھا کیا واقعی رمشا کا غصہ غلط تھا، یا وہ صرف سچ بول رہی تھی جسے سننا مشکل تھا۔

رمشا رات کے سناٹے میں بیٹھی تھی۔ پورا گھر سو رہا تھا مگر اس کے اندر ایک عجیب سی بے چینی جاگ رہی تھی۔ موبائل کی اسکرین پر وہ بار بار دیکھ رہی تھی، جیسے کسی کی چیٹ اس کی رات کا واحد سہارا ہو۔ جب اس نے دیکھا کہ

مومنہ آن لائن ہے تو اس کے دل میں ایک ہلکی سی امید جاگی، مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ اگلے چند میسجز اس امید کو بوجھ میں بدل دیں گے۔

رمشا نے لکھا:

"کیسی ہو؟ سب ٹھیک ہے؟"

یہ سوال عام تھا، مگر اس رات اس میں غیر معمولی فکر چھپی ہوئی تھی۔ کچھ لمحوں بعد مومنہ کا جواب آیا، اور اس کے الفاظ میں وہ تھکن تھی جو صرف جسم کی نہیں ہوتی، روح کی بھی ہوتی ہے۔

"بس ٹھیک ہوں... مگر اندر سے نہیں"

رمشا نے میسج پڑھ کر ایک لمحے کو سکرین کو گھورا۔ اسے لگا جیسے یہ صرف ایک جملہ نہیں بلکہ کسی پوری زندگی کا خلاصہ ہو۔ اس نے آہستہ سے لکھا:

"اتنی رات کو کیوں جاگ رہی ہو؟ آرام کرو، خود کو تھوڑا calm کرو"

مومنہ نے جواب دیا:

"نیند نہیں آتی... دماغ میں بہت کچھ چل رہا ہے... اور سب کچھ بھاری لگتا ہے"

یہ پڑھ کر رمشا کے ہاتھ رک گئے۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ جس سے بات کر رہی ہے، وہ صرف تھکی ہوئی نہیں بلکہ اندر سے بکھری ہوئی ہے۔

رمشا نے نرمی سے لکھا:

"زیادہ مت سوچو... تم اکیلی نہیں ہو، میں ہوں نا"

یہ الفاظ لکھتے ہوئے خود رمشا کو بھی احساس تھا کہ یہ صرف تسلی ہے، حل نہیں۔

کچھ دیر چیٹ میں عام باتیں ہوتی رہیں، مگر وہ خاموشی جو ہر میسج کے درمیان چھپی تھی، وہ کسی بڑے طوفان کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اچانک مومنہ نے ایک ایسا سوال کیا جس نے ساری گفتگو کا رخ بدل دیا۔

"رمشا... تمہیں فلک شبیر کے بارے میں کچھ بتاؤں؟"

رمشا فوراً سنجیدہ ہو گئی:

"ہاں... بتاؤ"

اس کے بعد مومنہ کی چیٹ ایک ایسے درد میں بدل گئی جسے الفاظ مکمل نہیں کر پا رہے تھے۔ اس نے آہستہ آہستہ لکھنا شروع کیا، جیسے ہر جملہ لکھنے سے پہلے وہ اسے کئی بار اندر سے جھیل رہی ہو۔

"باہر سے وہ بہت اچھا لگتا ہے... سب کہتے ہیں نیک آدمی ہے، لوگوں کی مدد کرتا ہے، خیرات دیتا ہے... سب اس کی عزت کرتے ہیں"...

رمشا نے یہ پڑھا تو اس کے دل میں ایک عجیب سا خلا سا بن گیا۔ اسے لگا جیسے وہ جس شخص کے بارے میں سن رہی ہے وہ دو الگ انسان ہیں ایک دنیا کے سامنے اور ایک گھر کے اندر۔

مومنہ نے آگے لکھا:

"مگر گھر میں وہ بالکل مختلف ہے... ہر چیز پر کنٹرول... میں کیا پہنوں، کس سے بات کروں، کب فون استعمال کروں... سب کچھ اس کی مرضی سے ہوتا ہے"

رمشا کے ہاتھ آہستہ آہستہ کانپنے لگے۔ اس نے فوراً لکھا:

"مومنہ... یہ سب ٹھیک نہیں ہے"

مگر مومنہ کی چیٹ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ جیسے برسوں کا بوجھ ایک رات میں اتار رہی ہو۔

"شروع میں میں نے خود کو سمجھایا... سوچا شاید وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے... مگر ہر دن پہلے سے زیادہ مشکل ہوتا گیا"

اب رمشا صرف پڑھ رہی تھی، بول نہیں رہی تھی۔ اس کے اندر ایک بے بسی تھی، کیونکہ وہ جان رہی تھی کہ یہ صرف ایک کہانی نہیں، ایک حقیقت ہے جو آہستہ آہستہ کسی کو توڑ رہی ہے۔

مومنہ نے آخری میسج لکھا:

"لوگ سمجھتے ہیں میں خوش نصیب ہوں... مگر رمشا... میں اندر سے روز ٹوٹ رہی ہوں"

اس کے بعد چیٹ خاموش ہو گئی۔

مگر اس خاموشی میں وہ سب کچھ چیخ رہا تھا جو لفظ نہیں کہہ سکے تھے۔

مومنہ نے میسج لکھا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، جیسے وہ الفاظ نہیں بلکہ اپنا اندر کا ٹوٹا ہوا سکون لکھ رہی ہو۔

"اور تمہیں کیا ہی بتاؤں... پہلے دن سے ہی سب بدل گیا تھا... میں اس کے ساتھ سونے کو تیار نہیں تھی... میں نے منع کیا تھا... مگر اس نے میری ایک نہ سنی"...

رمشا یہ پڑھ کر ساکت رہ گئی۔ اس کے چہرے پر رنگ بدل گیا، اور موبائل اس کے ہاتھ میں جیسے بھاری ہو گیا ہو۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جواب کیا دے۔

مومنہ نے کچھ دیر بعد پھر لکھا، اس بار اس کے الفاظ اور زیادہ ٹوٹے ہوئے تھے:

"میں نے خود کو بہت سمجھایا... بہت برداشت کیا... مگر اس نے کبھی میری مرضی کو اہمیت نہیں دی... میں اندر سے روز ٹوٹتی رہی"...

رمشا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے لکھا:

"مومنہ... تم نے یہ سب اکیلے کیسے برداشت کیا؟ تم نے کسی کو کیوں نہیں بتایا؟"

کچھ لمحے خاموشی رہی۔ پھر مومنا کا جواب آیا، بہت سادہ مگر بہت بھاری:

"کیونکہ مجھے ڈر تھا... کوئی یقین نہیں کرے گا... اور سب کہیں گے میں نے خود چنا ہے یہ سب"...

رمشا نے اسکرین کو گھورا، جیسے وہ الفاظ نہیں بلکہ ایک پورا درد پڑھ رہی ہو۔ اس کے دل میں پہلی بار غصہ اور بے بسی ایک ساتھ اتر آئے تھے۔

اس نے آہستہ سے لکھا:

"تم اکیلی نہیں ہو مومنہ... اب تمہیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے"

مگر اس رات کی خاموشی میں دونوں کو پتا تھا کہ یہ صرف الفاظ نہیں تھے... یہ ایک ایسی حقیقت تھی جو اب چھپ نہیں سکتی تھی۔

مومنہ نے میسج لکھا:

"مجھے ارمان کی بہت یاد آ رہی ہے"...

یہ جملہ پڑھتے ہی رمشا ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گئی۔ اس نے اسکرین کو غور سے دیکھا، جیسے الفاظ کے پیچھے چھپی ہوئی گہرائی کو سمجھ رہی ہو۔ مومنہ کی آواز چیٹ کے ذریعے بھی اداس اور بھاری محسوس ہو رہی تھی۔

رمشا نے آہستہ سے جواب لکھا:

"اچھا... اگر واقعی تمہیں اس کی اتنی یاد آرہی ہے تو پھر ایک بار جا کر اسے دیکھ لو"

یہ لکھتے ہوئے اس کے دل میں ایک عجیب سا احساس تھا ایک طرف فکر، دوسری طرف امید۔

مومنہ نے کچھ دیر خاموشی اختیار کی، پھر مختصر سا جواب آیا:

"پتہ نہیں... کیا یہ ٹھیک ہو گا؟"

رمشا نے فوراً نرمی سے لکھا:

"اگر دل کہہ رہا ہے تو کبھی کبھار دل کی سن لینی چاہیے... کم از کم ایک بار جا کر دیکھ لو"

اسی لمحے رمشا کے ذہن میں سکندر کی باتیں بھی آئیں، ہسپتال، ICU اور ارمان کی حالت۔ اسے لگا یہ وہ موقع ہے جس میں اگر مومنہ اور ارمان ایک دوسرے کو دیکھ لیں تو شاید بہت کچھ بدل سکتا ہے۔

رمشا نے آخری میسج لکھا:

"ارمان ہسپتال میں ہے... اگر تم واقعی اسے یاد کر رہی ہو تو یہ بہترین وقت ہے اسے جا کر دیکھنے کا"

اس کے بعد چیٹ میں خاموشی چھا گئی، مگر رمشا کو محسوس ہوا جیسے اس نے ایک قدم آگے بڑھا دیا ہو اب فیصلہ مومنہ کے ہاتھ میں تھا۔

مومنہ نے جیسے ہی ہسپتال کا سنا، اس کے اندر گھبراہٹ بڑھ گئی۔ اس کے ہاتھوں سے موبائل تھوڑا سا کانپنے لگا اور اس نے فوراً لکھا:

"وہ ہسپتال میں کیسے ہے ؟"

رمشا نے اس کا میسج پڑھا تو ایک لمحے کو رک گئی۔ اسے احساس ہوا کہ اب بات صرف یادوں یا احساسات کی نہیں رہی، اب حقیقت سامنے آ رہی ہے۔

رمشا نے نرمی مگر سنجیدگی سے جواب دیا:

"مومنہ... اس کا accident ہوا ہے"

یہ پڑھ کر مومنہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے فوراً ٹائپ کیا:

"کیا... ؟ کب ؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

رمشا نے گہری سانس لی، پھر آہستہ سے لکھا:

"وہ ICU میں ہے... حالت نازک ہے... اس لیے سکندر تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا"

مومنہ کے لیے یہ جملہ بہت بھاری تھا۔ وہ کچھ دیر بالکل خاموش رہی، جیسے الفاظ اس کے اندر کہیں اٹک گئے ہوں۔

پھر اس نے لرزتے ہوئے لکھا:

"میں... میں ابھی وہاں جا سکتی ہوں؟"

رمشا نے اس کے میسج کو دیکھا اور فوراً جواب دیا:

"ہاں... اگر تم دل سے جانا چاہتی ہو تو یہی وقت ہے"

چیٹ خاموش ہو گئی، مگر اس خاموشی میں ایک فیصلہ جنم لے رہا تھا ایک ایسا فیصلہ جو سب کی زندگی بدل سکتا تھا۔

مومنہ نے کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد لکھا:

"ٹھیک ہے... سکندر سے میری بات کروا دو"

رمشا نے یہ میسج پڑھا تو ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئی۔ رات کی خاموشی اور اس فیصلے کا بوجھ دونوں ایک ساتھ اس کے دل پر آ گرے۔ اسے اندازہ تھا کہ اب بات صرف ایک کال کی نہیں رہی، اب بہت کچھ بدلنے والا ہے۔

رمشا نے آہستہ سے ٹائپ کیا:

"ٹھیک ہے... میں اسے ابھی بتاتی ہوں"

چیٹ بند ہوتے ہی کمرہ پھر سے خاموش ہو گیا۔ رمشا نے فون ہاتھ میں لیا، مگر کال کرنے سے پہلے ہی اس کے دماغ میں ہزاروں سوال گھومنے لگے اگر یہ بات ہو گئی تو کیا سب ٹھیک ہو گا؟ یا پھر سب پہلے سے بھی زیادہ بکھر جائے گا؟

اس نے ابھی کال ملانے ہی والی تھی کہ اس کا ہاتھ رُک گیا۔

اگلے لمحے اس کے فون کی اسکرین روشن ہوئی

Incoming Call: سکندر

رمشا نے سکرین کو دیکھا... اور سانس آہستہ ہو گئی۔

کال بجتی رہی... اور اس نے ابھی تک جواب نہیں دیا تھا۔

رات کے تین بجے کی خاموشی میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ ایک طرف مومنہ برسوں بعد ارمان سے ملنے پر آمادہ ہو رہی تھی، دوسری طرف سوال اب بھی وہی تھا جو برسوں سے ادھورا پڑا تھا۔

آخر ایسا کیا ہوا تھا کہ دو لوگ، جو نکاح کے دہانے تک پہنچ چکے تھے، ایک دوسرے سے اس طرح بچھڑ گئے ؟

مومنہ نے آخر ارمان کو کیوں چھوڑا؟

کیا محبت کم پڑ گئی تھی ؟

کیا کسی نے بیچ میں زہر گھولا تھا؟

کیا مومنہ نے بے وفائی کی...

یا وہ خود کسی ایسی آگ سے گزری تھی جس کا کسی کو اندازہ نہیں ؟

شاید ارمان ساری عمر غلط شخص سے جواب مانگتا رہا۔

شاید قصور وہاں تھا ہی نہیں جہاں سب سمجھتے رہے۔

اور شاید مومنہ کے خاموش رہنے کے پیچھے ایک ایسا راز دفن تھا...

جو اگر کھل جاتا، تو کئی زندگیاں بدل جاتیں۔

مگر وہ راز کیا تھا...؟

مومنہ نے آخر ارمان کو کیوں چھوڑا؟

یہ سوال ابھی باقی تھا... اور کہانی بھی۔

—

فلیش بیک:

رمضان شروع ہو چکا تھا۔

یاقوب جٹ کی وفات کے بعد سکندر کا یہ پہلا رمضان تھا... اور یہ رمضان عبادت سے زیادہ آزمائش لگ رہا تھا۔

پہلی سحری ہی عجیب تھی۔

رات کے آخری پہر جب سحری کے لیے جگایا گیا تو سکندر چند لمحے بستر پر بیٹھا رہ گیا۔ اسے عادت تھی بابا کی آواز پر اٹھنے کی

"اٹھ بے غیرت کام چور لڑکے سحری نہ رہ جائے سحری کر لے"...

مگر اس بار کسی نے اسے ایسے نہیں جگایا۔

بس خاموشی تھی۔

وہ کچن میں آیا تو دستر خوان بچھا ہوا تھا، امّی، داؤد، خالہ سلوٰی اور دانش...

سب موجود تھے۔

مگر ایک جگہ خالی تھی۔

وہی جگہ جہاں یعقوب جٹ بیٹھا کرتے تھے۔

سکندر کی نظر وہیں جم گئی۔

اس نے چاہا نظریں ہٹا لے... مگر نہ ہٹا سکا۔

اسے یاد آیا کیسے بابا سحری میں سب سے زیادہ بولتے تھے۔

"اتنا کم مت کھاؤ، روزہ لمبا ہے"...

"پانی پی لو"...

"نماز کے بعد سونا مت"...

چھوٹی چھوٹی باتیں...

جو تب معمول لگتی تھیں۔

اب خزانہ لگ رہی تھیں۔

سکندر خاموش بیٹھا نوالے توڑ رہا تھا مگر نگلا نہیں جا رہا تھا۔

امّی نے دیکھا تو آہستہ سے کہا،

"کھاؤ بیٹا"...

اس نے بس سر ہلا دیا۔

وہ کسی سے کہنا چاہتا تھا

یہ سحری ادھوری ہے...

مگر کہا نہیں۔

افطاری اس سے بھی مشکل ہوتی۔

مغرب سے کچھ پہلے جب پکوڑوں کی خوشبو گھر میں پھیلتی تو اسے بابا یاد آتے

جو ہمیشہ کچن میں جھانک کر کہتے،

"اتنے پکوڑے روزے کے لیے ہیں یا محلے کے لیے؟"

اور سب ہنس پڑتے۔

اب وہی خوشبو دل پر بوجھ ڈالتی۔

اذان سے پہلے سب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے۔

سکندر بھی اٹھاتا...

مگر اکثر دعا کی بجائے صرف اپنے بابا کا چہرہ سامنے آجاتا۔

اذان ہوتی۔

سب کھجور منہ میں رکھتے۔

اور سکندر ہر بار ایک لمحے کو رکتا...

کیونکہ بابا ہمیشہ پہلے اسے کہتے تھے،

"پہلے کھجور"...

وہ عادت اب بھی تھی۔

آدمی مر جائے...

عادتیں نہیں مرتیں۔

ایک دن افطاری پر اس نے بے اختیار ایک اضافی پلیٹ نکال لی۔

پھر خود ہی رکا۔

کافی دیر تک پلیٹ ہاتھ میں پکڑے دیکھتا رہا۔

پھر آہستہ سے واپس رکھ دی۔

کسی نے کچھ نہیں کہا۔

مگر سب سمجھ گئے۔

رات تراویح کے بعد وہ اکثر چھت پر چلا جاتا۔

ہوا چلتی...

محلے سے قرآن کی آوازیں آتیں...

اور وہ آسمان دیکھ کر بیٹھا رہتا۔

کبھی آہستہ سے کہتا،

"بابا... آپ کی بہت یاد آتی ہے... میں سب کو سنبھال رہا ہوں"

مگر اگلے ہی لمحے اندر سے آواز آتی

نہیں، میں نہیں سنبھال پا رہا۔

اسے یاد آتا بابا کہتے تھے،

"مرد روتے کم ہیں، بوجھ زیادہ اٹھاتے ہیں"...

اور وہ سوچتا

میں بوجھ تو اٹھا رہا ہوں... مگر اندر سے ٹوٹ بھی رہا ہوں۔

سحری میں کرسی خالی ہوتی۔

افطاری میں ایک آواز کم ہوتی۔

نماز میں ایک سایہ غائب ہوتا۔

اور ہر روز یہ کمی نئی لگتی۔

رمضان رحمت کا مہینہ تھا...

مگر سکندر کے لیے یہ یادوں کی عدالت بن گیا تھا۔

ہر روز ایک نیا مقدمہ کھلتا

پچھتاوے کا۔

کاش میں بابا کے ساتھ زیادہ وقت گزارتا۔

کاش ان کی بیماری پہلے جان لیتا۔

کاش...

یہ "کاش" اس کے دل کو روز کاٹتا تھا۔

اور سب سے عجیب بات

وہ اب بھی رو نہیں پا رہا تھا۔

یہی بات اسے اندر سے کھا رہی تھی۔

وہ سوچتا،

میں کیسا بیٹا ہوں... جس کے باپ چلے گئے اور آنسو بھی نہ آئے...

مگر حقیقت یہ تھی

کچھ غم آنسوؤں سے نہیں نکلتے۔

وہ انسان کی چال، آواز اور خاموشی میں بس جاتے ہیں۔

اور سکندر...

اب انہی خاموشیوں میں رہنے لگا تھا۔

دوسری طرف ارمان اور مومنہ کا رمضان واقعی الگ ہی تھا۔ کچھ محبتیں ملاقاتوں سے نہیں، دعاؤں سے زندہ رہتی ہیں اور ارمان کی محبت انہی میں سے ایک تھی۔

رمضان شروع ہوا تو ارمان کے معمول بدل گئے۔ وہ پہلے بھی عبادت کرتا تھا، لیکن اب عبادت میں مومنہ شامل ہو گئی تھی۔

کسی نے اسے بتایا تھا کہ اگر رمضان کے اکیس دن فجر کے بعد، سورج طلوع ہونے سے پہلے سورۂ طٰہٰ پڑھی جائے اور نیت نکاح کی ہو، تو بند راستوں میں بھی آسانی پیدا ہوتی ہے۔

بس پھر کیا تھا۔

ارمان نے اس بات کو صرف سنا نہیں، مان لیا۔

ہر رات سحری میں اٹھتا تو اس کے دل میں ایک عجیب سی سنجیدگی ہوتی، جیسے وہ کسی روحانی وعدے پر عمل کر رہا ہو۔ اذانِ فجر کے بعد جب شہر ابھی نیم تاریکی میں ہوتا، لوگ دوبارہ بستروں میں لوٹ رہے ہوتے، تب ارمان جائے نماز پر بیٹھ جاتا۔

خاموشی میں۔

تنہائی میں۔

اور مومنہ کے نام کے ساتھ۔

وہ دھیرے دھیرے سورۂ طٰہٰ پڑھتا۔

ہر آیت پر جیسے دل جھک جاتا۔

ہر لفظ کے ساتھ امید بندھتی۔

پڑھنے کے بعد ہاتھ اٹھاتا اور دیر تک دعا کرتا۔

"یا اللہ... مومنہ کو میرا نصیب بنا دے"...

یہ اس کی روز کی دعا تھی۔

اور عجیب بات یہ تھی کہ وہ صرف مانگتا نہیں تھا، یقین بھی رکھتا تھا۔

کبھی دعا مانگتے مانگتے اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک جاتے۔

کبھی سجدہ لمبا ہو جاتا۔

کبھی وہ سجدے سے اٹھ کر مسکرا دیتا، جیسے دل کہہ رہا ہو قبولیت قریب

ہے۔

افطار سے پہلے بھی وہ مومنہ کے لیے دعا کرتا۔

پہلا لقمہ لینے سے پہلے۔

آخری سجدے میں۔

تراویح کے بعد۔

حتیٰ کہ چلتے پھرتے بھی دل میں ایک ہی ورد ہوتا

مومنہ۔

اکیس دن اس نے ایک دن بھی ناغہ نہ کیا۔

گرمی ہو، تھکن ہو، نیند ہو وہ فجر کے بعد سورج نکلنے سے پہلے سورۂ طٰہٰ پڑھتا

ہی تھا۔

لوگ شاید اسے دیوانگی کہتے۔

ارمان اسے محبت کہتا تھا۔

اسے لگتا تھا اگر دنیا والوں نے رکاوٹیں ڈالی ہیں، تو شاید آسمان والا راستہ نکال دے۔

وہ اکثر تصور کرتا

ایک دن انہی دعاؤں کے بعد نکاح ہو گا۔

وہ اور مومنہ ایک ہی دستر خوان پر افطار کریں گے۔

سحری میں ایک دوسرے کو جگائیں گے۔

اور رمضان صرف انتظار نہیں، وصال کا مہینہ ہو گا۔

شاید مومنہ کو خبر بھی نہ تھی

کہ کوئی ہر سحر اس کے نام پر رب سے لڑ رہا ہے۔

کوئی محبت کو دعا بنا چکا ہے۔

کوئی اکیس دن سے اپنی قسمت لکھوانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اور ارمان کو یقین تھا

بعض دعائیں دیر سے قبول ہوتی ہیں...

رد نہیں ہوتیں۔

مومنہ اور ارمان کی محبت شور والی محبت نہیں تھی، وہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھے جو ہر راہداری میں ساتھ دکھائی دیں، ہر کونے میں باتیں کرتے ملیں یا دوسروں کی نظروں میں اپنی قربت کا اعلان کرتے پھریں۔ ان دونوں نے یونیورسٹی کے اندر ملنا جلنا بہت محدود رکھا تھا، جیسے محبت کو لوگوں کی نظروں سے بچا کر رکھنا چاہتے ہوں۔

وہ جانتے تھے یونیورسٹی میں نظریں صرف دیکھتی نہیں، باتیں بھی بناتی ہیں۔

اسی لیے اکثر وہ دور رہ کر قریب رہتے تھے۔

کلاس کے بعد کبھی دور سے ایک نظر۔

کبھی لائبریری کے باہر مختصر سی بات۔

کبھی صرف اتنا کہ ارمان گزرے اور مومنہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دے۔

اور پورا دن اسی ایک مسکراہٹ پر کٹ جائے۔

مگر محبت کم نہ تھی۔

بس محتاط تھی۔

اُس زمانے میں طارق انور ابھی تک بیمار تھے، اور مومنہ کو اکثر ان کی تیمارداری کے لیے ہسپتال جانا پڑتا تھا۔ کئی دن وہ یونیورسٹی سے چھٹی لے لیتی۔ کبھی لیکچر چھوڑ دیتی، کبھی پورا دن غائب رہتی۔

اور اکثر ان دنوں ارمان ہی اسے بائیک پر لاتا لے جاتا۔

یہ ایک معمول سا بن گیا تھا۔

ہسپتال کے راستے۔

لمبی سڑکیں۔

شام کی ہوا۔

اور بائیک پر خاموش ساتھ۔

کبھی مومنہ پیچھے بیٹھی آہستہ سے پوچھتی،

"اتنی آہستہ کیوں چلا رہے ہو؟"

اور ارمان ہنس کر کہتا،

"آپ ساتھ ہوں تو احتیاط خود آجاتی ہے"

کبھی وہ ہسپتال کے باہر دیر تک انتظار کرتا رہتا۔

مومنہ اندر والد کے پاس ہوتی، اور ارمان باہر بینچ پر بیٹھا رہتا، بس اس لیے کہ واپسی پر اسے اکیلے نہ جانا پڑے۔

کبھی مومنہ تھکی ہوئی باہر نکلتی تو ارمان بغیر پوچھے پانی کی بوتل آگے کر دیتا۔

"پہلے پانی پیو"

یہ چھوٹی چیزیں تھیں۔

مگر محبت اکثر انہی میں چھپی ہوتی ہے۔

راستے میں کبھی دونوں بہت کم بولتے۔

مگر خاموشی بوجھ نہیں لگتی تھی۔

سکون لگتی تھی۔

مومنہ کو اس کے ساتھ ایک عجیب سا تحفظ محسوس ہوتا۔

جیسے اس شور بھری دنیا میں ایک شخص ایسا ہے جس کے ساتھ بیٹھ کر دل دفاعی حالت سے نکل آتا ہے۔

ارمان کے پیچھے بائیک پر بیٹھے ہوئے اسے لگتا تھا زندگی اتنی پیچیدہ نہیں۔

کبھی وہ ہلکا سا اس کے کندھے کو تھام لیتی اور خود بھی چونک جاتی۔

کبھی ارمان پیچھے دیکھے بغیر پوچھتا،

"ڈر تو نہیں لگ رہا؟"

اور وہ آہستہ سے کہتی،

"نہیں"...

مگر اصل جواب یہ تھا

"تمہارے ساتھ نہیں"

کم از کم اُس وقت تک تو یہی سچ تھا۔

مومنہ کو لگتا تھا وہ ارمان کے پاس محفوظ ہے۔

دنیا کی تلخیوں سے۔

لوگوں کی نظروں سے۔

وقت کے دھوکوں سے۔

مومنہ پر اُن دنوں طارق انور کی بیماری کا بوجھ اس قدر تھا کہ بعض اوقات اسے وقت، دن، اپنے وجود تک کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ ہسپتال کے چکر، دواؤں کی فہرستیں، رپورٹس، ڈاکٹروں کی باتیں... ان سب نے اسے اندر سے نچوڑ رکھا تھا۔

رمضان انہی دنوں آیا۔

لوگ افطار کی تیاریوں میں مصروف ہوتے، گھروں میں پکوڑوں کی خوشبو پھیلتی، دستر خوان سجتے... مگر مومنہ کبھی ہسپتال کی راہداری میں بیٹھی ہوتی، کبھی والد کے سرہانے، اور کبھی اتنی ذہنی تھکن میں کہ اسے یاد ہی نہ رہتا کہ روزہ کھولنے کا وقت ہو چکا ہے۔

کئی بار ایسا ہوتا کہ اذان ہو جاتی...

مگر مومنہ بھول جاتی۔

واقعی بھول جاتی۔

اسے ہوش ہی نہ رہتا۔

اور انہی لمحوں میں ارمان کا فون آتا۔

جیسے اسے وقت سے پہلے احساس ہو جاتا ہو۔

فون بجتا۔

مومنہ تھکے لہجے میں اٹھاتی۔

"ہلو"...

ادھر سے ارمان کی نرم آواز آتی،

"مومنہ... افطار کر لیں"

وہ چونک جاتی۔

"اوہ... میں تو بھول گئی"...

ارمان ہلکا سا مسکراتا۔

"مجھے معلوم تھا"

کبھی وہ پوچھتا،

"کچھ کھایا بھی ہے یا صرف پانی پر افطار کریں گی؟"

مومنہ تھکی ہنسی سے کہتی،

"ابھی کچھ نہیں"...

تو ارمان ہلکی ڈانٹ میں محبت چھپا کر کہتا،

"یہ روزے رکھ رہی ہیں یا خود کو سزا دے رہی ہیں؟ پہلے کھجور کھائیں"

کبھی وہ اذان سے چند منٹ پہلے ہی فون کر دیتا۔

"دیکھیں، آج بھولنا نہیں ہے"

مومنہ کہتی،

"آپ کو میری فکر بہت رہتی ہے"

اور ارمان جواب دیتا،

"آپ اپنی فکر خود نہیں کرتیں، کسی کو تو کرنی پڑے گی"

یہ جملے معمولی تھے۔

مگر مومنہ کے لیے سہارا تھے۔

بعض دن وہ ہسپتال میں اتنی ٹوٹی ہوئی ہوتی کہ فون پر بس خاموش رہتی۔

ارمان سمجھ جاتا۔

وہ موضوع بدل دیتا۔

"اچھا بتائیں آج افطار میں کیا ہے؟"

وہ کہتی،

"کچھ نہیں"...

ارمان فوراً کہتا،

"یہ جواب قبول نہیں، جا کے کچھ کھائیں"

اور وہ واقعی اٹھ جاتی۔

صرف اس کے کہنے پر۔

کبھی مومنہ سوچتی

یہ کیسا آدمی ہے جسے میرے روزہ کھولنے تک کی فکر ہے۔

جو مجھے مجھ سے زیادہ یاد رکھتا ہے۔

کبھی وہ اذان کے بعد کھجور ہاتھ میں لے کر مسکرا دیتی...

"اگر ارمان فون نہ کرتا تو آج پھر بھول جاتی"...

محبت کبھی بڑے دعووں میں نہیں چھپی ہوتی۔

کبھی صرف ایک فون کال میں ہوتی ہے

"افطار کر لیں"

اور مومنہ کے لیے یہ صرف یاد دہانی نہیں تھی۔

یہ خیال تھا۔

محبت تھی۔

تحفظ تھا۔

اسے لگتا تھا دنیا بکھر بھی جائے...

تو ایک شخص ہے جو اذان کے وقت اسے یاد رکھتا ہے۔

اور شاید یہی چیز اسے ارمان کے پاس محفوظ محسوس کراتی تھی۔

فی الحال تو مومنا کو یہی لگتا تھا۔

یونیورسٹی کا دوپہر کا وقت تھا۔ لان میں ہلکی دھوپ بچھی ہوئی تھی، درختوں کے سائے بنچوں تک پھیلے تھے، اور طلبہ اپنے اپنے حلقوں میں بیٹھے باتوں، ہنسی اور اسائنمنٹس میں گم تھے۔

شہویر اور دانیال کینٹین کے قریب بنچ پر بیٹھے تھے۔ سامنے چائے کے کپ رکھے تھے، مگر گفتگو چائے سے زیادہ گرم چل رہی تھی۔ کبھی کلاس کی بات، کبھی یونیورسٹی کی سیاست، کبھی دوستوں کے لطیفے۔

دانیال ابھی کوئی بات مکمل ہی کر رہا تھا کہ سامنے سے نادیا آتی دکھائی دی۔

اس کے قدم تیز تھے۔

چہرے پر ہلکی سی جلدی۔

اور جیسے کسی خاص کو ڈھونڈ رہی ہو۔

وہ آ کر ان دونوں کے سامنے رکی۔

"سکندر کہاں ہے؟"

شاہویر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"خیریت؟"

نادیا نے مختصر جواب دیا،

"ہاں... بس کام ہے"

دانیال نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، پھر کہا،

"شاید لائبریری کے پاس ہو... کچھ دیر پہلے وہیں دیکھا تھا"

نادیا نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔

"اچھا"

بس اتنا کہا۔

اور فوراً مڑ گئی۔

وہ جس تیزی سے آئی تھی، تقریباً اسی تیزی سے واپس چل دی۔

شہویر نے جاتے ہوئے اسے دیکھا، پھر دانیال کی طرف معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھا۔

"یہ آج سکندر کو کیوں ڈھونڈ رہی ہے؟"

دانیال ہلکا سا ہنسا۔

"لگتا ہے قصہ دلچسپ ہونے والا ہے"

اور دوسری طرف نادیا لائبریری کی طرف بڑھ رہی تھی...

اسے شاید خود بھی معلوم نہیں تھا

کہ وہ صرف سکندر کو ڈھونڈنے نہیں جا رہی...

بلکہ ایک نئی کہانی کے دروازے کی طرف جا رہی تھی۔

نادیا تیز قدموں سے لائبریری کی طرف گئی۔ راہداری میں ہلکی خاموشی تھی، کہیں صفحات پلٹنے کی آواز، کہیں سرگوشیاں۔ اسے یقین تھا سکندر وہیں ملے گا۔

مگر وہ وہاں نہیں تھا۔

اس نے لائبریری کے اندر ایک نظر دوڑائی۔

پھر دوسری۔

پھر باہر آ کر بھی دیکھا۔

سکندر کہیں نہ تھا۔

اس کے چہرے پر بے چینی آ گئی۔

"آخر گیا کہاں"...

وہ آہستہ سے خود سے بولی۔

جس جلدی میں وہ آئی تھی، اب وہی جلدی پریشانی میں بدل رہی تھی۔

تبھی اس کی نظر سامنے پڑی۔

کچھ فاصلے پر رمشا کھڑی تھی، کتاب ہاتھ میں، مگر جیسے ذہن کہیں اور ہو۔

نادیا ایک لمحے کو رکی۔

سوچا اس سے پوچھ لے۔

شاید اسے سکندر کا پتا ہو۔

مگر قدم آگے نہ بڑھے۔

کیونکہ مسئلہ صرف سوال کا نہیں تھا۔

ان دونوں کے درمیان ایک خاموش تصادم موجود تھا۔

ایسا تصادم جسے یونیورسٹی میں کوئی نہیں جانتا تھا۔

سوائے ان دونوں کے...

اور سکندر کے۔

وجہ ایک ہی شخص تھا۔

ایک ایسی محبت...

جس نے دونوں کے دلوں میں الگ الگ دعویٰ چھوڑ رکھا تھا۔

اور یہی چیز ان کے درمیان نرم لہجوں کے نیچے چھپا ہوا تناؤ بن چکی تھی۔

باہر سے دونوں معمول کے مطابق ملتی تھیں۔

مگر اندر کہیں مقابلہ موجود تھا۔

خاموش۔

غیر اعلانیہ۔

مگر حقیقی۔

نادیا نے رمشا کی طرف دیکھا۔

رمشا نے بھی اسے دیکھ لیا۔

چند لمحے نظریں ملیں۔

وہ لمحے معمولی نہیں تھے۔

ان میں پرانی کھنچاؤ کی ہلکی چبھن تھی۔

نادیا چاہتی تھی پوچھ لے

"سکندر کہاں ہے؟"

مگر انا نے راستہ روک لیا۔

رمشا بھی شاید سمجھ گئی تھی کہ نادیا کچھ کہنا چاہتی ہے۔

مگر دونوں خاموش رہیں۔

اور بعض خاموشیاں لفظوں سے زیادہ بولتی ہیں۔

نادیا نے ہونٹ بھینچے، نظریں ہٹائیں...

اور دل میں ایک الجھن لیے وہیں کھڑی رہ گئی۔

اسے سکندر نہیں ملا تھا۔

مگر شاید اس سے زیادہ پیچیدہ چیز سامنے آ گئی تھی۔

اگلے دن یونیورسٹی میں عجیب سا اتفاق تھا، جیسے بکھرے ہوئے سب کردار ایک ہی منظر میں اکٹھے ہو گئے ہوں۔

کیمپس صبح کی دھوپ میں نہایا ہوا تھا۔ لانز میں ہلکی ہوا چل رہی تھی، درختوں کے سائے زمین پر پھیلے تھے، اور طلبہ معمول کے مطابق اپنے اپنے گروہوں میں گھوم رہے تھے۔ مگر اس دن کچھ اور تھا... ایک غیر محسوس سی کشش، جیسے کوئی اہم دن خاموشی سے اپنا آغاز کر رہا ہو۔

اتفاق سے اس دن سب آئے ہوئے تھے۔

مومنہ بھی۔

ارمان بھی۔

زینب گل، رمشا، نادیا، فوزیہ، دانیال، شہویر...

اور سکندر بھی۔

جیسے قسمت نے سب کو ایک ہی دن ایک ہی جگہ بلا لیا ہو۔

کینٹین کے باہر شہویر اور دانیال حسبِ معمول بحث میں لگے ہوئے تھے۔

فوزیہ اور زینب گل ہنستی ہوئی آ رہی تھیں۔

نادیا دور سے کسی کو ڈھونڈتی نظر آ رہی تھی۔

رمشا ہمیشہ کی طرح خاموش مگر سب کچھ observe کرتی ہوئی۔

اور سکندر... جیسے ہر جگہ موجود مگر کہیں پوری طرح نہیں۔

اسی دوران مومنہ آئی۔

سادہ لباس، ہاتھ میں کتابیں، چہرے پر وہی ٹھہرا ہوا وقار۔

اور کہیں فاصلے پر ارمان۔

جس کی نظریں غیر ارادی طور پر اس پر جا ٹھہرتی تھیں۔

وہ دونوں ہمیشہ کی طرح دوسروں کی نظروں میں زیادہ نہیں آنا چاہتے تھے، مگر ان کے درمیان جو خاموش رابطہ تھا وہ چھپتا بھی کہاں تھا۔

ایک لمحے کو ایسا لگا جیسے پورا کیمپس الگ الگ کہانیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک ہی کہانی کے کرداروں سے بھر گیا ہو۔

دوست۔

محبتیں۔

خاموش رقابتیں۔

ان کہی شکایتیں۔

سب ایک جگہ۔

اور شاید کسی کو خبر نہیں تھی کہ یہ معمول کا دن نہیں۔

ایسے دن اکثر کہانیوں میں موڑ لے آتے ہیں۔

اور یہ دن بھی شاید ایسا ہی ہونے والا تھا۔

کلاس ختم ہوتے ہی سب آہستہ آہستہ لان میں آ بیٹھے۔ رمضان کی وجہ سے پورے کیمپس کا ماحول بھی بدلا ہوا تھا نہ وہ شور، نہ وہ بے فکری والی تیزی، سب کچھ جیسے خود بخود نرم ہو گیا ہو۔

سکندر، شہویر اور دانیال ایک طرف بیٹھے تھے۔ ہلکی دھوپ میں سب اپنے اپنے انداز میں بیٹھے تھے، کوئی پانی کی بوتل گھما رہا تھا تو کوئی گھاس کو انگلیوں سے چھو رہا تھا۔

اسی دوران کچھ فاصلے پر مومنہ، رمشا، نادیا اور زینب گل بھی آ کر بیٹھ گئی تھیں، اپنی اپنی باتوں میں مصروف۔

اور تھوڑے فاصلے پر خاموش سا کھڑا ارمان بھی تھا، جو سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر زیادہ بول نہیں رہا تھا۔

لڑکوں کی طرف گفتگو چل رہی تھی۔

شاہویر ہنستے ہوئے بولا:

"یار روزے میں اصل ٹیسٹ بھوک نہیں ہوتی"...

دانیال فوراً بولا:

"مجھے پتا ہے، گالی روکنا"!

سب ہنس پڑے۔

سکندر نے مسکراتے ہوئے کہا:

"سچ کہو تو بندہ بھوکا پیاسا رہ لے، لیکن زبان قابو میں رکھنا مشکل ہوتا ہے"

ارمان جو خاموش کھڑا تھا، آہستہ سے قریب آیا اور بولا:

"روزہ صرف کھانے پینے کا نہیں ہوتا... اپنے غصے اور زبان کا بھی ہوتا ہے"

یہ سن کر ایک لمحے کو سب رک گئے، پھر شاہویر ہنسا:

"واہ ارمان! تم تو آج بڑے سنجیدہ موڈ میں ہو"

دانیال نے فوراً چھیڑا:

"لگتا ہے رمضان نے تمہیں لیکچرر بنا دیا ہے"

ارمان ہلکا سا مسکرایا مگر کچھ نہیں کہا۔

دور بیٹھی لڑکیاں بھی ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ مومنہ نے ایک لمحے کو نظر اٹھائی اور ارمان کی طرف دیکھا، پھر فوراً نظریں جھکا لیں۔

سکندر نے ہنستے ہوئے کہا:

"اصل مشکل یہ ہے کہ روزے میں بندہ بھوکا نہیں مرتا... اپنی عادتوں سے لڑتا ہے"

شہویر نے سر ہلایا:

"اور سب سے بڑی عادت زبان ہے"

سب پھر ہنس دیے۔

رمضان کے اس سادہ سے لمحے میں بھی ہر کسی کے اندر ایک مختلف کہانی چل رہی تھی مگر باہر صرف ہنسی، خاموشی اور وہ عجیب سا سکون تھا جو صرف روزے کے دنوں میں آتا ہے۔

لان میں بیٹھے ہوئے سب کے چہرے پر وہی افطار والی ہلکی سی بے چینی تھی، بھوک الگ تنگ کر رہی تھی اور سوال ایک ہی گھوم رہا تھا۔

"آج افطار کون کروائے گا؟"

شاہویر نے فوراً بات پکڑی:

"یار ہمیشہ میں ہی کیوں؟ آج کسی اور کی باری ہے"

دانیال ہنستے ہوئے بولا:

"میں تو صاف کہہ رہا ہوں، آج میرا wallet بھی روزے پر ہے"

سکندر نے مسکرا کر کہا:

"تو پھر ہم سب کیا کریں؟ بھوکے رہ کر ثواب بڑھائیں؟"

اتنے میں ارمان نے ہلکے سے کہا:

"مسئلہ پیسے کا نہیں... مسئلہ نیت کا ہے"

سب نے اس کی طرف دیکھا۔

شاہویر فوراً بولا:

"اچھا حضرت! پھر آپ نیت کر لیں آج"

ارمان نے بغیر جھجک کے جواب دیا:

"ٹھیک ہے... میں کرواتا ہوں افطار"

ایک لمحے کے لیے سب خاموش ہو گئے۔

دانیال نے حیرانی سے کہا:

"واقعی؟ تم؟"

ارمان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

"ہاں... لیکن شرط یہ ہے کہ سب ساتھ بیٹھیں گے، کوئی بھاگے گا نہیں اور ایک دوسرے کے لیے اچھے سے دعا کرنی ہے"

سکندر نے ہنستے ہوئے کہا:

"ویسے میں نے سنا تھا جو اپنے دوستوں کو افطاری کرواتا ہے اس کی جلدی شادی ہوتی ہے کہیں تم بھی انہیں چکروں میں تو نہیں؟"

ارمان شرمانے لگا تھا مگر جواب نہ دے سکا۔

مگر اس ہنسی کے پیچھے ایک عجیب سا سکون آ گیا تھا۔

اور لان میں بیٹھے سب کو یہ احساس ہو رہا تھا کہ کبھی کبھی افطار کون کروائے گا... یہ سوال نہیں ہوتا،

یہ صرف بہانہ ہوتا ہے اکٹھے بیٹھنے کا۔

سب لڑکوں کی ہلکی سی بحث، ہنسی اور افطار کے پلان کے شور کے بعد جب وہ اٹھ کر جانے ہی لگے تھے تو اچانک پیچھے سے ایک آواز نے فضا کا رخ بدل دیا۔

"سکندر"...

سکندر نے فوراً مڑ کر دیکھا۔

سامنے مومنہ کھڑی تھی، باقی لڑکیوں کے ساتھ، مگر اس کی نظر سیدھی سکندر پر تھی۔ اس کی آواز میں وہی ہلکی سی جھجک تھی جو کسی اہم بات سے پہلے ہوتی ہے۔

ایک لمحے کو سب رک گئے۔

شاہویر اور دانیال نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، جیسے سمجھ گئے ہوں کہ اب یہاں ان کی موجودگی مناسب نہیں۔

سکندر نے فوراً خود کو سنبھالا اور ہلکے مگر سنجیدہ لہجے میں کہا:

"تم سب لوگ جاؤ... میں آتا ہوں، ان سے بات کر کے"

لڑکے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ وہاں سے چل دیے۔

دانیال نے جاتے جاتے مسکرا کر کہا بھی:

"اچھا جی... پرائیویٹ میٹنگ"!

مگر سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اب لان میں صرف خاموشی رہ گئی۔

مومنہ اپنی جگہ کھڑی تھی، اور سکندر کچھ فاصلے پر۔

ہوا تھوڑی سی تھم گئی تھی، جیسے وقت بھی رک کر سن رہا ہو کہ اب بات کیا ہونے والی ہے۔

سکندر ابھی مومنہ کے قریب ہی کھڑا تھا کہ اس نے بات کا رخ بدلتے ہوئے آہستہ سے کہا:

"نادیا نے تم سے بات کرنی ہے"

یہ جملہ سن کر سکندر ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔ اس کی پیشانی پر ہلکی سی الجھن آ گئی۔

اس نے نظریں اٹھا کر فوراً ادھر دیکھا جہاں نادیا کھڑی تھی۔

نادیا کی حالت ویسی نہیں تھی جیسی ہمیشہ ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر وہ معمول کی سختی یا بے نیازی نہیں تھی... بلکہ آنکھوں میں نمی تھی، جیسے وہ کسی چیز کو بہت دیر سے روک رہی ہو اور اب مزید روک نہ پا رہی ہو۔

سکندر کو سمجھ نہیں آیا کہ یہ اچانک کیا ہو گیا ہے۔

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا، مگر رک گیا۔

نادیا نے نظریں جھکا لی تھیں، مگر آنکھوں کی نمی چھپ نہیں رہی تھی۔

سکندر کے دل میں ایک غیر واضح سا سوال اٹھا،

"آخر نادیا کو ہوا کیا ہے؟"

لان کا شور جیسے پیچھے رہ گیا ہو۔ لڑکیوں کی آوازیں، ہوا کا چلنا، سب کچھ مدھم ہو گیا۔

اب صرف ایک خاموشی تھی...

اور ایک سوال جو ابھی جواب مانگ رہا تھا۔

لان کی خاموش فضا اچانک بھاری ہو گئی۔ سکندر نے ایک قدم آگے بڑھایا، نظریں سیدھی رکھیں اور سنجیدگی سے پوچھا:

"کیا ہوا ہے؟ سب خاموش کیوں ہیں؟"

کچھ لمحے کسی نے جواب نہیں دیا۔ نادیا کی آنکھیں اب بھی نم تھیں، اور باقی لڑکیاں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں، جیسے کوئی بات کہنے سے ہچکچا رہی ہوں۔

اسی خاموشی کو توڑتے ہوئے زینب گل نے آگے بڑھ کر تلخ لہجے میں کہا:

"کیسی محبت ہے تمہاری سکندر؟ جس کے لیے تم ایک لڑکی کے لیے بھی کھڑے نہیں ہو سکتے؟"

سکندر ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے ساتھ ساتھ ایک ہلکی سی ناراضی بھی ابھر آئی۔

اس نے فوراً جواب دیا:

"کس محبت کی بات کر رہی ہو تم؟ میں نے کبھی کسی سے کوئی محبت کا دعویٰ نہیں کیا"

زینب نے فوراً بات کاٹ دی، آواز میں غصہ واضح تھا:

"نہیں کیا؟ تو پھر یہ سب کیا ہے؟ یہ جو تم ہر وقت ادھر ادھر نظریں گھماتے تھے جلدی سے مجھ سے شادی کر لیں یہ جو تم سمجھتے ہو کہ سب کچھ چھپا رہے ہو... یہ کیا ہے پھر؟"

سکندر کا لہجہ اب سخت ہو گیا:

"تم لوگ بات کو کہاں سے کہاں لے جا رہے ہو۔ میں یہاں کسی ڈرامے میں نہیں ہوں۔ اگر کوئی مسئلہ ہے تو سیدھی بات کرو، الزام نہ لگاؤ"

نادیا نے پہلی بار آہستہ سے سر اٹھایا، مگر کچھ نہ بولی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی بھی وہی الجھن اور دکھ تھا۔

زینب نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا:

"سیدھی بات؟ سیدھی بات یہ ہے سکندر کہ تمہیں خود بھی پتا نہیں تم چاہتے کیا ہو۔ نہ تم کسی کے لیے کھڑے ہوتے ہو، نہ کسی کو روکتے ہو، اور پھر کہتے ہو محبت نہیں ہے"

سکندر کا چہرہ سخت ہو گیا۔ اس نے ایک لمحے کو سب کو دیکھا، پھر مضبوط آواز میں بولا:

"میں نے کسی سے محبت نہیں کی... اور نہ میں نے کبھی کسی کو جھوٹی امید دی ہے"

اس کے الفاظ فضا میں گونج گئے۔

کچھ لمحے مکمل خاموشی رہی۔

یہ خاموشی نارمل نہیں تھی... یہ وہ خاموشی تھی جو اندر چھپے سچ اور ان کہی باتوں کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہے۔

نادیا کی آنکھیں جھکی رہیں، اور زینب کے چہرے پر غصہ ابھی بھی موجود تھا۔

اور سکندر... وہ پہلی بار خود بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اس کے انکار کے باوجود یہ سب اتنا ذاتی کیوں لگ رہا ہے۔

لان میں ہوا جیسے ایک لمحے کے لیے رک گئی ہو۔ سب لڑکیاں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں، اور بیچ میں کھڑا سکندر پہلی بار واقعی الجھن میں نظر آ رہا تھا۔

سکندر نے آہستہ سے بات شروع کی، مگر جیسے الفاظ خود بھی بھاری ہوں:

"اصل مسئلہ کیا ہے یہ بتاؤ"...

پھر وہ رکا، مومنہ کے لیے جیسے اگلا جملہ کہنا مشکل ہو۔

"نادیا کی"...

وہ ابھی مکمل بول بھی نہ پائی تھی کہ سکندر نے فوراً رخ نادیا کی طرف کر لیا:

"نادیا کی کیا؟"

نادیا نے نظریں جھکا لیں، مگر کچھ نہ بولی۔ فضا میں بے چینی بڑھ گئی۔

مومنہ نے ہلکی آواز میں کہا:

"نادیا کی شادی طے ہو گئی ہے، سکندر"...

یہ سن کر سکندر کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے حیرت آئی، پھر فوراً سخت لہجہ آگیا:

"تو اس میں میں کیا کروں؟"

زینب گل نے فوراً جواب دیا، آواز میں تلخی تھی:

"وہ لڑکا اسے پسند نہیں"...

سکندر نے بات کاٹی:

"تو منع کر دے شادی سے"

زینب نے فوراً سر ہلایا:

"نہیں کر سکتی وہ ایسا"

سکندر نے تیزی سے پوچھا:

"کیوں؟"

اس بار رمشا بولی، آواز تھوڑی نرم مگر واضح تھی:

"کیونکہ وہ ڈرتی ہے... اور تمہیں چاہتی ہے"

یہ جملہ فضا میں گر کر جیسے ٹوٹ گیا ہو۔

مومنہ کا چہرہ سخت ہو گیا:

"کیا تم نے اس سے شادی کا وعدہ نہیں کیا تھا؟"

رمشا نے سچائی کے ساتھ کہا:

"کیا تھا اس نے وعدہ نادیہ سے"...

سکندر نے فوراً جواب دیا، آواز بلند ہو گئی:

"تو اب کیا ہوا؟"

زینب نے بھی بات میں وزن ڈالا:

"وہ سب مذاق تھا؟ یا تم خود بھی سمجھتے ہو کہ یہ مذاق تھا؟"

سکندر سنجیدہ ہو کر بولا،

"تمہیں پوری بات نہیں پتا، نادیا خود بتائے"

نادیا اب بھی خاموش تھی، مگر اس کی آنکھوں میں پانی واضح تھا۔

سکندر نے ایک قدم آگے بڑھایا، آواز اب سنجیدہ اور بھاری تھی:

"جو بھی ہے... تم لوگوں کو یہ سب اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا"

لان میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

مگر اس خاموشی کے پیچھے اب ایک سادہ سا مسئلہ نہیں تھا...

یہ وہ الجھن تھی جس میں سچ، وعدے اور خوف سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو چکے تھے۔

لان میں وہی بھاری خاموشی ابھی ٹوٹی بھی نہیں تھی کہ نادیا اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ تھی مگر چہرے پر ایک عجیب سا فیصلہ تھا جیسے وہ اب کسی بھی بحث کو ختم کرنے آئی ہو، نہ کہ مزید شروع کرنے۔

اس نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا، چند لمحے کچھ ڈھونڈا، پھر ایک سفید سا کارڈ نکالا۔

سب کی نظریں اسی پر جم گئیں۔

نادیا نے آگے بڑھ کر وہ کارڈ سیدھا سکندر کے ہاتھ میں تھما دیا۔

اور بغیر کسی جذباتی ٹوٹ پھوٹ کے، ایک سیدھا سا جملہ کہا:

"شادی میں ضرور آنا"

یہ کہتے ہی اس نے ایک لمحہ بھی نہیں روکا۔

بس مڑ گئی۔

اور وہاں سے چل دی۔

اس کے قدم تیز تھے، مگر آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔

سکندر وہیں کھڑا رہ گیا۔

کارڈ اس کے ہاتھ میں تھا، مگر وہ جیسے سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ ابھی ہوا کیا ہے۔

اس نے کارڈ کو دیکھا... پھر نادیا کو جاتے ہوئے... پھر دوبارہ کارڈ کو۔

اس کے چہرے پر الجھن واضح تھی۔

"یہ... کیا تھا؟"

وہ آہستہ سے خود سے ہی بولا۔

دوسری طرف رمشا خاموش کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی، مگر اس حیرت میں کچھ اور بھی تھا خاموش سا دکھ، اور شاید سمجھ بھی۔

وہ جانتی تھی کہ سکندر کو نادیا پسند کرتی تھی...

مگر یہ سب اس انداز میں ختم ہو گا، یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

مومنہ بھی ساکت تھی۔ اس نے ایک لمحے کو نادیا کو جاتے دیکھا، پھر نظریں جھکا لیں، جیسے اس منظر کا بوجھ برداشت کرنا مشکل ہو گیا ہو۔

زینب گل بھی کچھ نہ بول سکی۔ اس کی تلخ باتیں بھی اس لمحے خاموش ہو گئیں۔

اور سکندر...

وہ اب بھی وہی کھڑا تھا، ہاتھ میں شادی کا کارڈ لیے۔

جیسے کسی نے اس کے سامنے ایک کہانی بند نہیں کی تھی...

بلکہ اچانک اس کا مطلب ہی بدل دیا ہو۔

ایک وقت تھا جب سکندر کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ وہ یعقوب جٹ سے نادیا کے بارے میں بات کرے۔ وہ چاہتا تھا کہ سب کچھ صاف ہو جائے، رشتے کی بات آگے بڑھے، اور جو الجھنیں ہیں وہ ختم ہوں۔

مگر وقت کے ساتھ اس کے اندر ایک تبدیلی آتی گئی۔

اس نے خود کو ہی روک لیا۔

اسے لگنے لگا کہ شاید وہ اس قابل نہیں ہے۔

نہ وہ اتنا مضبوط ہے، نہ اتنا بہتر کہ نادیا جیسے رشتے کے لیے کھڑا ہو سکے۔

آہستہ آہستہ اس کے ذہن میں ایک عجیب سا خوف بیٹھ گیا

کہ جو بھی اس کے قریب آتا ہے، وہ کسی نہ کسی تکلیف میں پڑ جاتا ہے۔

کبھی غلط فہمیاں۔

کبھی مسئلے۔

کبھی درد۔

یہ سوچ اس کے اندر اتنی گہری ہو گئی کہ وہ خود سے ہی دور ہونے لگا۔

لوگوں سے کم بات۔

رشتوں سے فاصلہ۔

اور نادیا سے بھی خاموشی۔

وہ خود کو قائل کرتا رہا کہ شاید دور رہنا ہی بہتر ہے۔

کہ شاید اس کا قریب ہونا ہی دوسروں کے لیے مسئلہ بن جاتا ہے۔

اور اسی سوچ نے اسے کمزور نہیں بلکہ خاموش بنا دیا تھا۔

ایسا خاموش... جو سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی کسی کے ساتھ نہیں ہوتا۔

رمشا نے جب نادیا کو شادی کا کارڈ دے کر چلے جاتے دیکھا تو اس کے ذہن میں ایک لمحے کے لیے عجیب سا سکون آیا۔

اسے لگا جیسے راستے میں ایک رکاوٹ ہٹ گئی ہو۔

جیسے اب سب کچھ سیدھا ہو جائے گا۔

اور سکندر اس کے قریب آ سکتا ہے۔

مگر یہ صرف اس کا وہم تھا۔

ایک خاموش سی غلط فہمی...

جو حقیقت سے بہت دور تھی۔

سکندر نے کبھی کسی سے وہ محبت نہیں کی تھی جس کا لوگ اندازہ لگا رہے تھے۔

نہ نادیا سے۔

نہ رمشا سے۔

نہ کسی اور سے۔

وہ ہمیشہ فاصلے پر رہنے والا شخص تھا خاموش، الجھا ہوا، اور اپنے ہی اندر کی لڑائیوں میں قید۔

وہ کسی کے قریب آیا بھی تو مکمل طور پر نہیں۔

اور اگر کوئی اس کے قریب آیا... تو وہ خود پیچھے ہٹ گیا۔

رمشا کو لگ رہا تھا کہ اب راستہ صاف ہو گیا ہے۔

مگر حقیقت یہ تھی کہ راستہ کبھی بند ہی نہیں تھا

بس وہ خود ہی وہاں تک آنے سے رک گیا تھا۔

پندرہ روزے گزر چکے تھے۔ وقت جیسے اپنے معمول میں چل رہا تھا، مگر سکندر کے اندر کچھ اور ہی جنگ جاری تھی۔

وہ ظاہری طور پر ویسا ہی تھا خاموش، سنبھلا ہوا، اپنے کام میں مصروف مگر اندر سے وہ بکھرتا جا رہا تھا۔

کبھی نماز میں کھڑا ہوتا تو رکعات بھول جاتا۔

کبھی سجدے میں دل کہیں اور چلا جاتا۔

کبھی ایک ہی آیت بار بار دہرانا پڑتی، جیسے ذہن ساتھ دینے سے انکار کر رہا ہو۔

دو دن بعد نادیا کی شادی تھی۔

یہ بات اس کے ارد گرد سب جانتے تھے، مگر سکندر نے اس پر کبھی بات نہیں کی تھی۔

نہ کسی سے۔

نہ خود سے۔

بس اندر ہی اندر وہ حقیقت بیٹھ چکی تھی، اور آہستہ آہستہ اسے کھا رہی تھی۔

وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کرے کیا۔

جائے یا نہ جائے۔

روکے یا چھوڑ دے۔

کچھ کہے یا مکمل خاموش ہو جائے۔

مگر اصل مسئلہ یہ نہیں تھا۔

اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ کسی سے بات ہی نہیں کرتا تھا۔

نہ رمشا سے۔

نہ مومنہ سے۔

نہ کسی اور سے۔

اس کی جنگ ہمیشہ اس کے اندر رہتی تھی۔

خاموش۔

بھاری۔

اور اکیلی۔

وہ باہر سے ٹھیک نظر آتا تھا، مگر اندر ہر دن کچھ نہ کچھ ٹوٹ رہا تھا۔

اور اب وہ اس موڑ پر کھڑا تھا جہاں صرف دو دن باقی تھے...

اور فیصلہ کسی اور کے ہاتھ میں نہیں رہا تھا۔

صرف اس کے اپنے ہاتھ میں تھا۔

دو دن بہت بھاری تھے۔ سکندر کے لیے ہر لمحہ ایک ایسی کشمکش بن چکا تھا جس میں نہ وہ پوری طرح کھڑا ہو پا رہا تھا اور نہ ہی مکمل طور پر گر رہا تھا۔ وہ باہر سے معمول کے مطابق تھا، مگر اندر سے ہر چیز بکھر رہی تھی۔

اس نے بہت سوچا۔

بار بار سوچا۔

اور آخر کار وہی فیصلہ کیا جس سے وہ کافی عرصے سے بھاگ رہا تھا کہ وہ نادیا سے محبت نہیں کرتا۔

یہ بات مان لینا آسان نہیں تھا، مگر یہی حقیقت تھی۔

اور جب حقیقت واضح ہو جائے تو انسان کے پاس دو ہی راستے رہ جاتے ہیں...

یا تو اسے جھٹلائے، یا اسے قبول کر لے۔

سکندر نے دوسرا راستہ چنا۔

شادی سے پہلے اس نے طے کیا کہ وہ وہاں نہیں جائے گا۔ نہ کوئی ڈرامہ، نہ کوئی تماشا، نہ کوئی جھوٹی امید۔

بس ایک خاموش اختتام۔

اسی خاموشی میں اس نے فون اٹھایا اور نادیا کا نمبر ملایا۔

کچھ لمحے گزرے، پھر کال connect ہوئی۔

نادیا کی آواز آئی:

"ہیلو"...

اس کی آواز معمول سے ہلکی تھی، جیسے وہ بھی کسی انتظار میں ہو۔

سکندر نے ایک گہری سانس لی، پھر آہستہ سے بولا:

"نادیا... تم ایک بات سن لو آرام سے"

نادیا نے فوراً کہا:

"ہاں... بولو"

سکندر نے چند لمحے خاموش رہ کر کہا:

"میں نے بہت سوچا ہے... اور میں تم سے ایک سچ کہنا چاہتا ہوں"

نادیا کی آواز میں ہلکی سی بے چینی آ گئی:

"کیا سچ؟"

سکندر نے الفاظ سنبھالتے ہوئے کہا:

"تم بہت اچھی ہو... بہت اچھی انسان ہو... مگر میں تم سے محبت نہیں کرتا"

یہ جملہ کہتے ہی اس کی آواز تھوڑی بھاری ہو گئی، جیسے خود اسے بھی اندر سے تکلیف ہو رہی ہو۔

دوسری طرف مکمل خاموشی چھا گئی۔

پھر نادیا کی آواز آئی، تھوڑی کانپتی ہوئی:

"تم... ابھی یہ کہہ رہے ہو؟ شادی سے پہلے؟"

سکندر نے فوراً نرمی سے کہا:

"میں تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا... لیکن جھوٹ بول کر زندگی شروع نہیں کی جا سکتی"

نادیا کی سانس تھوڑی تیز ہو گئی۔

"تو پھر پہلے کیوں نہیں بتایا؟ جب سب کچھ طے ہو رہا تھا؟"

سکندر نے آہستہ کہا:

"میں خود بھی سمجھنے میں وقت لگا بیٹھا... مگر اب میں جانتا ہوں کہ میں تمہیں وہ نہیں دے سکتا جو تم deserve کرتی ہو"

نادیا کی آواز اب کچھ سخت ہو گئی، مگر اس کے اندر دکھ زیادہ تھا:

"اور یہ بات تمہیں اب یاد آئی ہے؟ جب سب کچھ ختم ہونے کے قریب ہے؟"

سکندر خاموش رہا۔

پھر بہت ہلکے لہجے میں بولا:

"میں غلط ہوں... مگر میں مزید جھوٹ نہیں کہہ سکتا"

نادیا نے کچھ لمحے سانس لی، پھر کہا:

"تمہیں اندازہ ہے تم کیا کر رہے ہو؟"

سکندر نے آہستہ سے جواب دیا:

"ہاں... شاید پہلی بار"

نادیا کی آواز ٹوٹنے لگی:

"تم نے مجھے درمیان میں چھوڑ دیا... بغیر یہ سوچے کہ میں کیا ہوں گی اس کے بعد"

سکندر نے آنکھیں بند کر لیں۔

اس نے دھیرے سے کہا:

"میں جانتا ہوں... اور اس کی معافی شاید میرے پاس نہیں"

نادیا کچھ دیر خاموش رہی۔

پھر اس کی آواز آئی، بہت مدھم:

"ٹھیک ہے... اگر یہی تمہارا فیصلہ ہے... تو میں تمہیں روکوں گی نہیں"

سکندر نے فوراً کہا:

"نادیا"...

نادیا نے اس کی بات کاٹ دی:

"نہیں سکندر... اب کچھ نہیں کہنا۔ تم نے فیصلہ کر لیا ہے"

کچھ لمحے مکمل خاموشی رہی۔

صرف سانسوں کی آواز۔

پھر نادیا نے آخری بات کہی:

"میں ٹھیک ہو جاؤں گی... فکر مت کرنا لیکن تم کبھی خوش نہیں ہو گے"

اور کال بند ہو گئی۔

سکندر وہیں کھڑا رہ گیا۔

فون اس کے ہاتھ میں تھا، مگر اب کوئی آواز نہیں تھی۔

صرف ایک خاموشی تھی...

جو بتا رہی تھی کہ کچھ فیصلے صحیح یا غلط نہیں ہوتے...

بس دیر سے کیے جاتے ہیں۔

تین چار دن گزر چکے تھے۔ وقت اپنی رفتار سے چل رہا تھا، مگر سکندر کے اندر سب کچھ جیسے تھم سا گیا تھا۔

نادیا والے واقعے کا ذکر صرف چند لوگوں تک محدود تھا—زینب گل، رمشا اور مومنا۔

یونیورسٹی میں باقی کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔

نہ کوئی سوال۔

نہ کوئی افواہ۔

نہ کوئی نیا تماشا۔

سب کچھ بظاہر نارمل تھا۔

سکندر بھی اسی دن یونیورسٹی آیا۔

وہ جیسے اپنے آپ کو دوبارہ معمول میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ صبح سے ہی شہویر اور دانیال کے ساتھ تھا۔ کبھی کینٹین، کبھی لان، کبھی کلاس کے باہر۔ وہ ہنستا بھی تھا، بات بھی کرتا تھا، مگر اس ہنسی کے پیچھے ایک خاموشی چھپی ہوئی تھی جسے صرف وہ خود جانتا تھا۔

شہویر نے مذاق کیا:

"آج سکندر بڑا نارمل لگ رہا ہے"

دانیال نے ہنستے ہوئے کہا:

"یہ نارمل نہیں، یہ over-controlled ہے"

سکندر نے صرف ہلکی سی مسکراہٹ دی اور بات بدل دی۔

کسی نے زیادہ غور نہیں کیا۔

مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ خود کو مصروف رکھ کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کہ کہیں رک نہ جائے۔

کہ کہیں سوچنے نہ لگے۔

کہ کہیں وہ سب یاد نہ آجائے جو وہ خود پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

کلاس کے بعد سب لان میں آ بیٹھے۔

رمضان کا دن تھا، فضا میں وہی سکون اور تھکن دونوں موجود تھے۔

لوگ ہنسی مذاق میں لگے تھے، مگر سکندر خاموش بیٹھا تھا۔

وہ سب کے ساتھ تھا، مگر دل میں کہیں اور تھا۔

کچھ لمحوں بعد مومنہ دور سے گزری۔

سکندر نے اسے دیکھا۔

بس ایک لمحہ۔

نہ کوئی اشارہ۔

نہ کوئی بات۔

مومنہ نے بھی شاید اسے دیکھا، مگر نظریں فوراً ہٹ گئیں۔

وہ لمحہ گزر گیا۔

اور سکندر نے بھی کوئی ردعمل نہیں دیا۔

وہ واپس شاہویر کی باتوں میں شامل ہو گیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

مگر اندر کہیں ایک بات واضح ہو چکی تھی

سب کچھ کہنے کے بعد بھی، بعض کہانیاں خاموشی سے چلتی رہتی ہیں...

اور کچھ لوگ صرف بظاہر ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

ارمان کی زندگی میں ان دنوں ایک عجیب سا بدلاؤ آ چکا تھا۔ وہ پہلے جیسا خاموش اور انتظار کرنے والا نہیں رہا تھا... اب وہ زیادہ زندہ، زیادہ باتونی اور حد سے زیادہ خوش نظر آتا تھا۔

جیسے اسے لگتا ہو کہ اب اس کی دنیا مکمل ہو گئی ہے۔

جس لڑکی کے لیے وہ دعا کرتا رہا تھا، وہ اب اس کے قریب تھی۔ مومنہ اس کے لیے وہ وجود بن چکی تھی جس کی وہ ہمیشہ فکر کرتا تھا، جس کا خیال اس کے دل میں سب سے پہلے آتا تھا۔

اب وہ ہر وقت اسی کے ساتھ جڑا رہتا تھا۔

چوبیس گھنٹے میں بار بار کالز۔

لمبی لمبی باتیں۔

اور اکثر ایسی باتیں بھی جن کا کوئی خاص موضوع نہیں ہوتا تھا۔

کبھی وہ خود ہنس کر کہتا:

"یار میں کیا بات کروں اب؟"

اور مومنہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ جواب دیتی:

"پھر بھی بات تو کر رہے ہیں نا"...

ارمان بھی ہنس دیتا:

"ہاں... بس آپ کی آواز سننی ہوتی ہے"

کبھی دونوں کے پاس واقعی بات کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تھا، مگر کال پھر بھی چلتی رہتی۔

خاموشی بھی ساتھ ہوتی، اور ہلکی ہلکی سانسوں کی آواز بھی۔

ارمان کے لیے یہ سب بہت تھا۔

اسے لگتا تھا کہ شاید یہی وہ مقام ہے جس کے لیے اس نے اتنی دعائیں کی تھیں۔

وہ اکثر بغیر کسی خاص وجہ کے بھی کال کر دیتا۔

"کیا کر رہی ہیں؟"

"کھانا کھایا؟"

"آرام کر رہی ہیں یا ہسپتال میں ہیں؟"

اور ہر سوال کے پیچھے ایک ہی احساس ہوتا تھا" فکر"

مومنہ کبھی تھک جاتی تو کہتی:

"ارمان، آپ کو اور کوئی کام نہیں ہوتا کیا؟"

اور وہ ہلکے سے جواب دیتا:

"ہوتا ہے... مگر آپ سے بات کرنا سب سے اہم کام لگتا ہے"

وہ خوش تھا... واقعی خوش۔

اتنا خوش کہ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ بعض خوشیاں بھی آہستہ آہستہ حقیقت سے دور کر دیتی ہیں۔

اسے لگتا تھا سب کچھ حاصل ہو چکا ہے۔

محبت بھی۔

قربت بھی۔

اور وہ سکون بھی جس کے لیے وہ دعائیں کرتا تھا۔

مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ کچھ کہانیاں مکمل ہونے سے پہلے بھی خاموشی سے بدلنا شروع ہو جاتی ہیں...

رحمان شیخ نے کچھ دنوں سے ایک بات محسوس کرنا شروع کر دی تھی کہ ارمان پہلے جیسا نہیں رہا۔ اس کی خوشی بڑھ تو گئی تھی، مگر اس میں ایک عجیب سی بے خبری بھی شامل ہو گئی تھی جیسے وہ ہر وقت کسی اور ہی دنیا میں جیتا ہو۔

رحمان شیخ خاموشی سے اس کے بدلتے رویے کو نوٹ کر رہے تھے۔ کبھی وہ بے وجہ مسکراتا، کبھی فون پر گھنٹوں لگا رہتا، اور کبھی بات کرتے کرتے بھی ذہن کہیں اور ہوتا تھا۔

اسی دوران ایمان نور بھی اس سب سے کسی حد تک واقف تھیں۔ انہیں مومنہ کا نام صرف ایک بار ارمان کے منہ سے سننے کو ملا تھا، مگر وہ نام ان کے ذہن میں کہیں نہ کہیں بیٹھ گیا تھا۔

ارمان نے خود بھی کبھی اس موضوع کو کھول کر نہیں بتایا تھا نہ تفصیل، نہ کہانی، نہ رشتہ۔

بس ایک نام تھا جو ایک بار درمیان میں آ گیا تھا... اور پھر خاموشی ہو گئی تھی۔

مگر نعمان، جو ارمان کا بھائی تھا، وہ سب باتوں سے زیادہ باخبر تھا۔ وہ ارمان کی باتوں کو بھی سمجھتا تھا اور خاموشیوں کو بھی۔

اس نے کبھی براہِ راست کچھ نہیں پوچھا، مگر وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ معاملہ صرف عام دوستی یا معمولی تعلق جیسا نہیں ہے۔

ایک طرف ارمان اپنی دنیا میں خوش دکھائی دیتا تھا، اور دوسری طرف اس کے آس پاس کچھ لوگ اس خوشی کے پیچھے چھپی حقیقت کو سمجھنے لگے تھے۔

رحمان شیخ نے ایک دن خاموشی سے سوچا:

"یہ خوشی... واقعی سکون ہے یا صرف وقتی فرار؟"

مگر اس نے یہ سوال اونچی آواز میں نہیں کیا۔

کیونکہ کبھی کبھی حقیقت کو بولنے سے زیادہ، دیکھنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

اسی دوران گھر کے ماحول میں ایک اور بات نے اچانک ہلچل پیدا کر دی۔

ساجد شیخ جو ارمان کے چچا تھے، کافی دنوں سے خاموش تھے، مگر اس دن انہوں نے سب کے سامنے وہ بات رکھ دی جس نے پورے گھر کا سکون ہلا دیا۔

انہوں نے صاف لہجے میں کہا کہ اب وہ الگ گھر لینا چاہتے ہیں، اور اس کے لیے یا تو یہ گھر بیچا جائے، یا پھر انہیں ان کا حصہ دیا جائے۔

یہ جملہ سنتے ہی کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔

پھر وہ خاموشی اچانک شور میں بدل گئی۔

سب لوگ حیران تھے، کچھ ناراض، اور کچھ کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ساجد شیخ یہ بات یوں سب کے سامنے رکھیں گے۔

ایمان نور کہنے لگیں۔

"یہ کیا بات کر رہے ہیں آپ؟" "اتنے سالوں بعد یہ فیصلہ؟" "گھر کو یوں توڑنے کی بات ہو رہی ہے"!

ارمان ایک کونے میں کھڑا سب سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت بھی تھی اور الجھن بھی کیونکہ یہ صرف جائیداد کا مسئلہ نہیں لگ رہا تھا، بلکہ کچھ اور ہی ٹوٹنے جا رہا تھا۔

ساجد شیخ نے سخت لہجے میں کہا:

"میں اپنا حق مانگ رہا ہوں، کوئی غلط بات نہیں کر رہا"

رحمان شیخ نے جواب دیا:

"حق مانگنے کا یہ وقت تھا؟ عید سے پہلے یہ سب؟"

بات مزید بڑھنے لگی۔

آوازیں اونچی ہوتی گئیں۔

اور گھر، جو ابھی کچھ دیر پہلے عید کی تیاریوں سے بھرا ہوا تھا، اب تقسیم کے ایک نئے خطرے کے سامنے کھڑا تھا۔

ارمان نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں۔

اور اس کے ذہن میں صرف ایک سوال گونجا

"کیا واقعی یہ گھر اب ایک ہی رہے گا... یا ٹوٹنے والا ہے؟"

اور اسی سوال کے ساتھ... ماحول مزید بگڑنے لگا۔

عید آ چکی تھی۔

مگر اس بار عید کی آمد نے سکندر کے اندر کوئی چراغ روشن نہیں کیا تھا۔ گھروں میں چاند رات کی رونقیں تھیں، بازاروں میں بھیڑ تھی، بچوں کے ہاتھوں پر مہندی تھی، کپڑوں پر استری ہو رہی تھی، باورچی خانے سے

سویوں کی خوشبو اٹھ رہی تھی... مگر سکندر کے اندر جیسے سب کچھ بجھا ہوا تھا۔

یہ پہلی عید تھی جو اس کے بابا یعقوب جٹ کے بغیر تھی۔

اور بعض جدائیاں وقت کے ساتھ کم نہیں ہوتیں...

وہ تہواروں پر اور نمایاں ہو جاتی ہیں۔

اسی لیے اس صبح جب گھر میں سب لوگ عید کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے، سکندر ایک کونے میں خاموش بیٹھا تھا۔ جیسے اس کا اس دن سے کوئی تعلق نہ ہو۔

نہ نئے کپڑے نکالنے کا شوق۔

نہ عطر لگانے کی خواہش۔

نہ عید گاہ جانے کی جلدی۔

بس ایک بے نام سا بوجھ۔

اسے لگ رہا تھا عید دوسروں کے لیے آئی ہے، اس کے لیے نہیں۔

داود اور دانش صبح سویرے ہی تیار ہو چکے تھے۔ ایک دوسرے کے کپڑوں پر تبصرے، جوتے پالش کرنا، عید کی نماز کے بعد کہاں جانا ہے ان دونوں میں وہی معمول کی چہل پہل تھی۔

مگر سکندر...

وہ جیسے اس منظر سے باہر کھڑا کوئی تماشائی تھا۔

کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اسے بار بار بھیر بابا یاد آ رہے تھے۔

وہی ہاتھ پکڑ کر عید گاہ لے جانا۔

راستے بھر نصیحتیں۔

نماز کے بعد سینے سے لگا لینا۔

اور پھر بچوں کی طرح عیدی دینا۔

آج وہ سب کچھ یاد بن چکا تھا۔

اور یادیں کبھی کبھی زندہ لوگوں سے زیادہ بھاری ہوتی ہیں۔

تبھی سلمٰی جٹ کمرے میں آئیں۔

انہوں نے سکندر کو یوں بیٹھا دیکھا تو کچھ دیر خاموش رہیں، جیسے اس کے اندر کے موسم کو پڑھ رہی ہوں۔

پھر دھیرے سے بولیں،

"سکندر... اٹھو، عید کی نماز کے لیے تیار ہو جاؤ"

اس نے ان کی طرف دیکھا، مگر چہرے پر کوئی حرکت نہ آئی۔

صرف آہستہ سے کہا،

"دل نہیں چاہ رہا"

یہ ایک جملہ تھا، مگر اس میں تھکن تھی، خالی پن تھا، شاید شکوہ بھی۔

سلمٰی جٹ اس کے قریب آ بیٹھیں۔

"دل نہ بھی چاہے تو کیا؟ ہر کام دل کے کہنے پر نہیں ہوتا"

سکندر نے نظریں جھکا لیں۔

کچھ دیر بعد بولا،

"اب نماز میں دل ہی نہیں لگتا"

یہ اعتراف شاید اس نے پہلی بار کسی سے کیا تھا۔

اور شاید خود سے بھی۔

وہ واقعی مذہب سے دور ہونے لگا تھا۔

یا یوں کہیے اسے دین دور ہوتا محسوس ہونے لگا تھا۔

کبھی نماز میں کھڑا ہوتا تو ذہن بھٹک جاتا۔

کبھی سجدہ لمبا ہو جاتا مگر دعا نہیں نکلتی۔

کبھی دل میں سوال آتا

اگر دعا سب بدل دیتی ہے...

تو کچھ لوگ واپس کیوں نہیں آتے؟

کچھ رشتے بچتے کیوں نہیں؟

کچھ درد ختم کیوں نہیں ہوتے؟

یہ سوال اس کے ایمان کو نہیں، اس کے سکون کو کھا رہے تھے۔

سلمیٰ نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"تم اللہ سے ناراض ہو؟"

سکندر ہلکا سا مسکرایا۔

وہ مسکراہٹ ہنسی نہیں، ٹوٹن تھی۔

"پتا نہیں... شاید خود سے ہوں"

کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔

پھر سلمٰی جٹ نے آہستہ سے کہا،

"کبھی کبھی بندہ اللہ سے دور نہیں ہوتا... صرف اپنے غم کو خدا سمجھ بیٹھتا ہے... اللہ اپنے خاص بندوں کو ہی امتحان میں ڈالتا ہے۔"

یہ جملہ سکندر کے اندر کہیں گہرا اتر گیا۔

وہ خاموش اٹھا۔

الماری کھولی۔

کپڑے نکالے۔

سفید کُرتا ہاتھ میں لیا۔

کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا۔

پھر بدلنے لگا۔

جیسے صرف عید کی نماز کے لیے نہیں...

بلکہ اپنے بکھرے ہوئے اندر سے دوبارہ ملنے کے لیے تیار ہو رہا ہو۔

مگر اسے کیا خبر تھی

یہ عید صرف سوگ کی عید نہیں...

یہ ایک ایسے واقعے کی تمہید تھی

جو اس کی زندگی کی سمت بدلنے والا تھا۔

عید کی نماز ادا ہو چکی تھی۔

صفیں ٹوٹ چکی تھیں۔

لوگ ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے، "عید مبارک" کی صدائیں فضا میں پھیلی ہوئی تھیں، بچے عیدی کے نوٹ ہاتھوں میں لیے بھاگ رہے تھے، کہیں قہقہے تھے، کہیں مصافحے، کہیں مٹھاس۔

مگر سکندر کے اندر کوئی تہوار نہ اترا۔

نماز اس نے ادا تو کر لی تھی، مگر دل کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔

جیسے جسم عید گاہ میں تھا...

اور روح کسی پرانی قبر کے پاس۔

نماز کے بعد سب لوگ گھروں کو لوٹنے لگے، مگر سکندر ایک اور راستے پر مڑ گیا۔

خاموش۔

اکیلا۔

بغیر کسی کو بتائے۔

اس کے قدم اسے خود بخود یعقوب جٹ کی قبر تک لے آئے۔

قبرستان میں عید کی رونق نہیں تھی۔

صرف خاموشی تھی۔

ہوا میں مٹی کی بو۔

خشک پتوں کی سرسراہٹ۔

اور قبروں کے درمیان وہ سکون جو کبھی کبھی دل کو اور بے چین کر دیتا ہے۔

سکندر آہستہ سے قبر کے پاس بیٹھ گیا۔

کافی دیر کچھ نہ بولا۔

صرف قبر کو دیکھتا رہا۔

پھر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

وہی ٹوٹی ہوئی۔

اور جیسے کسی زندہ شخص سے مخاطب ہو، آہستہ بولا:

"عید مبارک بابا"...

یہ کہتے ہی اس کی آواز بھرا گئی۔

کچھ لمحے خاموشی رہی۔

پھر وہ جیسے دل کھول کر باتیں کرنے لگا۔

"دیکھا... آج بھی نماز پڑھنے آ گیا میں"

ہلکا سا سر جھکایا۔

"ماما نے زبردستی بھیجا... ورنہ دل نہیں تھا"

وہ مٹی کو انگلی سے کریدنے لگا۔

جیسے برسوں کی باتیں اکٹھی نکل رہی ہوں۔

"آپ کے بعد عید... عید نہیں رہی بابا... سب ہنستے ہیں... تو میں بھی ہنس لیتا ہوں، مگر آپ ہوتے تو سمجھ جاتے"

ہوا کا جھونکا آیا۔

سکندر نے قبر کی مٹی پر ہاتھ رکھا۔

"بابا... ایک بات پوچھوں؟ جب بندہ سب کے لیے ٹھیک رہ سکتا ہے... تو اپنے لیے کیوں نہیں؟"

خاموشی۔

صرف خاموشی۔

مگر وہ جواب مانگ نہیں رہا تھا۔

وہ درد اتار رہا تھا۔

پھر آہستہ ہنسا۔

"آپ ہوتے تو کہتے... ڈرامے کم کیا کرو"

آنکھوں میں نمی آگئی۔

"بابا... میں تھک گیا ہوں"

یہ جملہ شاید پہلی بار اس نے کسی سے سچ میں کہا تھا۔

"لوگ سمجھتے ہیں میں ضدی ہوں... مگر اندر سے... میں بس تھک گیا ہوں"

کچھ دیر بعد اس نے نادیا کا ذکر چھیڑ دیا۔

"میں نے اسے چھوڑ کے ٹھیک کیا یا غلط... پتا نہیں مگر جھوٹا وعدہ کر کے کسی کی زندگی خراب نہیں کرنا چاہتا تھا وہ میرے سے بہتر انسان ڈیزرو کرتی ہے"

پھر بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔

جیسے جواب سن رہا ہو۔

جیسے قبر کے نیچے سے کوئی اسے سمجھا رہا ہو۔

پھر آہستہ بولا:

"اور بابا... ایک بات اور"

“میں دین سے دور ہو رہا ہوں شاید”

“یا شاید خود سے”…

“مگر اگر آپ ہوتے نا”…

وہ رک گیا۔

آواز بیٹھ گئی۔

“تو شاید میں اتنا نہیں ٹوٹتا”

اس نے قبر کی مٹی سیدھی کی۔

فاتحہ پڑھی۔

اور اٹھنے لگا۔

مگر جاتے جاتے پھر مڑ کر دیکھا۔

اور آہستہ کہا:

“عید مبارک بابا”…

“اگلے سال پھر آؤں گا… اگر خود کو سنبھال لیا تو”

اور اسے معلوم نہ تھا...

یہ قبر پر کہی گئی باتیں

جلد اس کی زندگی کا فیصلہ بننے والی تھیں۔

قبرستان سے واپس آتے ہوئے سکندر کے قدم آہستہ تھے، جیسے وہ ابھی تک آدھا وہیں رہ گیا ہو۔ دل کچھ ہلکا بھی تھا اور عجیب طرح بھاری بھی۔ یعقوب جٹ کی قبر پر کہی ہوئی باتیں اس کے اندر ابھی تک گونج رہی تھیں۔

جب وہ گھر پہنچا تو باہر دروازے کے قریب عید کی چہل پہل تھی۔ بچوں کی آوازیں، کچن سے سویوں کی خوشبو، عورتوں کی باتیں، برتنوں کی ہلکی کھنک...

زندگی اپنی رفتار سے چل رہی تھی۔

وہ ابھی جوتے اتار ہی رہا تھا کہ سامنے سے سلوٰی خالہ تیزی سے آئیں۔

انہوں نے سکندر کو دیکھا...

اور کچھ کہے بغیر اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

"عید مبارک، پتر"...

ان کی آواز میں ماں جیسی نمی تھی۔

سکندر چند لمحے ویسے ہی کھڑا رہا، جیسے اس اچانک ملنے والی شفقت نے اسے بے خبر پکڑ لیا ہو۔

پھر آہستہ بولا،

"خیر مبارک خالہ"...

سلوٰی خالہ نے ذرا پیچھے ہٹ کر اسے دیکھا، جیسے اب بھی بچپن والا سکندر ہی ان کے سامنے کھڑا ہو۔

پھر ہنستے ہوئے اپنی مٹھی کھولی۔

اس میں کچھ نوٹ دبے ہوئے تھے۔

انہوں نے وہ سکندر کے ہاتھ پر رکھنے چاہے۔

"لو، عیدی"

سکندر چونک کر ہنسا۔

"خالہ، رہنے دیں... اب میں بچہ تھوڑی ہوں"

انہوں نے فوراً آنکھیں نکالیں۔

"میرے لیے تو بچہ ہی ہے"

سکندر نے ہاتھ پیچھے کیا۔

"نہیں واقعی، نہیں چاہیے"

سلوٰی خالہ ویسی ہی ضدی تھیں۔

انہوں نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

"ہاتھ آگے کرو"

"خالہ"...

"سکندر"!

وہ ویسا ہی ڈانٹنے والا لہجہ تھا جس میں محبت چھپی ہوتی ہے۔

مجبوراً اس نے ہاتھ بڑھایا۔

اور انہوں نے زبردستی وہ پیسے اس کی مٹھی میں دبا دیے۔

"یہ عیدی ہے، انکار نہیں ہوتا"

سکندر بے اختیار مسکرا دیا۔

"آپ بھی نا"...

"ہاں، میں بھی نا... اب رکھو"

اس نے چاہا واپس کر دے، مگر جانتا تھا فائدہ نہیں۔

آخر ہار مان کر پیسے رکھ لیے۔

اور ہلکے سے کہا،

"شکریہ خالہ"

سلوٰی خالہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"شکریہ نہیں کہتے... دعا دیتے ہیں"

اس ایک لمحے میں، عید پہلی بار کچھ عید جیسی لگی۔

سکندر کو عجیب سا احساس ہوا

بعض دفعہ انسان بڑے دکھوں سے نہیں...

ایسی چھوٹی محبتوں سے سنبھلتا ہے۔

قبرستان کی اداسی سے لے کر اس زبردستی تھمائی گئی عیدی تک...

زندگی شاید اسی کا نام تھی۔

درد بھی۔

اور اس کے بیچ اچانک مل جانے والی محبت بھی۔

سلوٰی خالہ کی زبردستی تھمائی ہوئی عیدی ابھی سکندر کی مٹھی میں دبی ہوئی تھی، اور وہ خود بھی شاید اس چھوٹے سے لمحے کی حرارت محسوس کر رہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ اندر آیا۔

گھر کے اندر عید کی رونق زیادہ تھی۔

ڈرائنگ روم میں رشتے دار بیٹھے تھے، کہیں قہقہے، کہیں بچوں کا شور، کہیں سویوں کے پیالے گردش میں۔

مگر ان سب کے درمیان اس کی نظر سیدھی اپنی ماں پر جا کر رکی۔

سلمٰی جٹ مصروف تھیں، مگر جیسے ہی سکندر کو دیکھا، چہرے پر ایک الگ ہی نرمی آگئی۔

سکندر آگے بڑھا۔

جھک کر عید ملی۔

سلمیٰ جٹ نے اسے سینے سے لگالیا۔

"عید مبارک میرے لعل"...

یہ دو لفظ سن کر اس کے اندر کچھ پگھلا۔

وہ بچپن کی طرح چند لمحے ویسے ہی لگا رہا۔

پھر آہستہ بولا:

"خیر مبارک ماما"

سلمیٰ جٹ نے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر دیکھا۔

"آج بڑے چپ چپ لگ رہے ہو"

سکندر ہلکا سا مسکرایا۔

"بس ایسے ہی"

ماں سب سمجھتی تھیں، مگر ہر بات پوچھتی نہیں تھیں۔

انہوں نے صرف ماتھے کو چھوا اور کہا،

"اللہ خوش رکھے"

سکندر نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

"دانش اور داود کہاں ہیں؟"

سلمیٰ جٹ نے برتن رکھتے ہوئے جواب دیا،

"وہ دونوں باہر نکل گئے ہیں"

"کہاں؟"

"دوستوں سے ملنے شاید... عید ہے نا"

سکندر ایک لمحہ خاموش رہا۔

اسے عجیب سا لگا۔

گھر میں آیا تو دل چاہ رہا تھا وہ دونوں مل جائیں، تھوڑا شور ہو، کچھ رونق لگے۔

مگر وہ باہر جا چکے تھے۔

اس نے ہلکی سانس لی۔

"اچھا"...

پھر کمرے کے دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

باہر شور تھا۔

اندر سکون۔

اور وہ دونوں کے بیچ کہیں۔

اسے اچانک احساس ہوا کہ عید کے دن بھی بعض لوگ ہجوم میں تنہا رہ جاتے ہیں۔

سلمیٰ جٹ نے پیچھے سے آواز دی:

"کھانا کھاؤ گے یا پھر ایسے ہی سوچتے رہو گے؟"

سکندر ہنسا۔

شاید دن میں پہلی بار سچ مچ۔

"پہلے دانش اور داود آجائیں"...

پھر جیسے خود سے بولا،

"عید ان دونوں کے بغیر ادھوری لگتی ہے"

ماما نے اس کے چہرے کو دیکھ کر جیسے جان لیا تھا کہ وہ پھر کہیں اپنے خیالوں میں کھو رہا ہے۔ انہوں نے ہلکی سی شفقت بھرے لہجے میں کہا،

"شیر خورمہ بنا ہے... تھوڑا سا کھالو"

پھر مسکرا کر اضافہ کیا،

"اور سب مہمان اندر بیٹھے ہیں، ان سے بھی مل لینا"

سکندر نے ہلکا سا سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے"

صرف دو لفظ۔

مگر لہجے میں وہی تھکن، وہی نرمی۔

ماں کچن کی طرف چلی گئیں اور سکندر چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔

پھر آہستہ قدموں سے اندر آیا۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ دھکیلا تو ایک الگ ہی منظر سامنے تھا۔

کمرہ مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔

رنگ برنگے کپڑے۔

عید کی خوشبو۔

چائے کے کپ۔

شیر خورمے کے پیالے۔

اور باتوں کا مسلسل شور۔

کسی نے ہنستے ہوئے کہا،

"اوئے سکندر آ گیا"

کسی نے آواز دی،

"عید مبارک بھئی"

وہ ایک ایک سے ملنے لگا۔

مصافحے۔

گلے ملنا۔

روایتی دعائیں۔

"جیتے رہو"

"خوش رہو"

"اللہ نصیب اچھے کرے"

ہر دعا سن کر وہ بس مسکرا دیتا۔

اسے عجیب لگتا تھا کہ لوگ دعائیں کتنی آسانی سے دے دیتے ہیں... مگر مشکل وقت میں مدد نہیں کرتے۔

اور دعائیں پوری ہونے میں پوری زندگیاں لگ جاتی ہیں۔

وہ ایک طرف بیٹھ گیا۔

سامنے میز پر شیر خورمہ رکھا تھا۔

سلمٰی جٹ نے دور سے اشارہ کیا،

"کھاؤ بھی"

اس نے چمچ اٹھایا۔

ایک نوالہ لیا۔

میٹھاس منہ میں گھلی تو یکایک بچپن کی کئی عیدیں یاد آ گئیں۔

بابا۔

عیدی۔

صبح کی نماز۔

اور گھر کی یہی رونق۔

ایک لمحے کو دل بھاری ہوا۔

مگر اس نے چہرے پر کچھ نہ آنے دیا۔

ایک بزرگ مہمان نے ہنستے ہوئے پوچھا،

"اور میاں، شادی کب کر رہے ہو؟"

کمرے میں قہقہہ پڑا۔

سکندر بھی ہلکا سا ہنس دیا۔

"جب آپ کی بیٹی مانے"

محفل پھر ہنسی میں ڈوب گئی۔

چاہے جیسا بھی ہو تھا تو وہ سکندر، حاضر جوابی میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا

مگر اسی شور کے بیچ اسے یوں لگا جیسے وہ سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی کہیں الگ بیٹھا ہے۔

وہ شیر خورمہ کھاتا رہا۔

لوگوں کی باتیں سنتا رہا۔

اور عید کی یہ عام سی دوپہر، خاموشی سے کسی غیر معمولی موڑ کی طرف بڑھتی رہی۔

مہمانوں کے درمیان کچھ دیر بیٹھنے کے بعد سکندر آہستہ سے اٹھا اور باہر آنگن میں آکر کھڑا ہو گیا۔

اندر اب بھی ہنسی کی آوازیں آرہی تھیں۔

برتنوں کی کھنک۔

بچوں کا شور۔

کسی کے قہقہے۔

عید اپنے پورے رنگ میں زندہ تھی۔

مگر وہ پھر بھی باہر آگیا۔

شاید شور سے نہیں...

اپنے اندر کے شور سے بچنے۔

دروازے کے پاس کھڑے ہو کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

انگلیاں عادتاً سگریٹ کے پیکٹ تک گئیں۔

اس نے پیکٹ نکالا...

کچھ دیر ہاتھ میں گھماتا رہا۔

پھر ہلکا سا مسکرایا۔

ایک وقت تھا جب یہی سگریٹ اس کے دن رات کا حصہ بن گئی تھی۔

بے چینی ہو

سگریٹ۔

اداسی ہو

سگریٹ۔

سوچ زیادہ ہو

سگریٹ۔

خوشی ہو

سگریٹ۔

جیسے دھواں درد کو تھوڑی دیر ڈھانپ دیتا ہو۔

مگر اب اس نے بہت کم کر دی تھی۔

پیتا تو تھا...

مگر پہلے جیسا نہیں۔

شاید عمر نے سکھایا تھا، یا تھکن نے۔

اس نے ایک سگریٹ نکالی۔

لبوں تک لایا۔

پھر کچھ سوچ کر واپس رکھ دی۔

"چھوڑو"...

آہستہ سے خود سے بولا۔

ہوا میں عید کی شام کی نرمی تھی۔

اس نے دیوار سے ٹیک لگا لی۔

دور گلی میں بچے نئے کپڑوں میں دوڑ رہے تھے۔

کوئی نقلی گولیوں والی پستول چلا رہا تھا۔

کوئی عیدی گن رہا تھا۔

اور سکندر خاموش کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔

اسے محسوس ہوا جیسے زندگی ہمیشہ شور میں نہیں چلتی...

کبھی کبھی ایسے خاموش لمحوں میں بھی پوری عمر گزر جاتی ہے۔

اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔

ہلکی سانس لی۔

اور دل میں نجانے کیا سوچا۔

شاید یعقوب جٹ۔

شاید نادیا۔

شاید خود کو۔

شاید کچھ بھی نہیں۔

بس ایک خالی سا وقفہ۔

جس میں آدمی صرف موجود ہوتا ہے۔

باہر کھڑا اسکندر ابھی اپنے خیالوں میں ہی گم تھا کہ پیچھے سے آہستہ قدموں کی آہٹ آئی۔

اس نے مڑ کر دیکھا تو سلوٰی خالہ تھیں۔

ہاتھ میں دوپٹہ سمیٹے، چہرے پر وہی اپنائیت، مگر آنکھوں میں آج کچھ پوچھنے والا رنگ۔

وہ اس کے قریب آکر کھڑی ہوئیں اور بغیر تمہید کے بولیں،

"وہ رمشا کا کیا بنا؟ کیسی ہے وہ؟"

سکندر جیسے چونک گیا۔

اسے واقعی توقع نہیں تھی کہ خالہ یہ سوال پوچھیں گی۔

چند لمحے وہ بس ان کو دیکھتا رہا، پھر آہستہ بولا،

"ٹھیک ہے وہ... خالہ جی"

سلویٰ خالہ نے ذرا غور سے اسے دیکھا، پھر پوچھا،

"سلمیٰ کو پتا ہے اس لڑکی کا؟"

سکندر نے سر ہلایا۔

"نہیں... ابھی نہیں بتایا انہیں"

خالہ نے جیسے اچانک کچھ یاد کرتے ہوئے کہا،

"اوہ ہاں... یاد آیا، تمہیں تو شاید کوئی اور پسند تھی نا"...

یہ سن کر سکندر خاموش ہو گیا۔

اس خاموشی میں جواب بھی تھا اور انکار بھی۔

خالہ نے اس کی طرف ذرا جھک کر پوچھا،

"اس کا کیا بنا... وہ طلاق والی"...

سکندر کی پلکیں ہلکی سی جھپکیں۔

اس نے نظریں ہٹالیں۔

"اس کی شادی ہو گئی... رمضان کے دوسرے عشرے کے اندر"

خالہ کے چہرے پر فوراً افسوس آیا۔

"اوہ بیٹا... معذرت، مجھے پتا نہیں تھا"

سکندر نے ہلکا سا سر جھکایا۔

"کوئی بات نہیں خالہ جی... میں نے ہی اسے منع کیا تھا"

خالہ نے جیسے بات سمجھنے کی کوشش کی۔

"لیکن کیوں بیٹا؟"

یہ سوال سنتے ہی سکندر نے ایک عجیب تھکی ہوئی مسکراہٹ دی۔

پھر بہت دھیرے کہا،

"شاید... میں یہ سب پیار deserve نہیں کرتا"

جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا

چھپّاااک!

سلوٰی خالہ کا زوردار تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔

سکندر خود بھی ساکت رہ گیا۔

خالہ کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

وہ غصے سے بولیں،

"ایسے نہیں کہتے"!

سکندر حیرت سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔

خالہ نے انگلی اٹھا کر کہا،

"پیار deserve نہیں کرتا؟ کون سکھا گیا تمہیں یہ بکواس؟"

ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

"انسان محبت مانگ کر نہیں لیتا... نصیب میں آتی ہے"

سکندر خاموش۔

بالکل خاموش۔

جیسے اس ایک تھپڑ نے اندر کوئی بند دروازہ کھٹکھٹا دیا ہو۔

خالہ پھر بولیں،

"یہ مت کہنا دوبارہ کہ تم محبت کے قابل نہیں،

سمجھے؟"

سکندر نے پہلی بار بچے کی طرح نظریں جھکا لیں۔

خالہ نے اس کے گال کو چھوا جہاں تھپڑ لگا تھا۔

اب لہجہ نرم تھا۔

"تمہیں چوٹیں لگی ہیں... اس کا مطلب یہ نہیں تم محبت کے لائق نہیں"

پھر دھیرے سے بولیں،

"تم بس ڈرے ہوئے ہو"

یہ جملہ سکندر کے اندر اتر گیا۔

وہ کچھ نہ بول سکا۔

صرف اتنا کہا،

...“خالہ جی”

اور آواز بیٹھ گئی۔

سلویٰ خالہ نے اسے سینے سے لگا لیا۔

“پاگل لڑکے”

عید کے شور سے دور، آنگن کے اس کونے میں، ایک تھپڑ نے شاید وہ کہہ دیا تھا...

جو نصیحتیں کبھی نہیں کہہ پاتیں۔

سلویٰ خالہ نے اسے سینے سے لگائے کچھ دیر خاموش رکھا، جیسے صرف الفاظ نہیں، اپنا تجربہ بھی اس کے اندر اتار دینا چاہتی ہوں۔ پھر ذرا پیچھے ہٹیں، اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولیں:

“سنو بیٹا سکندر... ایک بات یاد رکھنا”

وہ رکی، پھر دھیرے مگر وزن سے کہا:

“محبت انعام ہوتی ہے، امتحان نہیں...

جو اسے سزا سمجھنے لگے، وہ خود کو کھو دیتا ہے۔”

سکندر خاموش سنتا رہا۔

خالہ نے پھر کہا،

"اور ایک بات بزرگ کہا کرتے تھے

جو شخص یہ سمجھ لے کہ وہ محبت کے قابل نہیں،

اصل میں وہ سب سے زیادہ محبت کا محتاج ہوتا ہے۔"

یہ جملے سیدھے اس کے اندر اترتے گئے۔

سلوٰی خالہ نے اس کے چہرے کو دیکھا، پھر نرم مسکراہٹ کے ساتھ بولیں:

"بیٹا، رشتے ڈر سے نہیں نبھاتے... حوصلے سے نبھاتے ہیں جو تمہارے قریب آتا ہے وہ تمہاری وجہ سے نہیں ٹوٹتا...

لوگ اپنی آزمائشوں سے ٹوٹتے ہیں"

پھر ایک لمحہ رک کر گویا کوئی پرانا راز سنا رہی ہوں:

"اور سنو... جو مرد ہر وقت خود کو بوجھ سمجھنے لگے،

وہ ایک دن دوسروں کی پناہ بننے کی صلاحیت بھی بھول جاتا ہے۔"

سکندر نے پہلی بار نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"اگر میں واقعی لوگوں کو تکلیف دیتا ہوں تو؟"

خالہ نے فوراً کہا،

"تو پھر تمہیں اور نرم ہونا چاہیے، دور نہیں"

پھر ہلکے طنز سے بولیں،

"ہر دکھ کے بعد فقیر نہیں بنتے، کچھ لوگ رومانٹک شوہر بھی ایسے ہی بنتے ہیں نرم ہو کر"

سکندر ہنس دیا۔

شاید آج دل سے۔

خالہ نے موقع دیکھ کر آخری نصیحت دی:

"سن لو میری بات

محبت سے بھاگنے والا اکثر عمر بھر اسی کو ڈھونڈتا رہتا ہے۔

اور

جو خود کو نااہل سمجھ کر پیچھے ہٹ جائے،

وہ کبھی نہیں جان پاتا کہ شاید کوئی اس پر جان دیتا تھا۔"

پھر انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"جس دن دل کسی کے لیے سچا ہو... ڈر کر پیچھے مت ہٹنا اور جس دن پھر محبت کرو"...

وہ ہنسیں۔

"مجھے سب سے پہلے بتانا"

سکندر نے مسکرا کر کہا،

"خالہ جی... آپ عجیب ہیں"

انہوں نے جواب دیا،

"اور تم ضدی ہو"

پھر ایک آخری جملہ کہا، جو سکندر شاید برسوں نہ بھولتا:

"بیٹا، محبت مانگی نہیں پڑتی...

مگر جب بغیر مانگے مل جائے، اسے اپنی نااہلی کے ہاتھوں ضائع نہیں کرتے۔"

اس لمحے ان دونوں کے درمیان صرف خالہ اور بھانجے کا رشتہ نہیں رہا تھا...

ایک دوستی، ایک اعتماد، ایک پناہ سی بن گئی تھی۔

سکندر نے خالہ کی باتیں خاموشی سے سنیں، مگر اس کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ آگئی۔ جیسے وہ مان بھی رہا ہو... اور نہیں بھی۔

اس نے آہستہ سے کہا،

"لیکن اب کیا فائدہ خالہ جی"...

وہ رکا۔

پھر بہت دھیمے لہجے میں بولا،

"نادیا تو جا چکی ہے... اس کی شادی ہو گئی"

سلویٰ خالہ نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔

"تو کیا ہوا؟"

سکندر نے چونک کر دیکھا۔

خالہ نے انگلی اٹھا کر کہا،

"رمشا تو ہے نا"

رمشا کا نام سن کر سکندر جیسے کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر خاموش رہ گیا۔

خالہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا،

"اور سنو... میرا مقصد تمہیں guilt دینا نہیں تھا، میں صرف یہ کہہ رہی ہوں"...

وہ قریب آکر بولیں،

"ایک دفعہ کھڑے تو ہوتے، لڑتے تو سہی، ڈر کے ایک طرف ہو گئے... کچھ نہیں کیا تم نے"

یہ الفاظ نرم بھی تھے اور چبھتے بھی۔

سکندر نے آہستہ سے کہا،

"میں لڑتا تو کس سے؟"

خالہ فوراً بولیں،

"اپنے ڈر سے"

یہ جواب سن کر وہ خاموش ہو گیا۔

خالہ نے کہا،

"بیٹا، محبت میں ہار جانا اتنا برا نہیں ہوتا... جتنی بزدلی سے پیچھے ہٹ جانا برا ہوتا ہے"

پھر وہ ذرا جذباتی ہوئیں۔

"تم نے نادیا کو انکار کیا، ٹھیک... مگر کبھی دل کے ساتھ کھڑے ہو کر دیکھا بھی نہیں صرف ڈرتے رہے"

سکندر نے آہستہ کہا،

"مجھے لگا میں کسی کے لائق نہیں"...

خالہ نے فوراً پھر ڈانٹ دیا:

"یہ پھر وہی بات"!

پھر نرم پڑ گئیں۔

"سن لو ایک بات... مرد وہ نہیں جو صرف محبت کرے،

مرد وہ ہے جو محبت کے لیے کھڑا بھی ہو۔'

سکندر کے چہرے پر خاموشی تھی۔

خالہ بولتی گئیں،

"نادیا گئی، قسمت تھی

مگر سبق ابھی باقی ہے

اور اگر رمشا تمہیں چاہتی ہے"...

انہوں نے ذرا شرارتی مسکراہٹ سے کہا،

"تو اس بار ڈر کر بھاگنا مت"

سکندر نے تلخی سے ہنس کر کہا،

"آپ کو لگتا ہے وہ اب بھی"...

خالہ نے بات کاٹ دی،

"عورت جب دل سے چاہ لے نا... تو دیر سے ہار مانتی ہے"

پھر وہ ذرا سنجیدہ ہوئیں۔

"اور سنو جو پہلی جنگ ہار جائے

اسے اگلی جنگ لڑنے سے منع نہیں کیا جاتا۔

نادیا کے ساتھ تم کھڑے نہ ہو سکے...

کم از کم آئندہ اگر دل کہیں جائے...

تو ڈر کو فیصلہ مت کرنے دینا"

سکندر کافی دیر خاموش رہا۔

پھر آہستہ بولا،

"شاید میں واقعی ڈر گیا تھا"

خالہ نے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"شاید نہیں... تم ڈرے ہوئے تھے

مگر ڈرا ہوا آدمی بھی بدل سکتا ہے"

پھر مسکرا کر بولیں،

"اور ویسے بھی...

ابھی عید ہے، باقی کا فلسفہ بعد میں کریں گے"

سکندر ہنس پڑا۔

اس بار سچی ہنسی۔

اور شاید پہلی بار اسے محسوس ہوا

خالہ صرف بزرگ نہیں...

اس کی طرف تھیں۔

وہ خالہ سے بات کر کے اندر آیا تو گھر کی وہی عید والی مصروف فضا پھر سے اس کے گرد آ گئی تھی ہنسی، باتیں، چائے کے کپ، اور مہمانوں کی آوازیں۔

سکندر آہستہ سے ایک کونے میں آ کر بیٹھ گیا، جیسے شور سے نہیں بلکہ اپنے ہی خیالات سے بچنا چاہتا ہو۔ اس نے جیب سے فون نکالا، اور معمول کے مطابق اسکرین کھولی۔

لیکن جیسے ہی رمشا کے میسجز سامنے آئے، اس کے ہاتھ رک گئے۔

اسکرین پر ایک کے بعد ایک تصویر آ رہی تھی رمشا تیار ہو کر، عید کے کپڑوں میں، کچھ سیلفیز، کچھ ایسے زاویے جن میں وہ زیادہ پر اعتماد، زیادہ بے فکر لگ رہی تھی۔

اور پھر چند ویڈیوز۔

وہ ویڈیوز عام نہیں تھیں۔

ان میں اس کا انداز، اس کی بے تکلفی، اور وہ ہلکی سی شرارت تھی جو صرف کسی خاص شخص کے لیے رکھی جاتی ہے۔

سکندر نے فون ذرا نیچے کیا، پھر دوبارہ دیکھا۔

اس کا چہرہ آہستہ آہستہ سرخ ہونے لگا۔

نہ غصے سے...

نہ خوشی سے...

بلکہ ایک ایسی الجھن سے جس کا نام اسے خود بھی نہیں آ رہا تھا "شرم"۔

وہ بار بار ارد گرد دیکھ رہا تھا، جیسے ڈر ہو کہ کوئی دیکھ نہ لے۔

فون کو اس نے تھوڑا سا کپڑوں کے اندر چھپا لیا اور دوبارہ ویڈیوز دیکھنے لگا۔

ہر کلپ کے ساتھ اس کی خاموشی گہری ہوتی جا رہی تھی۔

رمشا کی بے فکری، اس کی شوخی، اور وہ انداز جس میں وہ جیسے کسی چیز کی پرواہ نہیں کر رہی تھی...

یہ سب سکندر کے لیے نیا بھی تھا اور بھاری بھی۔

وہ خود سے آہستہ سے بولا،

"یہ... کیا ہے اب؟"

اس نے فون بند نہیں کیا، مگر سکرین پر انگلی بھی نہیں چلائی۔

بس خاموش بیٹھا رہا۔

اس کے اندر ایک عجیب سی کشمکش چل رہی تھی

ایک طرف وہ پرانی سوچ تھی کہ وہ کسی کے قابل نہیں...

اور دوسری طرف یہ سب تھا، جو شاید اسے کہہ رہا تھا کہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔

مگر وہ ابھی بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا

یہ توجہ تھی...

یا کچھ اور...

سکندر ابھی اسی الجھن میں بیٹھا فون دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک اسکرین روشن ہوئی۔

رنگ ٹون بجی۔

رمشا کی کال...

ایک بار۔

پھر دوسری بار۔

اور پھر مسلسل۔

فون ہاتھ میں ہی تھا مگر سکندر نے جیسے سانس روک لی ہو۔ اس کی انگلیاں سکرین کے اوپر منجمد ہو گئیں۔ نہ وہ کال اٹھا رہا تھا، نہ کاٹ رہا تھا۔

بس فون کو گھور رہا تھا۔

جیسے اس چھوٹے سے بکسے میں کوئی ایسا جواب چھپا ہو جو اس کی الجھن ختم کر دے۔

اس کے ذہن میں ایک ساتھ کئی باتیں چل رہی تھیں۔

تصاویر...

ویڈیوز...

خالہ کی باتیں...

اور وہ اپنا ہی جملہ: "میں یہ سب deserve نہیں کرتا"

فون پھر بجا۔

اس بار اس کے ہاتھ ہلکے سے کانپے۔

اس نے ایک لمحے کے لیے کال ریجیکٹ کرنے کا سوچا، پھر رک گیا۔

دل میں ایک عجیب سا دباؤ تھا نہ ہاں کہہ پا رہا تھا، نہ نہ۔

بس خاموشی تھی۔

تیسری بار کال آئی تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

پھر آہستہ سے فون کان سے لگا لیا۔

لیکن بولا کچھ نہیں۔

دوسری طرف سے بھی کچھ لمحے خاموشی رہی۔

پھر رمشا کی ہلکی سی آواز آئی

"سکندر... آپ ویڈیوز دیکھ رہے ہو نا؟"

وہ پھر بھی خاموش رہا۔

اس کے چہرے پر الجھن واضح تھی، جیسے وہ خود سے پوچھ رہا ہو کہ اسے یہاں ہونا ہی کیوں چاہیے تھا۔

رمشا نے دوبارہ کہا،

"جو بھی بھیجا ہے... بس ایسے ہی نہیں بھیجا"

سکندر نے نگاہ نیچے کر لی۔

اس کے پاس جواب نہیں تھا۔

نہ کوئی جملہ۔

نہ کوئی فیصلہ۔

بس ایک فون تھا جو اس کے ہاتھ میں تھا...

اور ایک آواز تھی جو اس کے اندر کچھ ہلا رہی تھی۔

سکندر نے ابھی فون کان سے ہٹایا ہی نہیں تھا کہ دوسری طرف سے رمشا کی آواز آئی۔

اس کی آواز معمول سے زیادہ نرم تھی، مگر اس میں وہی شرارت بھی چھپی ہوئی تھی جو وہ پہلے بھی ویڈیوز میں دکھا چکی تھی۔

وہ ہلکے سے ہنسی، پھر بولی:

"عید مبارک... میرے جان کے ٹوٹے"

یہ جملہ سن کر سکندر ایک لمحے کے لیے بالکل خاموش ہو گیا۔

اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے نہ وہ غصہ تھا، نہ خوشی، بس ایک عجیب سی بے یقینی۔

اس نے نظریں نیچے کر لیں۔

فون اب بھی اس کے کان سے لگا ہوا تھا، مگر وہ کچھ بول نہیں رہا تھا۔

رمشا نے فوراً پوچھا،

"کیا ہوا؟ جواب کیوں نہیں دے رہے؟"

سکندر نے آہستہ سانس لی، جیسے خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہو۔

پھر بہت دھیرے سے بولا،

"یہ سب... تم کیوں کر رہی ہو؟"

دوسری طرف ایک لمحہ خاموشی رہی۔

پھر رمشا نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا،

"کیا مطلب کیوں؟ عید ہے... اور آپ میرے ہوش اڑا دیتے ہو"

سکندر نے آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے ذہن میں وہی الجھن پھر سے آ گئی تصاویر، ویڈیوز، خالہ کی باتیں، اور اپنا ہی وہ خیال کہ وہ کسی کے قابل نہیں۔

مگر اس بار کچھ مختلف تھا۔

اس نے آہستہ سے پوچھا،

"تمہیں سمجھ ہے تم کیا کر رہی ہو؟"

رمشا نے فوراً جواب دیا،

"ہاں... اور آپ کو نہیں سمجھ آ رہی"

یہ جملہ اس کے اندر جیسے رک سا گیا۔

سکندر خاموش ہو گیا۔

فون کے دوسری طرف رمشا کی سانسوں کی آواز ہلکی ہلکی آ رہی تھی، اور یہاں سکندر صرف ایک چیز محسوس کر رہا تھا

کہ وہ اس بار بھی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا...

اور شاید یہی اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔

فون ابھی بھی سکندر کے ہاتھ میں تھا۔ دوسری طرف رمشا کی آواز نرم تھی، مگر اس کے الفاظ میں ایک ضد بھی چھپی ہوئی تھی۔

وہ آہستہ سے بولی،

"میری جان... آپ کو پتا ہے نا مجھے آپ کتنے پسند ہو"...

یہ جملہ سکندر کے دل پر سیدھا لگا، مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

رمشا نے تھوڑا سا رک کر پھر کہا،

"اب آپ بھی کچھ send کریں... میں اکیلی کیوں سب کچھ کر رہی ہوں؟"

سکندر نے فون کو گھورا۔

اس کے ہاتھ میں فون تھا مگر دماغ میں شور تھا۔

تصاویر... ویڈیوز... خالہ کی نصیحت... اور اپنا ہی وہ ڈر کہ وہ کسی کے قابل نہیں۔

وہ خاموش رہا۔

دوسری طرف رمشا نے دوبارہ نرمی سے کہا،

"سکندر... آپ سن رہے ہو نا؟"

اس نے ہلکی سی سانس لی، جیسے خود کو جواب دینے پر مجبور کر رہا ہو۔

پھر بہت دھیرے سے بولا،

"رمشا... ابھی نہیں"

خاموشی چھا گئی۔

یہ وہ خاموشی تھی جس میں لفظ ختم نہیں ہوتے... بلکہ وزن بڑھ جاتا ہے۔

رمشا نے فوراً پوچھا،

"کیوں نہیں؟ کیا میں غلط ہوں؟"

سکندر نے نظریں جھکا لیں۔

"تم غلط نہیں ہو"...

وہ رکا۔

"میں ابھی خود ٹھیک نہیں ہوں"

دوسری طرف کچھ لمحے خاموشی رہی۔

پھر رمشا کی آواز آئی، اب پہلے سے نرم،

"تو ٹھیک ہو جاؤ... میں ہوں نا"

سکندر نے فون آہستہ سے نیچے کر دیا۔

اس کے چہرے پر وہی الجھن تھی... مگر اب اس میں ایک نیا سوال بھی تھا

کہ کیا واقعی کوئی اس کے قریب رہ سکتا ہے...

یا وہ خود ہی سب کو دور کر دیتا ہے؟

سکندر نے فون ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا، مگر اس بار وہ خاموش نہیں تھا... بس الفاظ اپنے اندر جمع کر رہا تھا۔

دوسری طرف رمشا کی سانسیں ہلکی سی بے صبری میں ڈھل رہی تھیں، جیسے وہ جواب کا انتظار نہیں، فیصلہ سننا چاہتی ہو۔

سکندر نے ایک گہری سانس لی۔

اس کے چہرے پر وہی الجھن تھی، مگر اس بار اس کے ساتھ ایک عجیب سا سکون بھی آ گیا تھا جیسے وہ بھاگنے کے بجائے کھڑا ہونے والا ہو۔

اس نے آہستہ سے کہا:

"رمشا... ایک بات سنو"

دوسری طرف فوراً آواز آئی:

"ہاں... بولو"

سکندر چند لمحے خاموش رہا، پھر پہلی بار لفظوں کو سیدھا دل سے نکالا:

"مجھے نہیں پتا میں یہ ٹھیک کر رہا ہوں یا غلط"...

وہ رکا۔

پھر بہت دھیرے سے بولا:

"مگر اتنا پتا ہے کہ تم جب بھی سامنے آتی ہو... میں خود کو چھپانا بند کر دیتا ہوں"

رمشا خاموش ہو گئی۔

سکندر نے مزید کہا،

"میں نے خود کو ہمیشہ یہی کہا کہ میں کسی کے قابل نہیں"...

اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

"مگر تم نے وہ بات غلط ثابت کر دی"

دوسری طرف کوئی جواب نہیں آیا۔

صرف خاموشی۔

سکندر نے آخری بار سانس لی،

"رمشا... شاید مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے"

یہ جملہ بول کر اس نے آنکھیں بند کر لیں، جیسے اب سب کچھ ختم ہونے والا ہو۔

دوسری طرف مکمل سناٹا تھا۔

نہ خوشی۔

نہ انکار۔

نہ ہاں۔

بس ایک خاموشی...

اور پھر اچانک

کال cut ہو گئی۔

سکندر نے فون اسکرین کو گھورا۔

"Call Ended"

—

عید گزرے سات دن بیت چکے تھے، مگر سکندر کے اندر جیسے وقت ٹھہر گیا تھا۔ یونیورسٹی کے دروازے، جن کے راستے کبھی اسے امید کی طرف لے جاتے تھے، اب اسے اجنبی لگنے لگے تھے۔ وہ ان سات دنوں میں ایک بار بھی یونیورسٹی نہ گیا۔ جیسے اس کے قدموں نے خود سے بغاوت کر دی ہو۔ کمرے کی دیواریں، خاموش راتیں، اور تنہائی... سب اس کے اندر کے شور کو اور بڑھا دیتے تھے۔

رِمشا کی طرف سے اب تک کوئی جواب نہ آیا تھا۔

یہ خاموشی سکندر کے لیے لفظوں سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ وہ بار بار اپنے فیصلے کو ٹٹولتا... کیا واقعی اس نے رِمشا کو "ہاں" کہی تھی؟ یا یہ ہاں محض ایک زخم پر عارضی مرہم تھی؟ کہیں وہ رِمشا کو صرف اپنی ٹوٹی ہوئی کیفیت سے بچنے کے لیے استعمال تو نہیں کر رہا تھا؟ یہ سوال اس کے ذہن میں سانپ کی طرح بل کھاتے رہتے۔

نادیہ کی شادی کا غم ابھی پرانا کہاں ہوا تھا۔

وہ زخم ابھی تازہ تھا، جیسے کسی نے دل میں کیل ٹھونکی ہو اور ہر یاد اس کیل کو اور گہرا کر دیتی ہو۔ نادیہ کا نام آتے ہی اس کے اندر ایک سنّاٹا بھر جاتا۔ وہ سوچتا محبت کیا واقعی انسان کو جوڑتی ہے، یا پہلے توڑتی ہے پھر چھوڑ دیتی ہے؟

کئی راتیں وہ جاگتے گزارتا۔

چھت کو تکتا رہتا۔

کبھی خود سے سوال کرتا، "میں رِمشا سے محبت کرتا ہوں... یا صرف تنہائی سے بھاگ رہا ہوں؟"

اور پھر خود ہی خاموش ہو جاتا۔

اسے یوں لگتا جیسے وہ دو راستوں کے بیچ کھڑا ہے؛ ایک طرف نادیہ کی ادھوری یادیں تھیں، دوسری طرف رِمشا کی خاموش قبولیت... یا شاید انکار۔

اسے رِمشا کی وہ نظریں یاد آتیں، وہ مختصر گفتگو، وہ نرم لہجہ... اور پھر دل کہتا شاید وہ سچ تھی۔

مگر اگلے ہی لمحے دماغ کہتا، "اگر سچ تھی... تو جواب کیوں نہیں آیا؟"

یہ سوال اسے اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔

سکندر اب خود کو بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ محبت میں تھا یا ملال میں، وفا میں تھا یا فریب میں، اسے کچھ سمجھ نہ آتا۔

ایک شام وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا ڈوبتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ آسمان پر سرخی پھیل رہی تھی، بالکل ویسی ہی سرخی جیسی شکستہ دل لوگوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔

اس نے آہستہ سے خود سے کہا،

"کیا میں رِمشا کو چاہتا ہوں... یا نادیہ کو بھلانے کے لیے اس کے نام کا سہارا لے رہا ہوں؟"

یہ سوال اتنا بھاری تھا کہ اس کا اپنا وجود اس کے نیچے دبنے لگا۔

محبت کبھی کبھی انسان کو کسی اور سے زیادہ اپنے سامنے بے نقاب کر دیتی ہے۔

اور سکندر پہلی بار خود سے ڈرنے لگا تھا۔

اسے محسوس ہونے لگا شاید وہ رِمشا کے ساتھ ناانصافی کر رہا ہے... یا شاید خود اپنے ساتھ۔

دل رِمشا کی طرف کھنچتا تھا، ضمیر نادیہ کے مزار پر بیٹھا روتا تھا۔

اور سکندر ان دونوں کے درمیان کہیں گم ہو چکا تھا۔

سات دن گزرے تھے...

مگر اس کے اندر برسوں کی تھکن اتر آئی تھی۔

وہ نہیں جانتا تھا اگلا قدم کیا ہو گا، مگر اتنا ضرور جانتا تھا کہ انسان جب ایک محبت کے ملبے سے نکلے بغیر دوسری محبت میں قدم رکھتا ہے... تو اکثر دونوں کو کھو دیتا ہے۔

اور شاید سکندر بھی اسی راستے پر چل نکلا تھا... بے خبر... خاموش... اور اندر سے ٹوٹتا ہوا۔

کئی دنوں کی الجھن، خاموشی اور اندرونی کشمکش کے بعد جب سکندر دوبارہ یونیورسٹی آیا تو جیسے وہ پہلے والا سکندر نہیں رہا تھا۔ قدم وہی تھے، راستے وہی تھے، عمارتیں بھی وہی... مگر دیکھنے والی آنکھ بدل چکی تھی۔

اس دن عجیب بات یہ تھی کہ اس نے رِمشا کو ڈھونڈنے کی کوشش تک نہ کی۔

نہ راہداریوں میں نظریں بھٹکیں، نہ کینٹین کے آس پاس بے سبب چکر لگے، نہ لائبریری کے دروازے پر رک کر کسی آہٹ کا انتظار کیا۔

جیسے اس نے دل کے ایک باب پر وقتی طور پر مٹی ڈال دی ہو۔

وہ خاموشی سے کلاس میں آیا، اپنی نشست پر بیٹھا، اور مدتوں بعد سکون سے لیکچر سننے لگا۔ کتاب کے صفحے پلٹتے ہوئے پہلی بار اسے لگا شاید آدمی دکھ کے ساتھ جینا سیکھ بھی لیتا ہے۔

مگر یہ سکون زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔

اچانک اس کی نظر ارم-ان پر پڑی۔

اور وہ ٹھٹک گیا۔

یہ وہ ارم-ان نہیں تھا جو ہر وقت ہنستا، جملے کستا، محفل گرم رکھتا تھا۔ آج اس کے چہرے پر عجب ویرانی تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے، ماتھے پر شکنیں، اور جیسے کئی راتوں کی نیند اس سے روٹھ گئی ہو۔

سکندر نے غور کیا تو صرف ارم-ان ہی نہیں...

پورا کلاس روم کسی انجانے ماتم میں ڈوبا محسوس ہو رہا تھا۔

سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔

باتیں سرگوشیوں میں ہو رہی تھیں۔

قہقہے غائب تھے۔

ہوا میں ایک انجانی بے چینی تیر رہی تھی۔

سکندر کی سمجھ سے باہر تھا کہ ان چند دنوں میں ایسا کیا ہو گیا تھا؟

کون سا حادثہ ان سب کے درمیان خاموشی بن کر بیٹھ گیا تھا؟

اس نے ارم-ان کو دیکھا۔

وہ خالی نظروں سے کہیں دور دیکھ رہا تھا جیسے جسم یہاں ہو مگر روح کہیں اور۔

سکندر کے دل میں انجانا خدشہ جاگا۔

"یہ کیا ہوا ہے...؟"

مگر کسی سے پوچھنے سے پہلے ہی کلاس میں ایسی خاموشی اتری کہ گھڑی کی ٹک ٹک بھی سنائی دینے لگی۔

وہ لمحہ عجیب تھا۔

طوفان سے پہلے جیسا سکوت۔

سکندر کے ذہن میں خیال ابھرے، "کیا رِمشا کے بارے میں کچھ ہوا؟

یا ارم-ان پر کوئی مصیبت آئی؟

یا یونیورسٹی میں کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے جس کی خبر مجھ تک نہیں پہنچی؟"

سوال ہی سوال تھے۔

جواب کہیں نہیں۔

اس نے آہستہ سے ارم-ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

ارم-ان چونک کر پلٹا۔

ان کی نظریں ملیں۔

اور سکندر نے پہلی بار محسوس کیا...

کچھ ٹوٹ چکا ہے۔

بہت بری طرح۔

ارم-ان کے ہونٹ ہلے جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو مگر آواز ساتھ نہ دے رہی ہو۔

اس کی آنکھوں میں ایک ایسا خوف تھا جو الفاظ میں نہیں اترتا۔

سکندر کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی۔

اب اسے رِمشا بھی یاد نہ رہی۔

اب اس کے ذہن میں صرف ایک سوال تھا

ان دنوں میں آخر ہوا کیا ہے؟

اور اسے خبر نہ تھی...

جو جواب اسے ملنے والا تھا، وہ اس کی اپنی زندگی کا رخ بھی بدل دینے والا تھا۔

ارم-ان کے ہونٹ کپکپائے، جیسے لفظ باہر آنے سے انکار کر رہے ہوں۔

سکندر نے دوبارہ کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"یار کیا ہوا ہے؟ اتنا پریشان کیوں ہے؟"

ارم-ان نے ایک سرد سانس بھری، پھر خالی نظروں سے سامنے دیکھتے ہوئے بولا،

"سب ختم ہو گیا"...

سکندر چونکا۔

"کیا ختم ہو گیا؟"

ارم-ان نے جیسے بڑی مشکل سے لفظ نکلے۔

"مومنہ... مومنہ نے مجھے چھوڑ دیا۔"

یہ سن کر سکندر چند لمحے اسے دیکھتا رہ گیا۔

جیسے بات کانوں سے ٹکرائی ہو مگر ذہن نے قبول نہ کی ہو۔

"کیسے؟"

اس نے دھیرے سے پوچھا۔

ارم-ان تلخ مسکراہٹ ہنسا، ایسی ہنسی جس میں رونا چھپا تھا۔

"پتا نہیں... بس کہہ دیا" .she's not interested

یہ تین لفظ شاید چھوٹے تھے، مگر ارم-ان کے اندر پوری دنیا اجاڑ چکے تھے۔

She is not interested.

جیسے برسوں کی چاہت کو ایک جملے میں دفن کر دیا گیا ہو۔

سکندر خاموش ہو گیا۔

وہ کیا کہتا؟

تسلی؟

کیسی تسلی؟

وہ خود ادھورے رشتوں، خاموش جوابوں اور ٹوٹتی امیدوں کے درمیان بھٹک رہا تھا۔

ایک زخمی آدمی دوسرے زخمی کو کیسے سہارا دیتا ہے؟

اس نے ارم-ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

وہاں غصہ نہیں تھا۔

شکوہ نہیں تھا۔

صرف شکست تھی۔

ارم-ان بولا،

"میں نے کیا کم کیا تھا سکندر؟

کیا محبت کم تھی؟

کیا وفا کم تھی؟

یا میں ہی کم تھا؟"

یہ سوال سکندر کے سینے میں اترتے گئے۔

کیونکہ یہ سوال صرف ارم-ان کے نہیں تھے...

کسی حد تک اس کے اپنے بھی تھے۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر لفظ ساتھ چھوڑ گئے۔

کچھ لمحے دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

دو دوست۔

دو شکستہ دل۔

دو الگ کہانیاں۔

ایک سا درد۔

آخر سکندر نے دھیرے سے کہا،

"کبھی کبھی لوگ ہمیں اس لیے نہیں چھوڑتے کہ ہم ناکافی ہوتے ہیں... بلکہ اس لیے کہ ان کے دل میں ہمارے لیے جگہ ہی نہیں بنتی۔"

ارم-ان ہنسا...

کڑوی ہنسی۔

"محبت میں جگہ مانگی نہیں جاتی سکندر... دی جاتی ہے۔"

یہ سن کر سکندر کے پاس واقعی کوئی جواب نہ بچا۔

وہ صرف اسے دیکھتا رہا۔

اسے پہلی بار محسوس ہوا، محبت میں رد ہونا صرف انکار نہیں ہوتا...

وہ انسان کے اندر بہت کچھ مار دیتا ہے۔

آرم-ان نے میز پر مٹھی ماری۔

"میں نے اس کے لیے دعائیں مانگیں، صدقے دیے، خواب بنائے... اور بدلے میں کیا ملا؟"

اس کی آواز ٹوٹ گئی۔

"Not interested."

جیسے یہ جملہ نہیں، فیصلہ ہو۔

سکندر کا دل عجیب بوجھ سے بھر گیا۔

وہ سوچ رہا تھا...

کچھ دن پہلے وہ خود دِرمشا کی خاموشی سے الجھا ہوا تھا، آج ارم-ان کھلی جدائی کا زہر پی رہا تھا۔

محبت واقعی عجیب کھیل کھیلتی ہے۔

کسی کو جواب نہیں دیتی، کسی کو وجہ نہیں دیتی۔

صرف زخم دے دیتی ہے۔

اور سکندر...

وہ اب بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ ایسے لمحے میں دوست کو دلاسہ دیا جاتا ہے...

یا اس کے ساتھ خاموش بیٹھ کر ٹوٹا جاتا ہے۔

سکندر نے ارم-ان کی بات غور سے سنی، پھر کچھ دیر خاموش رہا۔ اسے محسوس ہوا یہ صرف بریک اپ نہیں... یہاں کوئی گرہ ہے جو کھلی نہیں۔

وہ آہستہ سے بولا،

"کوئی تو وجہ ہو گی نا ارم-ان... وہ ایسے ہی تو نہیں چھوڑ سکتی۔"

ارم-ان نے بے جان نظروں سے اسے دیکھا۔

سکندر نے پھر کہا،

"جا کر پوچھ لو اس سے۔ صاف پوچھو۔ بات ادھوری چھوڑنے سے زخم سڑتے ہیں۔"

ارم-ان نے ہلکی سی تلخ ہنسی ہنسی۔

"پوچھا تھا"...

"پھر؟"

"کچھ سمجھ نہیں آیا۔"

سکندر اب پوری طرح متوجہ ہو چکا تھا۔

"یہ سب ہوا کب؟"

ارم-ان نے ایک گہری سانس لی، جیسے وہ لمحہ دوبارہ جینا پڑ رہا ہو۔

"عید والے دن"...

اور یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش ہو گیا۔

پھر بولا،

"میں نے اپنی تصویریں مومنہ کو بھیجیں... ویسے ہی، خوشی میں۔ پھر اس سے کہا تم بھی اپنی بھیجو"...

سکندر سن رہا تھا۔

آرم-ان کی آواز بھاری ہو گئی۔

"اور وہ غصہ کر گئی۔"

"غصہ؟ صرف اس بات پر؟"

"ہاں... پہلے خشک جواب دیے۔ پھر کہا تم حد سے بڑھ رہے ہو۔"

سکندر کے ماتھے پر شکن پڑی۔

"پھر؟"

آرم-ان نے ہونٹ بھینچے۔

"پھر اس نے کہا" .she is not interested ...

یہ کہتے ہوئے اس کی آواز میں ایسا ٹوٹا پن تھا جیسے کوئی اندر سے بکھر رہا ہو۔

سکندر اب سوچ میں ڈوب گیا۔

یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں لگ رہا تھا۔

وہ آہستہ سے بولا،

"نہیں... بات صرف تصویروں کی نہیں۔ کچھ اور ہے۔"

ارم-ان نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب... یا تو وہ پہلے سے فاصلے میں تھی اور یہ بہانہ بن گیا،

یا تم دونوں میں boundaries کا فرق تھا... جو تم نارمل سمجھ رہے تھے وہ شاید اس کے لیے حساس بات تھی۔"

ارم-ان خاموش۔

سکندر نے بات جاری رکھی،

"مگر ایک بات سمجھ نہیں آتی... جو لڑکی محبت کرتی ہو، وہ ایک تصویر مانگنے پر رشتہ نہیں توڑتی۔"

یہ جملہ ارم-ان کے دل پر لگا۔

کیونکہ وہ خود بھی یہی سوچ سوچ کر جل رہا تھا۔

"تو پھر کیا وہ بہانہ تھا؟"

اس نے ٹوٹے لہجے میں پوچھا۔

سکندر نے سیدھا جواب نہ دیا۔

صرف کہا،

"جا کر اصل وجہ پوچھو۔

انکار برداشت ہو جاتا ہے...

مگر نامعلوم وجہ انسان کو اندر سے کھا جاتی ہے۔"

کلاس کے شور میں دونوں کی خاموشی عجیب گہری ہو گئی۔

ارم-ان آہستہ سے بولا،

"اگر وہ واقعی جانا چاہتی تھی تو؟"

سکندر نے خالی نظروں سے سامنے دیکھا اور جیسے خود سے کہا،

"پھر یہ تصویروں کا قصہ وجہ نہیں... صرف آخری بہانہ تھا۔"

ارم-ان کے چہرے پر درد اور بڑھ گیا۔

اور سکندر کے دل میں عجیب خیال ابھرا

محبت اکثر ختم نہیں ہوتی...

بس کسی ایک دن ایک معمولی سی بات اس کے مرنے کا اعلان بن جاتی ہے۔

ارم-ان کی بکھری ہوئی حالت دیکھ کر سکندر کے اندر کچھ جاگا۔ شاید دوستی... شاید تجسس... یا شاید یہ خواہش کہ کسی اور کی کہانی کم از کم اس کی اپنی کہانی جیسی ادھوری نہ رہ جائے۔

اس نے ارم-ان کی طرف دیکھا اور سنجیدگی سے کہا،

"اچھا ایسا کرو... میں خود جا کر مومنہ سے پوچھتا ہوں۔"

ارم-ان نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تم؟"

"ہاں، شاید وہ تم سے نہ کہہ رہی ہو... مجھ سے کہہ دے۔"

ارم-ان کے چہرے پر امید کی ایک مدھم لکیر ابھری، جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا ہو۔

پھر سکندر خاموش ہو کر کلاس ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

مگر اب اس کی توجہ لیکچر میں نہیں تھی۔

گھڑی کی سوئیاں جیسے آہستہ چل رہی تھیں۔

ہر منٹ بھاری۔

ہر لمحہ معلق۔

اور دل میں عجیب سی بے چینی۔

آخر کلاس ختم ہوئی۔

طلبہ نکلنے لگے۔

سرگوشیاں، بستوں کی آوازیں، قدموں کی چاپ...

اسی شور میں سکندر نے مومنہ کو جاتے دیکھا۔

وہ باہر نکلی تو سکندر بھی اس کے ساتھ ہولیا۔

دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

راہداری لمبی تھی، خاموشی اور لمبی۔

کچھ قدم بغیر بات کے گزرے۔

پھر مومنہ نے دھیرے سے کہا،

"نادیہ کی شادی کا سن کر بہت افسوس ہوا"...

یہ سنتے ہی جیسے کسی نے سکندر کے سینے پر پتھر رکھ دیا۔

قدم چلتے رہے...

مگر اندر کچھ رک گیا۔

نادیہ کا نام...

وہ نام جسے وہ خود سے بھی چھپانا چاہتا تھا۔

وہ زخم جس پر ابھی پپڑی بھی نہ جمی تھی۔

مومنہ کے ایک جملے نے پھر سے کچا کر دیا۔

اس کے چہرے پر ہلکی سی سختی آئی، مگر اس نے چھپالی۔

"ہاں..." بس اتنا ہی کہہ سکا۔

مگر دل کے اندر ہنگامہ تھا۔

اسے لگا جیسے کوئی پرانا قبرستان پھر آباد ہو گیا ہو۔

نادیہ کی یاد، اس کی شادی، اپنی بے بسی...

سب ایک ساتھ لوٹ آئے۔

چند لمحے وہ جواب نہ دے سکا۔

مومنہ شاید سمجھ گئی کہ بات اس کے دل پر لگی ہے۔

وہ نرم لہجے میں بولی،

"تم ٹھیک ہو؟"

سکندر نے مسکرانے کی کوشش کی۔

وہی مسکراہٹ جو صرف درد چھپانے کے لیے ہوتی ہے۔

"ہاں... بس کچھ باتیں وقت لے لیتی ہیں۔"

مگر حقیقت یہ تھی

اس کے دل پر واقعی بوجھ پڑ چکا تھا۔

اتنا کہ وہ چند لمحے بھول ہی گیا کہ وہ ارم-ان کے لیے آیا تھا۔

مومنہ اس کے ساتھ چلتی رہی۔

ہوا میں ہلکی سی خاموشی تھی۔

پھر سکندر نے خود کو سنبھالا۔

اصل بات یاد آئی۔

وہ رکا نہیں، چلتے چلتے آہستہ سے بولا،

"مومنہ... ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں؟"

"تم نے ارم-ان کو چھوڑنے کا اچانک فاصلہ کیوں کر لیا؟"

مومنہ کے قدم ایک لمحے کو سست پڑ گئے۔

ہوا جیسے رک گئی۔

اور سکندر نے محسوس کیا...

اصل کہانی اب شروع ہونے والی ہے۔

مومنہ نے بڑی سرد مہری سے کہا،

"ارم-ان میرے لیے ٹھیک نہیں۔"

یہ جملہ سنتے ہی سکندر جیسے ساکت رہ گیا۔

"کیا؟"

اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

وہی مومنہ...

جس نے کبھی خود آکر اعتراف کیا تھا کہ وہ ارم-ان کو پسند کرتی ہے۔

وہی آج ایسے بات کر رہی تھی جیسے وہ سب کبھی ہوا ہی نہ ہو۔

سکندر کے لیے یہ بات ناقابلِ یقین تھی۔

اس نے مومنہ کو دیکھا، جیسے اس کے چہرے پر جواب ڈھونڈ رہا ہو۔

"تم نے خود کہا تھا تم اسے پسند کرتی ہو... اب اچانک یہ سب؟"

مومنہ کے چہرے پر بےزاری ابھر آئی۔

"Feelings بدل جاتی ہیں سکندر۔"

سکندر نے ہار نہ مانی۔

"مگر وجہ؟ کوئی تو وجہ ہو گی۔"

یہ سنتے ہی مومنہ کے لہجے میں تیزی آ گئی۔

"مجھے کوئی guilt نہیں۔"

وہ رک کر اس کی طرف مڑی۔

"جو بھی کیا، اپنی مرضی سے کیا۔

اپنی مرضی سے ارم-ان کو چنا...

اور اپنی مرضی سے چھوڑ رہی ہوں۔"

یہ الفاظ سکندر کے مزاج پر چنگاری بن کر گرے۔

اسے غصہ آ گیا۔

آنکھوں میں سختی اتر آئی۔

"تم نے ایک معصوم دل توڑا ہے۔"

مومنہ کی آنکھیں یکدم بدل گئیں۔

اور پھر...

اس نے وہ کہا جس کی سکندر نے توقع نہ کی تھی۔

"تم نے بھی تو نادیہ کو چھوڑا تھا۔"

سکندر جیسے وہیں جم گیا۔

سانس اٹک گئی۔

وقت تھم گیا۔

"وہ تو تمہارے پاس آئی تھی"...

یہ جملہ مکمل ہوا ہی تھا کہ سکندر کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے دل میں ایک نہیں... کئی کیلیں ٹھونک دی ہوں۔

سیدھا دل میں۔

بے رحمی سے۔

وہ درد جو آدمی چہرے پر نہیں لاتا...

وہ اس کی روح تک اتر گیا۔

نادیہ...

وہ نام پھر خنجر بن گیا۔

اور مومنہ نے جیسے اس کے سب سے چھپے زخم پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

سکندر کے ذہن میں شور اٹھا

میں نے نادیہ کو چھوڑا تھا؟

یا حالات نے ہمیں الگ کیا؟

کیا واقعی میں بھی مجرم ہوں؟

اسے لگا جیسے اچانک وہ ارم-ان کا وکیل نہیں...

خود کٹہرے میں کھڑا ہے۔

وہ کچھ لمحے بول ہی نہ سکا۔

مومنہ شاید سمجھ رہی تھی اس نے دلیل دی ہے۔

مگر سکندر جانتا تھا

یہ دلیل نہیں،

وار تھا۔

گہرا وار۔

اس نے خشک ہونٹوں سے کہا،

"یہ ایک جیسی باتیں نہیں ہیں۔"

مومنہ نے کندھے جھٹکے۔

"تم مرد لوگ جب چھوڑو تو مجبوری،

اور ہم چھوڑیں تو ظلم؟"

یہ سن کر سکندر کے اندر غصہ اور درد دونوں ٹکرا گئے۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا،

اسے نادیہ کا وہ چہرہ یاد آیا...

وہ خاموش چاہت...

وہ ان کہی قربت...

اور پھر جدائی۔

اسے لگا مومنہ نے صرف الزام نہیں لگایا

اس نے اس کی اپنی کہانی اس کے خلاف موڑ دی۔

سکندر نے پہلی بار نظریں جھکا لیں۔

جیسے کسی نے اس کے ضمیر کے بند دروازے کھول دیے ہوں۔

وہ آہستہ سے بولا،

"تم نہیں جانتیں نادیہ کی کہانی"...

مگر آواز کمزور تھی۔

مومنہ کے الفاظ ابھی بھی اس کے سینے میں کیلوں کی طرح گڑے تھے۔

اور اس لمحے سکندر نے محسوس کیا

کبھی کبھی دوسروں کے ٹوٹے دلوں کا انصاف مانگتے

انسان اپنے ہی زخموں کے کٹہرے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

سکندر نے دل پر لگے اس وار کو بمشکل نگلا۔ مومنہ کے الفاظ ابھی تک اس کے سینے میں کیلوں کی طرح دھنسے ہوئے تھے، مگر اس نے خود کو سنبھالا۔

ارم-ان کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

وہ کچھ قدم اس کے ساتھ چلتا رہا، پھر دبے مگر سخت لہجے میں بولا،

"پھر بھی مومنہ... کوئی تو وجہ ہو گی نا ارم-ان کو چھوڑنے کی۔"

مومنہ خاموش رہی۔

سکندر نے دوبارہ کہا،

"ایسے کیسے چھوڑ سکتی ہو اسے؟"

اس کے لہجے میں اب سوال کم، ملامت زیادہ تھی۔

"وہ تمہیں چاہتا تھا۔ سچ میں چاہتا تھا۔

لوگ کھیل نہیں ہوتے مومنہ... دل ہوتے ہیں۔"

مومنہ کے قدم آہستہ ہوئے۔

مگر چہرے پر ضد تھی۔

سکندر رکا نہیں۔

"تم خود اس کے پاس آئی تھیں۔

تم نے اسے امید دی۔

تم نے اسے یقین دلایا...

اب ایسے ایک جملے سے "not interested" سب ختم؟"

ہوا میں تناؤ گھل گیا۔

مومنہ نے نظریں چرائیں۔

سکندر نے پہلی بار لہجہ اور گہرا کیا۔

"وجہ بتاؤ۔ اصل وجہ۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔

پھر مومنہ نے ٹھنڈے لہجے میں کہا،

"ہر رشتہ وجہ سے نہیں ٹوٹتا۔ کبھی دل اتر جاتا ہے۔"

سکندر کو یہ جواب چبھ گیا۔

"دل اتر جاتا ہے؟"

وہ ہلکا سا تلخ ہنسا۔

"انسان کوئی کپڑا ہے جو پسند نہ آئے تو بدل دو؟"

مومنہ کے چہرے پر ناگواری آگئی۔

"تم بات بڑھا رہے ہو۔"

"نہیں، بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

سکندر کی آنکھوں میں اب عجیب سنجیدگی تھی۔

"آخر ارم۔ان میں کمی کیا تھی؟"

یہ سوال سیدھا تھا۔

تیز تھا۔

مومنہ خاموش۔

سکندر نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا،

"کیا اس نے دھوکہ دیا؟

جھوٹ بولا؟

بدتمیزی کی؟

حد پار کی؟

کیا کیا اس نے؟"

مومنہ جیسے الجھ گئی۔

اور یہی الجھن سکندر نے محسوس کر لی۔

اسے لگا شاید یہاں کوئی چھپی ہوئی بات ہے۔

وہ آہستہ بولا،

"مومنہ... سچ کہو۔

تم اسے چھوڑ رہی ہو...

یا کسی اور کو چن لیا ہے؟"

یہ سنتے ہی مومنہ چونکی۔

اور اس ایک چونکنے نے سکندر کے دل میں شک کا بیج بو دیا۔

کچھ لمحے بعد مومنہ نے ذرا سخت لہجے میں کہا،

"میں کسی کو explain کرنے کی پابند نہیں۔"

سکندر نے فوراً جواب دیا،

"ارم-ان کو تو ہو۔"

یہ جملہ سیدھا لگا۔

مومنہ خاموش ہو گئی۔

راہداری لمبی تھی۔

قدم چل رہے تھے۔

مگر اب دونوں کے درمیان ہوا بھاری ہو چکی تھی۔

سکندر نے آخری بار کہا،

"محبت چھوڑنی ہو تو چھوڑ دو...

مگر کسی معصوم کو بے وجہ مت توڑو۔

کوئی تو وجہ ہو گی مومنہ...

ایسے کیسے چھوڑ سکتی ہو اسے؟"

اور یہ کہتے ہوئے سکندر خود بھی جانتا تھا...

وہ صرف ارم-ان کے لیے جواب نہیں مانگ رہا تھا۔

شاید وہ اپنی ادھوری محبتوں کا جواب بھی مومنہ سے طلب کر رہا تھا۔

مومنہ کے الفاظ ہوا میں کسی سخت تھپڑ کی طرح گونجے۔

"بھاڑ میں جاؤ سکندر... تم بھی اور تمہارا دوست بھی۔"

یہ کہہ کر وہ بغیر پلٹے وہاں سے چلی گئی۔

سکندر وہیں کھڑا رہ گیا۔

چند لمحے... بالکل ساکت۔

اسے سمجھ ہی نہ آیا ابھی ہوا کیا ہے۔ ہوا میں خاموشی تھی مگر اس خاموشی کے اندر شور بہت تھا۔

اس کے اندر پہلی چیز جو ٹوٹی وہ غصہ تھا پھر فوراً اس کے نیچے کچھ اور آ گیا... ایک عجیب سی بے بسی۔

اس نے آہستہ سے نظریں جھکائیں۔

دل میں ارم-ان کا چہرہ آیا، پھر نادیہ کا... اور پھر مومنہ کے الفاظ بار بار گونجنے لگے۔

"تم بھی... اور تمہارا دوست بھی"...

جیسے کسی نے ایک ہی جملے میں دو رشتوں کو ایک ساتھ رد کر دیا ہو۔

سکندر نے ایک لمبی سانس لی، مگر وہ سانس بھی ادھوری سی لگ رہی تھی۔

وہ چاہتا تھا پیچھے جا کر کچھ کہے، کچھ پوچھے... مگر قدم جیسے وزن کھو بیٹھے تھے۔

اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ ہر سوال کا جواب نہیں ہوتا، اور ہر سچ سنا بھی نہیں جاتا۔

وہ آہستہ آہستہ واپس چلنے لگا۔

کلاسز کا شور دور ہوتا جا رہا تھا، مگر اس کے اندر عجیب سا خلا بڑھتا جا رہا تھا۔

اور اسے اب یہ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا

وہ ارم-ان کے لیے جواب لینے گیا تھا...

یا خود ایک نئے سوال میں پھنس کر واپس آ رہا تھا۔

سکندر واپس آیا تو اس کے چہرے پر وہی الجھن تھی، مگر اس بار اس میں ایک عجیب سی خاموشی بھی شامل تھی۔ جیسے وہ کسی ایسی بات سے ٹکرا آیا ہو جسے الفاظ میں ڈھالنا ممکن ہی نہ ہو۔

آرم-ان فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں امید بھی تھی اور خوف بھی۔

"کیا کہا اس نے؟ وجہ بتائی؟"

سکندر کچھ لمحے خاموش رہا۔ جیسے اندر ہی اندر کوئی جواب تلاش کر رہا ہو جو تھا ہی نہیں۔

پھر آہستہ سے بولا،

"نہیں"...

بس یہ ایک لفظ۔

اتنا سا جواب۔

مگر اس ایک لفظ نے آرم-ان کے چہرے کا رنگ بدل دیا۔

اس کی سانس جیسے ایک لمحے کے لیے رُک گئی ہو۔

"نہیں...؟"

ارم-ان نے دھیرے سے دہرایا، جیسے یقین کرنا چاہتا ہو کہ اس نے ٹھیک سنا ہے۔

سکندر نے نظریں جھکا لیں۔

"اس نے کوئی واضح وجہ نہیں دی... بس... بات ختم کر دی۔"

ارم-ان چند لمحے خاموش کھڑا رہا۔

پھر آہستہ سے پیچھے ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔

اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو گئے تھے۔

سانسیں بے ترتیب۔

جیسے اندر کچھ اچانک خالی ہو گیا ہو۔

"بس... اتنا ہی؟"

اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

سکندر نے ہاں میں سر ہلایا۔

ارم-ان نے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھتے ہوئے کہا،

"تو پھر میں کیا تھا اس کے لیے...؟"

یہ سوال سکندر کے دل میں بھی اتر گیا۔

کلاس کا شور دور کہیں گم تھا، مگر یہاں دو دوستوں کے درمیان ایک ایسی خاموشی تھی جو چیخ سے بھی زیادہ بھاری تھی۔

ارم-ان نے دوبارہ سانس لینے کی کوشش کی، مگر ہر سانس جیسے ادھوری آ رہی تھی۔

"میں نے کچھ غلط تو نہیں کیا تھا نا؟"

اس نے سکندر کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

سکندر نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا... مگر الفاظ نہیں آئے۔

کیونکہ بعض دفعہ سچ یہ ہوتا ہے کہ

نہ کوئی غلط ہوتا ہے

نہ کوئی صحیح...

بس لوگ بدل جاتے ہیں۔

اور بدلنے کے بعد

وجہ بھی ضروری نہیں سمجھتے۔

تین مہینے گزر چکے تھے۔

یونیورسٹی کی زندگی اپنی رفتار سے چل رہی تھی، مگر سکندر کے اندر جیسے وقت کہیں رک سا گیا تھا۔ وہ باہر سے نارمل دکھائی دیتا تھا، کلاسز اٹینڈ کرتا، نوٹس لیتا، دوستوں سے بات بھی کر لیتا... مگر اندر کہیں ایک سوال مسلسل جاگ رہا تھا۔

آخر مومنہ نے ارم-ان کو کیوں چھوڑا؟

یہ سوال اب اس کے ذہن کا حصہ نہیں رہا تھا... یہ اس کے دل کی عادت بن چکا تھا۔

ان تین مہینوں میں وہ کتنی ہی بار مومنہ کے سامنے گیا۔

کبھی راہداری میں، کبھی کینٹین کے پاس، کبھی کسی بہانے گفتگو شروع کرنے کی کوشش کی...

مگر ہر بار وہی انجام ہوتا۔

مومنہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی موضوع بدل دیتی۔

کبھی ہلکی سی مسکراہٹ، کبھی سرد لہجہ، اور اکثر ایک ہی جملہ،

"رہنے دو سکندر... ضروری نہیں ہے۔

اپنے کام سے کام رکھو۔"

یہ جملہ ہر بار سکندر کے سوال کو درمیان میں ہی کاٹ دیتا۔

جیسے کوئی دروازہ کھلنے سے پہلے ہی بند کر دے۔

اور سکندر... ہر بار خاموش رہ جاتا۔

کیونکہ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ ضد کرے یا احترام کرے۔

ادھر ارم-ان اب بھی بدل چکا تھا۔

وہ پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔

کم بولتا، زیادہ سوچتا، اور اکثر کلاس میں بھی کہیں اور کھویا رہتا۔

سکندر اسے دیکھتا تو محسوس کرتا کہ کچھ زخم وقت کے ساتھ بھر نہیں رہے...

صرف گہرے ہو رہے ہیں۔

ایک دن سکندر نے ہمت کی۔

وہ مومنہ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"ایک بار سچ بتا دو... بس ایک بار۔"

مومنہ نے اسے دیکھا، پھر نظریں ہٹا لیں۔

"میں نے کہہ دیا نا سکندر... سب ختم ہو چکا ہے۔"

سکندر کی آواز تھوڑی بھاری ہو گئی۔

"مگر وجہ تو بتاؤ... ارم-ان کو حق تھا جاننے کا۔"

مومنہ نے ٹھنڈی سانس لی۔

"ہر بات کا جواب نہیں ہوتا۔"

"یا پھر تم دینا نہیں چاہتیں؟"

یہ جملہ تھوڑا تیز تھا۔

مومنہ نے اس بار سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"تم بار بار کیوں کو د رہے ہو ماضی میں؟"

سکندر خاموش ہو گیا۔

کیونکہ جواب سادہ نہیں تھا۔

وہ ماضی میں نہیں کود رہا تھا...

وہ حقیقت تلاش کر رہا تھا۔

مگر کچھ حقیقتیں ایسے دروازے رکھتی ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے:

"یہاں سے آگے جانا ضروری نہیں... مگر انسان پھر بھی جاتا ہے۔"

مومنہ مڑ کر چلی گئی۔

اور سکندر وہیں کھڑا رہ گیا۔

تین مہینے گزر چکے تھے...

مگر سکندر کے لیے ایک سوال آج بھی وہیں کھڑا تھا،

اور جواب آج بھی اسی طرح خاموش تھا جیسے پہلے دن تھا۔

تین مہینے یوں گزر گئے جیسے وقت چل نہیں رہا تھا، بس آگے سرک رہا تھا۔

سکندر اور رِمشا کے درمیان بھی ایک عجیب سی خاموشی قائم تھی۔ نہ پہلے جیسی باتیں رہیں، نہ وہ بے وجہ کی گفتگو، نہ وہ چھوٹے چھوٹے پیغامات۔ سکندر نے جیسے خود ہی ایک فاصلے کی لکیر کھینچ لی تھی۔

وہ خود کو یہ سمجھاتا رہا کہ وہ انتظار کر رہا ہے۔

رِمشا خود بات کرے گی... جب اس کا دل ہو گا، وہ خود آ جائے گی۔

مگر حقیقت یہ تھی کہ انتظار آہستہ آہستہ عادت میں بدل رہا تھا، اور عادت ایک دن بے حسی میں۔

دوسری طرف ارم-ان کی دنیا مکمل طور پر بدل چکی تھی۔

وہ وہ ارم-ان نہیں رہا تھا جو ہنستا تھا، مذاق کرتا تھا، اور ہر ماحول کو ہلکا بنا دیتا تھا۔ اب وہ زیادہ تر خاموش رہتا، جیسے ہر لفظ بولنے سے پہلے اس کے اندر کہیں مر جاتا ہو۔

مومنہ کی طرف سے ملنے والا وہ ایک جملہ...

“she is not interested”

آج بھی اس کے اندر گونجتا تھا۔

وہ اسے بھول نہیں پا رہا تھا۔

اصل میں وہ یہ سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی کوئی اتنی آسانی سے کیسے ختم ہو سکتا ہے۔

کبھی وہ سوچتا:

کیا میں واقعی اتنا بے وقعت تھا؟

کبھی خود کو سمجھاتا:

نہیں... شاید مسئلہ مجھ میں نہیں تھا۔

مگر کوئی بھی سوچ اسے سکون نہیں دیتی تھی۔

راتیں اب اس کی سب سے بڑی دشمن بن چکی تھیں۔

خاموش کمرہ، بند آنکھیں، اور ذہن میں چلتی ہوئی وہی پرانی باتیں...

ہر چیز اسے مومنہ تک لے جاتی تھی، اور پھر وہیں لا کر چھوڑ دیتی تھی۔

یونیورسٹی میں بھی وہ پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔

دوست بات کرتے تو جواب دیتا، مگر دل کہیں اور ہوتا۔

سکندر اسے دیکھتا تو سمجھ نہیں پاتا تھا کہ انسان ایک لمحے میں اتنا بدل کیسے جاتا ہے۔

اور خود سکندر؟

وہ دونوں کہانیوں کے بیچ کہیں پھنس چکا تھا۔

ایک طرف رِمشا کی خاموشی تھی، دوسری طرف ارم-ان کا ٹوٹتا ہوا دل، اور درمیان میں وہ خود...

جو نہ کسی کو روک پا رہا تھا، نہ کسی کے قریب جا پا رہا تھا۔

تین مہینے گزر چکے تھے...

مگر کچھ زخم ایسے تھے جو وقت کے ساتھ بھرنے کے بجائے صرف اپنی موجودگی کا احساس اور بڑھا دیتے ہیں۔

تین مہینوں کی خاموشی کے بعد وہ دن کچھ الگ ہی تھا۔

سکندر حسبِ معمول یونیورسٹی میں تھا، مگر آج اس کے اندر وہ پرانی بے چینی کم تھی۔ شاید اس نے خود کو اس انتظار کے ساتھ جینا سیکھ لیا تھا جو کبھی واضح نہیں تھا۔

اچانک اسے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔

اس نے نظریں اٹھائیں۔

رِمشا سامنے کھڑی تھی۔

کچھ لمحے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ جیسے وقت ایک دم رک گیا ہو اور پرانے دن درمیان میں آ کھڑے ہوئے ہوں۔

رِمشا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

"میں نے بہت زیادہ وقت لے لیا نا سکندر؟"

یہ جملہ سن کر سکندر کے چہرے پر بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

اس نے نرمی سے جواب دیا،

"نہیں... کوئی بات نہیں۔

ویسے بھی میں نے ہی کافی دیر کر دی تھی... تمہیں بھی بہت انتظار کروایا۔"

رِمشا نے اس کی طرف دیکھ کر ہلکی سی ہنسی ہنسی۔

وہ ہنسی سادہ تھی، مگر اس میں ایک عجیب سی راحت تھی... جیسے کسی بند دروازے کی کنڈی آخرکار کھل گئی ہو۔

سکندر بھی بے اختیار مسکرا دیا۔

پھر دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

پہلے الفاظ تھوڑے ہچکچاہٹ والے تھے، مگر آہستہ آہستہ گفتگو بہنے لگی۔

کلاس، یونیورسٹی، پرانے دن، چھوٹی چھوٹی باتیں...

ہر بات کے ساتھ دونوں کے درمیان جمی ہوئی خاموشی پگھلنے لگی۔

رِمشا کچھ کہتی اور خود ہی ہنس پڑتی۔

سکندر اس کی بات سن کر پہلے حیران ہوتا، پھر خود بھی ہنس دیتا۔

کبھی وہ کسی پرانی یاد پر بات کرتے، کبھی کسی عام سی بات پر بحث کر بیٹھتے،
اور پھر خود ہی ہنسی میں ختم کر دیتے۔

سکندر کو احساس ہوا کہ وہ پچھلے تین مہینوں میں کتنا بوجھ اٹھائے بیٹھا تھا۔

اور آج... وہ بوجھ جیسے کچھ دیر کے لیے ہلکا ہو گیا تھا۔

ایک لمحے کو اسے لگا شاید سب کچھ ویسا ہی ہو سکتا ہے جیسا پہلے تھا۔

مگر دل کے کسی کونے میں ایک دھیمی سی آواز بھی تھی

کیا واقعی سب کچھ ویسا ہی ہو سکتا ہے؟

رِمشا نے باتوں کے درمیان سکندر کی طرف دیکھا۔

"آپ اب بھی زیادہ سوچتے ہو نا؟"

سکندر ہلکا سا ہنسا۔

"شاید... کم نہیں ہوا۔"

رِمشا نے سر ہلایا۔

"یہی آپ کی سب سے بری عادت ہے۔"

دونوں پھر ہنس پڑے۔

مگر اس ہنسی کے پیچھے کہیں نہ کہیں وقت کی لکیر واضح تھی۔

وہ پہلے جیسے نہیں تھے...

اور شاید اب کبھی ویسے ہو بھی نہیں سکتے تھے۔

لیکن اس لمحے، کم از کم اتنا ضرور تھا

خاموشی ختم ہو چکی تھی۔

سکندر ہلکا سا ہنسا، مگر اس ہنسی میں تھکن بھی تھی اور سچائی بھی۔

"میں اوور تھنکر ہوں رِمشا... سوچوں گا نہیں تو چلے گا کیسے؟"

رِمشا نے فوراً اس کی طرف دیکھا۔

سکندر نے بات کو خود ہی آگے بڑھایا، جیسے اپنے آپ کو بھی سمجھا رہا ہو۔

"اتنا بھی اوور تھنکر نہیں ہونا چاہیے... بندہ بعض دفعہ خود ہی اپنی زندگی خراب کر لیتا ہے۔"

پھر اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ خود پر طنز کیا۔

"اور ویسے بھی... میں تو خراب کر ہی بیٹھا ہوں۔"

رِمشا نے ایک لمحے کو اسے دیکھا، پھر آہستہ سے بولی،

"آپ سوچتے کم نہیں... زیادہ سوچ کر خود کو تھکا دیتے ہو۔"

سکندر کچھ دیر خاموش رہا۔

یہ جملہ سیدھا لگا تھا، مگر غلط نہیں تھا۔

وہ چلتے چلتے بولا،

"شاید... مگر سوچنا بند کرنا میرے بس میں نہیں۔"

رِمشا نے کندھے ہلکے سے جھٹکے۔

"کوشش تو کر سکتے ہو نا؟"

سکندر ہنسا۔

"کوشش ہی تو کرتا ہوں... پھر بھی واپس وہیں آ جاتا ہوں۔"

پھر اس نے آہستہ سے، جیسے خود سے بات کر رہا ہو کہا،

"اگر نہ سوچوں تو پھر میں نہیں رہوں گا، رِمشا۔"

یہ سن کر رِمشا چند لمحے خاموش رہی۔

اس نے پہلی بار اس بات کو ہلکے سے نہیں لیا تھا۔

کیونکہ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ سکندر کی "overthinking" صرف عادت نہیں... اس کی فطرت بن چکی ہے۔

وہ نرم لہجے میں بولی،

"مگر ہر چیز سوچ کر نہیں جیتی جاتی۔ کچھ چیزیں بس جینی پڑتی ہیں۔"

سکندر نے اسے دیکھا۔

پھر ہلکا سا مسکرایا۔

"آپ صحیح کہتی ہو... مگر میں وہ بندہ ہوں جو جیتے ہوئے بھی سوچتا رہتا ہے کہ کہیں میں غلط تو نہیں کر رہا۔"

رِمشا نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"اور یہی عادت آپ کو بار بار تھکا دیتا ہے۔"

سکندر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا،

"تو پھر آپ بتاؤ... کیا کروں؟"

رِمشا چند لمحے رکی، پھر سادہ سا جواب دیا،

" کبھی کبھی چھوڑ دینا بھی سیکھ لیں... سب کچھ کنٹرول نہیں ہوتا۔"

یہ جملہ فضا میں ٹھہر گیا۔

سکندر نے کچھ نہیں کہا۔

مگر دل میں کہیں یہ بات بیٹھ گئی کہ شاید وہ واقعی بہت کچھ "سمجھنے" کی کوشش میں "جینا" بھول جاتا ہے۔

اور رِمشا کے ساتھ چلتے ہوئے اسے پہلی بار محسوس ہوا—

کہ کچھ رشتے جواب نہیں مانگتے...

صرف موجودگی مانگتے ہیں۔

سکندر نے اچانک بات کا رخ بدلتے ہوئے آہستہ سے پوچھا،

" آپ اب اس سے آگے کیا چاہتی ہو رِمشا؟"

رِمشا ایک لمحے کو رک گئی۔ اس نے سکندر کو دیکھا، جیسے اس کے سوال کی رفتار کو محسوس کر رہی ہو۔

" اتنی فاسٹ؟" اس نے ہلکی سی حیرت سے کہا۔

سکندر فوراً ہلکا سا مسکرایا،

"فاسٹ نہیں... بس پوچھنا چاہ رہا تھا۔"

رِمشا نے کندھے ہلکے سے جھٹکے۔

"کچھ نہیں"...

پھر اچانک اس نے بات کا رخ موڑ دیا۔

"ارم-ان کیسا ہے؟"

یہ سوال سنتے ہی سکندر کے چہرے پر ہلکی سی حیرت آ گئی۔

ایک لمحہ وہ خاموش رہا، جیسے جواب کو ترتیب دے رہا ہو۔

پھر آہستہ سے بولا،

"وہ ٹھیک نہیں ہو پا رہا... میں اسے بہت سمجھا رہا ہوں۔"

اس کی آواز میں ایک عجیب سی سنجیدگی تھی۔

رِمشا نے اس کی طرف دیکھا۔

"اب بھی؟"

سکندر نے سر ہلایا۔

"ہاں... وقت گزر گیا ہے مگر وہ اندر سے ابھی تک وہیں رکا ہوا ہے۔"

چند لمحے دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے، خاموشی کے ساتھ۔

ہوا میں ایک عجیب سا وزن تھا۔

رِمشا نے آہستہ سے کہا،

"کبھی کبھی لوگ سمجھانے سے نہیں... صرف وقت سے ٹھیک ہوتے ہیں۔"

سکندر نے اس کی بات سنی، مگر اس کے ذہن میں آرم-ان کا چہرہ گھوم گیا۔

وہ بولا،

"میں جانتا ہوں... مگر پھر بھی کوشش کرتا ہوں۔"

رِمشا نے اسے دیکھا، پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

"آپ ہر کسی کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے ہو نا؟"

سکندر کچھ نہیں بولا۔

بس تھوڑا سا مسکرایا۔

کیونکہ یہ بات غلط نہیں تھی۔

وہ خود بھی اکثر دوسروں کو سنبھالتے سنبھالتے خود کو بھول جاتا تھا۔

اور آج بھی...

وہ ارم-ان کو سنبھال رہا تھا، رِمشا سے بات کر رہا تھا...

مگر کہیں نہ کہیں وہ خود اب بھی کسی الجھن کے بیچ کھڑا تھا۔

سکندر نے تھوڑا سا رک کر، جیسے بات کو خود بھی اندر سے تول رہا ہو، آہستہ سے کہا،

"مسئلہ پتا ہے کیا ہے رِمشا... اگر مومنہ ارم-ان سے دور ہوتی نا، تو شاید وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ جاتا۔"

رِمشا نے اس کی طرف دیکھا، خاموشی سے سنتی رہی۔

سکندر نے بات جاری رکھی،

"مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ ارم-ان کو مومنہ روز دیکھنا پڑتا ہے۔"

اس نے ہاتھ ہلکا سا ہوا میں چلایا، جیسے لفظ ڈھونڈ رہا ہو۔

"وہ سامنے ہوتی ہے... کلاس میں، یونیورسٹی میں... ہر جگہ۔"

پھر اس کی آواز میں ہلکی سی تلخی آ گئی۔

"اور جب کوئی انسان جسے تم نے دل سے چاہا ہو، وہ روز تمہارے سامنے ہو اور پھر بھی تمہارا نہ ہو... تو یادیں ختم نہیں ہوتیں، بڑھ جاتی ہیں، اور انسان زندہ تو ہوتا ہے لیکن جی نہیں پاتا"

رِمشا نے آہستہ سے کہا،

"تو پھر اسے دور ہونا چاہیے۔"

سکندر نے فوراً سر ہلایا،

"یہ اتنا آسان نہیں ہوتا۔"

وہ کچھ لمحے خاموش رہا، پھر بولا،

"وہ اسے بھولنے کی کوشش بھی کرے تو نہیں کر پاتا... کیونکہ بھولنے کا مطلب ہے ہر روز اسے دوبارہ دیکھ کر خود کو توڑنا۔"

رِمشا کی نظریں نرم ہو گئیں۔

سکندر نے بات کو آہستہ سے ختم کیا،

"اسی لیے وہ آگے نہیں بڑھ پا رہا... نہ مکمل یاد رکھ پا رہا ہے، نہ مکمل بھول پا رہا ہے۔"

چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔

پھر رِمشا نے دھیرے سے کہا،

"یعنی وہ درمیان میں پھنس گیا ہے؟"

سکندر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

"ہاں... اور درمیان میں پھنسے لوگ سب سے زیادہ تھک جاتے ہیں۔"

ہوا خاموش تھی۔

اور اس خاموشی میں ارم-ان کی کہانی جیسے ایک بار پھر سچ بن کر کھڑی تھی۔

رِمشا نے سکندر کو تھوڑی دیر دیکھا، جیسے اس کے جواب میں سچ تلاش کر رہی ہو۔

"آپ ٹھیک ہو، سکندر؟"

سکندر نے فوراً ہلکا سا کندھے جھٹکا دیا۔

"ہاں، میں تو ٹھیک ہوں۔"

رِمشا نے آنکھیں سکیڑیں۔

"آپ کو تکلیف نہیں ہوتی کسی چیز سے؟"

یہ سوال تھوڑا سیدھا تھا، تھوڑا گہرا بھی۔

سکندر نے ایک لمحے کو اسے دیکھا، پھر ہنسا۔

"نہیں نہیں... میں انسان تھوڑی ہوں۔"

اس کے لہجے میں وہی پرانا طنز تھا جو وہ اکثر اپنے درد کو چھپانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔

یہ سن کر رِمشا بھی ہنس پڑی۔

"ہاں بس آپ کوئی مشین ہو۔"

سکندر نے ہنستے ہوئے سر ہلایا۔

"بالکل۔ نہ دل ٹوٹتا ہے، نہ فرق پڑتا ہے، نہ کچھ یاد رہتا ہے۔"

مگر جیسے ہی وہ ہنسا، اس کی آنکھوں کے پیچھے ایک لمحے کو کچھ اور سا چمکا تھا۔

رِمشا نے ہنستے ہنستے کہا،

"پھر اپ اتناسب کیوں سوچتے رہتے ہو؟"

سکندر کا قہقہہ تھوڑا سا مدھم ہوا۔

"یہ بھی part of system ہے شاید۔"

وہ چلتے ہوئے تھوڑا سا آگے دیکھنے لگا۔

"انسان نہیں ہوں نا... اس لیے bug آتے رہتے ہیں۔"

رِمشا نے سر ہلایا، مگر اس بار اس کی مسکراہٹ تھوڑی نرم تھی۔

"آپ اپنے آپ کو بہت ہلکا لیتے ہو، مگر اندر سے اتنے بھی ہلکے نہیں ہو۔"

سکندر نے فوراً بات بدلنے کی کوشش کی۔

"اور آپ کو کیسے پتا؟"

رِمشا نے سیدھا جواب دیا،

"کیونکہ جو لوگ زیادہ ہنستے ہیں نا... وہ سب سے زیادہ غم چھپاتے ہیں۔"

یہ جملہ کچھ لمحے فضا میں لٹکا رہا۔

سکندر خاموش ہو گیا۔

مسکراہٹ ابھی بھی تھی، مگر اب وہ پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔

اور رِمشا بھی خاموش ہو گئی۔

دونوں ساتھ چلتے رہے...

مگر اس خاموشی میں پہلی بار ایسا لگا جیسے ہنسی کے پیچھے کچھ اور بھی چھپا ہے جو ابھی لفظ نہیں بنا تھا۔

تبھی اچانک سکندر کے فون کی گھنٹی بجی۔

اس نے اسکرین پر دیکھا دانش کی کال تھی۔

سکندر نے فوراً کال اٹھائی۔

"ہاں دانش؟"

دوسری طرف سے آواز آئی، مگر وہ آواز سکندر کے اندر تک اتر گئی۔

دانش کی سانسیں بے ترتیب تھیں... آواز میں خوف تھا۔

"سکندر... امی... امی کو سانس نہیں آ رہی"...

سکندر کے ہاتھ سے جیسے وقت پھسل گیا۔

"کیا؟"

اس نے بے اختیار آگے جھکتے ہوئے پوچھا۔

دانش کی آواز ٹوٹ رہی تھی،

"اچانک ان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے... وہ... وہ سانس نہیں لے پا رہیں"...

سکندر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

دل ایک دم بھاری ہو گیا۔

"فوراً ایمبولینس بلاؤ! ابھی! انہیں ہسپتال لے جاؤ!" وہ تقریباً چیخ پڑا۔

اس کی آواز کانپ رہی تھی مگر حکم واضح تھا۔

"میں... میں آ رہا ہوں ابھی"!

کال کٹ ہو گئی۔

ایک لمحے کے لیے سکندر بالکل ساکت کھڑا رہا۔

جیسے زمین نے اس کے نیچے سے خود کو کھینچ لیا ہو۔

رِمشا نے فوراً اس کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا؟"

مگر سکندر نے جواب نہیں دیا۔

اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

آنکھوں میں ایک ہی خیال تھا

بس... کچھ برا نہ ہو...

اس نے بغیر کچھ کہے قدم موڑے۔

اور تیزی سے وہاں سے چل پڑا۔

اس کے پیچھے رِمشا کی آواز رہ گئی...

مگر سکندر اب سن ہی نہیں رہا تھا۔

ہوا بھاری ہو چکی تھی...

اور ہر قدم کے ساتھ دل کی دھڑکن تیز تر۔

سکندر تیزی سے جا رہا تھا، مگر اس کے ذہن میں صرف ایک ہی نام گونج رہا تھا... خالہ سلمیٰ۔

وہ اس کے لیے صرف رشتہ نہیں تھیں، ایک سہارا تھیں، ایک گھر جیسا احساس۔

دانش کی گھبرائی ہوئی آواز ابھی بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

اس کے قدم اور تیز ہو گئے۔

دل میں بس ایک ہی دعا تھی

بس خالہ سلمیٰ کے ساتھ کچھ برا نہ ہو...

سکندر یونیورسٹی سے تقریباً بھاگتا ہوا نکلا اور اگلے ہی لمحے بائیک اسٹارٹ کر کے سڑک پر آ چکا تھا۔ جولائی کی تپتی گرمی اس کے جسم پر طاری تھی، گرم

ہوا چہرے سے ٹکرا رہی تھی، ماتھے پر پسینہ بہہ رہا تھا... مگر اسے کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

اس کے دل میں صرف ایک نام دھڑک رہا تھا

خالہ سلمٰی۔

وہ غیر معمولی تیز رفتاری سے بائیک چلاتا جا رہا تھا، جیسے وقت سے مقابلہ کر رہا ہو۔ سڑکیں، گاڑیاں، شور... سب دھندلا سا لگ رہا تھا۔ ہر موڑ پر اس کے ہاتھ بے اختیار اور سختی سے ہینڈل پکڑ لیتے۔

اس کے ذہن میں دانش کی ڈری ہوئی آواز گونج رہی تھی،

"امی کو سانس نہیں آ رہی"...

یہ جملہ اس کے سینے میں ہتھوڑے کی طرح بج رہا تھا۔

گرمی جسم پر تھی...

مگر خوف روح پر۔

اسے بس ایک ہی ڈر کھائے جا رہا تھا

کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔

بائیک ہوا کو چیرتی جا رہی تھی اور سکندر کے لبوں پر بے اختیار دعا تھی

یا اللہ... خالہ سلمیٰ کو کچھ نہ ہو...

اس کے ذہن میں ایک ساتھ اتنا کچھ چل رہا تھا کہ اسے محسوس ہونے لگا جیسے اس کا سر درد سے پھٹ جائے گا۔ خیالات ایک سیدھی لکیر میں نہیں آ رہے تھے، ہجوم کی صورت اس پر حملہ آور تھے۔ ایک خیال آتا تو دوسرا اسے دھکیل دیتا، تیسرا پہلے دونوں کو روندتا ہوا نکل جاتا۔ دماغ جیسے سکون کا مفہوم بھول چکا تھا۔

کبھی بابا یاد آتے۔ ان کا خاموش چہرہ، ان کی تھکی ہوئی آنکھیں، وہ بوجھ جو وہ ہمیشہ بغیر شکایت کے اٹھائے رکھتے تھے۔ سکندر کے دل میں ایک انجانا سا خوف جاگتا کہ کہیں وہ بھی زندگی کی دوڑ میں اپنوں سے دور تو نہیں ہوتا جا رہا۔ وہ سوچتا، انسان اپنے قریبی لوگوں کی قدر اکثر تب کیوں محسوس کرتا ہے جب کوئی خطرہ سامنے آ کھڑا ہو۔

پھر نادیہ کی یاد اچانک کسی پرانے زخم کی طرح جاگ اٹھتی۔ وہ زخم جس پر وقت نے پٹی تو باندھ دی تھی مگر بھرنے نہ دیا تھا۔ اس کا نام آتے ہی دل میں ایک بوجھ اترتا۔ وہی ادھوری محبت، وہی محرومی، وہی سوال کہ اگر کچھ

فیصلے مختلف ہوتے تو کیا آج سب کچھ مختلف ہوتا؟ بائیک دوڑ رہی تھی مگر ذہن ماضی کے انہی ویران راستوں میں بھٹک رہا تھا۔

پھر ارم-ان یاد آتا۔ اس کا بجھا ہوا چہرہ، اس کی خاموش آنکھیں، مومنہ کے جانے کے بعد اس کا بدل جانا۔ سکندر کو احساس ہوتا کہ وہ صرف اپنا درد نہیں اٹھا رہا، دوستوں کے زخم بھی اس کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اسے ارم-ان کے وہ الفاظ یاد آتے اور دل میں ایک عجیب سا ملال بھر جاتا کہ کچھ لوگ ٹوٹنے کے بعد بکھرتے نہیں، بس خاموش ہو جاتے ہیں... اور وہ خاموشی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔

اور پھر رِمشا۔

ابھی کچھ دیر پہلے کی باتیں، ہنسی، ہلکی چھیڑ چھاڑ، اس کا کہنا کہ اتنا اوور تھنکر نہ بنو... یہ سب چند لمحے پہلے تک سکون لگ رہا تھا، مگر اب وہی سب یادیں کسی اور دنیا کی چیز محسوس ہو رہی تھیں۔ جیسے زندگی نے ایک لمحہ مسکرایا ہو اور اگلے ہی لمحے چہرہ بدل لیا ہو۔

مگر ان سب خیالات کے اوپر ایک خوف مسلسل سایہ کیے ہوئے تھا،

خالہ سلمیٰ۔

یہ خیال کہ وہ اچانک سانس نہیں لے پا رہیں...

یہ تصور ہی اس کے اندر ہلچل مچا رہا تھا۔

وہ اس کے لیے صرف خالہ نہیں تھیں، اپنے پن کا احساس تھیں۔ ان کے ساتھ کچھ ہو جانے کا خیال اس کے دل کو کاٹ رہا تھا۔ اس کے اندر بار بار یہی سوال اٹھ رہا تھا،

اگر دیر ہو گئی تو؟

یہ سوال ہر چند لمحے بعد واپس آتا، پہلے سے زیادہ بھاری ہو کر۔

اسے لگ رہا تھا جیسے دماغ کے اندر شور بھر گیا ہو۔ ماتھے کی رگیں تن رہی تھیں، سر میں درد دھڑک رہا تھا، مگر وہ بائیک کی رفتار کم نہیں کر رہا تھا۔ وہ جیسے صرف ہسپتال نہیں پہنچنا چاہتا تھا، وہ وقت کو پیچھے چھوڑ دینا چاہتا تھا۔

جولائی کی تپتی ہوا چہرے سے ٹکرا رہی تھی، مگر اس کے اندر کا خوف اس گرمی سے کہیں زیادہ شدید تھا۔

وہ سڑک پر تھا، مگر حقیقت میں کئی سمتوں میں بٹا ہوا تھا

ماضی، حال، دوستی، محبت، خاندان، خوف...

سب ایک ساتھ اس کے اندر چل رہا تھا۔

اور اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ انسان کبھی کبھی اتنا کچھ ایک ساتھ اٹھالیتا ہے
کہ دل نہیں، پورا وجود تھکنے لگتا ہے۔

مگر ان تمام خیالات، تمام شور، تمام درد کے بیچ اس کے دل میں ایک ہی نام
بار بار دھڑک رہا تھا

خالہ سلمٰی...

اور اس نام کے ساتھ ایک ہی دعا

یا اللہ... بس دیر نہ ہو۔

تبھی اس کے فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔

بائیک کی رفتار تیز تھی، ہوا شور کر رہی تھی، مگر اس گھنٹی کی آواز جیسے سیدھا
اس کے دل پر لگی۔ ایک لمحے کو اس کے ہاتھ سرد پڑ گئے۔ اس نے جلدی
سے اسکرین پر نظر ڈالی

دانش۔

یہ نام دیکھتے ہی اس کے اندر ایک نیا خوف جاگ اٹھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے کی دانش کی گھبرائی ہوئی آواز ویسے ہی اس کے ذہن میں گونج رہی تھی، اور اب دوبارہ اس کی کال...

سکندر پہلے سے زیادہ گھبرا گیا۔

اس نے بغیر وقت ضائع کیے بائیک چلاتے ہوئے ہی کال اٹھالی۔

"ہاں دانش... کیا ہوا؟"

اس کی آواز میں عجلت بھی تھی، خوف بھی۔

مگر دوسری طرف...

خاموشی۔

ایسی خاموشی کہ جیسے کال جڑی ہو مگر دنیا دوسری طرف رک گئی ہو۔

سکندر چند لمحے سمجھ ہی نہ سکا۔

اس نے پھر پکارا،

"دانش؟"

کوئی جواب نہیں۔

صرف خاموشی۔

اس کا دل عجیب طرح دھڑکنے لگا۔ ہاتھ ہینڈل پر سخت ہو گئے۔

اس نے آواز بلند کی۔

"دانش بولو! کیا ہوا؟ خالہ ٹھیک ہیں؟"

مگر دوسری طرف جیسے لفظ مر چکے تھے۔

نہ سانسوں کی آواز۔

نہ گھبراہٹ۔

نہ رونے کی۔

کچھ بھی نہیں۔

بس ایک خاموش، ڈرانے والی موجودگی۔

وہ خاموشی جتنی لمبی ہو رہی تھی، سکندر کے ذہن میں اتنے ہی خوفناک خیال جنم لے رہے تھے۔

کیا دانش بول نہیں پا رہا؟

کیا وہ رو رہا ہے؟

کیا ہسپتال پہنچ گئے؟

یا...

یہ "یا" ہی اس کے اندر دہشت بن رہا تھا۔

اچانک

بغیر کچھ کہے کال کٹ گئی۔

بس یوں ہی۔

ایک دم۔

سکندر کے لیے جیسے وقت ایک لمحے کو رک گیا۔

اس نے بے اختیار فون کو دیکھا، پھر سڑک کو۔

سمجھ نہیں آیا یہ کیا تھا۔

دانش نے کچھ کہا کیوں نہیں؟

اگر سب ٹھیک تھا تو خاموش کیوں رہا؟

اور اگر کچھ ٹھیک نہیں تھا...

تو کیا وہ خبر دینے کی ہمت نہ کر سکا؟

یہ خیال آتے ہی سکندر کے سینے میں جیسے برف اتر گئی۔

اسے محسوس ہوا اس کی سانس بھاری ہو رہی ہے۔

سر میں پہلے سے موجود درد اور بڑھ گیا۔

جیسے ہر خدشہ اب حقیقت بننے کے قریب ہو۔

اس نے بے اختیار بائیک کی رفتار اور تیز کر دی۔

اب وہ صرف جا نہیں رہا تھا...

دوڑ رہا تھا۔

وقت کے خلاف۔

خوف کے خلاف۔

اس نامعلوم خبر کے خلاف جس کا سایہ اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔

سڑک دھندلی لگنے لگی۔

ہارنوں کی آوازیں دور کہیں گم ہو گئیں۔

اس کے کانوں میں صرف ایک چیز گونج رہی تھی

وہ خاموش کال۔

وہ نہ بولنا۔

وہ اچانک فون کا کٹ جانا۔

کبھی کبھی الفاظ نہیں...

خاموشی زیادہ ڈرا دیتی ہے۔

اور اس وقت سکندر کو دانش کی خاموشی کسی بری خبر سے بھی زیادہ خوفناک لگ رہی تھی۔

دانش کی خاموش کال نے سکندر کے دل میں ایسا خوف بٹھا دیا تھا کہ اب ہر گزرتا لمحہ اسے بھاری لگنے لگا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے مگر اس نے ایک ہاتھ سے ہینڈل سنبھالتے ہوئے فوراً فون نکالا اور اپنی ماں سلمیٰ جٹ کو کال ملائی۔

گھنٹی بجتی رہی۔

ایک بار۔

دو بار۔

تین بار۔

مگر کسی نے فون نہ اٹھایا۔

سکندر کے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔

"اٹھائیں... خدا کے لیے اٹھائیں"...

وہ بے اختیار بڑبڑایا۔

اس نے فوراً کال کاٹی اور داؤد کو فون ملایا۔

اس بار اسے یقین تھا داؤد اٹھا لے گا۔

مگر وہاں بھی صرف گھنٹی۔

اور پھر خاموشی۔

کسی نے جواب نہ دیا۔

اس لمحے اس کے اندر خوف نے غصے کی شکل اختیار کر لی۔

ایسا غصہ جو بے بسی سے پیدا ہوتا ہے۔

"آخر سب فون کیوں نہیں اٹھا رہے؟"

اس کے ہونٹوں سے جھنجھلائے ہوئے انداز میں نکلا۔

اب اسے ہر خاموشی بری خبر لگنے لگی تھی۔

دانش کا خاموش رہنا۔

ماں کا فون نہ اٹھانا۔

داؤد کا جواب نہ دینا۔

جیسے سب کچھ مل کر کسی انجانے حادثے کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔

اس کے ماتھے کی رگیں تن گئیں۔

جبڑہ بھینچ گیا۔

اور اگلے ہی لمحے غصے میں اس نے بائیک کی رفتار اور تیز کر دی۔

اتنی تیز کہ ہوا اب چہرے سے نہیں، جسم کو چیرتی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ اب صرف جلدی نہیں کر رہا تھا

وہ بھاگ رہا تھا۔

اپنے خدشوں سے۔

اپنی بے بسی سے۔

اور شاید اس خبر سے بھی جسے سننے سے وہ ڈر رہا تھا۔

اس نے ہینڈل کو اور مضبوطی سے پکڑا اور بائیک سڑک پر تیر کی طرح دوڑا دی۔

دل میں بس ایک ہی چیخ تھی،

یا اللہ... خالہ سلمیٰ کو کچھ نہ ہو۔

جیسے ہی سکندر گھر پہنچا، اس نے بائیک کو تقریباً روکنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ وہ اسے جیسے کھینچتا ہوا چھوڑ کر فوراً نیچے اترا اور بغیر ایک لمحہ ضائع کیے اندر کی طرف دوڑ پڑا۔ اس کے لیے نہ بائیک کی فکر تھی، نہ اردگرد کا شور، نہ راستے میں آنے والے لوگ۔ اس کے ذہن میں بس ایک ہی چیز چل رہی تھی خالہ سلمیٰ۔ دل پہلے ہی ڈر سے بھرا ہوا تھا اور ہر قدم کے ساتھ وہ خوف اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اسے غیر معمولی خاموشی اور پھر ایک ہجوم نظر آیا جو ایک ہی جگہ اکٹھا تھا۔ کچھ لوگ سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے، کچھ کی آنکھیں نم تھیں، اور کچھ خاموش کھڑے تھے جیسے کسی صدمے میں جم گئے ہوں۔ اس منظر نے سکندر کے دل کو ایک دم سے بھاری کر دیا۔ اسے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی، اس کے اندر کسی نے پہلے ہی سچ بتا دیا تھا کہ کچھ بہت برا ہو چکا ہے۔

وہ تیزی سے ہجوم کی طرف بڑھا، لوگوں کو ہٹاتے ہوئے بے تابی سے آگے نکلا۔ "ہٹو... مجھے دیکھنے دو..." اس کی آواز میں بے چینی اور گھبراہٹ واضح تھی۔ ہر کوئی اسے راستہ دے رہا تھا مگر اس کے قدم جیسے اپنے ہی وزن سے لڑ رہے تھے۔ اور پھر وہ لمحہ آیا جب وہ اس جگہ پہنچا جہاں سب کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔

زمین پر سفید چادر کے نیچے خالہ سلمیٰ کا بے جان جسم پڑا تھا۔

وہ منظر دیکھتے ہی سکندر کے پاؤں جیسے زمین میں دھنس گئے۔ اس کے سینے میں سانس ایک دم رک گئی۔ آنکھیں پھیل گئیں، ہونٹ ہلنے کی کوشش کرتے رہے مگر آواز کہیں کھو گئی۔ اسے لگا جیسے وقت ایک لمحے کو نہیں،

ہمیشہ کے لیے رک گیا ہو۔ وہ عورت جو اس کے لیے گھر جیسی تھیں، جس کی موجودگی اس کے بچپن کا حصہ تھی، اب بالکل ساکت پڑی تھیں بغیر آواز، بغیر حرکت، بغیر زندگی۔

"نہیں"...

یہ لفظ اس کے اندر کہیں ٹوٹ کر رہ گیا۔ وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے مگر جسم ساتھ نہیں دیتا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے، ٹانگیں کمزور ہو رہی تھیں، اور دل جیسے مکمل طور پر بوجھ تلے آ چکا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ حقیقت ہے۔ ہر لمحہ وہ خود کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاید وہ غلط دیکھ رہا ہے، شاید سب خواب ہے، مگر سامنے کا منظر اسے بار بار توڑ رہا تھا۔

اسی لمحے اس کی ماں، سلمیٰ جٹ، کی چیخ سنائی دی جو پورے گھر میں گونج اٹھی۔ وہ خالہ سلمیٰ کے قریب بیٹھ کر زور زور سے رو رہی تھیں، ان کا رونا خاموش نہیں تھا بلکہ ایسا تھا جو دل چیر دیتا ہے۔ "سلمیٰ... میری بہن..." ان کی آواز بار بار ٹوٹ رہی تھی، سسکیاں الفاظ کو توڑ رہی تھیں، اور ان کا پورا جسم صدمے سے کانپ رہا تھا۔

سکندر وہیں کھڑا تھا، بالکل ساکت۔ اس کے اندر جیسے ہر چیز رک گئی تھی۔ نہ آنسو آ رہے تھے، نہ آواز نکل رہی تھی، بس ایک گہرا سناٹا تھا جو اس کے وجود میں پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا مگر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے لیے یہ لمحہ صرف ایک حادثہ نہیں تھا... یہ اس کی پوری دنیا کا ٹوٹ جانا تھا۔

داؤد بھی وہیں بیٹھا اپنی خالہ کے لیے رو رہا تھا، اس کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ہر سسکی کے ساتھ وہ جیسے اندر سے اور ٹوٹ رہا تھا۔ دوسری طرف دانش خاموش بیٹھا تھا، آنکھوں میں آنسو تھے مگر وہ رو نہیں پا رہا تھا، بس خالی نظروں سے ایک ہی جگہ دیکھے جا رہا تھا جیسے ابھی تک اسے یقین ہی نہ آیا ہو کہ اس کی ماں اب اس دنیا میں نہیں رہی۔

پورا گھر ماتم میں ڈوبا ہوا تھا، ہر طرف رونے کی آوازیں تھیں، مگر سکندر کے لیے سب کچھ دھندلا سا ہو چکا تھا۔ وہ وہیں کھڑا تھا، جیسے کسی نے اس کے جسم سے جان نکال دی ہو۔ اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب اچانک کیسے ہو گیا، چند گھنٹوں میں سب کچھ کیسے بدل گیا۔

اس کے ذہن میں ایک ہی سوال بار بار ٹکرا رہا تھا

ابھی تو سب ٹھیک تھا... پھر یہ سب کیسے؟

وہ کبھی داؤد کو دیکھتا، کبھی دانش کو، کبھی اپنی ماں کو جو خالہ سلمٰی کے پاس بیٹھی رو رہی تھیں۔ مگر اس کے اندر کوئی چیز کام نہیں کر رہی تھی، جیسے اس کا شعور ہی کہیں رک گیا ہو۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، کچھ پوچھنا چاہتا تھا، مگر الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ زبان جیسے بھاری ہو گئی ہو۔ صرف ایک چیز باقی تھی ایک گہرا، سنّاٹا بھرا اجھٹکا جو اس کے پورے وجود میں اتر چکا تھا۔

اور اس لمحے سکندر کو پہلی بار احساس ہوا کہ کچھ صدمے ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو رونے بھی نہیں دیتے... بس اندر سے خالی کر دیتے ہیں۔

خالہ سلمٰی اور سلمٰی جٹ دونوں ایسی عورتیں تھیں جن کی زندگی عبادت، صبر اور یقین کے گرد گھومتی تھی۔ وہ مشکل وقت میں بھی اللہ پر بھروسہ رکھتیں، دعا کو اپنا سہارا بناتیں، اور ہر دکھ کو خاموشی سے برداشت کر لیتیں۔ ان کے قریب رہنے والوں کو ہمیشہ یہی لگتا تھا کہ وہ ایمان اور سکون کی ایک مثال ہیں۔

لیکن سکندر کے ساتھ اس وقت جو ہوا تھا، اس نے اس کی پوری سوچ کو ہلا دیا تھا۔ خالہ سلمٰی کا اچانک چلا جانا اس کے لیے صرف ایک حادثہ نہیں تھا، بلکہ

ایک ایسا جھٹکا تھا جس نے اس کے اندر کے تمام یقین کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے دعائیں سنائی ہی نہیں دیتیں، جیسے حفاظت کا کوئی نظام موجود ہی نہیں۔

وہ اندر ہی اندر ٹوٹ چکا تھا۔

اب اس کے دل میں ایک خلا تھا، ایک ایسا سوال جس کا جواب اسے کہیں نہیں مل رہا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا تھا، باتیں کم ہو گئی تھیں، اور عبادت کا تصور بھی اس کے لیے بھاری ہو چکا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ خدا سے دور ہو گیا ہے، یا شاید خدا اس سے۔

یہی وجہ تھی کہ اب اس کے اندر یقین کی جگہ سوالات نے لے لی تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر خالہ سلمیٰ جیسی نیک، صابر اور اچھے دل والی انسان کے ساتھ ایسا ہو سکتا ہے تو پھر انصاف کہاں ہے؟ دعا کیوں؟ بھروسہ کیوں؟

مگر اس سب کے باوجود، اس کے اندر کہیں بہت گہرائی میں ایک ایسی جگہ بھی تھی جو مکمل طور پر خاموش نہیں ہوئی تھی۔ وہ جگہ اب بھی کسی جواب کی منتظر تھی، کسی سکون کی تلاش میں تھی، چاہے وہ خود اسے محسوس نہ کر رہا ہو۔

وہ آہستہ آہستہ دانش کے قریب آیا۔ اس کے قدم بھاری تھے، جیسے ہر قدم کے ساتھ وہ اپنے ہی اندر کے کسی ٹوٹے حصے کو ساتھ لے کر چل رہا ہو۔

دانش اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا، آنکھیں سرخ، چہرہ بھیگا ہوا، اور دل جیسے مکمل طور پر خالی ہو چکا تھا۔

سکندر اس کے پاس جا کر رک گیا۔

چند لمحے وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ الفاظ کہیں دور رہ گئے تھے۔ بس اتنا سا تعلق بچا تھا جو دکھ کو سمجھ سکتا تھا، الفاظ کو نہیں۔

پھر اس نے آہستہ سے آگے بڑھ کر دانش کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

یہ لمحہ خاموش تھا، مگر بہت بھاری۔

جیسے ہی دانش سکندر سے لگا، وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کا سارا صبر، ساری ہمت، ساری خاموشی ایک دم ٹوٹ گئی۔ وہ زور زور سے رونے لگا، اس کے کندھے ہچکولے لینے لگے، اور آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"امی..." وہ بس یہی لفظ بار بار دہرا رہا تھا، جیسے اس کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہا ہو۔

سکندر نے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔

اس کے ہاتھ دانش کی پیٹھ پر تھے، مگر اس کے اندر خود بھی کچھ لرز رہا تھا۔ وہ کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا، بس خاموشی سے اسے سہارا دے رہا تھا۔ اس لمحے وہ دوست نہیں تھا، کوئی نصیحت کرنے والا نہیں تھا... بس ایک انسان تھا جو دوسرے ٹوٹے ہوئے انسان کو گرنے سے بچا رہا تھا۔

ادھر اردگرد کا شور اب بھی موجود تھا، رونے کی آوازیں، دعا کے الفاظ، آہ و بکا... مگر سکندر اور دانش کے درمیان ایک الگ ہی خاموشی تھی۔

ایک ایسی خاموشی جس میں صرف درد سمجھا جا سکتا تھا، بیان نہیں۔

سکندر کو پہلی بار شدت سے احساس ہوا کہ کبھی کبھی الفاظ کسی کے کام نہیں آتے...

بس ایک ہاتھ ہوتا ہے جو گرنے سے پہلے تھام لے۔

سکندر گھر میں کھڑا سب کو دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف رونے کی آوازیں تھیں، سسکیاں تھیں، دعا تھی، اور ایک ایسا سناٹا جو چیخ سے بھی زیادہ بھاری لگ رہا تھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ رو دے... دل ہلکا ہو جائے... مگر آنکھوں میں

جیسے آنسو جم گئے تھے۔ اندر سب کچھ ٹوٹ رہا تھا، مگر باہر کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

وہ آگے بڑھا اور اپنی ماں سلمیٰ جٹ کے پاس گیا۔ وہ زمین پر بیٹھی خالہ سلمیٰ کے غم میں بالکل ٹوٹ چکی تھیں۔ سکندر نے انہیں آہستہ سے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے ہاتھ ان کی پیٹھ پر تھے، مگر وہ خود بھی کانپ رہا تھا۔ اس نے انہیں خاموش کرانے کی کوشش کی، تسلی دینے کی کوشش کی، مگر اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔

سلمیٰ جٹ پہلے ہی زندگی کے دو بڑے صدمے سہہ چکی تھیں۔ ایک اپنے شوہر کا دکھ، اور اب اپنی بہن کا اچانک چلا جانا۔ اب ان کے لیے جیسے کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ وہ مکمل طور پر تنہا ہو گئی تھیں، اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔ ان کا رونا صرف آنسو نہیں تھا، وہ ایک ٹوٹا ہوا انسان تھا جو سب کچھ کھو چکا ہو۔

سکندر یہ سب دیکھ رہا تھا مگر خود کچھ کر نہیں پا رہا تھا۔ وہ سب کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر خود اندر سے خالی ہو رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے

وہ ایک ایسے طوفان کے بیچ کھڑا ہے جہاں ہر طرف صرف نقصان ہی نقصان ہے... اور اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں۔

سب محلے دار اسے دلاسہ دے رہے تھے۔ کوئی کہتا "اللہ صبر دے گا"، کوئی کہتا "اللہ سب ٹھیک کر دے گا"، اور ہر طرف ایک ہی طرح کے جملے بار بار سنائی دے رہے تھے۔ مگر سکندر کے لیے یہ الفاظ اب آواز نہیں رہے تھے... شور بن چکے تھے۔

اس کے کانوں میں جیسے ایک ہی بات گونج رہی تھی، بار بار، مسلسل، بے ترتیب۔ اتنا شور کہ اس کا سر درد سے پھٹنے لگا۔ وہ پہلے ہی اندر سے بکھرا ہوا تھا، اور یہ جملے اس کی کیفیت کو اور بھاری کر رہے تھے۔

اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ایک گہرا سانس لیا، پھر دوسرا۔ آنکھیں بند کیں، جیسے خود کو اس ہجوم، اس آوازوں اور اس درد سے کچھ لمحے کے لیے الگ کرنا چاہتا ہو۔ مگر دل تھا کہ خاموش ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

اس نے اپنے اندر ایک جنگ محسوس کی رونے اور نہ رونے کے درمیان، ٹوٹنے اور سنبھلنے کے درمیان۔ وہ چاہتا تھا کہ سب کچھ نکل جائے، مگر کچھ تھا

جو اسے روک رہا تھا... شاید صدمہ، شاید بے یقینی، یا شاید وہ لمحہ جب انسان اتنا کچھ ایک ساتھ سہہ لے کہ آنسو بھی راستہ بھول جائیں۔

وہ وہیں کھڑا رہا، خاموش، بے حس سی دنیا کے بیچ ایک زندہ لیکن تھکے ہوئے وجود کی طرح۔ باہر لوگ اسے دلاسہ دے رہے تھے، مگر اندر وہ خود کو ہی سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سکندر اس صدمے کے درمیان بھی کسی طرح خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گھر میں شور، رونا، محلے داروں کی آمد، اور ہر طرف پھیلی ہوئی بے چینی... سب مل کر اس کے اعصاب پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ اسی کیفیت میں اس نے فون اٹھایا اور ایک ایک کر کے تمام رشتہ داروں کو اطلاع دینا شروع کر دی کہ گھر میں کیا ہوا ہے۔

کچھ ہی دیر میں گھر میں مزید لوگ آنا شروع ہو گئے۔ رشتے دار، جاننے والے، اور دور کے عزیز... ہر کوئی افسوس کرنے آ رہا تھا، مگر اس کے لیے وقت جیسے تھم گیا تھا۔ ان سب چہروں کے بیچ ایک چہرہ بھی آیا ماموں سجاد۔

وہ آئے تو سکندر نے ایک لمحے کو انہیں دیکھا، مگر اس نظر میں نہ امید تھی نہ سکون۔ ماموں سجاد وہ تھے جو صرف نام کے رشتے دار رہ گئے تھے۔ نہ وہ دانش

کے کسی مشکل وقت میں ساتھ تھے، نہ سکندر کے دکھوں میں کبھی واقعی شریک ہوئے تھے۔

شادی کے بعد وہ بدل گئے تھے۔ جو انسان پہلے اپنی بہنوں کے قریب تھا، وقت کے ساتھ وہی دور ہوتا چلا گیا۔ جیسے اپنی ہی خونی رشتوں سے فاصلے بنا لیے ہوں۔ اب ان کا آنا صرف ایک رسمی موجودگی تھی، کسی حقیقی سہارا بننے کی طاقت نہیں تھی۔

سکندر نے انہیں دیکھا مگر کچھ نہیں کہا۔ شاید اس کے اندر اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ کسی سے شکوہ کرے۔ اس وقت اسے صرف ایک چیز کی کمی محسوس ہو رہی تھی حقیقی ساتھ کی، ایسے لوگوں کی جو صرف نام کے نہیں، وقت کے بھی رشتے ہوں۔

گھر کا ماحول پہلے سے زیادہ بھاری ہو چکا تھا۔ ہر کوئی آیا تھا، ہر کوئی افسوس کر رہا تھا، مگر سکندر کے دل میں ایک عجیب سا خلا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اتنے لوگوں کے ہونے کے باوجود، اصل درد میں ہر کوئی کہیں نہ کہیں دور ہی کھڑا ہے۔

پھر جنازے کا وقت ہوا۔

گھر کا وہی صحن جہاں کچھ دیر پہلے چیخیں تھیں، اب ایک عجیب سی خاموشی میں ڈوب چکا تھا۔ لوگ قطاروں میں کھڑے تھے، نظریں جھکی ہوئی تھیں، اور ہر چہرے پر وہی بھاری اداسی تھی جو الفاظ میں نہیں آتی۔

جب میّت کو اٹھایا جانے لگا تو فضا اور زیادہ بوجھل ہو گئی۔ ہر قدم کے ساتھ رونے کی آوازیں تیز ہو رہی تھیں۔ اسی لمحے سلمیٰ جٹ کی طبیعت مزید بگڑ گئی۔ وہ پہلے ہی ٹوٹ چکی تھیں، اب جیسے ان کے اندر کی آخری ہمت بھی ختم ہو گئی۔ لوگ انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے، مگر وہ صرف سسک رہی تھیں، بے بس، خالی، اور مکمل طور پر ٹوٹی ہوئی۔

سکندر نے ایک لمحے کو انہیں دیکھا...

مگر پھر اس نے نظر ہٹا لی۔

کیونکہ اس وقت ہر چیز سے زیادہ ضروری وہ آخری سفر تھا۔

آہستہ آہستہ جب جنازہ اٹھایا گیا تو سکندر آگے بڑھا۔ اس کے قدم بھاری تھے، سانسیں بے ترتیب، مگر اس نے خود کو مضبوط رکھا۔ اور پھر اس نے اپنا کندھا آگے کیا۔

میّت اس کے کندھے پر رکھی گئی۔

اس لمحے اس کے جسم میں ایک جھٹکا سا لگا، مگر وہ نہیں ہٹا۔ اس نے دانت بھینچ لیے، نظریں جھکا لیں، اور قدم بڑھا دیے۔

اس کے ساتھ ساتھ لوگ چلنے لگے۔

خاموشی ایسی تھی جیسے پوری دنیا ایک لمحے کے لیے رک گئی ہو۔

سکندر چل رہا تھا…

مگر اس کے اندر کچھ ہر قدم کے ساتھ ٹوٹ رہا تھا۔

نہ آنسو تھے، نہ آواز…

صرف ایک بھاری سا احساس تھا جو اس کے وجود کو دبا رہا تھا۔

آگے راستہ تھا، قبرستان کی طرف۔

اور پیچھے وہ گھر تھا جہاں اب صرف یادیں رہ گئی تھیں۔

سکندر کو ہر قدم پر یہی لگ رہا تھا کہ وہ صرف جنازہ نہیں اٹھا رہا…

بلکہ اپنی زندگی کا ایک حصہ بھی ساتھ لے جا رہا ہے۔

خالہ سلمیٰ کی موت اچانک سانس بند ہو جانے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ یہ بات سکندر کے ذہن میں بار بار گونج رہی تھی، جیسے کسی نے ایک ہی جملہ اس کے اندر کھود کر رکھ دیا ہو۔

"اچانک... سانس بند ہو گئی"...

یہ لفظ اس کے لیے صرف خبر نہیں تھے، یہ ایک ایسا بوجھ تھے جو ہر قدم کے ساتھ اس کے اندر گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی اپنی دنیا بھی ساتھ ساتھ دفن ہو رہی ہو۔ ہر آواز دور ہوتی جا رہی تھی، ہر چہرہ دھندلا، ہر لمحہ بھاری۔ وہ چل تو رہا تھا، مگر اندر سے جیسے کہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

اس کے ذہن میں ایک خوفناک خیال بار بار اٹھ رہا تھا

کہ وہ جس کے بھی قریب ہوتا ہے... وہ اس سے دور چلا جاتا ہے۔

یعقوب جٹ...

نادیہ...

اور اب خالہ سلمیٰ...

ہر رشتہ جیسے اس کے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسلتا جا رہا تھا۔ وہ جتنا تھامنے کی کوشش کرتا، اتنا ہی سب کچھ بکھرتا محسوس ہوتا۔

اسے لگ رہا تھا جیسے وہ خود ہی کسی انجانی بدقسمتی کا حصہ ہو۔

اس کے قدم قبرستان کی طرف بڑھ رہے تھے، مگر دل میں ایک اور ہی قبر کھد رہی تھی اس کے اپنے یقین کی، اس کے اپنے سکون کی۔

وہ خود سے بھی نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔

اور پہلی بار اسے یوں محسوس ہوا کہ شاید مسئلہ صرف جانے والوں کا نہیں...

شاید کچھ ٹوٹا ہوا حصہ اس کے اندر بھی ہے، جو ہر رشتے کو تھکا دیتا ہے۔

کچھ وقت لگا اور قبر مکمل ہو گئی۔

مٹی کی آخری تہہ ڈالی گئی تو جیسے فضا اور بھی بھاری ہو گئی۔ سب لوگوں نے خاموشی سے ہاتھ اٹھائے، دعا کی، اور ایک ایک کر کے واپس مڑنے لگے۔ کچھ کے قدم تیز تھے، کچھ کے سست، مگر ہر کوئی اپنے اپنے دکھ کے ساتھ لوٹ رہا تھا۔

سکندر وہیں کھڑا تھا۔

اس کی نظریں قبر پر جمی ہوئی تھیں، مگر وہ اب دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔ سب کچھ دھندلا سا ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے مٹی تھی، مگر ذہن میں وہ لمحے تھے جب خالہ سلمٰی زندہ تھیں ہنستی ہوئی، بولتی ہوئی، گھر کو بھرا ہوا رکھنے والی۔

اب وہ سب کچھ مٹی کے نیچے تھا۔

اس کے جسم میں جیسے طاقت ختم ہو چکی تھی۔ قدم اٹھانے کی کوشش کرتا تو لگتا زمین نے اسے پکڑ لیا ہو۔ وہ چلنا چاہتا تھا، مگر جسم ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اندر سے کچھ ٹوٹ ٹوٹ کر اسے بٹھا دینا چاہ رہا تھا۔

وہ پیچھے رہ گیا۔

سب لوگ آہستہ آہستہ واپس جا رہے تھے، مگر سکندر جیسے وہیں کسی اور ہی دنیا میں کھڑا تھا۔ اس کی سانسیں بھاری تھیں، آنکھیں نم، اور دل میں ایک ایسی خاموشی تھی جو چیخ سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی۔

اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے اندر کی ساری طاقت اس قبر کے ساتھ دفن ہو گئی ہو۔

وہ جس کے بھی قریب ہوتا تھا... وہ دور چلا جاتا تھا۔

یہ خیال اب صرف سوچ نہیں رہا تھا، یہ اس کے وجود پر بیٹھ چکا تھا۔

اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، مگر وہ پھر بھی آہستہ آہستہ واپس مڑنے لگا۔

مگر اس کے اندر کوئی چیز اب بھی وہیں قبر کے پاس رہ گئی تھی

ایک ٹوٹا ہوا یقین، ایک بکھرا ہوا دل، اور ایک ایسی خاموشی جو اب شاید کبھی ختم نہ ہو۔

سکندر قبرستان سے واپس آ رہا تھا مگر اب وہ پہلے والا سکندر نہیں رہا تھا۔ راستے میں لوگ دعا کر رہے تھے، تسلی دے رہے تھے، "اللہ صبر دے گا" جیسے جملے بار بار سنائی دے رہے تھے، مگر یہ سب اس کے لیے جیسے کسی اور دنیا کی آوازیں تھیں، جن کا اس کی حالت سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔

اس کے اندر کچھ ٹوٹ چکا تھا... اور وہ بار بار ٹوٹ رہا تھا۔

اسے اپنے بابا یعقوب جٹ یاد آ رہے تھے۔ وہ ایک سادہ مگر بہت مضبوط ایمان رکھنے والے انسان تھے، جو دین کو اپنی زندگی کا حصہ سمجھتے تھے۔ اسی

طرح خالہ سلمٰی بھی تھیں نرم دل، صابر، اور اللہ پر یقین رکھنے والی عورت۔ دونوں اس کی زندگی کے وہ ستون تھے جنہیں وہ ہمیشہ محفوظ سمجھتا تھا۔

مگر اب دونوں اس دنیا سے جا چکے تھے۔

اور یہی حقیقت سکندر کے لیے سب سے بڑا صدمہ بن کر اس کے اندر بیٹھ گئی تھی۔

اسے لگ رہا تھا جیسے وہ لوگ جو یقین، صبر اور دعا کی مثال تھے... وہ بھی اس کے سامنے چھن گئے ہیں۔ اور یہ خیال اس کے دل کو مزید بھاری کر رہا تھا۔

وہ خاموش تھا، مگر یہ خاموشی سکون نہیں تھی۔ یہ ایک ایسا اندرونی بوجھ تھا جس نے اس کے سوچنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کی طاقت کو تھکا دیا تھا۔

وہ چل رہا تھا مگر جیسے ہر قدم کے ساتھ اس کے اندر کچھ اور گر رہا ہو۔

اس وقت اس کی دنیا میں صرف ایک ہی احساس تھا

کہ ہر چیز جو وہ اپنے قریب سمجھتا ہے... وہ ایک ایک کر کے اس سے دور ہو رہی ہے۔

سکندر نے مذہب پر یقین کرنا چھوڑ دیا تھا اب وہ مذہب سے بالکل دور ہو چکا تھا اور دین سے دور ہو چکا تھا نمازوں سے دور ہو چکا ہے اب کسی بھی مزہب پر یقین نہیں رکھتا تھا اسے لگتا تھا مذہب انسان کو جھوٹی تسلی دیتے ہیں انسان کو ٹھیک نہیں کرتے مزید توڑ دیتے ہیں۔

اب وہ ایک کافر تھا۔

ارم-ان اور سکندر دونوں اپنی زندگی کے مشکل ترین دور سے گزرنے کے بعد آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ دونوں کے اندر الگ الگ زخم تھے، الگ الگ ٹوٹ پھوٹ تھی، مگر ایک چیز مشترک تھی دونوں ہی کسی نہ کسی طرح زندگی سے لڑتے لڑتے تھک چکے تھے۔

اب وہ اکثر ساتھ رہنے لگے تھے۔ کبھی یونیورسٹی کے بعد کہیں بیٹھ جاتے، کبھی بے مقصد سڑکوں پر گھومتے رہتے، اور کبھی اچانک فیصلہ کر کے کہیں باہر نکل جاتے۔ چھوٹے چھوٹے کام، جیسے ایک ساتھ کھانا کھالینا، یا کسی جگہ خاموش بیٹھ جانا، اب ان کے لیے بڑی بات نہیں رہی تھی۔

دونوں نے آہستہ آہستہ ایک دوسرے کو سہارا دینا شروع کر دیا تھا۔ جہاں سکندر خاموش ہو جاتا، وہاں ارم-ان بول دیتا۔ جہاں ارم-ان ٹوٹنے لگتا، وہاں سکندر اسے سنبھال لیتا۔ یہ کوئی مکمل خوشی نہیں تھی، بلکہ ایک ایسی دوستی تھی جو دکھ کے بیچ جنم لے رہی تھی۔

ان دونوں کے لیے یہ ساتھ ایک عارضی سکون تھا... مگر اس سکون کے پیچھے بھی ایک خاموش درد موجود تھا، جو کبھی کبھی ان کی آنکھوں سے جھلک جاتا تھا۔

ایک دن وہ دونوں بائیک پر کہی جارہے تھے ارمان بائیک چلارہا تھا۔

سکندر نے ہلکی سی خاموشی کے بعد آہستہ سے پوچھا،

"تیری سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟"

ارم-ان نے ایک لمحہ سناٹا سا محسوس کیا، پھر تھکے ہوئے لہجے میں بولا،

"دو خواہشیں ہیں میری"...

سکندر نے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا؟"

ارم-ان نے گہری سانس لی۔

"پہلی... یہ کہ تو پھر سے دین کے قریب ہو جائے... اور دوسری"...

وہ رُکا، نگاہیں نیچی ہو گئیں۔

"کاش مومنہ واپس آجائے"...

سکندر چند لمحے خاموش رہا۔ اس نے ارم-ان کے چہرے کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں وہی خالی پن تھا جو وہ خود کئی دنوں سے محسوس کر رہا تھا۔

پھر وہ آہستہ سے بولا،

"تیری دوسری خواہش ہی پوری ہو سکتی ہے ارم-ان کیونکہ میں تو دین کے قریب آنے سے رہا"...

یہ سنتے ہی ارم-ان نے سر اٹھایا، حیرت اور امید دونوں اس کی آنکھوں میں ایک ساتھ آگئیں۔

مگر سکندر نے فوراً نظر ہٹا لی۔

اس کے چہرے پر کوئی خوشی نہیں تھی، بس ایک تلخی تھی... جیسے وہ خود بھی جانتا ہو کہ کچھ خواہشیں صرف لفظوں میں زندہ رہتی ہیں، حقیقت میں نہیں۔

ارم۔ان نے سکندر کو دیکھا اور آہستہ مگر سنجیدگی سے کہا،

"یار، آجانا نمازوں کی طرف واپس... سکندر، ایسے نہیں کرتے۔"

اس کے لہجے میں فکر بھی تھی اور ایک امید بھی کہ شاید سکندر سن لے۔

سکندر نے فوراً نظریں ہٹالیں۔ اس کے چہرے پر وہی تھکن اور خالی پن تھا جو دنوں سے اس کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔

"یار مجھے ضرورت نہیں ہے ان سب کی... میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔"

اس کے لہجے میں ضد بھی تھی اور اندرونی ٹوٹ پھوٹ بھی۔

ارم۔ان نے اس کے قریب آکر کہا،

"ٹھیک کیسے ہو تو؟ ہر چیز سے ٹوٹ چکے ہے، پھر بھی کہہ رہے ہے ٹھیک ہوں؟"

سکندر نے تیزی سے جواب دیا،

"ہر کوئی ٹوٹتا ہے ارم-ان... اور ہر کوئی مذہب کے پیچھے نہیں بھاگتا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا"!

ارم-ان کی آنکھوں میں درد آ گیا، مگر اس نے آواز اونچی نہیں کی۔

"میں کہہ نہیں رہا سب ٹھیک ہو جائے گا... میں کہہ رہا ہوں اکیلے مت رہو اس سب میں۔"

سکندر نے تلخ ہنسی ہنسی،

"اکیلا ہی تو ہوں میں... اور شاید بہتر بھی ہے۔"

آرم-ان نے کچھ لمحے اسے دیکھا، پھر آہستہ سے بولا،

"تم خود کو اور زیادہ کھو رہے ہو سکندر"...

سکندر نے فوراً جواب دیا،

"میں پہلے ہی سب کچھ کھو چکا ہوں ارم-ان! اب کچھ بچا ہی نہیں کھونے کو"

یہ سنتے ہی دونوں کے درمیان خاموشی آ گئی۔

ارم-ان کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر الفاظ نہیں نکلے۔

اور سکندر… وہ بس ایک طرف دیکھ رہا تھا، جیسے بحث ختم نہیں ہوئی ہو، بس اندر کہیں گہرائی میں جا کر دفن ہو گئی ہو۔

ارم-ان چند لمحے سکندر کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت بھی تھی اور دکھ بھی۔

"یہ تو کیا کہہ رہا ہے، سکندر؟"

سکندر نے نظریں ہٹا لیں، جیسے اس جملے کو دہرانا بھی اس کے لیے بھاری ہو۔

"دین، مذہب… یہ سب میرے لیے نہیں بنا ارم-ان۔ بس سمجھ لے۔"

ارم-ان نے ایک قدم آگے بڑھایا، آواز نرم مگر سنجیدہ تھی۔

"نہیں سکندر… یہ چیزیں کسی کے لیے 'بنتیں' یا 'نہیں بنتیں' ایسے نہیں ہوتا۔ تم اس وقت درد میں ہو، میں سمجھ سکتا ہوں… مگر درد فیصلہ نہیں ہوتا۔"

سکندر نے فوراً سر ہلایا، جیسے وہ یہ بات سننا ہی نہیں چاہتا تھا۔

"تم نہیں سمجھ رہے... ہر چیز چھن گئی مجھ سے۔ ہر چیز۔ پھر لوگ کہتے ہیں دعا کرو، صبر کرو... مگر کچھ بدلتا ہی نہیں۔"

ارم-ان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے نہیں، مگر نرمی سے کہا،

"میں یہ نہیں کہہ رہا سب بدل جائے گا فوراً... میں یہ کہہ رہا ہوں تم اکیلے مت جاؤ اس سب میں۔"

سکندر کی آواز بھاری ہو گئی۔

"میں اکیلا ہی ٹھیک ہوں۔ کم از کم اب کوئی امید تو نہیں ٹوٹے گی۔"

آرم-ان نے گہری سانس لی۔

"یہ امید چھوڑ دینا نہیں ہے سکندر... یہ خود کو بند کر لینا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے دونوں خاموش ہو گئے۔

سکندر کی نظریں زمین پر تھیں، اور آرم-ان کی نظریں اس پر۔

یہ بحث ختم نہیں ہوئی تھی... بس اس لمحے رک گئی تھی، جیسے دونوں میں سے کوئی بھی ابھی ایک قدم پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔

آرم-ان نے کچھ لمحے خاموش رہ کر گہری سانس لی، جیسے وہ اپنے اندر دبا ہوا بوجھ نکالنے جا رہا ہو۔

"ویسے مجھے تجھے ایک بات بتانی تھی..." اس نے آہستہ سے کہا۔

سکندر نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں بول"...

آرم-ان نے فوراً اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا،

"وعدہ کر... کسی کو نہیں بتائے گا۔"

سکندر نے سر ہلایا۔

"ہاں، وعدہ کیا... اب بول۔"

آرم-ان نے نظریں جھکا لیں، اور پھر آہستہ سے کہا،

"میں مومنہ کی پہلی محبت نہیں تھا... لیکن وہ میری پہلی محبت تھی"...

یہ سنتے ہی سکندر ایک لمحے کو ساکت رہ گیا۔

اس کی پیشانی پر ہلکی سی شکن آئی۔

"کیا مطلب؟..." اس نے حیرت سے پوچھا۔

ارم-ان نے ایک لمبی سانس لی، جیسے اب وہ پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا۔

"میں بتاتا ہوں..." اس نے آہستہ سے کہا، اور پھر اپنی بات شروع کر دی۔

آرم-ان نے ایک گہری سانس لی، جیسے پرانی باتیں پھر سے سینے پر وزن بن کر آگئی ہوں۔

"مومنہ مجھ سے پہلے بھی کسی کو پسند کرتی تھی..." اس نے آہستہ سے کہا۔

سکندر نے فوراً اس کی طرف دیکھا۔

"کون تھا وہ؟"

آرم-ان نے نظریں نیچی کر لیں۔

"مومنہ کے بابا کے دوست کا ایک بیٹا تھا... وہ دونوں ایک ساتھ اکیڈمی جاتے تھے، اور مومنہ اسے بہت پسند کرتی تھی... لیکن پھر"...

وہ رکا، جیسے لفظ گلے میں پھنس گئے ہوں۔

"پھر کیا، ارم-ان؟" سکندر نے آہستہ مگر سنجیدگی سے پوچھا۔

ارم-ان نے بمشکل خود کو سنبھالا۔

"اس لڑکے نے کسی اور سے شادی کر لی... اور مومنہ کو چھوڑ دیا۔"

یہ سن کر سکندر کے چہرے پر ہلکی سی افسوس بھری خاموشی آ گئی۔

"اوہ... افسوس ہوا بہت، ارم-ان"...

ارم-ان نے سر ہلایا، جیسے وہ اس بات کو پہلے ہی سینکڑوں بار اپنے اندر جھیل چکا ہو۔

"مومنہ کئی دفعہ اس کا ذکر میرے سامنے کرتی تھی...مجھے بہت غصہ آتا تھا۔ میں اسے کہتا تھا وہ ماضی ہے، میں مستقبل ہوں... بھول جاؤ اسے۔ لیکن وہ بھولنے کو تیار ہی نہیں تھی۔"

سکندر نے فوراً سوال کیا، الجھن کے ساتھ،

"اور تو یہ کیسے کہہ سکتا تھا؟"

ارم-ان نے ایک لمحے کو سکندر کو دیکھا، پھر آہستہ سے بولا،

"کیونکہ مومنہ نے مجھے خود کہا تھا... اگر اس لڑکے نے واپس آ کر اس سے دوسری شادی بھی کرنی چاہی تو وہ خوشی خوشی کر لے گی۔"

یہ سن کر سکندر ایک لمحے کو خاموش ہو گیا۔

"تیرے ساتھ relationship میں ہوتے ہوئے اس نے ایسا کہا؟"

ارم-ان نے فوراً سر ہلایا۔

"نہیں نہیں... ہم نے ابھی تک کنفرم ہی نہیں کیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں یا نہیں"...

سکندر نے آہستہ سے سر ہلایا، جیسے وہ پوری بات سمجھ رہا ہو، مگر اس کے چہرے پر اب بھی ایک گہری سوچ باقی تھی۔

"اچھا... اچھا"...

اور پھر دونوں کے درمیان ایک خاموشی آگئی، جس میں پرانے رشتوں کے سائے بھی تھے اور نئے زخموں کا وزن بھی۔

سکندر کچھ دیر خاموش رہا، پھر آہستہ سے بولا،

"مجھے ایک بات یاد آرہی ہے، ارم-ان"...

ارم-ان نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں بول"...

سکندر نے ہلکی سی سانس لی، جیسے الفاظ تلاش کر رہا ہو۔ پھر نادیہ کا چہرہ اس کے ذہن میں آیا وہ مسکرا رہی تھی اور وہ یاد کر رہا تھا کہ کب وہ چھت پر اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تھی اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ کر۔

"کسی دوسرے کی چھوڑی ہوئی محبت سے ہمدردی کرو... لیکن محبت نہیں۔ وہ اپنے محبوب کی ایک آواز پر واپس پلٹ سکتا ہے... اور پھر تمہارا کیا ہو گا؟"

ارم-ان نے اس کی بات سنتے ہی چپ سا ہو کر سنا، مگر سکندر نے آگے بڑھ کر آہستہ سے ایک شعر پڑھا:

"سبھی اپنی رفتگاں کو بھولنے آتے ہمارے پاس

ہم سے کبھی کسی کو پہلی محبت نہیں ہوئی"...

چند لمحے دونوں خاموش رہے۔

ہوا میں ایک عجیب سا بوجھ تھا، جیسے یہ شعر صرف لفظ نہیں تھے بلکہ ان کی اپنی زندگیوں کا عکس ہو۔

ارم-ان نے آہستہ سے نظریں جھکائیں۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو شاید..." اس نے دبے ہوئے لہجے میں کہا۔

سکندر نے اس کی طرف دیکھا، مگر اس کی آنکھوں میں کوئی فتح یا ہار نہیں تھی، صرف تھکن تھی۔

"محبت میں لوگ وعدے نہیں دیکھتے ارم-ان... وہ بس دل کے پیچھے چلتے ہیں، عورت کی دوسری محبت کو مقام کبھی میں مل پاتا جو وہ پہلی کو دیتی ہے۔"

ارم-ان نے گہری سانس لی۔

اور اس لمحے دونوں کے درمیان خاموشی نے سب سے زیادہ سچ بول دیا۔

سکندر نے آہستہ سے ارم-ان کی طرف دیکھا۔

"تجھے ابھی تک پتا نہیں چلا کہ اس نے تجھے چھوڑا کیوں؟"

ارم-ان نے ایک لمحے کے لیے نظریں نیچی کر لیں، پھر بھاری آواز میں بولا،

"نہیں سکندر... ایک سال ہو چکا ہے، اور میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ مجھے چھوڑ کر کیوں گئی۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

اس کی خاموشی میں سوال بھی تھا، درد بھی، اور ایک ایسی بے بسی بھی جو وقت کے ساتھ کم نہیں ہوئی تھی بلکہ اور گہری ہو گئی تھی۔

سکندر نے اس کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے بولا،

"کبھی کبھی وجہ نہیں ہوتی ارم-ان... یا پھر جو وجہ ہوتی ہے، وہ سننے کے قابل نہیں ہوتی۔"

آرم-ان نے فوراً سر اٹھایا۔

"مگر میں نے تو سب ٹھیک کیا تھا... پھر بھی میں ہی غلط کیوں نکلا؟"

سکندر اس سوال پر خاموش ہو گیا۔

اس کے پاس جواب نہیں تھا، یا شاید وہ جانتا تھا کہ کچھ سوالوں کے جواب ہوتے ہی نہیں... بس انسان ان کے ساتھ جیتا رہتا ہے۔

دونوں کے درمیان پھر ایک لمبی خاموشی آ گئی۔

ایسی خاموشی جو کسی ایک دل کی نہیں تھی... بلکہ دو ٹوٹے ہوئے دلوں کی مشترکہ زبان تھی۔

سکندر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا،

"اچھا، تم لوگ ریلیشنشپ میں کتنے عرصے رہے تھے؟"

ارم-ان نے کچھ لمحے سوچا، پھر آہستہ سے بولا،

"تقریباً ایک مہینہ... فل ٹائم... لیکن ہم ایک دوسرے کو کافی پہلے سے جانتے تھے۔"

سکندر نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ سر ہلایا۔

"پہلے مہینے میں تو ان جوڑوں کی ایسی باتیں ہوتی ہیں جیسے ابھی شادی کر لیں گے"...

اس کے جملے پر ارم-ان بھی ایک لمحے کو ہلکا سا مسکرا دیا، مگر وہ مسکراہٹ زیادہ دیر نہ ٹھہری۔

اچانک آرم-ان کا چہرہ سخت ہو گیا۔

"لَانتی... ہنس لے تو۔ تجھے کبھی محبت ہوئی ہوتی نا تو میرے درد کو سمجھتا"...

اس کے لہجے میں غصہ بھی تھا اور درد بھی، جیسے ہنسی نے کسی پرانے زخم کو چھیڑ دیا ہو۔

سکندر فوراً خاموش ہو گیا۔

اس نے ارم-ان کی طرف دیکھا، پھر نظریں نیچی کر لیں۔

اس بار وہ ہنس نہیں رہا تھا... بس خاموش تھا۔

"اگر عام الفاظ میں کہوں تو مومنہ ایک دفعہ دھوکہ کھا چکی تھی..." سکندر نے کہا۔

"ہاں یار اُس کُتے، لَانتی انسان کی وجہ سے مجھے بھی ذلیل ہونا پڑا..." ارم-ان نے غصے سے جواب دیا۔

دونوں کے درمیان ایک لمحے کی خاموشی چھا گئی۔ ہوا میں جیسے پرانی یادوں کا بوجھ آ گیا ہو۔ وہ دونوں اپنے اپنے زخموں کو دوبارہ محسوس کر رہے تھے، مگر بول کچھ نہیں رہے تھے۔

پھر سکندر نے آہستہ مگر گہرے لہجے میں کہا،

"ایک بار

دھوکہ کھائی ہوئی عورت کو اس بات کا

یقین دلانا کہ آپ اس سے محبت کرتے ہیں،

'ایک کافر کو مسلمان کرنے کے برابر ہے۔'"

اس جملے کے بعد فضا میں ایک عجیب سی خاموشی پھیل گئی۔ آرم-ان نے نظریں نیچی کرلیں۔ دونوں کچھ دیر تک کچھ نہ بول سکے، جیسے یہ بات صرف الفاظ نہیں بلکہ ان دونوں کی اندرونی تھکن کا عکس ہو۔

کچھ سال گزر چکے تھے۔

وقت نے اپنے طریقے سے سب کو بدل دیا تھا، مگر کچھ زخم ایسے تھے جو وقت کے ساتھ بھرے نہیں تھے، بس عادت بن گئے تھے۔

سکندر نے رمشا کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ یہ کوئی اچانک فیصلہ نہیں تھا، بلکہ ایک خاموش دوری تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی اپنی الجھنیں، اس کا اندر کا ٹوٹا ہوا پن، رمشا کی زندگی میں مزید تکلیف کا باعث بنے۔ اس نے خود کو پیچھے ہٹا لیا تھا، جیسے ہر رشتے سے دور ہو کر شاید دوسروں کو بچا لے گا۔

آرم-ان نے اپنی زندگی کو ایک نیا رخ دے دیا تھا۔ وہ اب ایک بایولوجسٹ اور سائنٹسٹ بن چکا تھا۔ اس کی دنیا بدل چکی تھی، مگر اندر کی کچھ پرانی باتیں اب بھی کہیں نہ کہیں موجود تھیں۔

شاہویر یو کے چلا گیا تھا، اپنی زندگی بنانے۔

اور دانیال اب بھی سکندر کے ساتھ ہی تھا۔ دونوں نے مل کر گارمنٹس کپڑوں کا کام شروع کیا تھا۔ چھوٹا سا بزنس تھا، مگر وقت کے ساتھ وہی ان کی پہچان بنتا جا رہا تھا۔

باہر سے سب کچھ آگے بڑھ رہا تھا...

مگر اندر کہیں نہ کہیں، ہر ایک کے اندر کوئی پرانی کہانی اب بھی ادھوری تھی، جو مکمل ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔

ارم-ان کو مومنہ اکثر بہت یاد آتی تھی۔ وقت گزرنے کے باوجود اس کے ذہن سے وہ مکمل طور پر نکلی نہیں تھی۔ کئی بار وہ خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا، اپنی زندگی کو آگے بڑھانے کی طرف دیکھتا، مگر کسی نہ کسی لمحے مومنہ کا خیال اسے پھر سے وہیں لا کھڑا کرتا جہاں سب کچھ ادھورا رہ گیا تھا۔

دوسری طرف سکندر نے اس دوران اپنی زندگی میں کئی لڑکیوں سے تعلقات بنانے کی کوشش کی، مگر کوئی بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ اس کی بے چینی، اس کی بدلتی ہوئی کیفیت، غیر مذہبی شخصیت اور اس کا اندرونی کھویا ہوا پن اکثر سامنے آ جاتا تھا۔ جو بھی اس کے قریب آتا، اس کی

الجھنوں اور اس کے غیر مستقل مزاج رویے کو سمجھ نہ پاتا، اور آہستہ آہستہ دور ہو جاتا۔

وقت کے ساتھ ارم-ان اور مومنہ کے درمیان ایک بار پھر رابطہ ہوا۔ بات چیت آہستہ آہستہ بڑھتی گئی، اور ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب دونوں کے درمیان دوستی کی سی ایک فضا بن گئی۔ وہ ایک دوسرے سے بات کر لیتے، حالات پوچھ لیتے، اور پرانی تلخیوں کا ذکر کم ہوتا گیا۔

لیکن مومنہ کے دل میں ایک حد تھی۔ وہ ارم-ان کو ایک دوست کے طور پر قبول کر چکی تھی، مگر اس سے آگے کوئی جگہ دینے کے لیے وہ تیار نہیں تھی۔ اس کے اندر کہیں نہ کہیں ایک رکاوٹ تھی، ایک یاد تھی، یا شاید ایک خوف، جو اسے مکمل طور پر دوبارہ جڑنے نہیں دیتا تھا۔

ارم-ان اس بات کو محسوس کرتا تھا، مگر پھر بھی وہ اسے اپنی زندگی کا حصہ رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

موجودہ وقت :

رمشا نے اچانک مومنہ اور سکندر کو کانفرنس کال پر لے لیا۔ چند لمحوں تک لائن پر خاموشی رہی، صرف ہلکی سی سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی، جیسے دونوں اپنی اپنی سوچوں میں الجھے ہوں۔

پھر مومنہ کی آواز آئی، نرم مگر واضح لہجے میں،

"السلام علیکم"...

سکندر نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد جواب دیا،

"وعلیکم السلام"...

اس کے لہجے میں نہ کوئی خوشی تھی، نہ ناراضی... بس ایک سنجیدہ سا سکوت تھا جو اس کے اندر کے بکھرے ہوئے حال کو چھپا رہا تھا۔

کال میں ایک عجیب سا بوجھل پن چھا گیا۔ مومنہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی مگر الفاظ جیسے رک سے گئے ہوں۔ سکندر بھی خاموش تھا، مگر اس کی خاموشی میں سوال بھی تھے اور تھکن بھی۔

رمشا درمیان میں موجود تھی، مگر وہ بھی اس لمحے کو توڑنے کے بجائے صرف سن رہی تھی... جیسے یہ گفتگو لفظوں سے زیادہ احساسات کی تھی، جنہیں سنبھالنا آسان نہیں تھا۔

سکندر نے خاموشی توڑی، اس کی آواز میں ایک عجیب سا بوجھ تھا۔

"آرم-ان ابھی وہیں ہے... وہ نہیں آ سکا۔"

چند لمحے وہ رکا، پھر مومنہ کی طرف جیسے سوال اچھال دیا،

"مومنہ... مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا... آخر ایسا کیا ہوا؟ تم جیسی محبت کرنے والی لڑکی ارم-ان سے اتنی نفرت کیسے کرنے لگی؟ اس نے کیا ہی کر دیا تھا؟ اس کی کیا غلطی تھی؟"

کال کے دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

مومنہ نے فوراً جواب نہیں دیا۔ چند لمحے صرف سانسوں کی آوازیں رہیں، جیسے وہ اپنے اندر کچھ دبا رہی ہو۔ پھر اس کی آواز آئی، تھوڑی بھاری، تھوڑی ٹوٹی ہوئی،

"کبھی کبھی... غلطی بڑی نہیں ہوتی سکندر... بس وقت اور حالات اسے بہت بڑا بنا دیتے ہیں۔"

وہ رکی، جیسے مزید کہنا مشکل ہو رہا ہو۔

"میں نے اس سے نفرت شاید ایک دن میں نہیں کی... یہ آہستہ آہستہ ہوا ہے... اعتماد ٹوٹتا گیا، اور میں خود کو بچانے کی کوشش کرتی رہی"...

سکندر خاموش ہو گیا۔

اس کی آنکھوں میں وہی سوال ابھی بھی موجود تھا، مگر اب اس میں الجھن بھی شامل ہو چکی تھی۔

رمشا درمیان میں خاموش تھی... اور کال پر ایک ایسا سکوت پھیل گیا تھا جس میں تینوں کے اپنے اپنے زخم صاف سنائی دے رہے تھے۔

سکندر نے بے چینی سے کہا،

"مومنہ... وہ ہسپتال میں اپنی جان کی بازی کھیل رہا ہے۔ کبھی بھی مر سکتا ہے، بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی۔ آخر ہوا کیا تھا؟ تم نے اسے کیوں چھوڑا؟"

کال پر ایک دم خاموشی چھا گئی۔

رمشا بھی سانس روکے بیٹھی تھی۔ سکندر کی گرفت موبائل پر سخت ہو گئی۔

پھر مومنہ کی آواز آئی… مگر اس بار وہ پہلے جیسی مضبوط نہیں تھی، ٹوٹی ہوئی تھی۔

"سکندر"…

وہ رکی، جیسے الفاظ گلے میں پھنس گئے ہوں۔

"میں نے اسے اس لیے نہیں چھوڑا کہ میں چاہتی تھی"…

ایک لمبی خاموشی۔

دوسری طرف صرف ہلکی ہلکی سانسوں کی آواز، اور کہیں دور بیپ بیپ کرتی ہوئی ہسپتال کی مشینوں کی آواز محسوس ہو رہی تھی۔

مومنہ نے جیسے ہمت جمع کی…

"اصل بات یہ ہے کہ اُس دن"…

یونیورسٹی میں وقت کے ساتھ مومنہ اور ارم-ان پہلے سے کہیں زیادہ قریب آ گئے تھے۔ یہ صرف رابطہ نہیں تھا، بلکہ جیسے دو پرانے زخمی لوگ ایک دوسرے میں پناہ ڈھونڈنے لگے ہوں۔

مومنہ کو ارم-ان میں ایک عجیب سا سکون مل گیا تھا۔ اس کے ساتھ بات کرنا، ہنسنا، چھوٹی چھوٹی باتیں بانٹنا یہ سب اس کے لیے بوجھ نہیں، راحت بنتا جارہا تھا۔ اور آرم-ان... وہ تو جیسے مومنہ میں ایک نئ دنیا پا چکا تھا۔

وہ اس کے سامنے خود کو کسی چھوٹے بچے کی طرح محسوس کرتا تھا۔

ایک ایسا بچہ، جو شاید برسوں پہلے کہیں کھو گیا تھا۔

اپنا وہ بچپن جو محرومیوں، طعنوں اور کمیوں میں گزرا، وہ جیسے اب مومنہ کے ذریعے جی رہا تھا۔ سکول کے دنوں میں باپ کی غیر موجودگی پر ملنے والے طعنے، دل میں دبی ہوئی محرومیاں، اور وہ زخم جو اپنی دادی کے سخت رویوں نے اس کے اندر چھوڑے تھے مومنہ جیسے ان سب پر مرہم رکھ رہی تھی۔

ارم-ان کو پہلی بار محسوس ہوا کہ کوئی اسے سن بھی سکتا ہے، سمجھ بھی سکتا ہے، اور بغیر کسی شرط کے قبول بھی۔

اور یہی چیز اسے مومنہ کا دیوانہ بنا رہی تھی۔

وہ اسے صرف پسند نہیں کرتا تھا، وہ اس کی عادت بنتی جا رہی تھی۔

ہر وقت مومنہ چاہیے ہوتی۔

ہر بات اسے بتانی ہوتی۔

ہر خوشی اس کے ساتھ بانٹنی ہوتی۔

ہر دکھ اس کے سامنے رکھ دینا چاہتا تھا۔

مومنہ اس کے لیے محبوب سے بڑھ کر ایک پناہ بن گئی تھی۔

اور ارم-ان... آہستہ آہستہ اس محبت میں اس حد تک ڈوب رہا تھا جہاں محبت ضرورت بننے لگتی ہے۔ جہاں انسان دوسرے کے بغیر خود کو ادھورا محسوس کرنے لگتا ہے۔

وہ اس کا نام سنتا تو مسکرا دیتا۔

اس کا پیغام آتا تو دل دھڑک اٹھتا۔

اور اگر چند گھنٹے بات نہ ہوتی تو جیسے دن ادھورا لگتا۔

وہ مومنہ سے صرف محبت نہیں کرتا تھا...

وہ اس میں جینے لگا تھا۔

مومنہ کبھی کبھی اپنی پہلی محبت کو یاد کر کے خاموش ہو جایا کرتی تھی۔ کچھ پرانی یادیں تھیں جو وقت کے باوجود اس کے اندر کہیں زندہ تھیں، اور بعض لمحوں میں وہ ان پر افسوس بھی کرتی تھی کہ اگر کچھ فیصلے مختلف ہوتے، اگر کچھ لوگ نہ بدلتے، تو شاید زندگی اور ہوتی۔

مگر اب ارم-ان اس کے ساتھ تھا۔

اور ارم-ان نے اسے وہ سکون دینا شروع کر دیا تھا جس کا مومنہ نے شاید کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

وہ اس کے ماضی سے مقابلہ نہیں کرتا تھا، نہ اس کی یادوں سے حسد کرتا تھا، بلکہ ان زخموں کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ جب مومنہ پرانی باتوں میں کھو جاتی، ارم-ان اسے سنبھال لیتا۔ جب وہ ٹوٹنے لگتی، وہ اسے سہارا دے دیتا۔

آہستہ آہستہ مومنہ نے محسوس کیا کہ ارم-ان صرف ایک محبت نہیں...

ایک پناہ بھی ہے۔

ایک ایسا سکون جو اسے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔

ارم-ان کے ساتھ اسے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ محبت صرف شدت نہیں ہوتی، کبھی کبھی محبت سکون بھی ہوتی ہے۔ ایک ایسی خاموش موجودگی جو دل کے شور کو کم کر دے۔

وہ اس کے ساتھ ہنستی تو بے فکری سے ہنستی۔

روتی تو بے جھجھک رو لیتی۔

اور جب خاموش ہوتی تو ارم-ان اس خاموشی کو بھی سمجھ لیتا۔

یہ وہ آسودگی تھی جو شاید مومنہ نے کبھی سوچی بھی نہ تھی۔

اور ارم-ان...

وہ اسے اتنا سکون دے رہا تھا کہ مومنہ کے پرانے زخم پہلی بار بھرنے لگے تھے۔

رمضان چل رہا تھا۔

مگر اس بار مومنہ کے لیے رمضان کی رونقیں، افطار کی چھل پہل اور سحری کی برکتیں جیسے ہسپتال کی سفید دیواروں میں قید ہو گئی تھیں۔

وہ طارق انور کے ساتھ ہسپتال میں تھی۔

دل کی بیماری کے باعث وہ داخل تھے، اور مومنہ ان کی رپورٹس اور ٹیسٹ کے نتائج کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ انتظار عجیب اذیت رکھتا تھا نہ مکمل امید، نہ مکمل خوف... بس ایک مسلسل بے چینی۔

وہ کبھی ڈاکٹر کے کمرے کے باہر جا کر کھڑی ہو جاتی، کبھی فائل ہاتھ میں لیے رپورٹس کو بار بار دیکھتی، جیسے اعداد بدل جائیں گے۔ کبھی اپنے والد کو سوتے دیکھتی تو دل اور بیٹھ جاتا۔

رمضان کے روزے بھی اس بار عبادت سے زیادہ آزمائش محسوس ہو رہے تھے۔

افطار ہسپتال میں ہی ہو جاتا، کبھی دو کھجوروں سے، کبھی چائے کے ایک کپ سے۔

مگر اس کے ذہن میں ہر وقت ایک ہی سوال گردش کرتا رہتا۔

رپورٹس کیا کہیں گی؟

یہ سوال اس کے روزے سے بھی لمبا ہو گیا تھا۔

طارق انور باہر سے مضبوط دکھنے کی کوشش کرتے، مگر مومنہ جانتی تھی ان کی خاموشی میں بھی خوف چھپا ہوا ہے۔

وہ ان کے پاس بیٹھتی، ان کے ہاتھ دباتی، کبھی مسکرا کر حوصلہ دیتی، مگر تنہائی میں اس کا اپنا دل کانپ اٹھتا۔

ہسپتال کے اس کمرے میں رمضان کی روحانیت بھی تھی... اور ایک بیٹی کی دعا بھی

کہ رپورٹ نارمل آجائے۔

کہ یہ آزمائش گزر جائے۔

کہ باپ سلامت رہے۔

ایک دن مومنہ اپنے بابا کے وارڈ کے باہر بیٹھی ہوئی تھی۔ راہداری میں خاموشی اور ہلکی ہلکی قدموں کی آوازیں تھیں، دیواروں پر پڑتی سفید روشنی

مزید اداسی پیدا کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں رپورٹوں کی فائل تھی مگر ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔

اسی اثنا میں فون کی اسکرین جگمگائی۔

ارم-ان کا پیغام تھا۔

"مومنہ، کیسی طبیعت ہے اب بابا کی؟"

یہ مختصر سا پیغام پڑھ کر مومنہ کے چہرے پر ہلکی سی نرمی آگئی۔ اس بے چین دن میں جیسے کسی مانوس آواز نے دستک دی ہو۔

اس نے جواب لکھا،

"ابھی وہی ہسپتال میں ہیں... رپورٹس کا انتظار ہے۔ دعا کرنا۔"

فوراً جواب آیا،

"میں مسلسل دعا کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ سب بہتر ہو گا۔ آپ خود کیسی ہو؟"

مومنہ چند لمحے اس سوال کو دیکھتی رہی، جیسے کسی نے پہلی بار اس کے اپنے حال کا بھی پوچھا ہو۔

"میں ٹھیک ہوں... بس تھوڑا ڈر لگ رہا ہے۔"

ارم-ان نے فوراً لکھا،

"آپ ڈرو مت، میں ہوں نا۔ کچھ بھی ہو مجھے بتانا۔"

یہ پڑھ کر مومنہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

پھر دونوں کے درمیان باتیں چل نکلیں۔

ہسپتال، روزے، تھکن، بچپن کی یادیں... ہر بات۔

ارم-ان اسے ہنسانے کی کوشش کرتا رہا، اور مومنہ کافی دنوں بعد دل سے مسکرائی۔

اس بے رنگ ہسپتال کی راہداری میں، بابا کے وارڈ کے باہر بیٹھی مومنہ کو اس دن پہلی بار لگا کہ شاید غم کے دنوں میں بھی کچھ لوگ سکون بن کر آتے ہیں۔

اور ارم-ان... آہستہ آہستہ وہی سکون بنتا جا رہا تھا۔

باتوں باتوں میں ماحول کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ ہسپتال کی اداسی کے بیچ دونوں پہلی بار معمول کی باتیں کر رہے تھے۔

ارم-ان نے اچانک لکھا،

"ویسے ایک بات کہوں؟ آپ نے جو اپنے بچپن کی تصویر مجھے دکھائی تھی... اس میں آپ اتنی مردانہ لگتی تھی۔"

مومنہ فوراً ہنس پڑی۔

"کیونکہ بابا نے مجھے ٹام بوائے بنا کر رکھا تھا"...

آرم-ان نے دلچسپی سے پوچھا،

"سچ؟"

مومنہ جیسے ماضی میں چلی گئی۔

"ہاں... بچپن میں میں لڑکوں سے لڑائیاں کرتی تھی، ان کے ساتھ کھیلتی تھی، کبھی گلی میں کرکٹ، کبھی لڑائی جھگڑا... بابا کہتے تھے میری بیٹی کسی سے کم نہیں۔"

آرم-ان یہ پڑھ کر مسکرا دیا۔

"تو مطلب آپ بچپن میں غنڈہ تھیں؟"

مومنہ نے فوراً جواب دیا،

"تمھیں نہیں... ہوں۔"

یہ پڑھ کر ارمان زور سے ہنس پڑا۔

"مجھے پہلے بتادیتی، میں ڈر کے محبت کرتا۔"

مومنہ نے لکھا،

"ابھی بھی وقت ہے، ڈر جاؤ۔"

دونوں کی گفتگو میں ایک شرارت آگئی تھی۔ ہسپتال کے باہر بیٹھی مومنہ، جو کچھ دیر پہلے رپورٹس کے خوف میں ڈوبی ہوئی تھی، اب فون کی اسکرین دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

اور ارمان... وہ اس کی ہر چھوٹی بات میں خوشی ڈھونڈنے لگا تھا۔ اسے اچھا لگتا تھا جب مومنہ اپنے بچپن کی باتیں کرتی، جیسے وہ اس کے ماضی کے ان حصوں میں بھی شامل ہو رہا ہو جہاں کبھی کوئی اور نہیں تھا۔

اور شاید وہیں سے ان کے درمیان قربت ایک اور سطح پر جا پہنچی تھی۔

باتوں ہی باتوں میں دونوں ہنس رہے تھے کہ تبھی ڈاکٹر وارڈ سے باہر آیا۔

مومنہ فوراً سنجیدہ ہو گئی، اس نے جلدی سے آرم-ان کو میسج کیا،

"ڈاکٹر آگیا ہے، میں بعد میں میسج کرتی ہوں"...

مگر آرم-ان نے فوراً شرارت سے لکھا،

"واہ جی واہ... ہمارے لیے تو اب وقت ہی نہیں ہے۔"

یہ پڑھ کر مومنہ کو ہلکا سا غصہ آیا۔ اس نے فوراً جواب دیا،

"میں ہسپتال میں ہوں، کہیں مستی کرنے نہیں آئی"...

پیغام میں ہلکی سی ناراضی صاف محسوس ہو رہی تھی۔

ارمان کو فوراً اندازہ ہو گیا کہ بات مذاق سے ذرا آگے نکل گئی ہے۔

اس نے لکھا،

"ارے پاگل، مذاق کر رہا تھا"...

مگر مومنہ نے فوراً جواب نہ دیا۔

وہ ڈاکٹر کی بات سننے لگ گئی، مگر جاتے جاتے ارمان کا وہ جملہ اس کے دل میں چبھ سا گیا تھا۔

اور ادھر ارمان موبائل ہاتھ میں لیے اسکرین دیکھ رہا تھا، جیسے اسے احساس ہو گیا ہو کہ کبھی کبھی محبت میں ہلکا سا مذاق بھی غلط وقت پر زخم دے جاتا ہے۔

کچھ دیر بعد مومنہ کا ایک مختصر سا میسج آیا،

"بعد میں بات کرتی ہوں۔"

بس اتنا۔

اور یہ دو لفظ ارمان کے لیے غیر معمولی طور پر بھاری ہو گئے۔ کیونکہ پہلی بار اسے ڈر لگا... کہ کہیں اس نے نادانستہ اسے ناراض تو نہیں کر دیا۔

اُدھر ارمان کی زندگی میں ایک اور طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

گھر میں ساجد شیخ نے الگ ہی لڑائی ڈال رکھی تھی۔ وہ مسلسل گھر بیچنے کی بات چھیڑتے رہتے، کبھی وراثت کا ذکر، کبھی حصے کا، کبھی یہ دلیل کہ اب اس گھر کو رکھنے کا فائدہ ہی کیا ہے۔ ہر دوسرے دن کوئی نئی بحث کھڑی ہو جاتی۔

ارمان پہلے ہی زندگی کے کئی بوجھ اٹھائے ہوئے تھا، اب گھر کے اندر یہ کشمکش اسے مزید تھکا رہی تھی۔

اور صرف ساجد شیخ ہی نہیں، رخسانہ بیگم بھی دل ہی دل میں یہی چاہتی تھیں کہ گھر بک جائے۔ ان کی خاموش رضامندی نے معاملے کو اور الجھا دیا تھا۔

یہ وہی گھر تھا جس کی دیواروں میں برسوں کی یادیں تھیں، جہاں ارمان نے بچپن گزارا تھا، جہاں ہر کمرے میں ماضی سانس لیتا تھا... اور اب انہی دیواروں کو بیچنے کی بات ہو رہی تھی۔

مگر ایمان نور یہ سب دیکھ کر بہت پریشان رہنے لگی تھی۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ گھر ٹوٹے۔

اس کے لیے یہ صرف اینٹوں کا مکان نہیں تھا، خاندان کا آخری سہارا تھا۔

وہ اکثر جھگڑوں کے بعد خاموش کمرے میں جا بیٹھتی، سوچتی رہتی کہ لوگ گھر بیچنے سے پہلے رشتے کیوں بیچ دیتے ہیں۔

ساجد شیخ کی آوازیں گھر میں اکثر بلند ہو جاتیں، رخسانہ بیگم اپنی ضد پر قائم رہتیں، اور ایمان نور اس سب کے درمیان بکھرتی جا رہی تھی۔

ارمان کئی بار دیوار سے ٹیک لگا کر یہ سب سنتا رہتا، خاموش۔

اسے لگتا تھا جیسے باہر محبت کی آزمائش ختم نہیں ہوئی، اور اب گھر بھی جنگ کا میدان بنتا جا رہا ہے۔

اور سب سے زیادہ خوفناک بات یہ تھی

یہ لڑائی صرف گھر بیچنے کی نہیں رہی تھی...

یہ خاندان ٹوٹنے کی ابتدا لگنے لگی تھی۔

گھر کے اندر اس روز فضا پہلے ہی بوجھل تھی۔ ہر چہرے پر تناؤ تھا، جیسے کوئی فیصلہ دیواروں کے بیچ منڈلا رہا ہو۔

ایمان نور نے ہمت کر کے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور دھیمی مگر لرزتی آواز میں کہا،

"سنیے رحمان جی... ساجد بھائی جو کہہ رہے ہیں وہ بہت غلط ہے۔ اگر گھر بک گیا تو ہمیں کرائے پر جانا پڑے گا، بچوں کی زندگی خراب ہو جائے گی... ایسا مت ہونے دیں"...

اس کی آواز میں خوف بھی تھا، التجا بھی۔

رحمان شیخ نے فوراً تیوری چڑھائی، جیسے یہ بات انہیں ناگوار گزری ہو۔

"ہم بھائیوں کے معاملے میں تمہیں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے... ہم خود دیکھ لیں گے سب"!

ان کا لہجہ غصے سے بھرا ہوا تھا۔

ایمان نور جیسے سہم گئی۔

"میں تو بس۔۔۔۔"

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر رحمان شیخ نے بات کاٹ دی۔

"کہہ دیا نا، یہ مردوں کا معاملہ ہے"!

کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔

ایمان نور کے چہرے کا رنگ اتر گیا۔ وہ چند لمحے انہیں دیکھتی رہی، جیسے یقین نہ آیا ہو کہ فکر کے جواب میں اسے جھڑک دیا گیا۔

اس نے نظریں جھکا لیں۔

مگر اس کے دل میں ایک ہی بات گونج رہی تھی،

یہ صرف بھائیوں کا معاملہ نہیں تھا...

یہ اس کے بچوں کے مستقبل کا سوال تھا۔

اور پہلی بار اسے محسوس ہوا، گھر صرف دیواروں سے نہیں ٹوٹتے... رویّوں سے بھی بکھر جاتے ہیں۔

آرم-ان بہت بے بس ہو رہا تھا۔

گھر میں چلتی اس لڑائی نے اسے اندر سے توڑ دیا تھا۔ باہر سے وہ خاموش رہتا، مگر اندر ایک مسلسل شور برپا تھا۔ ہر روز جائیداد، گھر، حصوں اور بٹوارے کی باتیں سن سن کر اسے لگنے لگا تھا جیسے یہ صرف مکان نہیں بٹ رہا... اس کا اپنا وجود بھی ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہا ہے۔

وہ کئی بار صحن میں خاموش بیٹھا دیواروں کو دیکھتا رہتا یہی دیواریں جن کے سائے میں اس نے بچپن گزارا، یہی گھر جہاں ہر کمرے سے کوئی یاد جڑی تھی... اور اب انہی دیواروں کے بیچ اجنبیت اتر آئی تھی۔

ساجد شیخ کی ضد، رحمان شیخ کی خاموشی، رخسانہ بیگم کی رضا... سب کچھ ارمان کے سینے پر بوجھ بنتا جا رہا تھا۔

وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ زندگی ہر طرف سے اسے آزمائشوں میں دھکیل رہی ہے۔

محبت میں زخم الگ،

گھر میں جنگ الگ۔

کئی راتیں وہ جاگتا رہتا، چھت کو گھورتا، اور سوچتا،

آخر انسان ایک وقت میں کتنی لڑائیاں لڑ سکتا ہے؟

مومنہ اس کے لیے سکون تھی، مگر گھر واپس آتے ہی وہ سکون بکھر جاتا۔

وہ خود کو پہلی بار واقعی بے بس محسوس کر رہا تھا۔

ایسی بے بسی... جس میں انسان چیخنا چاہے مگر آواز نہ نکلے۔

ارمان نے ماں کے سامنے کھڑے ہو کر بھاری آواز میں کہا،

"ماما، میں نہیں چاہتا کہ ہمارا گھر بکے"...

اس کے لہجے میں ضد بھی تھی اور بے بسی بھی۔

ایمان نور نے اسے نرمی سے دیکھا، جیسے وہ اس کے اندر کا درد سمجھ رہی ہوں۔

"بیٹا... میں تمہارے بابا کو یہی سمجھا رہی ہوں۔ اگر وہ سن لیں تو ساجد بھائی بھی مان جائیں گے۔ مگر وہ بھی نہیں سمجھ رہے... مکان دوبارہ آسانی سے نہیں بنتے، عمر لگ جاتی ہے"...

اس کے الفاظ میں حقیقت تھی، مگر آرم-ان کے دل میں ایک اور ہی طوفان چل رہا تھا۔

وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر آہستہ سے بولا،

"لیکن ماما... یہ صرف مکان نہیں ہے... یہ ہماری یادیں ہیں۔ اگر یہ بک گیا تو ہم کہاں جائیں گے؟ ہم کیا رہ جائے گا؟"

ایمان نور نے ایک گہری سانس لی۔

"میں سب جانتی ہوں بیٹا... مگر کبھی کبھی انسان کو یادوں سے زیادہ حالات دیکھنے پڑتے ہیں"...

یہ سن کر آرم-ان کی نظریں جھک گئیں۔

اسے لگا جیسے وہ کسی ایسی جنگ میں کھڑا ہے جہاں دونوں طرف اس کے اپنے ہی لوگ ہیں، اور فیصلہ پھر بھی اس کے بس میں نہیں۔

وہ خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا...

مگر اس کے دل میں گھر کے ٹوٹنے کا خوف اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔

اچانک گھر کے اندر شور شدت اختیار کر گیا۔

ایمان نور اور ارمان دونوں چونک کر باہر کی طرف دوڑے۔ صحن میں قدم رکھتے ہی جو منظر سامنے آیا، وہ کسی کے بھی ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔

ساجد شیخ اور رحمان شیخ آمنے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں کے چہرے غصے سے سرخ تھے، آوازیں اونچی ہو چکی تھیں اور ماحول میں ایک عجیب سی کشیدگی پھیل چکی تھی۔ بات اب صرف بحث تک محدود نہیں رہی تھی، تلخ جملے اور طعنے حدیں پار کر رہے تھے۔

"تمہیں صرف اپنی پڑی ہے!" ساجد شیخ غصے میں چیخ رہے تھے۔

"اور تم نے کیا سارا فیصلہ اپنے حق میں کر لیا ہے؟" رحمان شیخ نے بھی جواب دیا۔

لمحہ بھر میں صورتحال ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ ساجد شیخ نے غصے میں آ کر رحمان شیخ کو دھکا دیا، اور پھر ایک زور دار مکا بھی جڑ دیا۔ رحمان شیخ لڑکھڑائے، مگر فوراً سنبھلنے کی کوشش کی۔

ایمان نور یہ سب دیکھ کر کانپ گئی۔

اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، آنکھوں میں آنسو تھے۔

"یا اللہ... یہ کیا ہو رہا ہے..." اس کے لبوں سے بس یہی نکلا۔

وہ فوراً ارمان کی طرف مڑی، آواز لرز رہی تھی،

"بیٹا! جا کر اپنے بابا کو بچاؤ"!

آرم-ان لمحہ بھر بھی نہیں رکا۔

اس کے اندر غصہ، خوف اور بے بسی ایک ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دوڑتا ہوا سیدھا ان کے درمیان پہنچا۔ بغیر سوچے سمجھے اس نے اپنے چچا ساجد شیخ کو پیچھے سے زور سے دھکا دیا۔

ساجد شیخ توازن کھو بیٹھے اور لڑکھڑاتے ہوئے سیدھے دیوار سے جا لگے۔

ایک لمحے کے لیے پورا صحن جیسے ساکت ہو گیا۔

صرف بھاری سانسوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

رحمان شیخ ہانپ رہے تھے، ساجد شیخ دیوار سے ٹیک لگائے غصے سے ارمان کو گھور رہے تھے، اور ایمان نور بیچ میں کھڑی کانپ رہی تھیں۔

ارمان کا سینہ تیزی سے اُٹھ بیٹھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ مٹھیوں میں بند تھے، مگر اندر کہیں وہ خود بھی ٹوٹ رہا تھا۔

یہ وہ گھر تھا جہاں کبھی ہنسی گونجتی تھی... اور آج وہاں صرف چیخیں رہ گئی تھیں۔

ایمان نور نے آگے بڑھ کر ارمان کا بازو پکڑ لیا، جیسے اسے مزید کسی بھی غلطی سے روک رہی ہوں۔

مگر ماحول اب بھی بھرا ہوا تھا۔

غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا... بس لمحہ بھر کے لیے رک گیا تھا۔

اور سب کے دلوں میں ایک ہی خوف بیٹھ گیا تھا

یہ لڑائی اب اگر نہ رکی، تو صرف گھر نہیں... رشتے بھی ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائیں گے۔

اسی ہنگامے کے بیچ اچانک دادی رخسانہ بیگم باہر آ گئیں۔ ان کے قدم تیز تھے اور چہرے پر سختی کے ساتھ ساتھ غصے کی گہری لکیریں بھی واضح تھیں۔ جیسے ہی انہوں نے صحن کا منظر دیکھا جہاں رحمان شیخ اور ساجد شیخ کے درمیان جھگڑا ابھی بھی اپنی آخری حدوں کو چھو رہا تھا، ان کی آواز پورے گھر میں گونج اٹھی۔

"کتنی گندی اولاد ہے اس عورت کی گھر کے بڑوں پر ہاتھ اٹھاتی ہے"...

ان کے الفاظ میں صرف غصہ نہیں تھا بلکہ الزام اور فیصلہ بھی تھا، جیسے وہ پہلے ہی کسی ایک طرف کھڑی ہو چکی ہوں۔ ارمان فوراً آگے آیا، اس کے چہرے پر دکھ اور بے بسی ایک ساتھ تھے، وہ خود کو روک نہیں پایا اور بولا،

"میں نے تو بس بابا کو بچانے کے لیے یہ سب کیا"...

مگر اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی کیونکہ دادی نے اس کی وضاحت کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا ڈرامائی انداز مزید بڑھا دیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر لہجہ پہلے سے زیادہ سخت ہو گیا۔

وہ روتے روتے بولیں،

"میرے دونوں بیٹوں کو لڑوا دیا اس کمبخت عورت نے"...

پھر انہوں نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر اپنی آواز اور بلند کر دی،

"رحمان! سن لو... یا تو اس عورت کو طلاق دے دو... یا پھر میرا مرا ہوا منہ دیکھو گے"!

یہ جملہ جیسے پورے صحن پر بجلی بن کر گرا۔

ہر طرف ایک دم خاموشی چھا گئی۔ ایمان نور کے ہاتھ کانپ گئے، اس کی آنکھوں میں آنسو جم گئے، اور وہ بس زمین کو دیکھنے لگی جیسے اس کے پاس اب کہنے کو کچھ باقی نہ بچا ہو۔ آرم-ان کا چہرہ سخت ہو گیا،اس کی مٹھی بند ہو گئی مگر وہ بھی خاموش کھڑا رہا۔ رحمان شیخ ساکت تھے، جیسے وہ اس لمحے میں فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ وہ اپنے خاندان کے درمیان کھڑے ہوں یا اس ٹوٹتے ہوئے گھر کے بیچ۔

اور اس ایک جملے کے بعد... گھر میں چیخیں نہیں رہیں، بس ایک ایسی خاموشی رہ گئی جو اندر سے ہر رشتے کو آہستہ آہستہ توڑ رہی تھی۔

"امی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں..." رحمان شیخ نے حیرت اور الجھن سے کہا۔

مگر دادی رخسانہ بیگم کا لہجہ بدستور سخت تھا۔ وہ فوراً بولیں،

"ہاں بیٹا یہ دیکھو کیسے اس ارمان نے تمہارے ساجد کو دھکا دیا... کتنی گندی تربیت ہے اس کی"!

ان کے الفاظ ابھی فضا میں ہی تھے کہ رحمان شیخ کا چہرہ سخت ہو گیا۔ غصہ، بے بسی اور حالات کا دباؤ سب ایک ساتھ ان کے اندر پھٹ پڑا۔

وہ تیز قدموں سے آگے بڑھے، ایمان نور کے قریب آئے... اور ایک زور دار تھپڑ اس کے چہرے پر دے مارا۔

ایک لمحے کے لیے جیسے پورا صحن ساکت ہو گیا۔

ایمان نور کا سر جھٹکے سے ایک طرف ہوا، آنکھوں میں آنسو فوراً بھر آئے، اور وہ چند قدم پیچھے لڑکھڑا گئی۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے مگر آواز نہیں نکل رہی تھی۔

ارمان کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

وہ اپنی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا، جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ ابھی کیا ہوا ہے۔ اس کے اندر کچھ ٹوٹ گیا تھا خاموشی سے، مگر بہت گہرائی سے۔

ساجد شیخ بھی لمحے بھر کو خاموش ہو گئے۔ دادی رخسانہ بیگم کی سانسیں تیز ہو گئیں، مگر وہ پھر بھی اپنی جگہ پر قائم تھیں۔

ایمان نور نے آہستہ سے چہرہ سیدھا کیا، مگر اس کی آنکھوں میں اب صرف آنسو نہیں تھے... بلکہ ایک ایسی خاموشی تھی جو چیخ سے بھی زیادہ بھاری تھی۔

گھر کا صحن اب صرف لڑائی کا میدان نہیں رہا تھا...

یہ ایک ایسے زوال کی تصویر بن چکا تھا جہاں رشتے، احترام اور حدیں سب کچھ ایک لمحے میں بکھر گئے تھے۔

عید میں صرف چار دن باقی تھے۔

گلیوں میں رونق بڑھنے لگی تھی، بازار سجے ہوئے تھے، لوگ کپڑوں، چوڑیوں اور عید کی تیاریوں میں مصروف تھے... مگر آرم-ان کے لیے عید کی کوئی خوشبو نہیں تھی۔

اس کے گھر میں خوشی نہیں، کشیدگی بسی ہوئی تھی۔

جس گھر میں عید سے پہلے چراغاں ہونا چاہیے تھا، وہاں ہر روز نئی تلخی جنم لے رہی تھی۔ ساجد شیخ کی جائیداد والی باتیں، گھر کے جھگڑے، دادی رخسانہ بیگم کے طعنے، اور رحمان شیخ و ایمان نور کے درمیان پیدا ہوتی دراڑیں... سب کچھ آرم-ان کی روح پر بوجھ بنتا جا رہا تھا۔

عید میں چار دن باقی تھے...

مگر ارمان کی عید تو گھر والے پہلے ہی خراب کر رہے تھے۔

نہ نئے کپڑوں کا اشتیاق باقی تھا، نہ عید کی صبح کا انتظار۔

اسے لگتا تھا جیسے اس گھر میں تہوار نہیں، سوگ اتر آیا ہو۔

کبھی وہ چھت پر جا بیٹھتا، کبھی صحن کے کسی کونے میں خاموش ہو جاتا، اور سوچتا

کیا واقعی یہی وہ گھر ہے جہاں کبھی عید سب سے خوبصورت دن ہوا کرتی تھی؟

ایمان نور اسے سنبھالنے کی کوشش کرتی، مگر وہ خود ٹوٹی ہوئی تھی۔

اور ارمان...

وہ پہلی بار محسوس کر رہا تھا کہ بعض اوقات اپنے ہی لوگ انسان کے اندر کی عید مار دیتے ہیں۔

گھر کے جھگڑوں اور اندر کے شور سے بھاگنے کے لیے آرم-ان نے مومنہ سے میسجز پر باتیں کرنا شروع کر دیں۔ وہ اس سے صرف گفتگو نہیں کر رہا تھا، اپنا دل ہلکا کر رہا تھا، جیسے ہر وہ بوجھ جو گھر میں دم گھونٹ رہا تھا، لفظوں میں ڈال کر اس کے پاس رکھ دینا چاہتا ہو۔

مومنہ اس کی باتیں سنتی رہی، کبھی دلاسا دیتی، کبھی ہلکی ہنسی میں بات بدل دیتی۔

اسی دوران اچانک مومنہ نے اپنے پاؤں کی تصویر اسے بھیج دی۔

ارمان چند لمحے اس تصویر کو دیکھتا رہ گیا۔

وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ مومنہ نے اسے پاؤں کی تصویر کیوں بھیجی ہے۔

اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی، پھر اس نے فوراً میسج کیا

"مجھے پاؤں کی تصویر نہیں چاہیے... چہرے کی بھیجیں، میں دیکھنا چاہتا ہوں آپ اس وقت کیسی لگ رہی ہیں"...

میسج بھیجنے کے بعد وہ اسکرین کو دیکھتا رہا۔

کچھ لمحے...

پھر کچھ اور لمحے...

مگر مومنہ کا کوئی جواب نہیں آیا۔

آن لائن کا سبز نشان بھی غائب ہو گیا۔

ارمان اسکرین دیکھتا رہ گیا، پہلے ہلکی حیرت سے... پھر بے چینی سے۔

اسے سمجھ نہ آیا کہ وہ شرما گئی ہے، ناراض ہوئی ہے... یا اس نے اس بات کو سنجیدہ لے لیا۔

ہسپتال کے شور، گھر کے جھگڑوں، اور اس خاموشی کے بیچ ارمان پہلی بار اس ایک جواب کا انتظار کرنے لگا... جیسے اس جواب میں ہی اس دن کا سکون چھپا ہو۔

کافی دیر کی خاموشی کے بعد اچانک مومنہ کا جواب آیا۔

"مجھے space چاہیے آپ سے..." مومنہ نے اسے کہا۔

یہ پڑھتے ہی ارمان کے ہاتھ جیسے رک گئے۔ وہ کچھ لمحے اسکرین کو دیکھتا رہا، جیسے الفاظ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس نے فوراً لکھا،

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟" ارمان نے کہا۔

جواب آیا،

"میں آپ سے دوری چاہتی ہوں... بس ہر وقت میسجز پر بات نہیں کر سکتی، آپ کو کوئی اور کام ہی نہیں ہے..." مومنہ نے کہا۔

یہ الفاظ جیسے سیدھا ارمان کے سینے میں اتر گئے۔

وہ ساکت رہ گیا۔

جس شخص سے وہ اپنے دل کا بوجھ بانٹ رہا تھا، جس کے پاس آ کر وہ گھر کے جہنم سے چند لمحوں کی پناہ لیتا تھا، اسی کی طرف سے یہ جملہ...

"آپ کو کوئی اور کام ہی نہیں ہے"...

یہ صرف جملہ نہیں تھا، ارمان کو لگا جیسے اس کی محبت کو حقارت سے تول دیا گیا ہو۔

اس کے ہاتھ موبائل پر رک کے رہ گئے۔

وہ کچھ لکھنا چاہتا تھا...

مگر لکھ نہ سکا۔

اندر کہیں کچھ ٹوٹ گیا تھا۔

بہت خاموشی سے۔

بہت گہرائی سے۔

گھر والوں نے پہلے ہی اس کی عید چھین رکھی تھی...

اور اب مومنہ کے ان لفظوں نے جیسے باقی بچا سکون بھی چھین لیا تھا۔

ارمان اندر سے ٹوٹ گیا۔ اسے پہلی بار لگا شاید وہ محبت میں ضرورت سے زیادہ آگے نکل آیا ہے... اور دوسری طرف کوئی اتنا ساتھ چلنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

اس رات موبائل کی اسکرین روشن رہی...

مگر ارمان کے اندر کچھ بجھ گیا۔

مومنہ کے الفاظ آرم-ان کے دل میں تیر کی طرح اترے تھے، مگر وہ پھر بھی خود کو سنبھال کر جواب دینے کی کوشش کرنے لگا۔

کافی دیر اسکرین کو دیکھنے کے بعد اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے لکھا،

"لیکن آپ space کیوں چاہتی ہیں..." ارمان نے کہا۔

جواب نہ آیا۔

چند لمحے اور گزرے، پھر اس نے دوبارہ لکھا،

"کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتادیں..." ارمان نے دریافت کی۔

میسج سینڈ ہو گیا۔

مگر دوسری طرف خاموشی تھی۔

بہت گہری خاموشی۔

نہ...typing

نہ...seen

نہ کوئی جواب۔

ارمان بار بار اسکرین دیکھتا رہا، جیسے ہر چند سیکنڈ بعد امید بندھتی ہو کہ شاید اب جواب آجائے۔

مگر مومنہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اور یہی خاموشی آرم-ان کو الفاظ سے زیادہ زخمی کر رہی تھی۔

اگر مومنہ غصہ کرتی، ڈانٹ دیتی، لڑ لیتی... شاید ارمان اتنا نہ ٹوٹتا۔

مگر یہ خاموشی

یہ سب سے سخت جواب تھا۔

وہ موبائل ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا، نظریں سکرین پر، مگر ذہن کہیں اور۔

اس کے ذہن میں بار بار وہی جملہ گونج رہا تھا،

"مجھے space چاہیے"...

اور اب اس کے بعد یہ خاموشی۔

اسے پہلی بار خوف ہوا...

کہ کہیں وہ پھر کسی کھونے کے دہانے پر تو نہیں آ کھڑا ہوا۔

کافی دیر کی خاموشی کے بعد اچانک مومنہ کا پیغام آیا۔

"آپ کو سمجھ نہیں آرہا... مجھے space چاہیے آپ سے..." مومنہ نے کہا۔

یہ الفاظ پڑھ کر ارمان کے دل کی دھڑکن جیسے ایک لمحے کو رک گئی۔ اب بات اشاروں میں نہیں رہی تھی، مومنہ صاف صاف دوری مانگ رہی تھی۔

اس کے ہاتھوں میں ہلکی کپکپاہٹ آگئی۔

وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، پوچھنا چاہتا تھا، روکنا چاہتا تھا...

مگر خوف نے محبت پر سبقت لے لی۔

اس نے گھبراہٹ میں فوراً لکھا،

"اچھا ٹھیک ہے... جیسے آپ کو ٹھیک لگے۔ جب mood اچھا ہو میسج کر لینا..." ارمان نے گھبرا کر کہا۔

میسج بھیجنے کے بعد وہ دیر تک فون کو دیکھتا رہا۔

اس ایک جملے میں اس نے خود کو پر سکون ظاہر کیا تھا...

مگر حقیقت میں وہ اندر سے لرز گیا تھا۔

یہ رضامندی نہیں تھی...

یہ کھو دینے کے خوف میں دی گئی خاموش ہار تھی۔

اسے لگا اگر اس نے اور پوچھا تو شاید مومنہ اور دور چلی جائے گی۔

اس لیے اس نے خود کو پیچھے ہٹا لیا۔

مگر اس ایک "ٹھیک ہے" کے پیچھے اس کا دل چیخ رہا تھا۔

آخر کار عید آ ہی گئی۔

مگر جس عید کا بچپن سے انتظار ہوتا تھا، آرم-ان اس بار اس سے ڈر رہا تھا۔

اس کے دل میں صبح سے ایک ہی خوف تھا

بس آج گھر میں کوئی لڑائی نہ ہو...

وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ دن خیریت سے گزر جائے، کوئی تلخی نہ ہو، کوئی بات نہ بڑھے۔

صبح وہ رحمان شیخ اور نعمان کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے گیا۔ مسجد میں تکبیروں کی آواز گونج رہی تھی، لوگ گلے مل رہے تھے، دعائیں مانگ رہے تھے... مگر آرم-ان کے دل پر گھر کا بوجھ اب بھی رکھا ہوا تھا۔

نماز کے بعد بھی وہ زیادہ دیر نہیں رکا۔

فوراً گھر لوٹ آیا۔

دل میں عجیب سی بے چینی لیے۔

گھر آتے ہی اس نے خود کو معمول پر رکھنے کی کوشش کی۔ مسکرا کر سب کے پاس گیا، اور محبت سے کہا،

"عید مبارک"...

اس نے ایک ایک کو مبارک دی۔

مگر جب دادی رخسانہ بیگم اور ساجد کی طرف دیکھا...

وہاں خاموشی تھی۔

کوئی جواب نہیں آیا۔

نہ "خیر مبارک"

نہ مسکراہٹ۔

نہ نظر اٹھا کر دیکھنا۔

بس ایک سرد خاموشی۔

وہ لمحہ ارمان کے لیے بہت بھاری تھا۔

عید کے دن بھی یہ اجنبیت؟

یہ سرد مہری؟

اسے لگا جیسے مبارکباد کے ساتھ اس نے اپنا دل بھی بڑھایا تھا... اور وہ لوٹا دیا گیا۔

اس نے نظریں جھکا لیں، مگر اندر کچھ پھر سے ٹوٹ گیا۔

عید کی صبح تھی...

مگر آرم-ان کے لیے خوشی دروازے پر آکر واپس لوٹ گئی تھی۔

دادی اور ساجد کی خاموشی نے آرم-ان کے دل پر عجیب بوجھ ڈال دیا تھا۔

عید کے دن بھی اس سرد مہری نے اسے اندر تک چبھ لیا۔

وہ آہستہ سے کمرے میں آیا جہاں ایمان نور خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی عید والی چمک نہیں تھی، صرف تھکن تھی۔

آرم-ان نے بیٹھتے ہوئے دھیمی مگر ٹوٹی ہوئی آواز میں پوچھا،

"ماما... عید والے دن بھی یہ لوگ اتنے سخت مزاج ہیں؟ آخر ہم نے کیا کیا ہے جو ان کا رویہ ایسا ہے"...

اس کے لہجے میں شکوہ کم، دکھ زیادہ تھا۔

ایمان نور نے اپنے بیٹے کو دیکھا، جیسے اس سوال کا جواب برسوں سے ان کے پاس بھی نہ ہو۔

چند لمحے وہ خاموش رہیں، پھر آہستہ بولیں،

"بیٹا... بعض لوگ دل سے دور ہو جائیں نا، تو تہوار بھی انہیں نرم نہیں کرتے"...

آرم۔ان نے فوراً کہا،

"مگر ہم نے کیا بگاڑا ہے ان کا؟ ہم نے کب ان سے دشمنی کی؟"

اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

"عید کے دن بھی جواب تک نہ دینا"...

وہ جملہ ادھورا چھوڑ گیا۔

ایمان نور کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

"کچھ رشتے خون سے ہوتے ہیں، کچھ رویّوں سے... اور کبھی کبھی خون کے رشتے بھی رویّوں میں ہار جاتے ہیں۔"

آرم-ان خاموش ہو گیا۔

وہ صرف ماں کو دیکھتا رہا۔

پہلی بار اسے لگا شاید یہ لڑائی گھر کی نہیں... دلوں کی ہے۔

اور اس جنگ میں عید بھی ہار گئی تھی۔

ماں سے بات کے بعد آرم-ان کو اچانک مومنہ کا خیال آیا۔

اسے لگا شاید گھر والوں کی سرد مہری کے بعد وہی ایک شخص ہے جس سے بات کر کے دل ہلکا ہو سکتا ہے۔

اس نے فوراً فون اٹھایا اور مومنہ کو میسجز کرنے لگا۔

عید کی اپنی چند تصویریں بھیجیں... نئے کپڑوں میں، مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے، حالانکہ وہ مسکراہٹ دل سے نہیں تھی۔

اس نے لکھا،

"Eid Mubarak..."

پھر انتظار کرنے لگا۔

مگر مومنہ کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

نہ میسج...

نہ کوئی ری ایکشن...

نہ ایک لفظ۔

آرم-ان کو سمجھ نہ آیا۔

اس کے دل میں ہلکی بے چینی اترنے لگی۔

کچھ دیر انتظار کے بعد اس نے خود ہی مومنہ کو کال کر دی۔

فون بجا...

اور کال اٹھ گئی۔

آرم-ان نے فوراً نرم لہجے میں کہا،

"عید مبارک"...

دوسری طرف سے مومنہ کی ہلکی سی آواز آئی،

"خیر مبارک"...

بس اتنا۔

اور اگلے ہی لمحے کال بند ہو گئی۔

ارمان کچھ سیکنڈ فون کو دیکھتا رہ گیا۔

جیسے اسے یقین نہ آیا ہو ابھی کیا ہوا۔

یہ وہ مومنہ نہیں تھی جس کی آواز سن کر اسے سکون ملتا تھا۔

اس ایک مختصر "خیر مبارک" میں بھی اجنبیت تھی۔

فاصلہ تھا۔

اور یہی چیز آرم-ان کو ڈرانے لگی۔

اس کے دل میں عجیب سا خوف جاگا

کیا وہ دور ہو رہی ہے؟

گھر والوں کی سرد مہری ایک طرف...

اور اب مومنہ کی یہ بے رخی۔

عید کے دن پہلی بار ارمان کو خوشی سے زیادہ کھو دینے کا ڈر محسوس ہونے لگا۔

مومنہ کی وہ مختصر سی بات اور فوراً کال بند کر دینا آرم-ان کو اندر تک ہلا گیا۔

وہ بہت پریشان ہو گیا۔

اس کا دل ایک عجیب بوجھ سے بھرنے لگا، جیسے سینے پر کچھ رکھا ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ گھر والوں کے رویّے سے زخمی تھا، اور اب مومنہ کی بے رخی نے اس زخم کو اور گہرا کر دیا تھا۔

اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔

مومنہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟

وہ بار بار کال کا وہ لمحہ یاد کرنے لگا

اس کا "عید مبارک" کہنا...

اور جواب میں بس ایک سرد سا "خیر مبارک"...

پھر خاموشی۔

پھر کٹتی ہوئی کال۔

یہ سب ارمان کے دل میں کانٹے کی طرح چبھنے لگا۔

وہ کمرے میں ٹہلنے لگا، کبھی فون دیکھتا، کبھی اسکرین لاک کر دیتا، پھر دوبارہ کھول لیتا۔

شاید کوئی میسج آجائے۔

شاید وہ خود دوبارہ کال کرے۔

شاید وہ صرف مصروف ہو۔

مگر ہر "شاید" اگلے لمحے ٹوٹ جاتا۔

اسے پہلی بار واقعی خوف محسوس ہوا۔

ایسا خوف جو منطق سے نہیں، محبت سے پیدا ہوتا ہے۔

اس کا دل بھاری ہونے لگا۔

سانسیں بوجھل۔

سوچیں بے قابو۔

کیا وہ مجھ سے دور ہو رہی ہے؟

کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟

کیا وہ پھر مجھے چھوڑنے والی ہے؟

سوال ہی سوال تھے۔

جواب کوئی نہیں۔

اور عید کے شور کے بیچ ارمان کے اندر خاموشی کا ایک طوفان اٹھ چکا تھا۔

مومنہ کے سرد رویّے کے بعد آرم-ان نے خود کو روکنے کے بجائے اور زیادہ لکھنا شروع کر دیا۔ جیسے جتنا سامنے سے فاصلہ بڑھ رہا تھا، وہ اتنا ہی لفظوں سے اس خلا کو بھرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

وہ لمبے لمبے پیراگراف میسجز میں بھیجنے لگا۔

اپنے دل کی کیفیت...

اپنی بے چینی...

اپنی عید کی اداسی...

یہاں تک کہ اپنے خوف بھی۔

ہر میسج میں وہ مومنہ کو سمجھانے، روکنے، قریب رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مگر دوسری طرف سے جواب آتے،

"ہمم"...

"اچھا"...

"ٹھیک"...

"ہاں"...

صرف چھوٹے، ٹھنڈے، کٹے ہوئے الفاظ۔

بے جان۔

بے حس۔

ارمان ہر جواب پڑھ کر اور ٹوٹنے لگا۔

اسے محسوس ہونے لگا جیسے وہ اکیلا گفتگو کر رہا ہے، اور دوسری طرف صرف رسمی موجودگی ہے۔

جس محبت میں وہ خود کو پوری شدت سے ڈال چکا تھا، وہاں اب اسے اپنی ہی آواز گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔

اس کے اندر غصہ بھی اٹھ رہا تھا۔

مومنہ پر؟

خود پر؟

شاید دونوں پر۔

کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنی عزتِ نفس یہاں ختم کر چکا ہے۔

ایک ایک میسج کے ساتھ۔

ایک ایک منت کے ساتھ۔

ایک ایک وضاحت کے ساتھ۔

وہ شخص جو محبت میں وقار رکھتا تھا، آج جواب کے لیے ترس رہا تھا۔

اور یہی احساس اسے اندر سے جلا رہا تھا۔

اس نے فون مضبوطی سے پکڑ لیا۔

جبڑے بھنچ گئے۔

آنکھوں میں غصہ اور دل میں ذلت کا درد تھا۔

اسے لگا وہ محبت نہیں مانگ رہا...

خود کو گرا رہا ہے۔

اور یہ احساس ارمان کو اندر سے توڑ رہا تھا۔

عید کے چند دن بعد تک ارمان خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا، مگر دل تھا کہ مانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بار بار موبائل اٹھاتا، کچھ لکھتا، پھر مٹا دیتا۔ آخر کار ایک دن اس نے ہمت کر کے مومنہ کو میسج کر ہی دیا۔

"مومنہ... آپ سے بات کرنی تھی... سب ٹھیک ہو سکتا ہے نا؟" ارمان نے لکھا۔

کچھ دیر بعد جواب آیا۔

"سب ختم ہو چکا ہے I am not interested." ...مومنہ نے کہا۔

یہ جملہ ارمان کے دل پر جیسے سیدھا لگا۔ وہ چند لمحے اسکرین کو دیکھتا رہ گیا، پھر لرزتی انگلیوں سے لکھا،

"مگر کیوں؟ اچانک ایسا کیا ہو گیا؟ ہم ٹھیک تو تھے نا"...

اس کے جواب میں پھر وہی سردی تھی۔

"میں نے کہا نا... ختم ہو چکا ہے۔ پلیز سمجھنے کی کوشش کریں۔"

آرم-ان کا سانس جیسے رک گیا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں چلنے لگا، پھر واپس آ کر دوبارہ میسج لکھا،

"میں سمجھ نہیں پا رہا... میں نے کیا غلط کیا ہے؟"

مومنہ نے اس بار زیادہ سختی سے جواب دیا،

"آپ نے کچھ غلط نہیں کیا... بس مجھے اب یہ سب نہیں چاہیے۔"

یہ پڑھ کر ارمان کا ہاتھ فون سے ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ آہستہ سے بولا،

"تو پھر میں کیا کروں مومنہ؟"

مگر اس بار کوئی جواب نہ آیا۔

صرف seen بھی نہیں... صرف خاموشی۔

ارمان فون کو دیکھتا رہ گیا اور دھیرے سے بولا،

"تو مطلب واقعی ختم ہو گیا"...

ارمان چند لمحے وہیں ساکت بیٹھا رہا۔ اس کے ہاتھ میں فون تھا مگر اب اس میں کوئی زندگی نہیں بچی تھی۔ اسکرین بند ہو چکی تھی، مگر وہ جملے ابھی بھی اس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔

"سب ختم ہو چکا ہے"...

"I am not interested..."

وہ آہستہ سے اٹھا، کمرے میں چلنے لگا مگر ہر قدم جیسے بے معنی ہو گیا ہو۔ دل میں ایک عجیب سا بوجھ تھا، جیسے سینے پر کوئی چیز رکھی ہو اور سانس لینا مشکل ہو رہا ہو۔ وہ بار بار خود سے سوال کر رہا تھا، مگر جواب کہیں نہیں تھا۔

"میں نے کیا غلط کیا تھا؟" وہ خود سے ہی بولا۔

پھر خود ہی ہنس پڑا، مگر وہ ہنسی نہیں تھی... وہ ٹوٹا ہوا ردِ عمل تھا۔

وہ کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ باہر لوگ اپنی زندگیوں میں مصروف تھے، کوئی ہنس رہا تھا، کوئی جا رہا تھا، مگر ارمان کے لیے سب کچھ رک گیا تھا۔ اس کی دنیا جیسے ایک میسج میں سمٹ گئی تھی، اور اسی ایک جملے نے اسے اندر سے خالی کر دیا تھا۔

اسے سب سے زیادہ تکلیف اس بات کی نہیں تھی کہ مومنہ چلی گئی... بلکہ اس بات کی تھی کہ اسے سمجھ بھی نہیں آیا کیوں۔

وہ آہستہ سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں نمی تھی مگر آنسو ابھی تک نہیں گرے تھے، جیسے درد بھی تھک چکا ہو۔

"کیا محبت واقعی اتنی آسانی سے ختم ہو جاتی ہے..." اس نے خود سے کہا۔

اور پہلی بار اسے لگا کہ شاید وہ صرف کسی انسان کو نہیں... اپنی پوری امید کو کھو بیٹھا ہے۔

یونیورسٹی واپس آکر بھی آرم-ان کا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ کلاس روم میں بیٹھا ہوتا تو استاد کی آواز سنائی دیتی مگر الفاظ ذہن تک نہیں پہنچتے تھے۔ ہر صفحہ، ہر نوٹ، ہر چہرہ... سب دھندلا سا لگنے لگا تھا۔ اس کے اندر بس ایک ہی سوال بار بار گونجتا تھا۔

"آخر ہوا کیا تھا؟"

کئی بار اس نے فیصلہ کیا کہ مومنہ سے جا کر سیدھا بات کرے گا، سب کچھ پوچھے گا، کم از کم کوئی وجہ تو ملے گی۔ وہ خود کو تیار بھی کرتا، راستہ بھی طے کرتا، مگر جب سامنے مومنہ آتی... اس کے قدم جیسے رک جاتے۔

کبھی وہ اسے دور سے دیکھ لیتا، کبھی کلاس کے باہر کھڑے ہو کر ہمت جمع کرتا، مگر پھر بھی آگے نہیں بڑھ پاتا۔ دل میں ایک عجیب سا خوف تھا کہ اگر اس نے دوبارہ بات کی اور وہی سرد جواب ملا تو شاید وہ مکمل طور پر ٹوٹ جائے گا۔

مومنہ اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اس کا رویہ واضح تھا، فاصلے صاف تھے۔ وہ آرم-ان کو دیکھتی بھی تو بس ایک مختصر سی نظر... جیسے ماضی میں کچھ تھا مگر اب کچھ باقی نہیں۔

آرم-ان کئی بار خود سے کہتا،

"بس ایک بار... ایک بار وجہ پوچھ لوں"...

مگر وہ "ایک بار" کبھی حقیقت نہیں بن سکا۔

کیونکہ ہر بار ہمت اس کے قدموں سے پہلے ٹوٹ جاتی تھی۔

اور وہی سوال، جو اس کے دل کو دن رات کھا رہا تھا، آہستہ آہستہ اس کی خاموشی بننے لگا۔

یونیورسٹی کے دن گزرتے جا رہے تھے، مگر ارمان کے لیے ہر دن ایک ہی سوال چھوڑ جاتا تھا۔ کچھ دوستوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ "اگر محبت ختم ہو گئی ہے تو کم از کم دوستی ہی رکھ لو"، مگر آرم-ان ہر بار خاموش ہو جاتا۔

وہ دل ہی دل میں جانتا تھا کہ اس کے لیے مومنہ اب "دوست" نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے وہ ابھی بھی وہی جگہ رکھتی تھی جہاں سے یا تو سب کچھ ہوتا ہے... یا کچھ بھی نہیں رہتا۔

وہ خود سے کہتا،

"دوستی؟... نہیں... میں یہ نہیں کر سکتا۔"

کیونکہ سچ یہ تھا کہ آرم-ان ابھی بھی مومنہ سے محبت کرتا تھا۔ اور محبت کے ساتھ جب تکلیف جڑی ہو، تو دوستی کا لفظ بھی بے معنی لگنے لگتا ہے۔

مومنہ کا بدلتا ہوا رویہ، اس کی خاموشی، اس کا فاصلے رکھنا... یہ سب آرم-ان کے لیے برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ ہر بار اسے دیکھتا اور اندر سے ٹوٹتا

جاتا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ جس شخص کے ساتھ اس نے اپنے دل کے اتنے راز بانٹے، وہی اتنا اجنبی کیسے ہو گیا۔

وہ اکثر خود سے پوچھتا،

"کیا میں اتنا غیر ضروری ہو گیا ہوں اس کی زندگی میں؟"

اور جواب ہمیشہ خاموشی ہوتا۔

یہی خاموشی آرم-ان کو سب سے زیادہ زخمی کر رہی تھی۔ نہ کوئی لڑائی، نہ کوئی وضاحت… بس ایک ایسا خلا جو روز بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ محبت کو ختم نہیں کرنا چاہتا تھا، اور یہی بات اسے سب سے زیادہ توڑ رہی تھی۔ کیونکہ جس رشتے کو وہ زندہ رکھنا چاہتا تھا، وہ دوسری طرف سے پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔

موجودہ وقت :

"اب تم بتانا چاہو گی تم نے ارمان کو کیوں چھوڑا؟" سکندر نے مومنہ سے پوچھا۔

مومنہ چند لمحے خاموش رہی، پھر دھیمے لہجے میں بولی،

"جان کر کچھ بدل جائے گا سکندر"...

سکندر نے فوراً کہا،

"چاہے نہ بدلے، لیکن میں وجہ جاننا چاہتا ہوں۔ سات سال گزر چکے ہیں... سب ختم ہو گیا، مگر آخر وہ کیا وجہ تھی جو اتنی محبت کرنے والے شخص سے تم دور ہو گئی؟"

اس بار مومنہ نے نظریں جھکا لیں۔ اس کے چہرے پر وہی پرانی تھکن اور الجھن تھی جو برسوں سے اس کے اندر دبی ہوئی تھی۔

اس نے آہستہ سے کہا،

"ہر کہانی میں ایک وجہ نہیں ہوتی سکندر... کبھی کبھی وجہیں اتنی بکھری ہوتی ہیں کہ ان کا نام رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔"

سکندر نے فوراً مداخلت کی،

"مگر ارمان کے لیے یہ صرف کہانی نہیں تھی... وہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ آج بھی وجہ ڈھونڈ رہا ہے۔"

مومنہ کی آنکھیں کچھ لمحوں کے لیے بھیگ گئیں۔

"میں نے اسے ایک دن میں نہیں چھوڑا تھا..." وہ بولی۔ "یہ سب آہستہ آہستہ ہوا... خاموشیوں میں، غلط فہمیوں میں، اور ان باتوں میں جو ہم دونوں وقت پر کہہ نہیں سکے۔"

سکندر نے سخت لہجے میں کہا،

"تو پھر اصل بات کیا تھی مومنہ؟"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

مومنہ نے گہری سانس لی... اور بس اتنا کہا،

"کبھی کبھی ہم کسی کو چھوڑتے نہیں... بس خود سے کھو دیتے ہیں۔"

اور اس جملے کے بعد فضا میں ایک ایسا سکوت پھیل گیا جس میں نہ ارمان کا جواب تھا... نہ مومنہ کی پوری سچائی۔

"ارمان کو صرف اپنی پڑی ہوتی تھی..." وہ آہستہ بولی، جیسے کسی پرانی بات کو دوبارہ چھو رہی ہو۔

سکندر نے فوراً پوچھا،

"کیا مطلب؟"

مومنہ نے ایک لمحے کو نظریں اٹھائیں، پھر ہلکے غصے اور دکھ کے ملے جلے لہجے میں کہا،

"وہ میری نہیں سنتا تھا... بس اپنے رونے ہی میرے آگے رو دیتا تھا"...

سکندر نے فوراً بات کا زاویہ بدلا،

"مرد اپنی پسندیدہ عورت سے ہی سب کچھ شیئر کرتا ہے"...

مومنہ نے ایک سرد سی ہنسی ہنسی، جیسے بات دل پر لگی ہو مگر وہ دکھا نہ رہی ہو۔

"وہ تو ٹھیک ہے..." وہ بولی، "لیکن میری بھی تو سنتا نا... میں اسے babysit کرنے نہیں آئی تھی... میں خود اس کے سامنے baby بننا چاہتی تھی"...

اس کے لہجے میں اب سختی آ گئی تھی۔

"میں بھی چاہتی تھی وہ مجھے سنبھالے، میری بات سمجھے، میرے بھی احساسات ہوں... ہر وقت بس وہی ٹوٹے، وہی روئے، اور میں بس سنتی رہوں؟"

کمرے میں لمحہ بھر خاموشی چھا گئی۔

سکندر نے اسے غور سے دیکھا، مگر کچھ نہ بولا۔

مومنہ نے آہستہ سے نظریں نیچی کر لیں اور کہا،

"میں بھی انسان تھی سکندر... کوئی دیوار نہیں تھی جس کے ساتھ وہ ہر وقت اپنا درد رکھ دیتا اور میں بس سہتی رہتی۔"

اس جملے کے بعد فضا اور بھاری ہو گئی... جیسے دونوں طرف سچ تھا، مگر مکمل کہانی کسی کے پاس نہیں تھی۔

"میرا پاؤں سوجا ہوا تھا... اس کی pic اسے بھیجی تھی، اس نے دیکھا بھی نہیں کہ ہوا کیا ہے۔ الٹا کہتا رہا face کی pic بھیجو..." مومنہ نے آہستہ سے کہا، جیسے پرانی باتیں پھر سے دل پر آ گئی ہوں۔

سکندر نے فوراً پوچھا،

"تم نے اسے بتایا تھا کہ تمہارا پاؤں سوجا ہوا ہے؟"

مومنہ نے سر ہلا دیا،

"نہیں"...

یہ سنتے ہی سکندر نے گہری سانس لی اور تھوڑا سخت لہجے میں بولا،

"تو پھر اسے کیسے احساس ہونا تھا مومنہ؟ اسے پتا ہی نہیں تھا تم نے وہ pic کیوں بھیجی۔"

مومنہ کچھ کہنے لگی، مگر سکندر نے بات درمیان میں کاٹ دی،

"باتیں کرنے سے مسائل حل ہوتے ہیں... تمہیں جو چیز اس میں غلط لگتی تھی، تم اسے بتا دیتی، اسے بدلنے کا موقع تو دیتی... تم نے بتایا ہی نہیں اور خود ہی سائیڈ ہوتی چلی گئی۔"

مومنہ خاموش ہو گئی۔

اس کے چہرے پر کوئی جواب نہیں تھا، بس ایک بھاری سا سکوت تھا۔

سکندر نے اسے دیکھا اور پھر دھیمے مگر واضح لہجے میں کہا،

"رشتے اندازوں پر نہیں چلتے مومنہ... بات پر چلتے ہیں۔"

کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔

اور اس خاموشی میں مومنہ کو پہلی بار لگا کہ شاید کچھ فیصلے صرف دور ہونے کی وجہ سے نہیں ہوتے... بلکہ نہ بولنے کی وجہ سے بھی ہوتے ہیں۔

"میں مرد ہو کر تمہیں یہ کہہ رہا ہوں مومنہ"...

سکندر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ مگر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"مرد کو جذبات سمجھنے کی سمجھ اکثر دیر سے آتی ہے، کیونکہ اسے کبھی یہ سکھایا ہی نہیں جاتا کہ جذبات سے کیسے نمٹا جاتا ہے؛ اسی لیے وہ یہ بھی نہیں جان پاتا کہ جذباتی طور پر اس سے کہاں غلطی ہوئی۔"

مومنہ نے اس کی بات سنی، مگر فوراً جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی سنجیدگی آ گئی تھی، جیسے وہ اس جملے کو صرف سن نہیں رہی بلکہ اندر تک محسوس کر رہی ہو۔

کچھ لمحے بعد وہ آہستہ سے بولی،

"یہ بات ٹھیک ہے سکندر... مگر ہر غلطی کا ذمہ دار صرف سیکھنے کا فقدان بھی نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی ہم جانتے ہوئے بھی نہیں سنتے، اور جانتے ہوئے بھی نہیں رکتے۔"

سکندر خاموش رہا۔

مومنہ نے نظریں جھکا کر مزید کہا،

"جذبات نہ سمجھنا ایک بات ہے... مگر سامنے والے کے جذبات کو ignore کرنا دوسری بات ہے۔"

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔

یہ خاموشی اس بار تلخ نہیں تھی... بلکہ بھاری تھی۔

ایسی خاموشی جس میں دونوں طرف کچھ سچ تھے... مگر کوئی بھی مکمل طور پر صحیح نہیں تھا۔

"تم اسے بتاتی تو صحیح، کہ غلطی کہاں کی اس نے..." سکندر نے نرمی مگر سنجیدگی سے کہا۔

مومنہ ایک لمحے کو خاموش رہی، پھر اس کی آواز کانپ گئی۔

"میں تھک گئی تھی اپنی زندگی سے... میں چاہتی تھی کوئی میرے کہے بغیر ہی مجھے سمجھ لے، الفاظ کی ضرورت ہی نہ پڑے مجھے"...

اس کے یہ الفاظ آہستہ آہستہ ٹوٹتے گئے، اور پھر وہ روتے ہوئے بولی۔ کال پر خاموشی چھا گئی، صرف اس کی ہچکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

کنفرس کال پر موجود رِمشاء بھی یہ سن کر خاموش ہو گئی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا، بس ایک بے بسی تھی جو تینوں کے درمیان پھیل گئی۔

سکندر نے گہری سانس لی، جیسے وہ الفاظ کو تول رہا ہو۔

"مومنہ... مسئلہ یہ ہے کہ لوگ سمجھنے کی امید رکھتے ہیں، مگر بتاتے نہیں۔ اور جب بتاتے نہیں تو دوسرا شخص غلط سمجھ لیتا ہے۔"

مومنہ نے روتے ہوئے جواب دیا،

"مگر ہر بار میں ہی کیوں بتاؤں؟ ہر بار میں ہی کیوں سمجھاؤں؟"

رِمشاء نے آہستہ سے کہا،

"کبھی کبھی دونوں طرف خاموشی غلط فہمی سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے"...

مگر اب کوئی جلدی میں نہیں تھا۔

نہ مومنہ، نہ سکندر، نہ رِمشاء۔

کیونکہ اس لمحے میں سب سمجھ رہے تھے کہ مسئلہ صرف ایک شخص کا نہیں تھا... بلکہ وہ سب کہیں نہ کہیں ایک ہی کہانی کے مختلف درد تھے۔

"اچھا یہ بتاؤ... عید پر کیا ہوا تھا؟" سکندر نے آہستہ مگر سیدھا سوال کیا۔

مومنہ کچھ لمحے خاموش رہی۔ جیسے وہ اس دن کو دوبارہ یاد نہیں کرنا چاہتی تھی، مگر پھر اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

"میرے بابا ہسپتال میں تھے... میں ساری رات وہیں رہی تھی۔ دو تین دن سے سوئی بھی نہیں تھی۔ میری امی نے کہا کہ گھر جا کر سو جاؤ، اب وہ بابا کا دھیان رکھ لیں گی... میں سن کر گھر آ گئی تھی سونے کے لیے۔ عید میرے لیے کوئی عید نہیں تھی، اذیت تھی... مجھے ہوش نہیں تھا نہ نئے کپڑوں کی، نہ کسی چیز کی"...

وہ رک گئی، سانس لینا جیسے مشکل ہو رہا تھا۔

"صبح ارمان کے میسجز آئے... کہ عید کی pics send کرو... اسے پتا بھی تھا کہ میں ہسپتال میں بابا کے پاس ہوں... پھر بھی اس نے مجھے میسجز کر کے

تنگ کیا... پھر کال کر کے میری نیند خراب کر دی... میں دو گھنٹے بھی نہیں سو سکی تھی... پھر واپس ہسپتال چلی گئی"...

اس کی آواز کانپ گئی۔

"اس دن مجھے ارمان سے نفرت ہو گئی تھی... مجھے ارمان کے نام سے بھی نفرت ہے"...

کال پر ایک دم خاموشی چھا گئی۔

نہ سکندر بولا، نہ رمشاء۔

صرف ایک بھاری سی خاموشی تھی... جس میں صرف مومنہ کا درد گونج رہا تھا، اور آرم-ان کی غلطی کہیں بہت پیچھے ٹوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"تم نے اس لیے ارمان کو چھوڑ دیا تھا؟" سکندر نے آہستہ مگر سیدھا سوال کیا۔

مومنہ نے فوراً نفی میں سٹیکر سینڈ کیا، جس میں تھکن اور الجھن دونوں تھے۔

"اس لیے نہیں"...

سکندر نے فوراً پوچھا،

"پھر کس لیے؟"

مومنہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ اچانک اس کے لہجے میں ہلکی سی گھبراہٹ آ گئی۔

"میرے husband اٹھ گئے ہیں... میں تھوڑی دیر میں کال کرتی ہوں۔ یا تم ایسا کرو... مجھ سے ملنے آ جاؤ"...

یہ جملہ سن کر سکندر ایک لمحے کو ساکت رہ گیا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔

رات کے 2:30 بج رہے تھے۔

وہ دھیرے سے بولا،

"مومنہ... اس وقت؟"

مومنہ نے ہلکی سی بے بسی سے کہا،

"بس... ابھی بات ختم نہیں ہوئی"...

مگر سکندر نے ایک گہری سانس لی، اور اس کے لہجے میں حقیقت آ گئی۔

فون اچانک کٹ گیا۔

سکندر ایک لمحے کو ساکت رہ گیا، جیسے اس نے خود بھی توقع نہ کی ہو کہ بات ادھوری رہ جائے گی۔ پھر اس کے چہرے پر غصہ تیزی سے واپس آیا۔ وہ موبائل کو دیکھتا رہا، پھر زور سے میز پر رکھ دیا۔

اس کے اندر کا اضطراب اب قابو سے باہر ہو رہا تھا۔

اسی وقت اسے یاد آیا کہ رمشاء ابھی بھی کال پر تھی یا کم از کم کنیکٹ تھی۔

وہ فوراً موبائل دوبارہ کان سے لگاتے ہوئے سخت لہجے میں بولا،

"تمہیں پتا ہے کیا وجہ ہوئی ان دونوں کے الگ ہونے کی؟"

دوسری طرف خاموشی تھی۔

کچھ بھی نہیں۔

نہ جواب، نہ آواز۔

سکندر کا غصہ اور بڑھ گیا۔

"میں تم سے بات کر رہا ہوں! تم لوگ سب کچھ جانتے ہو مگر کوئی سیدھی بات نہیں کرتا"!

مگر رمشاء کی طرف سے اب بھی کوئی جواب نہ آیا۔

کال پر وہ موجود تو تھی... مگر خاموشی نے جیسے سب کچھ روک دیا تھا۔

سکندر نے دانت بھینچ لیے، اس کے ہاتھ مٹھی میں بند ہو گئے۔

"یہ سب کیا تماشا ہے..." وہ خود سے بولا۔

اس کا غصہ اب صرف ایک شخص پر نہیں تھا... بلکہ پوری اس کہانی پر تھا جو ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی، اور جسے کوئی بھی مکمل کرنے کو تیار نہیں تھا۔

سکندر سڑک پر چل رہا تھا مگر اب اس کے قدموں میں بھی بے چینی آ چکی تھی۔ اس کا غصہ مسلسل بڑھ رہا تھا، جیسے اندر کوئی چیز بار بار پھٹنے کو تیار ہو۔

وہ رک گیا، ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں، مگر ذہن پھر بھی خاموش نہیں ہوا۔ مومنہ کے الفاظ، رمشاء کی خاموشی، اور وہ ساری ادھوری باتیں ایک ساتھ اس کے اندر گھوم رہی تھیں۔

"آخر سب لوگ سیدھی بات کیوں نہیں کرتے..." وہ دانت بھینچ کر خود سے بولا۔

اس نے مٹھی مضبوط کر لی، پھر ہاتھ بالوں میں پھیرتے ہوئے تیزی سے دوبارہ چلنے لگا۔ اس کا چہرہ سخت تھا، سانسیں تیز، اور قدم بے ترتیب۔

راستے میں لوگ آجا رہے تھے مگر اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ جیسے اپنی ہی دنیا میں بند تھا—ایک ایسی دنیا جہاں ہر بات ادھوری تھی اور ہر جواب غائب۔

"میں پاگل ہو جاؤں گا اس سب میں..." اس نے غصے اور بے بسی کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

مگر اس غصے کے پیچھے اصل چیز صرف غصہ نہیں تھی... بلکہ وہ ٹوٹ پھوٹ تھی جو اسے اندر سے آہستہ آہستہ کھا رہی تھی۔

سکندر سڑک کے بیچ چند لمحے رُکا رہا، جیسے اپنے ہی فیصلے کو تول رہا ہو۔ اس کے اندر غصہ بھی تھا، بے چینی بھی، اور ایک ضد بھی جو اب اسے پیچھے ہٹنے نہیں دے رہی تھی۔

وہ آہستہ سے بولا،

"ٹھیک ہے... میں جا رہا ہوں مومنہ کے گھر۔ دیکھی جائے گی جو بھی ہو گا"...

یہ کہہ کر اس نے تیزی سے اپنی موٹر سائیکل نکالی۔ انجن اسٹارٹ کیا اور ایک لمحے کے بغیر سیدھا راستے پر نکل گیا۔ ہوا اس کے چہرے سے ٹکراتی رہی مگر اس کے ذہن کا شور کم نہیں ہو رہا تھا۔

اس کے ہاتھ مضبوطی سے ہینڈل پر تھے، اور آنکھیں ایک ہی سمت میں — مومنہ کے گھر کی طرف۔ ہر گزرتا لمحہ اس کے اندر کے فیصلے کو مزید سخت کر رہا تھا۔

راستے میں ٹریفک، لائٹس، اور لوگ سب پیچھے رہ گئے۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی بات چل رہی تھی — کہ آج اسے جواب چاہیے، چاہے وہ کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو۔

اور وہ اسی سوچ میں تیزی سے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا... اس منزل کی طرف جہاں شاید ایک سچ اسے مزید توڑنے والا تھا۔

ٹھیک ہے، اب میں اسی موڈ میں لکھ رہا ہوں زیادہ سوال نہیں، بس ملاقات اور باتیں، جیسے تم چاہتے ہو۔

تبھی رِمشا کی کال آئی۔

"سکندر... مجھے بھی راستے سے پک کر لو، ہم ساتھ چلتے ہیں... مومِنا کی طرف جانا ہے۔"

سکندر ایک لمحے کو رکا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ دو سال کی خاموشی اچانک اس ایک کال سے ٹوٹ گئی۔

وہ بس آہستہ سے بولا:

"ٹھیک ہے... میں چوبرجی پہنچ رہا ہوں۔"

اور پھر بائیک لے کر نکل پڑا۔

چوبرجی کی رات بالکل سنسان تھی۔

ہوا ٹھنڈی تھی، سڑکیں خالی، اور شہر ایک عجیب سی خاموشی میں ڈوبا ہوا۔ سکندر جتنا قریب جا رہا تھا، اتنا ہی اس کے اندر پرانی یادیں جاگ رہی تھیں۔

دو سال... یہ وقت نہیں تھا، یہ ایک ادھورا صفحہ تھا۔

وہ چوبرجی پہنچا۔

بائیک روکی، ہیلمٹ اتارا... اور نظریں اٹھائیں۔

اور پھر وہ رک گیا۔

رِمشا۔

وہ وہاں کھڑی تھی۔

سکندر بس ایک لمحے کو خاموش ہو گیا۔

دو سال بعد... اور وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ سادہ سا انداز، مگر وہی پرانی کشش جو سکندر کو ہمیشہ خاموش کر دیتی تھی۔

رِمشا نے بھی اسے دیکھ لیا۔

دونوں کی نظریں ملیں... اور وقت جیسے ٹھہر گیا۔

سکندر آہستہ آہستہ اس کے قریب آیا۔

"تم واقعی آ گئی ہو..." اس کی آواز بہت ہلکی تھی۔

رِمشا نے ایک چھوٹی سی سانس لی۔

"میں نے کہا تھا نا"...

بس اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

سکندر نے بائیک سٹارٹ کی۔

رِمشا پیچھے بیٹھ گئی۔

دونوں کے درمیان شروع میں خاموشی تھی... مگر وہ خاموشی عجیب سی نہیں تھی، پرانی سی تھی۔

کچھ دیر بعد سکندر نے ہلکے سے کہا:

"دو سال بعد بھی تم ویسی ہی ہو"...

پیچھے سے رِمشا کی آواز آئی:

"اور تم... شاید ویسے نہیں رہے۔"

سکندر ہلکا سا مسکرایا۔

"لوگ بدل جاتے ہیں رِمشا... مگر کچھ باتیں نہیں بدلتی۔"

رِمشا نے کچھ نہیں کہا۔

بس ہوا کو دیکھتی رہی۔

راستہ چلتا رہا۔

رات کے تین بج رہے تھے... اور چوبرجی کے بعد سڑکیں اور بھی خاموش ہو گئی تھیں۔

مگر اس خاموشی میں دو دل باتیں کر رہے تھے... بغیر سوالوں کے، بغیر وضاحت کے۔

بس یادوں کے ساتھ... اور ایک ادھوری سی کہانی کے ساتھ۔

وہ رِمشا اس کی بائیک پر بیٹھ گئی۔ رات کے تین بج رہے تھے اور چوبرجی کے سائے پیچھے رہ گئے تھے۔ دونوں خاموشی سے چل پڑے، مگر یہ خاموشی بھاری نہیں تھی بس پرانی تھی۔

ہوا ان کے چہروں سے ٹکرا رہی تھی۔ شہر کی روشنیاں پیچھے رہتی جا رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد پیچھے سے رِمشا کی آواز آئی:

"شادی کر لی تم نے؟"

سکندر نے بغیر کسی توقف کے جواب دیا:

"نہیں"...

کچھ لمحہ خاموشی۔

پھر رِمشا نے آہستہ سے پوچھا:

"کیوں؟"

سکندر نے بائیک چلاتے ہوئے سامنے دیکھتے ہوئے کہا:

"کوئی پسند نہیں آتی... سب میرے غیر مذہبی رویے سے دور ہو جاتے ہیں۔"

یہ سن کر رِمشا نے ایک ہلکی سی سانس لی، جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ پھر آہستہ سے بولی:

"لڑکیاں اکثر یہ سوچتی ہیں کہ وہ bad boys کو ٹھیک کر سکتی ہیں"...

سکندر نے ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا:

"لیکن وہ مجھے ٹھیک نہیں کر تیں... الٹا خود پریشان ہو کر بھاگ جاتی ہیں۔"

ایک لمحہ خاموشی چھا گئی۔

پھر رِمشا ہنس پڑی۔

اس کی ہنسی رات کی خاموشی میں بہت صاف سنائی دی، جیسے کوئی پرانا زخم کچھ دیر کے لیے درد بھول گیا ہو۔

"تم واقعی کبھی سیدھی بات نہیں کرتے، سکندر..." اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

سکندر نے آئینے میں اسے دیکھا، پھر آہستہ سے کہا:

"اور تم ہمیشہ سنجیدہ بات کو ہنس کر ٹال دیتی ہو۔"

رِمشا نے کچھ نہیں کہا، بس اب بھی ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر تھی۔

سکندر نے بائیک کی رفتار بڑھا دی۔

ہوا اور تیز ہو گئی، اور شہر کی روشنیاں اور دور۔

مگر اس رفتار میں بھی کوئی بے قابوپن نہیں تھا—بس ایک عجیب سا بہاؤ تھا، جیسے دونوں کہیں بھاگ نہیں رہے تھے... بلکہ کسی چیز کی طرف واپس جا رہے تھے۔

بائیک رات کی سڑک پر تیزی سے چل رہی تھی۔ ہوا شور کر رہی تھی، مگر ان کے درمیان ایک اور ہی شور تھا—جملوں کا، یادوں کا، اور پرانی ادھوری باتوں کا۔

سکندر نے خاموشی توڑی:

"ویسے تم نے شادی کیوں نہیں کی، رِمشا؟"

پیچھے سے رِمشا کی آواز آئی، ہلکی سی، مگر سیدھی:

"یہ وجہ تم پوچھ رہے ہو؟"

سکندر چند لمحے خاموش رہا۔ اس نے آئینے میں اسے دیکھا، پھر آہستہ سے بولا:

"معاف کرنا... میں نے تمہیں ایسے ہی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے لگتا ہے میں یہ سب... محبت وغیرہ deserve ہی نہیں کرتا۔"

رِمشا کی سانس تھوڑی سی بھاری ہوئی، پھر وہ بولی:

"بات پتا ہے کیا ہے؟ جس کے پاس شدت سے محبت کرنے والی لڑکی بھی ہو نا... اسے پھر بھی قدر نہیں ہوتی۔"

وہ رکی، پھر آواز ذرا کانپی:

"ادھر ارمان کو دیکھو... کیسے پاگل ہوا پڑا ہے مومنہ کے پیچھے"...

سکندر نے آہستہ سے کہا:

"کاش میں یہ جان پاتا... کہ مومنہ نے ارمان کو کیوں چھوڑا"...

رِمشا نے فوراً کہا، جیسے اس سوال سے اسے چبھ ہوئی ہو:

"یہ جاننا ضروری ہے کیا؟"

سکندر نے سادہ سا جواب دیا:

"شاید میرے لیے ہو"...

چند لمحے خاموشی چھا گئی۔

صرف بائیک کی آواز اور رات کا شور تھا۔

پھر رِمشا کی آواز آئی، اس بار زیادہ بھاری، زیادہ سچ کے قریب:

"تم نے نادیہ کو چھوڑا... مجھے چھوڑا... اور مومنہ نے بھی... ویسے ہی چھوڑ دیا ہو گا، سکندر"...

یہ جملہ ہوا میں لٹک گیا۔

سکندر نے بائیک آہستہ کی۔

اس کے چہرے پر کوئی جواب نہیں تھا... بس ایک خاموش سی تھکن تھی۔

بائیک رات کی خاموش سڑک پر تیزی سے چل رہی تھی۔ ہوا ٹھنڈی تھی، مگر باتوں نے ماحول کو بھاری کر دیا تھا۔

سکندر نے کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد آہستہ سے کہا:

"لیکن میں نے تم دونوں کو کوئی امید نہیں دی تھی"...

پیچھے خاموشی چھا گئی۔

پھر وہ دھیرے سے بولا، جیسے خود سے بات کر رہا ہو:

"مومنہ تو... اس کی روح میں شامل ہو گئی تھی۔ اس کا حصہ بن گئی تھی"...

یہ جملہ کہتے ہوئے اس کی آواز پہلی بار ٹوٹی ہوئی محسوس ہوئی۔

بائیک کچھ لمحے سیدھی چلتی رہی، پھر سکندر نے ہلکی سی سانس لی:

"میں نے کبھی وعدہ نہیں کیا تھا... نہ تم سے، نہ نادیہ سے"...

پیچھے رِمشا خاموش تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی آواز آئی، بہت دھیمی:

"وعدے ہمیشہ لفظوں کے نہیں ہوتے سکندر"...

سکندر نے آئینے میں اس کی طرف دیکھا۔

رِمشا نے بات جاری رکھی، مگر اس بار اس کے لہجے میں طنز نہیں تھا، صرف حقیقت تھی:

"کبھی کبھی انسان اپنی موجودگی سے بھی کسی کو امید دے دیتا ہے"...

سکندر خاموش ہو گیا۔

اس کے ہاتھ ہینڈل پر مضبوط ہو گئے۔

کچھ لمحے صرف بائیک کی آواز تھی۔

پھر وہ آہستہ سے بولا:

"تو پھر میں کیا تھا؟"...

رِمشا نے فوراً جواب نہیں دیا۔

بس ہوا کو دیکھتی رہی... پھر آہستہ سے بولی:

"تم... وہ تھے جو آئے بھی اور چلے بھی گئے... مگر کسی کے اندر سے کبھی گئے نہیں۔"

یہ سن کر سکندر نے کچھ نہیں کہا۔

بس بائیک کی رفتار تھوڑی کم ہو گئی۔

رات اور گہری ہو رہی تھی... اور ان کے درمیان الفاظ کم، مگر احساس زیادہ ہو رہا تھا۔

تبھی وہ دونوں ایک بڑے اور خاموش سے بنگلے کے سامنے آ کر رُک گئے۔

رات کے تین بج رہے تھے اور پورا ماحول غیر معمولی حد تک سنسان تھا۔ اونچی دیواریں، لوہے کا بھاری سا گیٹ، اندر سے آتی مدھم پیلی روشنیاں اور کہیں دور سے آتی ہلکی سی آوازیں۔ سب کچھ مل کر یہ احساس دے رہا تھا جیسے وہ کسی بند دنیا کے دروازے پر کھڑے ہوں۔

سکندر نے بائیک آہستہ سے سائیڈ پر لگائی، انجن بند کیا اور کچھ لمحے بغیر کچھ کہے اس عمارت کو دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر وہی ضد تھی جو رات بھر بڑھتی رہی تھی۔ پھر اس نے ہیلمٹ اتارا اور آہستہ سے بولا:

"ہمیں اندر جانا ہے... مومنہ سے ملنے کے لیے۔"

پیچھے بیٹھی رِمشا نے فوراً گیٹ کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک گارڈ موجود تھا جو ان کی طرف ہی دیکھ رہا تھا، اور اس کی موجودگی ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ اندر جانا آسان نہیں ہو گا۔

رِمشا نے آہستہ سے کہا، "سکندر... یہ لوگ ہمیں آسانی سے اندر نہیں جانے دیں گے۔"

سکندر نے اس کی بات پر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور پھر رک گیا۔ اس کی نظریں سیدھی گیٹ پر تھیں، جیسے وہ اندر کی خاموشی کو توڑنا چاہتا ہو۔

رِمشا نے اس کا بازو تھامنے کی کوشش کی، "چلو یہاں سے... یہ ٹھیک نہیں لگ رہا۔"

مگر سکندر نے اس بار بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کے اندر کوئی چیز بہت پہلے فیصلہ کر چکی تھی۔

وہ آہستہ سے آگے بڑھا، اور گیٹ کے بالکل سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

رِمشا بھی اس کے ساتھ آ گئی، مگر اس کے قدم ہچکچاہٹ سے بھرے ہوئے تھے۔

ان دونوں کے سامنے وہی گارڈ موجود تھا، مگر باتیں نہیں ہو رہیں تھیں بس ایک خاموش توازن تھا جو کسی بھی لمحے ٹوٹ سکتا تھا۔

سکندر نے گہری سانس لی۔

"ہمیں مومنہ سے ملنا ہے..." اس نے بہت آہستہ مگر واضح آواز میں کہا۔

اس کی آواز میں نہ درخواست تھی، نہ بحث—بس ایک ضد تھی، ایک ادھورا سوال جو مکمل ہونا چاہتا تھا۔

گارڈ نے کچھ لمحے ان دونوں کو دیکھا، پھر گیٹ کی طرف مڑ گیا۔ اندر کا ماحول کچھ لمحوں کے لیے بدلتا محسوس ہوا جیسے کوئی اندر سے صورتحال سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

رِمشا نے دھیرے سے سکندر کی طرف دیکھا۔

"سکندر... تمہیں لگتا ہے وہ تم سے ملے گی؟"

سکندر نے نظریں گیٹ سے ہٹائے بغیر جواب دیا:

"مجھے بس یہ پتہ ہے... میں یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔"

یہ جملہ رات کی خاموشی میں بھاری ہو گیا۔

رِمشا کچھ نہ بولی۔

بس وہ دونوں وہیں کھڑے رہے ایک بند دروازے کے سامنے نہیں... بلکہ ایک ایسے ماضی کے سامنے جو دوبارہ ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا، اور اب فیصلہ کسی اور کے ہاتھ میں نہیں تھا۔

سکندر نے ایک لمحے کے لیے پورے ماحول کو غور سے دیکھا۔ رات کا دھندلا سا سکوت تھا، اور اس سکوت میں صرف دور کھڑا گارڈ اپنی معمولی سی نقل و حرکت کے ساتھ اس خاموشی کو توڑ رہا تھا۔ سکندر کے چہرے پر سنجیدگی تھی، جیسے وہ ہر ممکن خطرے کا اندازہ لگا رہا ہو۔ وہ آہستہ سے رمشا کے قریب آیا اور تقریباً سرگوشی میں بولا، "میں گارڈ کا دھیان کچھ دیر کے لیے دوسری طرف کر دیتا ہوں... یہ وقت ہے، تم مومنہ کو فوراً کال کرو اور اسے باہر لے آؤ۔ زیادہ دیر نہیں ہے ہمارے پاس۔"

رمشا نے اس کی بات سنی تو اس کے دل میں ایک ہلکی سی بے چینی دوڑ گئی۔ یہ سب اتنا آسان نہیں لگ رہا تھا جتنا وہ سوچ رہی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے نیچے دیکھا، پھر خود کو مضبوط کیا۔ اس نے فون اپنی انگلیوں میں مضبوطی سے پکڑا، جیسے اس کے اندر ہمت واپس آ رہی ہو۔ اس نے مومنا کا

نمبر ڈائل کیا۔ ہر بیل کے ساتھ اس کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی، اور اسے لگ رہا تھا جیسے وقت بھی جان بوجھ کر سست ہو گیا ہو۔

آخر کار دوسری طرف سے مومنا کی آواز آئی، "ہیلو؟"

رمشا نے فوراً اپنی آواز کو نارمل بنانے کی کوشش کی، مگر اس کے لہجے میں جلدی چھپی ہوئی تھی۔ "مومنہ... ذرا باہر آ جاؤ، ایک ضروری بات کرنی ہے۔ ابھی فوراً آؤ، پلیز زیادہ سوال نہ کرو۔"

دوسری طرف چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔ وہ خاموشی رمشا کے لیے سب سے بھاری تھی۔ پھر مومنا کی آواز آئی، اس بار تھوڑی حیران اور الجھی ہوئی، " اچھا میں آ رہی ہوں ہم فوراً یہاں سے نکلیں گے بس تم دیکھو باہر گارڈ کوئی ادھر ادھر کروں"

رمشا نے جلدی سے جواب دیا، "ہاں سب ٹھیک ہے... بس تم آ جاؤ، میں گیٹ کے پاس ہی ہوں، جلدی کرو۔"

کال بند ہوتے ہی رمشا نے گہری سانس لی اور سکندر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاموش سا اشارہ تھا، ایک پیغام تھا کہ کام ہو گیا ہے۔

سکندر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور آہستہ سے سر ہلایا، جیسے وہ اس لمحے کی اہمیت کو پوری طرح سمجھ رہا ہو۔ "وہ آرہی ہے..." رمشا نے دھیرے سے کہا۔

سکندر نے ایک لمحہ خاموشی سے لیا، پھر بولا، "اب اصل وقت شروع ہوا ہے۔ گارڈ کو ابھی میں ہینڈل کرتا ہوں، بس تم اپنی جگہ تیار رہنا۔ ایک بھی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔"

رمشا نے سر ہلایا مگر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی۔ وہ اپنے اندر چھپی ہوئی گھبراہٹ کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی، مگر ماحول ہی ایسا تھا کہ ہر چیز بوجھل لگ رہی تھی۔

سکندر آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور گارڈ کی طرف چل دیا۔ اس کی چال میں ایک عجیب سا اعتماد تھا، جیسے وہ جانتا ہو کہ اسے کیا کرنا ہے۔ دوسری طرف رمشا گیٹ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھی، ہر قدم کے ساتھ اس کی نظریں بار بار ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔

کچھ ہی لمحوں بعد ہوا میں ایک ہلکی سی حرکت پیدا ہوئی، جیسے رات خود بھی جاگ رہی ہو۔ دور سے قدموں کی آواز آہستہ آہستہ قریب آرہی تھی۔ یہ

مومنا تھی، جو شاید اس بات سے بے خبر تھی کہ اس کے آنے سے پہلے ہی ایک پورا منصوبہ اس کے انتظار میں کھڑا ہے۔

اور اسی لمحے، وقت جیسے تھم سا گیا... ہر کردار اپنی اپنی جگہ پر جم گیا، اور فضا میں ایک غیر یقینی سا سکوت پھیل گیا، جیسے اگلا سانس کسی بڑی تبدیلی کی شروعات ہو۔

سکندر جیسے ہی گارڈ کے قریب پہنچا، اس نے بات کا رخ بالکل نارمل رکھنے کی کوشش کی تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ وہ ہلکے سے مسکرا کر بولا،

"بھائی... یہ نوکری آپ کو کب سے ملی ہوئی ہے؟"

گارڈ نے تھوڑا حیران ہو کر سکندر کی طرف دیکھا، پھر نرمی سے جواب دیا،

"بس دو تین سال ہو گئے ہیں یہاں ڈیوٹی کرتے ہوئے۔"

سکندر نے سر ہلایا جیسے دلچسپی لے رہا ہو، اور بات کو آگے بڑھایا،

"اچھا... تنخواہ ٹھیک مل جاتی ہے پھر؟ گزارہ ہو جاتا ہے؟"

گارڈ نے ہلکی سی آہ بھری اور کندھے اچکا دیے،

"گزارہ تو کر لیتے ہیں بھائی، زیادہ کچھ نہیں... بس اتنا کہ گھر چل جائے۔"

سکندر نے موقع دیکھ کر اگلا سوال کیا، جیسے عام سی گفتگو ہو،

"آپ کی عمر کیا ہے؟ کافی عرصہ ہو گیا ہو گا یہ کام کرتے ہوئے؟"

گارڈ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا،

"چالیس کے آس پاس ہوں گے... زندگی چل رہی ہے بس۔"

سکندر نے نرمی سے سر ہلایا، پھر جیسے بات کو ذاتی رخ دیتے ہوئے بولا،

"شادی شدہ ہیں؟ بچے ہیں؟"

گارڈ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے نرم سا تاثر آیا۔ اس نے دور دیکھتے ہوئے کہا،

"ہاں جی، شادی بھی ہو گئی ہے... دو بچے ہیں، ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ ان ہی کے لیے سب کچھ کر رہے ہیں۔"

سکندر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا،

"ماشاءاللہ... اللہ خوش رکھے آپ کو۔"

گارڈ کو اب گفتگو معمولی لگنے لگی تھی، اس کی توجہ بھی کچھ دیر کے لیے سکندر کی باتوں میں لگ گئی۔

اسی لمحے سکندر کی آنکھوں میں ایک باریک سی چمک آئی اس نے بالکل وہی کیا تھا جس کے لیے وہ یہاں آیا تھا: گارڈ کی توجہ ہٹانا... بغیر کسی شک کے۔

دوسری طرف مومنہ نے جیسے ہی رمشا کی بات سنی، اس کے دل میں ہلکی سی بے چینی ضرور اٹھی، مگر اس نے زیادہ سوال نہیں کیے۔ وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھی اور تیز قدموں کے ساتھ باہر کی طرف بڑھ گئی۔

رات کی ہوا میں ایک ہلکی سی سردی تھی، اور ماحول میں عجیب سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ مومنہ جیسے ہی گیٹ سے باہر نکلی، اس کی نظر فوراً رمشا پر پڑی جو پہلے ہی بے چینی کے عالم میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ رمشا نے اسے دیکھتے ہی جلدی سے ہاتھ ہلایا اور قریب بلایا۔

"جلدی آؤ مومنہ..." رمشا نے دھیمی مگر جلدی بھری آواز میں کہا۔

مومنہ نے قریب آتے ہوئے پوچھا، "کیا ہوا ہے؟ تم اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہو؟"

رمشا نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا، بس اس کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً کھینچتے ہوئے ساتھ لے چلی۔

"ابھی سوال نہیں... چلتی رہو، سب بعد میں بتاؤں گی۔"

دونوں تیزی سے آگے بڑھیں، ان کے قدموں کی آواز خاموش رات میں ہلکی ہلکی گونج رہی تھی۔ گیٹ سے تھوڑا فاصلے پر ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی—اندھیرے میں سکندر پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا اور ان کے انتظار میں تھا۔

جیسے ہی وہ دونوں موٹر سائیکل کے پاس پہنچیں، رمشا نے جلدی سے کہا،

"آؤ جلدی بیٹھو... وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔"

مومنہ نے ایک نظر رمشا اور پھر سکندر پر ڈالی، اس کے چہرے پر اب بھی سوال تھے مگر صورتحال کی سنجیدگی کو دیکھ کر وہ خاموش رہی۔ اس نے آہستہ سے پیچھے بیٹھنے کی تیاری کی۔

رمشا نے جلدی سے خود بھی موٹر سائیکل سنبھالی، اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پیچھے کہیں سکندر کا گارڈ کے ساتھ پلان ابھی بھی چل رہا تھا، اور یہاں ہر سیکنڈ قیمتی تھا۔

موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی ہلکی سی آواز فضا میں پھیلی، اور پھر تینوں ایک غیر یقینی سفر کی طرف بڑھنے لگے جہاں ہر گزرتا لمحہ انہیں یا تو محفوظ راستے کی طرف لے جا سکتا تھا، یا کسی بڑے انکشاف کی طرف۔

سکندر نے گارڈ کو ایک ہلکا سا سلام کیا اور جیسے ہی موقع ملا، وہاں سے آہستہ آہستہ ہٹتا ہوا موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے قدم تیز تھے مگر چہرے پر وہی سنجیدہ احتیاط باقی تھی۔

موٹر سائیکل کے قریب پہنچ کر اس نے جلدی سے رمشا اور مومنا کو دیکھا اور بولا،

"چلو جلدی... ہمیں ہسپتال چلنا ہے، وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

مگر اس سے پہلے کہ وہ مکمل بات ختم کرتا، مومنا نے فوراً مداخلت کی۔ اس کے چہرے پر اطمینان کم اور ضد زیادہ تھی۔ وہ تھوڑا آگے جھکی اور صاف لہجے میں بولی،

"نہیں... ہسپتال نہیں جانا۔ گھر کے پاس ایک پارک ہے، وہاں چلتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر بات کریں گے۔"

ایک لمحے کے لیے سکندر خاموش ہو گیا۔ اس نے مومنا کو دیکھا، پھر رمشا کی طرف۔ اس کے چہرے پر واضح حیرت تھی، جیسے اس نے ایسی بات کی توقع ہی نہ کی ہو۔ وہ ہلکے سے بولا،

"پارک؟ اس وقت؟ ہسپتال بہتر نہیں رہے گا؟"

مومنہ نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا، بس ایک ہی بات دہرائی،

"میں ہسپتال نہیں جاؤں گی۔ بس پارک چلیں۔"

سکندر نے ایک لمحہ رک کر سانس لیا، اس کے اندر الجھن بھی تھی اور وقت کی جلدی بھی۔ اس نے رمشا کی طرف دیکھا، جیسے کسی اشارے کی تلاش میں ہو۔

رمشا نے صورتحال کو محسوس کیا، مومنا کے چہرے کی ضد بھی دیکھی اور وقت کی نزاکت بھی۔ اس نے آہستہ سے سکندر کو دیکھا اور مختصر سا کہا،

"ٹھیک ہے... چلو پارک چلتے ہیں۔"

سکندر نے ہلکی سی ناگواری کے ساتھ سر ہلایا، مگر بحث کا وقت نہیں تھا۔ اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور آہستہ سے کہا،

"ٹھیک ہے... جیسا تم لوگ چاہو، لیکن جلدی بات ختم کرنی ہو گی۔"

اور پھر رات کے سناٹے میں موٹر سائیکل آہستہ آہستہ پارک کی طرف بڑھنے لگی، ہر کوئی اپنے اپنے خیالوں میں گم تھا مگر سب کے ذہن میں ایک ہی بات گونج رہی تھی کہ یہ ملاقات شاید اتنی سادہ نہیں جتنی نظر آ رہی تھی۔

تینوں جب پارک کے قریب پہنچے تو رات کا سکون اور بھی گہرا ہو چکا تھا۔ سڑک سے اندر آتے ہی درختوں کے سائے لمبے ہوتے گئے اور ہلکی سی ٹھنڈی ہوا نے ماحول کو مزید خاموش بنا دیا۔ موٹر سائیکل آہستہ رکی تو ایک لمحے کے لیے سب خاموش رہے، جیسے کسی نے وقت کو بھی وہیں روک دیا ہو۔

سکندر نے پہلے چاروں طرف نظر دوڑائی، پارک نسبتاً خالی تھا، بس کہیں کہیں دور ایک آدھ روشنی جل رہی تھی۔ اس نے ہلکی سی تسلی لی مگر اس کی آنکھوں میں اب بھی احتیاط موجود تھی۔ وہ موٹر سائیکل سے اترا اور پیچھے مڑ کر رمشا اور مومنا کو دیکھا۔

رمشا خاموش تھی مگر اس کی آنکھوں میں ایک بے چینی سی تھی، جبکہ مومنہ اب بھی اپنے فیصلے پر قائم لگ رہی تھی، جیسے اس کے ذہن میں کوئی بات پکی ہو چکی ہو۔

"یہاں بیٹھتے ہیں..." مومنہ نے ایک سائیڈ پر بینچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سکندر نے بینچ کو دیکھا، پھر آہستہ سے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے... لیکن جلدی بات ختم کرنی ہو گی، زیادہ وقت ٹھیک نہیں ہے یہاں رکنا۔"

وہ تینوں بینچ کے قریب آ گئے۔ رات کی ہوا ہلکے سے ان کے چہروں کو چھو رہی تھی، اور دور کہیں سے کتے کے بھونکنے کی آواز ماحول کو اور بھی سنسان بنا رہی تھی۔

مومنا بیٹھ گئی، رمشا اس کے پاس آ کر کھڑی رہی، جبکہ سکندر تھوڑا سا فاصلے پر کھڑا رہا، ہر سمت پر نظر رکھے ہوئے۔

ایک لمحے کے لیے سب خاموش تھے... پھر جیسے آنے والی بات نے اس خاموشی کو توڑنا تھا، اور اس ملاقات کا اصل مقصد آہستہ آہستہ سامنے آنے والا تھا۔

سکندر نے بنچ کے پاس کھڑے ہو کر مومنا کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے کہا:

"اب بتاؤ مومنہ... کیا ہوا تھا؟"

مومنا نے کچھ لمحے خاموشی اختیار کی، جیسے الفاظ اس کے اندر کہیں الجھ گئے ہوں۔ پھر اس نے نظریں نیچی کر کے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا:

"عید کے بعد ہماری کافی لڑائی ہو گئی تھی... ارمان میں ذرا بھی میچورٹی نہیں ہے۔ وہ چیزوں کو سنجیدگی سے نہیں لیتا، ہر بات کو ہلکا لے لیتا ہے۔ اور میں... میں جو اس سے ایک سمجھداری، ایک میچور رویہ چاہتی تھی، وہ مجھے کبھی ویسا دے نہ سکا۔"

اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر گہرا سانس لیا، پھر آگے بڑھتے ہوئے بولی:

"میں نے بار بار کوشش کی کہ سب ٹھیک ہو جائے، میں نے اسے سمجھانے کی بھی کوشش کی، مگر ہر بار وہی باتیں، وہی رویہ... اور پھر لڑائیاں بڑھتی گئیں۔ باتیں چھوٹی چھوٹی تھیں، مگر دلوں کے درمیان فاصلہ بڑا ہوتا گیا۔"

سکندر خاموشی سے اسے سنتا رہا، اس کی آنکھوں میں سنجیدگی تھی۔ رمشا ایک طرف کھڑی یہ سب سن رہی تھی، اس کے چہرے پر بھی ایک خاموش سی الجھن تھی۔

مومنہ نے آخری بات آہستہ مگر صاف لفظوں میں کہی:

"میں نے رشتہ بچانے کی کوشش کی تھی... مگر جب ایک طرف سے ہی کوشش ہو، تو رشتہ زیادہ دیر نہیں چلتا۔"

مومنا کی آواز اب پہلے سے زیادہ بھاری ہو چکی تھی۔ اس نے آہستہ سے سانس لیا، جیسے پرانی یادیں پھر سے سامنے آگئی ہوں، پھر بولی:

"جب اس نے مجھے 14 فروری کو سب کے سامنے پرو پوز کیا تھا... اور ویڈیو بھی بنائی تھی... اسی دن سے میرے اندر ایک عجیب سی الجھن شروع ہوگئی

تھی۔ میں چاہتی تھی کہ ہمارا رشتہ اتنا کھلا نہ ہو، کسی کو اس کا علم نہ ہو... میں اسے کبھی باقاعدہ 'ریلیشنشپ' بھی نہیں کہتی تھی۔ مگر ارمان"...

وہ لمحہ بھر رکی، پھر تلخی سے مسکرا دی،

"ارمان کو یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ سب کے سامنے شوخا بن جاتا تھا... اگر کوئی لڑکا میرے قریب سے بھی گزرتا تو وہ اسے ایسے دیکھتا جیسے میں کوئی چیز ہوں، کوئی ایسی چیز جو صرف اس کی ہے اور کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔"

مومنہ کی آنکھوں میں نمی سی جھلکنے لگی۔ اس نے نظریں نیچی کر لیں اور آہستہ سے کہا:

"میں انسان تھی... مگر وہاں میں ایک نمائش بن گئی تھی۔ ہر جگہ، ہر نظر کے سامنے... جیسے میری اپنی کوئی پرائیویسی، میری اپنی مرضی کچھ بھی نہ ہو۔"

اس نے رک کر گہرا سانس لیا، آواز اب تقریباً ٹوٹنے لگی تھی:

"میں نے بار بار اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا... مگر وہ سمجھنے کے بجائے اسے اپنی محبت سمجھتا رہا۔ اور میں اندر ہی اندر گھٹتی رہی۔"

سکندر خاموش تھا۔ رمشا بھی سن رہی تھی، ماحول میں ایک بھاری سی خاموشی پھیل گئی تھی جیسے ہر لفظ اپنے ساتھ ایک پرانا درد بھی لے آیا ہو۔

مومنا کی آواز اب پوری طرح ٹوٹنے لگی تھی۔ وہ اپنی انگلیاں آپس میں جکڑے ہوئے بولی،

"یونیورسٹی کی سب لڑکیاں مجھ سے دور ہوتی گئیں... وہ کہتی تھیں یہ لڑکی ٹھیک نہیں ہے۔ میں اکیلی پڑتی جا رہی تھی... پہلے ہی میرے ساتھ لطیف والا واقعہ ہو چکا تھا، اور اس کے بعد سکندر... میں اپنی ہی نظروں میں مزید نہیں گر سکتی تھی۔"

اس نے لمحہ بھر کے لیے رک کر گہرا سانس لیا، جیسے اندر کا بوجھ لفظوں کے ساتھ باہر آ رہا ہو۔

"مجھے... مجھے یہ پیار محبت کی چیزوں سے ہی گھِن آنے لگی تھی۔ ہر طرف صرف تماشہ، باتیں، الزام... اور میں بس اپنے اندر سمٹتی جا رہی تھی۔ میں کسی کی کہانی بننا نہیں چاہتی تھی، نہ کسی کی بحث، نہ کسی کی نظروں کا مرکز۔"

مومنہ کی آنکھیں اب نمی سے بھر چکی تھیں، مگر وہ روئی نہیں، جیسے وہ رو لینے سے بھی تھک چکی ہو۔

سکندر کچھ لمحے خاموش کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی، مگر اس بار وہ صرف سن نہیں رہا تھا وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رمشا بھی خاموش تھی، فضا میں ایک عجیب سا دباؤ تھا، جیسے ہر شخص اپنے اپنے اندر کسی پرانی کہانی کا وزن اٹھائے کھڑا ہو۔

مومنہ کی آواز اب بھاری ہو چکی تھی، جیسے ہر لفظ کے ساتھ کوئی پرانا زخم بھی کھل رہا ہو۔ وہ آہستہ سے بولی:

"رمضان میں میں نے اسے کتنی بار کہا تھا کہ محبت اور ہوس کے علاوہ بھی ایک دنیا ہوتی ہے... میرے بابا بیمار تھے، میں اسپتال میں تھی، مجھے ان کی دیکھ بھال کرنی تھی... مگر ارمان سننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ کبھی تصویروں کی ڈیمانڈ، کبھی کالز کی ضد... مجھے لگنے لگا میں خود کو ہی کھو رہی ہوں۔"

وہ ایک لمحے کو رکی، پھر نظریں نیچی کر کے بولی:

"مجھے بہت غصہ آنے لگا تھا... اور ساتھ ساتھ یہ احساس بھی کہ شاید میں غلط کر رہی ہوں، شاید میں وہ نہیں ہوں جو میں ہونا چاہتی تھی۔ میں بھٹک گئی تھی... کہیں اندر ہی اندر۔"

اس کی آواز میں اب دکھ اور تھکن دونوں تھے۔

"جب ارمان میری زندگی میں آیا... تو وہ اس زندگی کا حصہ ہی نہیں تھا جو میں نے اپنے لیے سوچ رکھی تھی... وہ ویسا نہیں تھا جس کا میں نے تصور کیا تھا"...

مومنہ نے ایک گہرا سانس لیا، پھر آہستہ سے کہا:

"میں نے سکندر... جو کچھ میں نے زندگی سے چاہا تھا، وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ بس الجھن تھی، دباؤ تھا، اور میں خود سے ہی دور ہوتی گئی۔"

پارک میں ایک لمحے کے لیے مکمل خاموشی چھا گئی۔ ہوا درختوں کے درمیان سے گزر کر صرف ایک ہلکی سی سرسراہٹ چھوڑ رہی تھی۔ سکندر خاموش کھڑا تھا، اس کی آنکھوں میں سنجیدگی گہری ہو چکی تھی، اور رمشا

صرف اسے دیکھ رہی تھی — جیسے ہر بات ایک بھاری سچ بن کر ان کے درمیان آ گری ہو۔

مومنہ کی آواز اب بالکل ٹوٹ چکی تھی، جیسے وہ برسوں کا بوجھ ایک ساتھ لفظوں میں نکال رہی ہو۔ اس نے نظریں نیچی کیے ہوئے دھیرے سے کہنا شروع کیا:

"پھر جب میں نے اسے 'not interested' کہا... تو وہ پاگل سا ہو گیا۔ ہماری آپس کی باتیں بھی اس نے اپنے تک نہیں رکھیں... سب کو بتا دی۔ میں نے سوچا تھا شاید میں نے زیادہ غصہ کر دیا، چل کر اس سے بات کرتی ہوں، سب ٹھیک کر لوں گی"...

وہ لمحہ بھر رکی، پھر اس کی آواز اور بھاری ہو گئی:

"لیکن جب میں کلاس میں آئی... تو سب سے پہلے زینب گل میرے پاس آئی اور بولی کہ ارمان سے ناراض نہ ہونا۔ مجھے اس وقت اتنا غصہ آیا کہ اس نے ہماری پرائیویٹ باتیں سب کو بتا دی تھیں"...

مومنا نے ایک گہرا سانس لیا، اس کی انگلیاں کپکپانے لگیں:

"پھر آپی فوزیہ بھی آئیں... انہوں نے بھی مجھے برا کہا... انہیں یہ نہیں پتا تھا کہ میں اس وقت کس حال میں تھی۔ میرے بابا کا ہارٹ کا آپریشن ہونا تھا، ڈاکٹر نے پہلے ہی بتا دیا تھا، میں پہلے ہی ڈری ہوئی تھی... اور اوپر سے سب کے سامنے مجھے غلط بنا دیا گیا تھا۔"

اس کی آواز اب تقریباً رُکنے لگی تھی:

"سب لڑکیاں مجھے کہہ رہی تھیں کہ جا کر ارمان سے بات کرو... اور پھر وہ آیا... ارمان خود آیا... لیکن تب، جب سب کچھ پہلے ہی خراب ہو چکا تھا۔ وہ خود پہلے نہیں آیا تھا... اس نے میری عزت سب کے سامنے ختم کر دی تھی۔ میری کوئی پرائیویٹ لائف نہیں رہی تھی"...

مومنہ خاموش ہو گئی۔ اس کے کندھے ہلکے سے لرز رہے تھے، مگر وہ رو نہیں رہی تھی جیسے اب رونے سے بھی آگے نکل چکی ہو۔

پارک میں خاموشی اور بھی گہری ہو گئی۔ سکندر کی نظریں زمین پر تھیں، اور رمشا کا چہرہ بھی سنجیدہ تھا۔ ماحول میں ایک ایسا بوجھ تھا جو لفظوں سے نہیں، صرف احساس سے سمجھ آ رہا تھا۔

مومنہ نے ایک لمحہ رُک کر آہستہ سے سانس لیا، جیسے اندر کا آخری بوجھ بھی لفظوں کے ساتھ باہر آرہا ہو۔ پھر اس نے دھیمی مگر واضح آواز میں کہا:

"میں نے پہلے تو سوچا تھا کہ شاید میں اسے اپنی زندگی میں شامل کر لوں... شاید سب کچھ ٹھیک ہو جائے، شاید میں غلط نہیں سوچ رہی"...

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی، نظریں زمین پر جم گئیں۔ پھر اس کی آواز میں فیصلہ شامل ہو گیا:

"لیکن جب باقی لڑکیوں نے آکر مجھ سے باتیں کیں... جب میں نے سنا، جب میں نے سب کچھ دیکھا... تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب ارمان میری زندگی کا حصہ نہیں رہے گا۔"

اس نے ایک گہرا سانس لیا، جیسے وہ اس فیصلے کے ساتھ خود کو بھی آزاد کر رہی ہو۔

"میں نے بہت سوچا... بہت برداشت کیا... لیکن آخر میں مجھے یہی لگا کہ جہاں عزت نہ رہے، جہاں سکون نہ رہے... وہاں رشتہ بھی نہیں رہتا۔"

سکندر خاموش کھڑا اسے سن رہا تھا، اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی مگر اب اس میں سمجھنے کا پہلو بھی تھا۔ رمشا بھی چپ تھی، فضا میں ایک عجیب سی اداسی چھائی ہوئی تھی جیسے ہر لفظ نے اپنے پیچھے ایک پرانی کہانی دفن کر دی ہو۔

سکندر نے ایک گہری سانس لی، پھر آہستہ مگر سنجیدہ لہجے میں بولا:

"ارمان بے وقوف تھا مومنہ... اسے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وہ کہاں غلطی کر رہا ہے۔"

مومنہ نے اس کی طرف دیکھا، آنکھوں میں تھکن اور درد دونوں تھے۔ وہ بولی:

"تو میں کیا کرتی سکندر؟ اگر میں اسے اپناتی بھی تو وہ ساری زندگی ہماری باتیں دوسروں سے ہی کرتا رہتا... اس میں وہ میچورٹی ہی نہیں تھی جو میں چاہتی تھی۔ ایک وقت پر مجھے لگا تھا شاید وہ ٹھیک ہے... شاید میں غلط سوچ رہی ہوں... لیکن وہ آہستہ آہستہ مجھے خود سے دور کر رہا تھا۔"

اس کی آواز بھاری ہو گئی، اور وہ لمحہ بھر رکی، جیسے الفاظ گلے میں اٹک گئے ہوں۔ پھر وہ بولی:

"یونیورسٹی کے سب لڑکے لڑکیاں مجھے بری نظروں سے دیکھتے تھے... جیسے میں کوئی عزت والی لڑکی نہیں، جیسے میں... طوائف ہوں۔"

یہ لفظ کہتے ہی اس کی آواز کانپ گئی۔ پارک کی خاموشی اور بھی گہری ہو گئی، ہوا بھی جیسے رک سی گئی ہو۔

سکندر نے فوراً نظریں نیچی کر لیں، اس کے چہرے پر سخت سنجیدگی آ گئی۔ رمشا نے بے چینی سے ہونٹ کاٹے، ماحول ایک دم بھاری ہو گیا تھا جیسے سب کچھ کسی ایک تلخ سچ کے نیچے دب گیا ہو۔

سکندر نے مومنہ کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے نظریں نیچی کر لیں، پھر آہستہ مگر سنجیدہ لہجے میں بولا:

"مومنہ... اصل میں اسے یہ ہی نہیں پتا تھا کہ لڑکی کے ساتھ کیسے برتاؤ کرنا ہے۔ کہاں وہ ٹھیک کر رہا ہے اور کہاں غلط... اس نے پوری یونیورسٹی میں یہ چیز پھیلا دی تھی کہ تم اس کی محبت ہو، مگر اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس

کے کیا نتائج نکلیں گے۔ لوگ لڑکی کو ہی غلط سمجھتے ہیں، سارا الزام اسی پر آتا ہے۔"

اس نے تھوڑا سا توقف لیا، پھر مزید سنجیدگی سے کہا:

"اسی لیے میں خود بھی یونیورسٹی کے رشتوں سے دور رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ لڑکی کی عزت سب سے زیادہ اہم ہے... اور جب تک انسان اس چیز کو سمجھ نہ لے، وہ کسی کے جذبات کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔"

رمشا خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب سمجھ کا ایک نیا پہلو تھا، جیسے پہلی بار وہ سکندر کے اس فاصلے کی وجہ کو پوری طرح سمجھ پائی ہو۔

وہ آہستہ سے نظریں ہٹا کر سوچ میں ڈوب گئی اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ سکندر کا خاموش رہنا، دور رہنا، شاید بے حسی نہیں تھی... بلکہ ایک سوچا سمجھا تحفظ تھا۔

سکندر نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد مومنہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آواز نرم تھی مگر سوال گہرا:

"لیکن تم نے اس سے دوستی کیوں رکھنا چاہی، مومنہ؟"

مومنا نے بینچ کے کونے پر ہاتھ جما دیے، جیسے ماضی کے کسی موڑ پر واپس چلی گئی ہو۔

"میں نے سوچا تھا اسے ایک چانس دوں... شاید محبت نہیں تو کم از کم دوستی میں وہ بدل جائے... شاید سمجھدار ہو جائے۔ لیکن میں پھر غلط ثابت ہوئی۔ وہ بیچ بیچ میں پھر محبت کی باتیں لے آتا تھا... وہ دوستی کو بھی دوستی رہنے نہیں دیتا تھا۔"

سکندر نے بھنویں سکیڑیں، پھر قدرے مختلف لہجے میں بولا:

"لیکن یہ بھی تو غلط ہے نا مومنہ... ایک شخص نے کسی کو دل و جان سے چاہا ہو، اور پھر اسے کہا جائے کہ اب دوست بن کر رہو... یہ اس پر ظلم نہیں؟"

یہ سنتے ہی مومنا نے فوراً اس کی طرف دیکھا، جیسے اس سوال نے اسے اندر تک چبھ دیا ہو۔

"تو مجھ پر ظلم نہیں تھا کیا؟" اس کی آواز میں دبے ہوئے برسوں کے شکوے جاگ اٹھے۔ "اسے پتا تھا مجھے کن کن چیزوں سے مسئلہ ہے... اور وہ سب وہی کرتا تھا جن سے مجھے تکلیف ہوتی تھی۔"

پارک کی ہوا جیسے یکدم بھاری ہو گئی۔

"میں نے کہا ہماری باتیں پرائیویٹ رہیں... اس نے سب میں پھیلا دیں۔

میں نے کہا مجھے نمائش نہ بناؤ... اس نے مجھے تماشا بنا دیا۔

میں نے کہا مجھے اسپیس دو... وہ مزید قریب دھکیلتا رہا۔

میں نے کہا میرے بابا بیمار ہیں... اور وہ اپنی خواہشوں میں الجھا رہا اور اپنے گھر کے مسئلے میرے سامنے لاتا رہا"

اس کی آواز کانپنے لگی۔

"پھر ظلم صرف اس پر کیسے ہو گیا سکندر؟"

سکندر خاموش ہو گیا۔

مومنہ نے آہستہ مگر کٹتے ہوئے لہجے میں کہا:

"محبت صرف چاہنے کا نام نہیں... دوسرے کی حدود سمجھنے کا نام بھی ہے۔ اگر کسی کو معلوم ہو کہ کون سی بات مجھے توڑتی ہے... اور وہ بار بار وہی کرے... تو وہ محبت نہیں، ضد ہوتی ہے۔"

رمشا اب تک خاموش بیٹھی دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ مگر اس لمحے اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ یہ صرف مومنہ اور ارمان کی کہانی نہیں، یہ محبت اور ملکیت کے فرق پر بحث بن چکی تھی۔

سکندر نے مومنہ کو دیکھا، پھر دھیرے سے کہا:

"میں ارمان کا دفاع نہیں کر رہا... بس سوچ رہا ہوں، شاید وہ محبت کو possessiveness سمجھ بیٹھا تھا"...

مومنہ ہلکی تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولی:

"اور میں اسی possessiveness میں گھٹ رہی تھی۔"

کچھ لمحے خاموشی رہی۔

پھر سکندر نے آہستہ سے کہا:

"شاید... تم دونوں ایک دوسرے کو سمجھنے کے بجائے اپنے اپنے زخموں سے بات کر رہے تھے۔"

مومنہ نے سر جھکا لیا۔

"ہو سکتا ہے... مگر ایک بات طے ہے سکندر... میں وہاں واپس نہیں جا سکتی تھی جہاں میری عزت مجھ سے چھننے لگے۔"

یہ سن کر رمشا نے پہلی بار سکندر کو بڑے غور سے دیکھا۔

اب وہ سمجھ رہی تھی یہی وجہ تھی کہ سکندر یونیورسٹی میں لڑکیوں سے فاصلے پر رہتا تھا۔

اس کے لیے تعلق صرف کشش نہیں، ذمہ داری تھا۔

اور شاید اسی لیے... وہ باقی لڑکوں جیسا نہیں تھا۔

سکندر کچھ دیر خاموش رہا، پھر جیسے کوئی پرانا سوال دل میں ابھر آیا ہو، اس نے دھیرے سے کہا:

"اس نے مجھے بتایا تھا... کہ وہ تمہاری پہلی محبت نہیں تھا... تمہیں کوئی اور پسند تھا۔"

یہ سنتے ہی مومنہ کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی تلخ، تھکی ہوئی، سمجھدار۔

وہ آہستہ سے بولی:

"ہمیں اکثر دوسری محبت اُن سے ہو جاتی ہے... جنہیں ہم پہلی محبت کا قصہ سناتے ہیں"...

سکندر چونکا۔ رمشا نے بھی چونک کر مومنا کو دیکھا۔ اس جملے میں جیسے ایک پوری عمر کی تھکن تھی۔

مومنہ نے آگے کہا:

"اور سکندر... اس نے میری پہلی محبت والی بات کو بھی راز نہیں رکھا۔ تمہیں بتا دیا۔ اب تم ہی بتاؤ... جو شخص میرے دل کے اتنے ذاتی راز کو بھی سنبھال نہ سکا... کیا وہ ساری زندگی مجھے اسی بات پر ذلیل نہ کرتا؟"

اس کی آواز میں اب شکوہ نہیں، یقین تھا۔

"آج تمہیں بتایا... کل کسی اور کو بتاتا۔ پھر کسی لڑائی میں یہی بات میرے منہ پر مارتا... کہ تم تو پہلے بھی کسی اور کو چاہتی تھی۔"

وہ ہلکا سا ہنسی... مگر وہ ہنسی دردناک تھی۔

"ایسے مرد محبت نہیں کرتے سکندر evidence ... جمع کرتے ہیں، تاکہ ایک دن تمہارے خلاف استعمال کریں۔"

یہ سن کر سکندر کی آنکھوں میں سنجیدگی اتر آئی۔

مومنہ اب رُکی نہیں۔

"میں نے اسے اپنی پہلی محبت کا قصہ trust میں بتایا تھا confession ... کے طور پر... کہ وہ مجھے بہتر سمجھ سکے۔ مگر اس نے اسے بھی ownership سمجھ لیا۔ جیسے میرے ماضی پر بھی اس کا حق ہو۔"

اس نے سکندر کی طرف سیدھا دیکھتے ہوئے کہا:

"تم ہی بتاؤ... جس شخص نے میرے ماضی کو بھی میرے خلاف ہتھیار بنالیا... کیا اس کے ساتھ مستقبل محفوظ ہوتا؟"

سکندر جواب نہ دے سکا۔

پارک کی خاموشی ایک بار پھر گہری ہو گئی۔

کچھ دیر بعد سکندر نے بہت دھیرے سے کہا:

"شاید... تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

مومنا نے سر ہلایا۔

"نہیں، شاید نہیں۔ میں جانتی ہوں۔ کیونکہ میں اس آدمی کے ساتھ زندگی گزارنے کا سوچ چکی تھی... پھر میں نے خوف محسوس کیا۔ محبت نہیں۔"

رمشا اب سکندر کو دیکھ رہی تھی، مگر اس بار حیرت سے۔

سکندر نے آہستہ سے پوچھا:

"تو تم نے اسی دن فیصلہ کر لیا تھا؟"

مومنہ نے جواب دیا:

"جس دن مجھے احساس ہوا کہ وہ میرے راز سنبھالنے کے قابل نہیں... اسی دن۔ کیونکہ جو شخص راز نہ رکھ سکے، وہ رشتہ بھی نہیں رکھ سکتا۔"

یہ سن کر سکندر نے نظریں جھکا لیں۔

اور پہلی بار... اسے لگا شاید ارمان کی غلطی نادانی سے بڑی تھی۔

وہ محبت کرنا جانتا تھا... مگر عزت دینا نہیں۔

مومنہ کی بات ختم ہوئی تو ایک گہری خاموشی تینوں کے درمیان اتر آئی۔

درختوں سے گرتی ہوا کی سرسراہٹ بھی جیسے اس خاموشی کو چیرنے سے ہچکچا رہی تھی۔

اسی خاموشی میں پہلی بار سکندر نے غور سے مومنا کا چہرہ دیکھا۔

اور پھر اس کی نظر ٹھہر گئی۔

گال کے پاس ہلکے نیل کے نشان… ہونٹ کے قریب باریک سا زخم… کلائی پر خراشوں کی مدھم لکیریں۔

سکندر کا دل جیسے ایک لمحے کو رک گیا۔

"یہ…" اس کے ہونٹوں سے بمشکل نکلا۔

وہ بے اختیار ایک قدم اس کے قریب بڑھا، جیسے زخموں کو دیکھ کر دل نے دماغ سے پہلے ردِ عمل دیا ہو۔

"مومنہ… یہ کس نے۔۔۔۔"

مگر مومنہ فوراً ذرا پیچھے ہٹ گئی۔

اتنی تیزی سے جیسے قربت بھی اب خطرہ لگتی ہو۔

سکندر وہیں رک گیا۔

رمشا نے بھی پہلی بار وہ نشان واضح دیکھے، اور اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

مومنہ نے ہلکی، شکستہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

"یہی میری زندگی ہے سکندر"...

اس کی آواز میں عجیب سا سکون تھا، وہ سکون جو اکثر بہت زیادہ درد سہنے کے بعد آتا ہے۔

"یہی درد کے ساتھ مجھے جینا ہے اب۔"

سکندر نے جیسے یہ جملہ سنا نہیں، محسوس کیا۔

وہ دھیرے سے بولا:

"کیا مطلب... کون کرتا ہے یہ سب؟"

مومنہ نے جواب نہ دیا۔

صرف آسمان کی طرف دیکھا، پھر بہت آہستہ کہا:

"کچھ زخم لوگ دیتے ہیں... کچھ حالات۔

اور کچھ... اپنے فیصلے۔"

سکندر ایک بار پھر اس کے قریب ہونے کو بڑھا، مگر اس بار احتیاط سے۔

"مومنہ..." اس کی آواز پہلی بار کانپی، "تم یہ سب اکیلے برداشت کر رہی ہو؟"

مومنہ نے ہلکے سے سر جھکا دیا۔

"ہر کوئی اپنے حصے کا صلیب خود اٹھاتا ہے سکندر۔"

سکندر کے چہرے پر ایسا درد ابھرا جو شاید مومنا نے پہلے کبھی اس میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ دھیرے سے بولا:

"تم نے بتایا کیوں نہیں؟"

مومنہ ہنسی...

وہ ہنسی جو رونے سے زیادہ دردناک ہوتی ہے۔

"کسے بتاتی؟

لوگ محبت کا تماشا دیکھتے ہیں... درد کا نہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

چاندنی اس کے زخموں پر پڑ رہی تھی۔

اور سکندر کو پہلی بار محسوس ہوا،

مومنا صرف ٹوٹی نہیں تھی... زخمی بھی تھی۔

وہ بے اختیار ایک قدم اور بڑھا۔

اس بار بہت آہستہ۔

مگر مومنہ پھر ذرا پیچھے ہٹ گئی۔

"نہیں سکندر"...

اس نے دھیرے سے کہا۔

"اتنا قریب مت آؤ... میں عادی نہیں رہی کسی کی نرمی کی۔"

یہ سن کر سکندر کے اندر کچھ ٹوٹا۔

وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر بہت دھیمے لہجے میں بولا:

"تم درد کو قسمت سمجھ بیٹھی ہو"...

مومنا نے فوراً جواب دیا:

"نہیں... قسمت نہیں۔

سزا۔"

رمشا نے بے اختیار سکندر کی طرف دیکھا۔

اس نے پہلی بار سکندر کی آنکھوں میں نمی دیکھی۔

سکندر نے جیسے خود سے کہا:

"جس لڑکی کو دنیا غلط سمجھتی رہی... وہ تو خود اپنے زخم چھپاتی رہی"...

مومنا نے اس کی بات سنی، پھر بہت دھیرے کہا:

"اور کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں سکندر...

جن پر مرہم نہیں رکھا جاتا...

صرف جیا جاتا ہے۔"

رات اور بھی خاموش ہو گئی۔

اور اس خاموشی میں، سکندر پہلی بار مومنہ کو سمجھنے نہیں...

محسوس کرنے لگا تھا۔

سکندر کی نظریں ابھی تک مومنا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان زخموں نے جیسے اس کے اندر کچھ جلا دیا تھا۔ اس نے بھاری آواز میں پوچھا:

"کس نے کیا یہ سب؟"

مومنہ خاموش رہی۔

خاموش... مگر اس خاموشی میں اعتراف تھا۔

تب رمشا نے آہستہ مگر کٹے ہوئے لہجے میں کہا:

"اس کے شوہر... فلک شبیر نے۔"

ایک پل کے لیے جیسے ہوا رک گئی۔

سکندر کا چہرہ بدل گیا۔

اس کی آنکھوں میں غصہ ایک دم بھڑک اٹھا۔

"اُس کُتے کی تو۔۔۔"

وہ غصے میں آگے بڑھا، مٹھی بھینچ لی، جبڑا سخت ہو گیا۔

"وہ ہاتھ اٹھاتا ہے اس پر؟"

اس کی آواز میں ایسا اشتعال تھا کہ رمشا بھی چونک گئی۔

"میں ابھی۔۔۔۔"

مگر رمشا فوراً درمیان میں بول پڑی۔

"سکندر"!

اس کے لہجے میں ایسی سختی تھی کہ وہ رک گیا۔

رمشا نے سنجیدگی سے کہا:

"ابھی وہ ضروری نہیں ہے۔ ہمیں ارمان کے پاس واپس جانا ہے... اس کا آپریشن ہے۔"

یہ سنتے ہی سکندر جیسے غصے سے حقیقت میں واپس آیا۔

چند لمحے وہ خاموش کھڑا رہا، سانس بھاری چل رہی تھی۔

اس نے مومنہ کو دیکھا۔

پھر زخموں کو۔

پھر نظریں پھیر لیں۔

جیسے ابھی کچھ کہنا خطرناک ہو۔

"اچھا"...

اس نے دبے ہوئے غصے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

مگر اس "ٹھیک ہے" میں ٹھیک کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ ابھی بھی جل رہا تھا۔

اس نے مومنہ کی طرف دیکھا اس نظر میں ضد نہیں، التجا تھی۔

"مومنہ... ایک بار ارمان سے جا کر مل لو"...

مومنا نے چونک کر اسے دیکھا۔

سکندر ایک قدم قریب آیا، آواز بھاری ہو گئی۔

"خدا کے لیے... مل لو اس سے۔"

مومنا خاموش رہی۔

سکندر کے لہجے میں اب فریاد اتر آئی تھی۔

"وہ مر جائے گا مومنہ"...

یہ الفاظ جیسے رات کے سناٹے میں ٹوٹ کر گرے۔

رمشا نے بھی سکندر کو ایسے لہجے میں پہلی بار دیکھا۔

سکندر بولتا گیا:

"تم نہیں جانتیں وہ کس حال میں ہے... وہ تمہارے نام پر ٹوٹا ہوا ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا اور تم نے اسے ایک بار بھی نہ دیکھا... یہ بوجھ شاید عمر بھر ساتھ رہے گا۔"

مومنہ کی آنکھیں جھک گئیں۔

سکندر کی آواز کانپ گئی۔

"میں اس کے لیے نہیں... تم دونوں کے لیے کہہ رہا ہوں۔ کچھ رشتے واپس نہیں آتے، مگر ایک الوداع... ایک ملاقات... کبھی کبھی ایک زندگی بچا دیتی ہے۔"

اس نے پہلی بار تقریباً ہاتھ جوڑ دینے والے انداز میں کہا:

"مومنہ... پلیز۔ جا کر مل لو اس سے۔"

مومنہ کے ہونٹ ہلے مگر آواز نہ نکلی۔

چند لمحے بعد اس نے آہستہ کہا:

"تمہیں لگتا ہے میرے جانے سے سب ٹھیک ہو جائے گا؟"

سکندر نے فوراً جواب دیا:

"نہیں... مگر شاید ایک دل مرنے سے بچ جائے۔"

خاموشی۔

بہت گہری خاموشی۔

پھر مومنہ نے درد سے مسکرا کر کہا:

"سکندر... کچھ لوگ محبت سے نہیں، یاد سے جیتے ہیں۔"

"اور کچھ لوگ یاد میں مر جاتے ہیں..." سکندر نے فوراً کہا۔

یہ سن کر مومنہ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

وہاں التجا تھی۔

سچی۔

بے غرض۔

رمشا نے دھیرے سے مومنا کا ہاتھ دبایا۔

"چل لو... ایک بار۔"

مومنہ نے لمبی سانس لی۔

جیسے اندر ایک جنگ چل رہی ہو۔

موٹر سائیکل کے پاس پہنچ کر بھی سکندر جیسے بے چین تھا۔ آخر وہ مومنا کے سامنے آ کر رک گیا، اس کی آواز میں پہلی بار غرور نہیں، صرف فریاد تھی۔

"مومنہ... ایک بار ارمان سے جا کر مل لو... خدا کے لیے۔ وہ مر جائے گا"...

یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھاری ہو گئی، جیسے وہ صرف دوست کے لیے نہیں، کسی ٹوٹے ہوئے انسان کے لیے مانگ رہا ہو۔

مومنہ نے اس کی طرف دیکھا، مگر چہرے پر سختی سی آ گئی۔

"نہیں سکندر۔"

صرف دو لفظ۔

مگر اتنے قطعی کہ ہوا رک گئی۔

سکندر نے پھر کوشش کی۔

"مومنہ،، میں آپریشن سے پہلے تمہیں اسے دکھنا چاہتا ہوں... شاید آخری بار۔۔۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔" مومنہ نے اس بار درمیان میں ہی کاٹ دیا۔

رمشا نے بے چینی سے دونوں کو دیکھا۔

سکندر ایک قدم اور آگے آیا۔

"تم سمجھ کیوں نہیں رہیں... اگر اسے کچھ ہو گیا۔۔"

مومنہ کی آنکھوں میں اچانک برسوں کا دبایا ہوا دکھ چمکا۔

"اور اگر میں واپس اُس دلدل میں چلی گئی تو؟"

سکندر خاموش۔

مومنہ نے آہستہ مگر کاٹ دینے والے لہجے میں کہا:

"میں نے بڑی مشکل سے خود کو اس رشتے سے نکالا ہے... اب مرحم بننے واپس نہیں جا سکتی۔"

سکندر نے تقریباً منت کی:

"مگر وہ تم سے محبت کرتا ہے"...

مومنہ تلخ ہنسی۔

"محبت؟"

وہ اس کے قریب آ کر بولی:

"جو میری عزت نہ بچا سکا... وہ محبت کیا بچاتا؟"

یہ جملہ سیدھا سکندر کے سینے میں لگا۔

وہ پھر بھی ہارا نہیں۔

"مومنہ... ایک ملاقات..."

"نہیں"!

اس بار مومنہ کی آواز بلند ہو گئی۔

خاموش پارک میں وہ لفظ گونج اٹھا۔

"میں نہیں جاؤں گی سکندر۔

نہ ہسپتال۔

نہ ارمان کے پاس۔

نہ ماضی کی طرف۔"

چند لمحے کوئی کچھ نہ بولا۔

پھر اس نے بہت دھیرے کہا:

"تم اسے بچانا چاہتے ہو...

میں خود کو بچا رہی ہوں۔"

رمشا نے سکندر کو دیکھا اس کے چہرے پر مایوسی اتر چکی تھی۔

مومنہ نے رخ پھیر لیا۔

"اسے کہہ دینا... میں نے اسے معاف کیا۔

مگر واپس نہیں آ سکتی۔"

سکندر نے جیسے شکستہ سانس لی۔

پھر بہت آہستہ بولا:

"اچھا۔"...

یہ "اچھا" قبولیت نہیں، ہار تھی۔

رمشا نے دھیرے سے کہا:

"چلو سکندر"...

سکندر نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی، مگر بیٹھنے سے پہلے ایک بار مومنہ کو دیکھا۔

شاید آخری امید کے ساتھ۔

مگر مومنا نے نظریں نہ اٹھائیں۔

اور اسی لمحے سکندر سمجھ گیا

کچھ دروازے بند نہیں ہوتے...

ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتے ہیں۔

مومنہ کو گھر کے قریب چھوڑتے وقت کسی نے کچھ نہیں کہا۔ نہ مومنہ نے، نہ سکندر نے۔ جیسے ساری باتیں پارک میں رہ گئی ہوں اور اب صرف خاموشیاں ساتھ سفر کر رہی ہوں۔

مومنہ اترتے ہوئے ایک لمحے کو رکی، جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو... مگر پھر خاموشی سے پلٹ گئی۔

دروازے کے اندر جاتے ہوئے اس نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا۔

اور یہی شاید سکندر کے لیے سب سے بھاری تھا۔

موٹر سائیکل دوبارہ اسٹارٹ ہوئی۔

اب رخ ہسپتال کی طرف تھا...

ارمان کی طرف۔

مگر راستے بھر سکندر نے ایک لفظ نہ کہا۔

ایک بھی نہیں۔

صرف سڑک پر دوڑتی موٹر سائیکل کی آواز تھی اور رات کا سنّاٹا۔

رمشا پیچھے بیٹھی ہوئی تھی، اور اس نے سکندر کو زور سے پکڑ رکھا تھا صرف توازن کے لیے نہیں...

بلکہ اس شکست خوردہ خاموشی کو سنبھالنے کے لیے۔

وہ جانتی تھی سکندر ٹوٹا ہوا ہے۔

اس نے دوست کے لیے فریاد کی تھی...

اور پہلی بار خالی ہاتھ لوٹا تھا۔

سکندر کی گرفت ہینڈل پر سخت ہوتی جا رہی تھی۔

وہ غیر معمولی خاموش تھا۔

اتنا خاموش کہ رمشا کو ڈر لگنے لگا۔

اس نے آہستہ سے پکارا:

"سکندر"...

کوئی جواب نہیں۔

صرف رفتار ذرا بڑھ گئی۔

رمشا نے اس کی کمر کو اور مضبوطی سے تھام لیا۔

وہ اس کی شکست سے واقف تھی۔

جانتی تھی یہ صرف ارمان کے لیے ناکامی نہیں تھی...

سکندر کو پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ وہ کسی کو بچا نہیں سکا۔

کچھ دور جا کر اس نے خود ہی بہت دھیرے سے کہا،

"میں نے سوچا تھا وہ مان جائے گی"...

رمشا نے اس کے کندھے پر سر ہلکا سا ٹکایا۔

"تم نے پوری کوشش کی"...

سکندر تلخ ہنسا۔

"کوشش؟

میں اپنے دوست کے لیے اس کی محبت بھی واپس نہ لا سکا۔"

رمشا خاموش رہی۔

کبھی کبھی تسلی جھوٹ لگتی ہے۔

راستہ سنسان تھا۔

اسٹریٹ لائٹس ایک ایک کر کے پیچھے چھوٹ رہی تھیں۔

اور ہر روشنی کے ساتھ سکندر جیسے تھوڑا اور اندر ڈوبتا جا رہا تھا۔

رمشا نے آہستہ کہا:

"تم خود کو قصوروار مت سمجھو"...

اس بار سکندر نے جواب دیا۔

"قصوروار نہیں"...

ایک توقف۔

"شکست خوردہ۔"

یہ لفظ سن کر رمشا کا دل ہل گیا۔

اس نے بے اختیار اسے اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔

جیسے کہہ رہی ہو

گرنا مت۔

میں ہوں۔

مگر سکندر شاید کہیں اور تھا۔

اپنے خیالوں میں۔

ارمان کے آپریشن تھیٹر کے باہر...

مومنہ کے انکار کے درمیان...

اور اپنی بے بسی کے اندر۔

موٹر سائیکل رات چیرتی ہسپتال کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اور اس سفر میں دو لوگ ساتھ تھے

مگر دونوں اپنی اپنی خاموشی میں تنہا۔

ہسپتال پہنچتے پہنچتے صبح کے چار بج چکے تھے۔ فضا میں وہ عجیب سا سکوت تھا جو صرف ہسپتالوں اور فجر سے پہلے کے وقت میں ہوتا ہے۔ راہداریوں میں مدھم روشنیاں جل رہی تھیں، کہیں دور مانیٹر کی بیپ سنائی دے رہی تھی، اور تھکن ہر چہرے پر اتر چکی تھی۔

سکندر نے موٹر سائیکل روکی، مگر اترتے ہوئے اس کے قدموں میں وہی بوجھ تھا جو راستے بھر اس کے ساتھ آیا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی نعمان بے چینی سے ان کی طرف بڑھا۔

"آ گئے تم لوگ۔۔۔"

وہ مومنہ کے بارے میں پوچھنے ہی لگا تھا کہ سکندر کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

سوال ہونٹوں تک آیا...

اور وہیں مر گیا۔

نعمان سب سمجھ گیا۔

مومنہ نہیں آئی۔

سکندر نے کچھ نہ کہا، بس آ کر دیوار سے ٹیک لگا لی۔

چہرے پر شکست لکھی ہوئی تھی۔

رمشا نے فوراً ماحول ہلکا کرنے کی کوشش کی، شاید اس بھاری خاموشی کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے۔

وہ مصنوعی شوخی سے بولی:

"کیا ہوا جو رحمان شیخ اور مومنہ نہیں آئے... ہم لوگ تو ہیں نا یہاں"!

پھر ہلکا سا مسکرا کر بولی:

"اور ارمان کے لیے خون بھی مل گیا ہے... اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

نعمان نے بات پکڑ لی، وہ بھی جانتا تھا ابھی امید کو زندہ رکھنا ضروری ہے۔

"ہاں بھائی، خون کا انتظام ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے آپریشن ہو جائے تو خطرہ ٹل سکتا ہے۔"

سکندر خاموش رہا۔

رمشا نے اسے دیکھ کر کہا:

"سکندر... کچھ تو بولو۔"

وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر دھیرے سے بولا:

"وہ نہیں آئی"...

یہ صرف اطلاع نہیں تھی۔

اعتراف تھا۔

ہار کا۔

نعمان نے آہستہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تو کیا ہوا؟ ہم ہیں نا اس کے ساتھ۔ ارمان اکیلا نہیں ہے۔"

سکندر نے تلخ مسکراہٹ دی۔

"وہ اسی کا نام لے رہا تھا"...

خاموشی۔

پھر رمشا نے جان بوجھ کر شوخ لہجے میں کہا:

"دیکھو، ابھی ڈرامہ بند کرو دونوں۔ فجر ہونے لگی ہے، سب خیر ہو گا۔"

نعمان ہلکا سا ہنسا۔

"ہاں ورنہ مریض سے پہلے تیماردار گر جائیں گے۔"

پہلی بار سکندر کے ہونٹوں پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

مگر آنکھوں کی تھکن باقی تھی۔

آپریشن تھیٹر کے باہر تینوں بیٹھ گئے۔

رات اب صبح میں ڈھل رہی تھی۔

اور امید...

اب دعا بن چکی تھی۔

نعمان اور رمشا آہستہ آہستہ باتوں میں لگ گئے، شاید جان بوجھ کر ماحول کو نارمل رکھنے کی کوشش کر رہے تھے، مگر سکندر ان دونوں کے درمیان ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ اس کا ذہن کہیں اور اٹکا ہوا تھا مومنہ کے انکار میں، ارمان کے چہرے میں، اور اپنی بے بسی میں۔

چند لمحے بعد وہ خاموشی سے اٹھا۔

کسی نے اسے روکا نہیں۔

وہ آہستہ آہستہ راہداری سے نکل کر باہر آ گیا۔

صبح کی مدھم سفیدی افق پر ابھر رہی تھی۔

اور تب فجر کی اذان بلند ہوئی۔

"اللہ اکبر... اللہ اکبر"...

آواز ہسپتال کے ایک کونے میں بنی چھوٹی سی مسجد سے آرہی تھی۔

وہ آواز سکندر کے اندر کہیں گہرا اتر گئی۔

اس نے سر اٹھا کر مسجد کی طرف دیکھا...

پھر بے اختیار اسی سمت چل پڑا۔

قدم بھاری تھے۔

مگر جیسے دل کو کوئی جگہ مل گئی ہو۔

مسجد کے دروازے پر پہنچ کر اس نے جوتے اتارے۔

ننگے قدم ٹھنڈی زمین پر پڑے تو عجیب سی ٹھنڈک رگوں میں اتری۔

وہ سیدھا وضو خانے کی طرف گیا...

مگر وضو نہ کیا۔

جا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

بس بیٹھ گیا۔

خاموش۔

جھکا ہوا۔

ٹوٹا ہوا۔

کافی دیر۔

بہت دیر۔

پانی کی دھیمی آواز بہہ رہی تھی۔

اذان ختم ہو چکی تھی۔

لوگ نماز کے لیے آ رہے تھے۔

مگر سکندر وہیں بیٹھا رہا۔

جیسے اپنے اندر کے شور کو سن رہا ہو۔

اس کے ہاتھ گھٹنوں پر تھے، سر جھکا ہوا۔

کبھی اپنے بابا یاد آتے۔

کبھی خالہ سلوی۔

کبھی نادیا۔

کبھی مومنہ کے زخم یاد آتے۔

کبھی ارمان کا نام۔

کبھی اپنی وہ فریاد،

"مومنہ... وہ مر جائے گا"...

اور پھر اس کا انکار۔

اس نے پہلی بار محسوس کیا،

کچھ شکستیں باہر نہیں، اندر ہوتی ہیں۔

اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

ہونٹ ہلے۔

مگر الفاظ نہ نکلے۔

صرف ایک دبی ہوئی سانس۔

کچھ دیر بعد اس نے نل کھولا۔

پانی ہتھیلیوں پر گرا۔

اس نے چہرے پر مارا۔

مگر شاید ٹھنڈا پانی بھی اندر کی آگ بجھا نہ سکا۔

وہ پھر وہیں بیٹھ گیا۔

وقت گزرتا رہا۔

اور شاید پہلی بار سکندر دعا کرنے نہیں...

جواب ڈھونڈنے آیا تھا۔

کیوں کچھ لوگ جنہیں ہم بچانا چاہتے ہیں، بچتے نہیں۔

کیوں کچھ محبتیں ملنے کے لیے نہیں، جلنے کے لیے ہوتی ہیں۔

اور کیوں ہر سچا ارادہ کامیاب نہیں ہوتا۔

وضو خانے کے اس سنسان کونے میں بیٹھا سکندر...

اب دوست، عاشق، یا نجات دہندہ نہیں لگتا تھا۔

صرف ایک تھکا ہوا انسان۔

جو اپنے رب کے گھر میں آکر ٹوٹنے کی اجازت لے رہا تھا۔

وضو خانے کے کونے میں بیٹھا سکندر ابھی بھی اپنے خیالوں میں گم تھا کہ اچانک ایک ننھی سی آواز نے اس کے اندر کا سکوت توڑ دیا۔

"آپ وضو کیوں نہیں کر رہے؟"

سکندر چونک کر جیسے حال میں واپس آیا۔

اس نے سر اٹھایا۔

سامنے کوئی پانچ سال کا بچہ کھڑا تھا۔

چھوٹا سا، سفید کرتا پہنے، ہاتھ میں ننھا سا تولیہ۔

آنکھوں میں معصوم حیرت۔

سکندر چند لمحے اسے دیکھتا رہا، جیسے سمجھ ہی نہ پایا ہو کہ یہ سوال اس سے ہوا

ہے۔

بچے نے پھر پوچھا،

"نماز نہیں پڑھنی؟"

سکندر کے ہونٹوں پر تھکی ہوئی مسکراہٹ آئی۔

اس نے آہستہ کہا،

"مجھے... وضو نہیں آتا۔"

بچے کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"اتنے بڑے ہو گئے ہو... وضو نہیں آتا؟"

سکندر پہلی بار ہلکا سا ہنسا۔

وہ ہنسی جس میں درد بھی تھا۔

"آتا ہے"...

اس نے دھیرے سے کہا،

"لیکن میں نے کافی دنوں سے نماز نہیں پڑھی... شاید بھول گیا ہوں۔"

بچے نے معصوم سنجیدگی سے پوچھا:

"کتنے دنوں سے نہیں پڑھی؟"

سکندر نے چند لمحے خاموش رہ کر جواب دیا۔

"سات سال سے۔"

یہ کہتے ہوئے جیسے کوئی بوجھ زبان سے اتر کر زمین پر گر گیا۔

بچے نے حیرت سے کہا:

"سات سال؟"!

پھر وہ قریب آیا، بالکل سکندر کے سامنے بیٹھ گیا۔

"اتنی دیر پہلے تو میں پیدا ابھی نہیں ہوا تھا"...

سکندر بے اختیار مسکرا دیا۔

بچے نے بڑے فخر سے کہا:

"میں سکھا دوں وضو؟"

یہ سن کر سکندر کی آنکھوں میں عجیب سی نمی آئی۔

ایک پانچ سالہ بچہ...

اور وہ...

جیسے دونوں جگہ بدل گئے ہوں۔

سکندر نے دھیرے سے پوچھا:

"تم سکھاؤ گے مجھے؟"

بچے نے فوراً سر ہلایا۔

"ہاں۔ پہلے ہاتھ دھوتے ہیں۔ ایسے"...

اس نے ننھے ہاتھوں سے نل کھولا۔

پانی بہا۔

اور سکندر اسے دیکھتا رہا۔

پھر بہت آہستہ اس کے ساتھ ہاتھ دھونے لگا۔

بچہ بول رہا تھا:

"پہلے ہاتھ... پھر کلی... پھر ناک"...

جیسے کوئی استاد ہو۔

اور سکندر خاموشی سے مان رہا تھا۔

ہر چھینٹا جیسے صرف چہرہ نہیں...

سات سال کی گرد بھی دھو رہا تھا۔

وضو کرتے کرتے بچے نے پوچھا:

"آپ نے نماز کیوں چھوڑ دی؟"

سکندر رک گیا۔

پھر آہستہ بولا:

"شاید... میں اللہ سے دور ہو گیا تھا۔"

بچہ بولا:

"اللہ سے دور؟"

یہ سوال تیر کی طرح لگا۔

سکندر خاموش ہو گیا۔

پھر دھیرے سے بولا:

"شاید ہاں"...

بچے نے بڑی سادگی سے کہا:

"کوئی بات نہیں۔ اب پڑھ لو۔ اللہ ناراض نہیں ہوتے جلدی۔"

سکندر نے اس معصوم چہرے کو دیکھا۔

اور پہلی بار دل ہلکا ہوا۔

جیسے جواب مل گیا ہو۔

جیسے رب نے ایک پانچ سالہ بچے کو بھیج کر کہا ہو،

اب لوٹ آؤ۔

وضو مکمل ہوا۔

بچہ مسکرا کر بولا:

"اب چلو، نماز پڑھتے ہیں۔"

سکندر اٹھا۔

اور برسوں بعد پہلی بار اسے لگا،

شاید کچھ دروازے بند نہیں ہوتے۔

ہم خود دور چلے جاتے ہیں۔

مسجد کے اندر اذان کے بعد کی خاموشی اب بھی پھیلی ہوئی تھی۔ صفیں سیدھی ہو رہی تھیں، لوگ آہستہ آہستہ نماز کے لیے کھڑے ہو رہے تھے۔

سکندر بھی ان کے ساتھ کھڑا تھا مگر اس کا دل کہیں اور تھا، یا شاید کہیں نہیں تھا۔ برسوں کی دوری، تھکن، شکایتیں… سب اس کے اندر ایک بھاری بوجھ کی طرح موجود تھیں۔

وہ بچہ اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا، چھوٹا سا، مگر اطمینان سے بھرا ہوا۔

امام نے تکبیر کہی:

"اللہ اکبر"

اور سب صفیں سیدھی ہو گئیں۔

سکندر نے ہاتھ اٹھائے۔

مگر اس بار وہ ہاتھ صرف ایک رسم کے لیے نہیں اٹھے تھے۔

یہ ہاتھ جیسے کسی گمشدہ راستے کی طرف پلٹ رہے تھے۔

اس نے آنکھیں بند کیں۔

اور پہلی بار برسوں بعد دل سے ایک کوشش کی،

خاموش، ٹوٹی ہوئی، مگر سچی۔

نماز شروع ہوئی۔

ہر رکوع کے ساتھ اس کے اندر کا بوجھ جیسے تھوڑا ہلکا ہوتا گیا۔

ہر سجدے میں جیسے وہ خود کو زمین کے قریب نہیں، حقیقت کے قریب محسوس کر رہا تھا۔

اور وہ بچہ...

اس کے بالکل ساتھ کھڑا تھا۔

چھوٹے چھوٹے ہاتھ بندھے ہوئے۔

بے فکری سے نہیں، اعتماد سے۔

جیسے اسے یقین ہو کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

نماز مکمل ہوئی۔

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ"...

دائیں، پھر بائیں۔

خاموشی۔

سکندر ابھی بھی کچھ لمحے سجدے کی حالت کے اثر میں رہا۔

پھر آہستہ سے سیدھا ہوا۔

اس کی آنکھیں نم تھیں مگر وہ رویا نہیں تھا۔

بس... کچھ ٹوٹ کر نرم ہو گیا تھا۔

بچہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا:

"آپ نے کرلی نا نماز؟"

سکندر نے دھیرے سے سر ہلایا۔

"ہاں"...

اس کی آواز بہت کمزور تھی، مگر سچی۔

بچے نے خوش ہو کر کہا:

"دیکھا! اللہ ناراض نہیں ہوتے۔ آپ واپس آ گئے ہو نا۔"

یہ جملہ سکندر کے دل میں اتر گیا۔

واپس آ گئے ہو نا...

سکندر نے بچے کو دیکھا۔

اور پہلی بار محسوس کیا

وہ واقعی کہیں سے واپس آ رہا ہے۔

اس نے مڑ کر کہا:

"اب نماز چھوڑنا مت، ٹھیک ہے؟"

سکندر نے بہت آہستہ کہا:

"نہیں چھوڑوں گا"...

مسجد کے اندر روشنی بدل رہی تھی۔

اور اس کے اندر...

ایک اندھیرا آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔

وہ کافر نہیں تھا...

وہ بس بھٹک گیا تھا۔

اور آج...

ایک بچے نے اسے راستہ دکھا دیا تھا۔

نماز کے بعد مسجد کی خاموشی پہلے سے بھی زیادہ گہری ہو چکی تھی۔ لوگ آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے، کوئی تلاوت میں مشغول تھا، کوئی باہر جا رہا تھا۔

سکندر وہیں ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا، ہاتھ ہتھیلیوں میں تھے۔ اس کے اندر اب الفاظ نہیں تھے صرف ایک بھاری سا احساس تھا جو برسوں سے جمع ہو رہا تھا۔

پھر اس نے آہستہ سے آنکھیں بند کیں۔

اور دل ہی دل میں بول اٹھا:

"یا اللہ... میری زندگی میرے دوست کو لگا دے... اسے معاف کر دے... وہ بہت پریشان ہے"...

اس کی آواز دل ہی دل میں تھی، مگر درد اتنا سچا تھا کہ جیسے آسمان تک پہنچ رہا ہو۔

"میں کچھ بھی نہیں کر سکا... نہ اسے بچا سکا، نہ اس کے درد کو روک سکا"...

اس کی سانس بھاری ہو گئی۔

"بس تو اسے سنبھال لے"...

یہ کہتے ہوئے اس کے دل میں ایک عجیب سی شکست بھی تھی اور ایک ہلکی سی امید بھی۔

خاموشی۔

پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔

سامنے وہی پانچ سال کا بچہ کھڑا تھا۔

وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

اس کی بڑی بڑی آنکھیں سکندر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، جیسے وہ ہر لفظ نہیں... احساس سمجھ رہا ہو۔

سکندر نے اسے دیکھا۔

دونوں چند لمحے خاموش رہے۔

پھر بچہ آہستہ سے بولا:

"آپ رو رہے تھے؟"

سکندر نے فوراً نظریں جھکا لیں۔

"نہیں"...

مگر اس کی آواز اسے ہی دھوکہ دے گئی۔

بچے نے ایک قدم آگے آکر معصومیت سے کہا:

"میری امی کہتی ہیں دعا میں رویا جائے تو اللہ زیادہ سنتے ہیں"…

یہ جملہ سکندر کے دل میں اتر گیا۔

وہ خاموش رہا۔

بچے نے پھر پوچھا:

"آپ کس کے لیے دعا کر رہے تھے؟"

سکندر نے لمبی سانس لی۔

اور بہت دھیرے سے کہا:

"اپنے دوست کے لیے"…

بچہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر نرمی سے بولا:

"وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ سب ٹھیک کر دیتا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے سکندر کی طرف دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ دی۔

سکندر کے ہونٹ کانپ گئے۔

اس نے سر جھکا لیا۔

اور دل میں پہلی بار واقعی سکون جیسا کچھ محسوس ہوا۔

بچہ مڑ کر جانے لگا، پھر رُکا اور پیچھے دیکھ کر بولا:

"اور آپ بھی ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

یہ جملہ جیسے سیدھا سکندر کے ٹوٹے ہوئے اندر جا کر بیٹھ گیا۔

اور سکندر وہیں بیٹھا رہا۔

آنکھوں میں نمی تھی...

مگر دل میں پہلی بار ہلکی سی روشنی۔

سکندر ابھی بھی اسی کیفیت میں بیٹھا ہوا تھا، جیسے دل کا بوجھ کم ہوا ہو مگر ختم نہ ہوا ہو۔ بچہ آہستہ آہستہ وہاں سے جانے لگا تو اچانک سکندر نے اسے آواز دی۔

"ویسے تمہارا نام کیا ہے؟"

بچہ رُک گیا۔ چند لمحے سکندر کو دیکھتا رہا، پھر معصومیت سے بولا:

"یعقوب۔"

یہ نام سنتے ہی سکندر جیسے ساکت ہو گیا۔

اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر آیا حیرت، سکون، اور ایک اندرونی ٹوٹ پھوٹ ایک ساتھ۔

اگلے ہی لمحے وہ بے اختیار اٹھا اور اس بچے کو اپنے قریب کھینچ لیا۔

"یعقوب..." اس کے ہونٹوں سے دھیرے سے نکلا، جیسے یہ نام صرف ایک لفظ نہیں، ایک جواب تھا جس کی اسے مدتوں سے تلاش تھی۔

اس نے بچے کو مضبوطی سے گلے لگا لیا۔

اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

جسم تھوڑا کانپ رہا تھا۔

جیسے ساری پریشانی، ساری تھکن، ساری شکست ایک لمحے میں باہر آ رہی ہو۔

بچہ پہلے تھوڑا حیران ہوا، پھر خاموش ہو گیا۔

اس نے کچھ نہیں کہا، بس سکندر کو دیکھتا رہا۔

سکندر نے آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور بھاری آواز میں بولا:

"تمہیں پتا ہے... تم نے آج مجھے کیا دیا ہے؟"

بچہ خاموش رہا۔

سکندر نے اس کے ماتھے پر ہلکی سی نظر ڈالی، آنکھیں اب بھی نم تھیں۔

"تم نے مجھے واپس راستہ دکھا دیا ہے"...

وہ لمحہ بہت دیر تک ایسے ہی رہا۔

مسجد کی دیواریں، فجر کی روشنی، اور ایک انسان کی ٹوٹی ہوئی روح

سب ایک چھوٹے سے بچے کے وجود میں سمٹ گئے تھے۔

پھر سکندر نے آہستہ سے اسے چھوڑ دیا، مگر اس کی نظر ابھی بھی اس پر تھی۔

جیسے وہ بچہ اب صرف بچہ نہیں رہا تھا

بلکہ اس کی زندگی کا ایک نیا موڑ بن چکا تھا۔

سکندر مسجد سے اٹھ کر آہستہ آہستہ واپس وارڈ کی طرف چل پڑا۔ اس کے قدم اب پہلے جیسے بھاری نہیں تھے، مگر دل ابھی بھی عجیب سی خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا جیسے بہت کچھ بدل گیا ہو مگر سب کچھ مکمل نہ ہوا ہو۔

وارڈ کے باہر آ کر وہ ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ صبح کی ہلکی سی روشنی ہسپتال کی دیواروں پر پھیلنے لگی تھی۔ رات کی تھکن اب ہر چیز پر غالب آ چکی تھی۔

کچھ ہی دیر میں رمشا بھی آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ کچھ نہیں بولی، بس سکندر کو دیکھا... اور پھر آہستہ سے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

سکندر نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔

نہ کوئی سوال۔

نہ کوئی بات۔

بس ایک خاموش قبولیت تھی۔

اس لمحے دونوں کے درمیان الفاظ کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔

رمشا کی سانسیں آہستہ آہستہ برابر ہونے لگیں، اور تھکن نے اسے نیند کے حوالے کر دیا۔

اس کا سر سکندر کے کندھے پر ہی جھکا رہا۔

اور سکندر...

وہ بس سامنے دیکھتا رہا۔

کبھی وارڈ کے دروازے کی طرف، کبھی آسمان کی ہلکی سی روشنی کی طرف۔

اس کی آنکھوں میں اب وہی تھکن تھی، مگر اس کے اندر ایک عجیب سا سکون بھی تھا—جیسے فجر کی نماز نے اندر کہیں کچھ ٹھیک کر دیا ہو۔

چند لمحوں بعد اس نے ہلکی سی نظر رمشا کی طرف کی۔

وہ سو چکی تھی۔

سکندر نے آہستہ سے اپنی چادر اس کے اوپر درست کی، جیسے اس کی نیند کو محفوظ کرنا چاہتا ہو۔

پھر وہ دوبارہ خاموش ہو گیا۔

ہسپتال کے اس خاموش کونے میں، دو تھکے ہوئے لوگ اور ایک ادھورا دن سب فجر کی نرم روشنی میں آہستہ آہستہ اگلے لمحے کا انتظار کر رہے تھے۔

—

20سال بعد...

ٹی وی اسٹوڈیو میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ لائٹس جل رہی تھیں، کیمرے سیٹ ہو رہے تھے، اور ہال میں بیٹھے لوگ بے چینی سے اس لمحے کا انتظار کر رہے تھے جس کا چرچا پچھلے کئی ہفتوں سے ہر جگہ تھا۔

آج اس دہائی کا سب سے بڑا مصنف آنے والا تھا۔

وہ شخص جس کی کتابیں دنیا کے تقریباً ہر بڑے زبان میں ترجمہ ہو چکی تھیں۔

جس نے اردو ادب کو ایک نئی پہچان دی تھی۔

ہال میں سرگوشیاں تھیں:

"آج احمد علی آئے گا"...

"وہی جس کی کتاب 'تم تو میرے محرم تھے' نے سب کو ہلا دیا تھا"...

کیمرہ زوم ان ہوا۔

اور پھر وہ لمحہ آیا۔

دروازہ کھلا۔

ایک نوجوان سا مگر پُر اعتماد شخص اندر داخل ہوا۔

سادہ سفید لباس، آنکھوں میں گہری سنجیدگی، اور چہرے پر ایک عجیب سا سکون جیسے وہ دنیا کی بھیڑ میں رہ کر بھی کہیں اور جیتا ہو۔

اس کا نام تھا:

احمد علی

ہال میں خاموشی چھا گئی۔

وہ سٹیج کی طرف بڑھا۔

تالیاں بجیں... مگر وہ شور اس کی خاموشی سے چھوٹا لگ رہا تھا۔

میزبان نے مسکراتے ہوئے کہا:

"احمد صاحب... آپ کی کتاب 'تم تو میرے محرم تھے' کو آج پاکستان کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب کہا جاتا ہے۔ اس کہانی کا آغاز کہاں سے ہوا؟"

احمد علی نے ایک لمحہ خاموشی اختیار کی۔

جیسے سوال صرف حال کا نہیں تھا... ماضی کا بھی تھا۔

اس کی نظریں ہلکی سی نیچے ہو گئیں۔

پھر اس نے دھیرے سے مائیک کے قریب آ کر کہا:

"کہانی... کہیں سے شروع نہیں ہوتی۔

کہانی... کہیں سے اٹھائی جاتی ہے۔"

ہال میں سناٹا پھیل گیا۔

اس نے آہستہ سے آگے کہا:

"یہ کتاب... کسی ایک شخص کی نہیں ہے۔

یہ اُن سب لوگوں کی ہے جو کبھی محبت، درد، اور خاموش شکست سے گزرے ہیں۔"

ایک وقفہ۔

پھر اس کی آواز مزید دھیمی ہو گئی:

"اور جو سب سے اہم بات ہے"...

وہ رُکا۔

پھر آہستہ سے بولا:

"یہ کہانی... مجھے کسی نے سنائی تھی۔"

ہال میں ایک عجیب سا سکوت چھا گیا۔

میزبان نے حیرت سے پوچھا:

"کس نے؟"

احمد علی نے ہلکی سی سانس لی۔

اس کی آنکھوں میں ایک پرانی تصویر جھلک گئی — ایک ہسپتال، ایک فجر کی اذان، ایک خاموش بینچ...

"ایک ایسے انسان نے... جو خود اپنی کہانی میں ہار گیا تھا، مگر دوسروں کو جیتنا سکھا گیا۔"

کچھ لوگ سمجھ نہیں پائے...

کچھ لوگ خاموش ہو گئے...

مگر احمد علی کے چہرے پر پہلی بار ایک ہلکی سی نمی آئی۔

اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر دل ہی دل میں کہا:

"یہ کتاب میں نے نہیں لکھی... میں نے صرف لکھنے کی ہمت کی۔"

اور اس لمحے...

اسٹیج کی روشنیاں جیسے تھوڑی دیر کے لیے مدھم ہو گئیں۔

میزبان نے مائیک تھوڑا قریب کیا، اس کے لہجے میں تجسس بھی تھا اور احترام بھی۔ پورا ہال جیسے ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا۔ کیمرے آہستہ آہستہ زوم ان ہوئے اور سیدھے احمد علی کے چہرے پر ٹھہر گئے۔

اس نے ایک لمحہ خاموشی میں گزارا۔ اس کی انگلیاں ہلکے سے میز پر ٹکی ہوئی تھیں، اور نگاہ کہیں دور، جیسے ماضی کے کسی ان دیکھے صفحے پر ہو۔

پھر میزبان نے وہی سوال آہستہ مگر واضح انداز میں دہرایا:

"احمد صاحب... آخری سوال یہ ہے کہ آپ کی کتاب 'تم تو میرے محرم تھے' کا اختتام کیا تھا؟ یہ کہانی آخر ختم کیسے ہوئی؟"

ہال میں سانسیں تھم گئیں... اور اسی لمحے پردہ سیاہ پڑنے کے قریب تھا۔

صبح کے 7 بجے کا وقت تھا۔ ہسپتال کی فضا اب بھی پوری طرح جاگ نہیں پائی تھی، مگر آپریشن تھیٹر کے باہر ہر شخص کی آنکھوں میں نیند سے زیادہ بے چینی تھی۔ سکندر کی آنکھ اچانک کھلی، جیسے کسی اندرونی گھڑی نے اسے وقت سے پہلے جگا دیا ہو۔ اس نے چند لمحے بے سمتی سے اردگرد دیکھا دیواروں پر مدھم روشنیاں، راہداری میں چلتے ہوئے نرسوں کے قدموں کی آواز، اور وہ بھاری سا سکوت جو صرف ہسپتال کے انتظار گاہوں میں محسوس ہوتا ہے۔ اسے یاد آیا کہ آپریشن میں اب صرف ایک گھنٹہ باقی ہے۔

وہ آہستہ سے اٹھا اور اپنی جگہ سے آگے بڑھا۔ اس کی نظر جیسے ہی بینچ کی طرف گئی، ایمان نور دکھائی دی جو خاموشی سے بیٹھی ہاتھ اٹھائے ارمان کے لیے دعا کر رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے مگر آواز نہیں تھی بس ایک دل تھا جو کسی کی زندگی کے لیے رب سے لپٹ گیا تھا۔ سکندر چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر خاموشی سے نظریں ہٹا لیں۔ اس کے دل میں ایک عجیب سا بوجھ تھا، جیسے ہر شخص اپنی اپنی دعاؤں میں مصروف تھا اور وہ خود درمیان میں کہیں کھو سا گیا ہو۔

اسی لمحے اس کی نظر سامنے پڑی۔ راہداری کے دوسرے کونے میں ایک شخص کھڑا تھا بھاری جسم، گہری اور متجسس آنکھیں، اور ایک ایسی خاموشی جو عام آدمی کی نہیں لگ رہی تھی۔ سکندر نے پہلے تو صرف ایک نظر ڈالی، پھر دوبارہ غور سے دیکھا۔ کچھ دیر تک وہ سمجھ ہی نہ سکا، جیسے دماغ نے تصویر پہچاننے میں دیر لگا دی ہو۔ مگر جیسے ہی پہچان واضح ہوئی، اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

یہ رحمان شیخ تھے۔

سکندر چند لمحے بالکل ساکت کھڑا رہا۔ اس کے دل کی دھڑکن جیسے تیز ہو گئی۔ سوال ایک ساتھ ذہن میں امڈ آئے وہ یہاں کیوں ہیں؟ کس لیے آئے ہیں؟ اور سب سے اہم... اس لمحے ان کی موجودگی کا مطلب کیا تھا؟ اس نے آہستہ سے ایک قدم آگے بڑھایا، پھر رک گیا۔ رحمان شیخ نے بھی نظریں اٹھا لیں۔ دونوں کے درمیان ایک خاموش سا فاصلہ تھا، مگر اس فاصلہ میں چھپے سوالات بہت بڑے تھے۔ اور ہسپتال کی اس خاموش صبح میں، جیسے ایک نیا موڑ اپنی سانسیں روک کر کھڑا تھا۔

"کدھر ہے میرا بیٹا؟"

یہ آواز ہسپتال کی خاموش راہداری میں گونجتی ہوئی سیدھا دل پر آکر لگی۔

رحمان شیخ کے لہجے میں وہی باپ والی بے چینی تھی جو فاصلے اور وقت کو ایک ساتھ جلا دیتی ہے۔

ایمان نور نے جیسے ہی یہ آواز سنی، وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں پہلے سے موجود دعا اچانک حقیقت کے قریب آگئی۔ وہ تیز قدموں سے ان کی طرف بڑھی، جیسے برسوں کا انتظار ایک لمحے میں ختم ہو گیا ہو۔

"انکل..." اس نے دھیرے سے کہا، مگر آواز میں سکون نہیں تھا، صرف اضطراب تھا۔ وہ سیدھی ان کے قریب جا کھڑی ہوئی، جیسے کسی سہارا کی تلاش ہو۔

ادھر نعمان بھی ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔ اس نے حیرت سے رحمان شیخ کو دیکھا اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ ہی نہیں رہی تھی کہ اس کے والد یہاں، اس وقت، اس حالت میں موجود ہیں۔ اس کی آنکھوں میں سوال بھی تھا اور بے یقینی بھی۔

"بابا آپ..." نعمان نے آہستہ سے کہنا چاہا، مگر الفاظ مکمل نہ ہو سکے۔

رحمان شیخ نے بس ایک ہی بات دہرائی، آواز بھاری مگر ٹوٹی ہوئی:

"میرا بیٹا ارمان... وہ کیسا ہے؟"

اسی لمحے رمشا اور سکندر بھی آ گے آئے۔ سکندر کے چہرے پر وہی تھکن تھی، مگر اب اس میں ایک ہلکی سی امید بھی جھلک رہی تھی۔ رمشا نے ایک نظر سکندر کو دیکھا، پھر رحمان شیخ کی طرف۔

اور پھر جیسے پورا ماحول بدل گیا۔

نعمان نے فوراً کہا، "بابا آپ وقت پر آ گئے ہیں، ڈاکٹر نے کہا ہے خون بھی مل گیا ہے اور آپریشن ابھی شروع ہونے والا ہے"...

یہ سنتے ہی رحمان شیخ کی آنکھوں میں پہلی بار ہلکی سی سکون کی لہر آئی، مگر ساتھ ہی وہ بے چینی ابھی باقی تھی۔

ایمان نور نے آہستہ سے کہا، "وہ اندر ہے... ابھی لے جا رہے ہیں آپریشن تھیٹر میں"...

یہ سن کر رحمان شیخ چند لمحے خاموش کھڑے رہے، پھر آہستہ سے آگے بڑھے، جیسے ہر قدم بھاری ہو۔

رمشا نے سکندر کی طرف دیکھا، اور پہلی بار دونوں کے چہروں پر ایک ہلکی سی خوشی آئی وہ خوشی جو صرف اس لیے ہوتی ہے کہ کم از کم سب آ گئے ہیں، کم از کم کوئی اکیلا نہیں ہے۔

مگر اسی لمحے فضا میں وہی تناؤ واپس آ گیا

کیونکہ آپریشن تھیٹر کا دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے والا تھا۔

نعمان نے جب اپنے والد رحمان شیخ کو سامنے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے جیسے اس کے اندر ساری سختی پگھل گئی۔ وہ جو اب تک خود کو مضبوط رکھے ہوئے تھا، اچانک ٹوٹ سا گیا۔

اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی، ہونٹ کانپ گئے، اور وہ چند قدم آگے بڑھ کر رک گیا۔ جیسے یقین کرنا چاہ رہا ہو کہ واقعی اس کے بابا یہاں ہیں، اس کے سامنے، اس مشکل ترین وقت میں۔

رحمان شیخ نے بھی بیٹے کو دیکھا تو ان کی سختی نرم پڑ گئی۔ ان کے چہرے پر وہی باپ والی بے چینی تھی جو صرف اولاد کے لیے ہوتی ہے۔ وہ آگے بڑھے اور نعمان کو ایک نظر دیکھ کر بس اتنا کہا:

"میں آ گیا ہوں"...

یہ سنتے ہی نعمان کے آنسو روک نہ سکے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اپنے والد کے قریب آکر کھڑا ہو گیا، جیسے برسوں کا فاصلہ ایک لمحے میں ختم ہو گیا ہو۔

اس کی آواز ٹوٹ گئی۔

"بابا"...

بس اتنا ہی نکل سکا۔

رحمان شیخ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ لمس سادہ تھا، مگر نعمان کے لیے جیسے پوری ڈھارس بن گیا ہو۔

ادھر سکندر اور رمشا یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ دونوں خاموش تھے، مگر ان کی آنکھوں میں بھی ایک ہلکی سی نرمی آ گئی۔ سکندر نے آہستہ سے سانس لی، جیسے دل کا کوئی بوجھ کچھ ہلکا ہوا ہو۔

ہسپتال کی راہداری میں اس لمحے صرف ایک چیز واضح تھی

پریشانی سب کی ایک جیسی تھی، مگر اس کا سہارا ابھی اب سب کے پاس تھا۔

اور اسی خاموشی میں آپریشن تھیٹر کا دروازہ ایک بار پھر سب کی توجہ اپنی طرف کھینچنے لگا۔

پورا ہسپتال کا ماحول ایک عجیب سی مکملیت میں بدل گیا تھا۔ وہی لوگ جو کبھی بکھرے ہوئے تھے، آج ایک ہی جگہ، ایک ہی مقصد کے لیے اکٹھے کھڑے تھے۔ سکندر کچھ فاصلے پر گیلری کے قریب آ کر رک گیا۔ وہ سب کو دیکھ رہا تھا رحمان شیخ، نعمان، ایمان نور، رمشا... سب ایک ہی فریم میں جیسے زندگی نے خود انہیں دوبارہ جوڑ دیا ہو۔

اس کے چہرے پر تھکن تھی، مگر اس تھکن کے پیچھے ایک ہلکی سی مسکراہٹ بھی تھی۔ وہ آہستہ سے گیلری کی طرف بڑھا اور شیشے کے پاس آ کر کھڑا ہو

گیا۔ باہر کا منظر دھندلا سا تھا، مگر اس کے اندر کا منظر واضح ہو رہا تھا—وہ سب جو کبھی ایک دوسرے سے دور ہو گئے تھے، آج ایک ساتھ کھڑے تھے۔ سکندر نے گہری سانس لی، جیسے برسوں کا دباؤ کسی حد تک کم ہوا ہو۔

اسی دوران تھوڑی دور سے شاہ ویر اور دانیال بھی وہاں پہنچے۔ جیسے ہی ان کی نظر اس پورے منظر پر پڑی، وہ چند لمحے ساکت رہ گئے۔ ان کے چہروں پر واضح حیرت تھی۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے، پھر دوبارہ ہجوم کی طرف جیسے یقین کرنا چاہ رہے ہوں کہ یہ حقیقت ہے یا کوئی اتفاق۔

ان کی نظر جب رمشا پر پڑی تو وہ مزید حیران ہو گئے۔ "یہ سب لوگ... اتنے عرصے بعد ایک ساتھ؟" شاہ ویر نے آہستہ سے کہا، اور دانیال بس خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔

ہسپتال کی اس گیلری میں سکندر خاموش کھڑا تھا، مگر اس کے اندر ایک عجیب سا سکون اتر رہا تھا۔ اسے پہلی بار لگا کہ شاید کچھ کہانیاں ختم نہیں ہوتیں... بس وقت کے ساتھ دوبارہ اکٹھی ہو جاتی ہیں۔

آپریشن تھیٹر کے دروازے کے باہر اب مکمل سناٹا چھا چکا تھا۔ سب کی نظریں اسی بند دروازے پر جمی ہوئی تھیں جس کے اندر ارمان کی زندگی کا فیصلہ ہونے والا تھا۔

نرس نے آکر آہستہ سے فائل ہاتھ میں لی اور ڈاکٹر کو اندر بلانے کا اشارہ کیا۔ دروازے کے اوپر سرخ بلب اچانک روشن ہو گیا۔

Operation Started.

یہ دیکھتے ہی فضا میں موجود ہر شخص کی سانس جیسے رک گئی۔

رحمان شیخ نے آنکھیں بند کر لیں اور دیوار سے ٹیک لگا لیا۔ نعمان نے ہاتھ جوڑ لیے۔ ایمان نور کی آنکھوں سے آنسو خاموشی سے گرنے لگے۔ رمشا نے سکندر کی طرف دیکھا وہ بالکل ساکت کھڑا تھا، مگر اس کی مٹھی مضبوطی سے بند تھی، جیسے اندر ہی اندر کوئی دعا زور پکڑ رہی ہو۔

سکندر آہستہ سے آگے بڑھا اور شیشے کے پاس آکر رک گیا۔ اس کی نظر دروازے پر تھی۔

اس نے بہت دھیرے سے کہا:

"اب سب کچھ اُس کے ہاتھ میں ہے"...

وقت جیسے کھنچنے لگا۔

ہر منٹ صدیوں جیسا محسوس ہو رہا تھا۔

کبھی نرس اندر جاتی، کبھی ڈاکٹر کا سایا دروازے کے پار نظر آتا، کبھی دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔

اور باہر کھڑے لوگ... ہر ایک اپنی اپنی دعا میں گم تھا، مگر سب کی دعا ایک ہی نام کے گرد گھوم رہی تھی،

ارمان۔

آپریشن تھیٹر کے باہر وہی گہرا سناٹا تھا جس میں ہر آواز اپنی ہی گونج لگتی ہے۔ دروازے کے اوپر سرخ بلب جل رہا تھا اور اندر ارمان کی زندگی ایک نازک موڑ پر کھڑی تھی۔

سکندر کچھ دیر خاموش کھڑا رہا، پھر اس نے جیب سے فون نکالا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔

دوسری طرف سے فوراً آواز آئی:

"سکندر؟ کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہے؟"

یہ اس کی ماں، سلمیٰ جٹ تھیں۔

سکندر نے آہستہ مگر سنجیدگی سے کہا:

"ماما... ارمان کا آپریشن شروع ہونے والا ہے... اور اس کے بابا بھی آ گئے ہیں... رحمان شیخ یہاں ہیں۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی، جیسے بات سمجھنے میں وقت لگ رہا ہو۔

پھر سلمیٰ جٹ کی آواز آئی، حیرت اور سکون ایک ساتھ:

"رحمان شیخ؟ وہ آ گئے ہیں؟ اچھا... اچھا ہوا... کم از کم اب وہ اکیلا نہیں ہے"...

ان کے لہجے میں ایک ہلکی سی خوشی بھی تھی، جیسے دل کا بوجھ ہلکا ہوا ہو۔

"ساری فیملی اکٹھی ہو گئی ہے..." انہوں نے آہستہ سے کہا، "یہ بھی اللہ کی طرف سے رحمت ہے"...

سکندر خاموش رہا۔

سلمیٰ جٹ نے تھوڑی دیر بعد نرمی سے پوچھا:

"اور مومنہ... وہ آئی ہے؟"

یہ نام سنتے ہی سکندر کے چہرے پر ایک پل کی خاموشی اتر آئی۔

اس نے کچھ لمحے کچھ نہ کہا۔

بس نظر جھکا لی۔

پھر بہت آہستہ سے بولا:

"نہیں ماما"...

دوسری طرف بھی خاموشی چھا گئی۔

نہ سوال آگے بڑھا، نہ جواب آیا۔

سکندر نے فون آہستہ سے بند کر دیا۔

اور پھر دوبارہ شیشے کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

اس کے سامنے اب صرف ایک چیز تھی،

آپریشن تھیٹر کا دروازہ۔

اور اندر وہ زندگی... جو ہر کسی کے انتظار کی وجہ بنی ہوئی تھی۔

سکندر نے فون بند کیا تو چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔ جیسے ماں کی آواز ابھی بھی اس کے کانوں میں گونج رہی ہو "سب کا خیال رکھو"...

اس نے آہستہ سے سر جھکا دیا۔

"ٹھیک ہے، ماما"...

بس اتنا کہا، اور فون جیب میں رکھ دیا۔

وہ دوبارہ آپریشن تھیٹر کے سامنے آ گیا۔ فضا اب بھی ویسی ہی تھی خاموش، بھاری، اور دعاؤں سے بھری ہوئی۔

رحمان شیخ ایک طرف کھڑے تھے، ہاتھ مسلسل تسبیح میں۔ نعمان ان کے قریب تھا مگر اس کی نظریں بار بار دروازے پر جا رہی تھیں۔ ایمان نور خاموشی سے دعا میں مشغول تھی، اور رمشا سکندر کے قریب کھڑی اسے دیکھ رہی تھی جیسے جانتی ہو کہ اس وقت وہ اندر سے کیا محسوس کر رہا ہے۔

سکندر نے ایک نظر سب پر ڈالی۔

اس کے چہرے پر تھکن بھی تھی اور ذمہ داری بھی۔ جیسے وہ واقعی سب کا سہارا بننے کی کوشش کر رہا ہو۔

وہ آہستہ سے آگے بڑھا، شیشے کے پاس آکر رک گیا۔

اور پھر بہت دھیرے سے بولا:

"بس... اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

یہ جملہ اس نے خود کو بھی سنایا تھا، اور سب کو بھی۔

مگر اس کے دل کے اندر کہیں ایک ہلکی سی لرزش ابھی باقی تھی۔

اسی لمحے آپریشن تھیٹر کے دروازے کے اوپر لگی لائٹ مزید روشن ہو گئی...

اور وقت جیسے ایک بار پھر رک سا گیا۔

رحمان شیخ چند لمحے سکندر کو دیکھتے رہے، ان کی آنکھوں میں تھکن بھی تھی اور شکر گزاری بھی۔ پھر وہ آہستہ سے اس کے قریب آئے، جیسے دل کی بات دبے ہوئے لفظوں میں نکل رہی ہو۔

"تم بہت اچھے لڑکے ہو... تمہارا شکریہ۔ اگر تم مجھے منانے نہ آتے تو شاید میں آج اپنی اولاد کی ایسی حالت دیکھنے بھی نہ آتا"...

ان کی آواز میں ایک باپ کا درد صاف جھلک رہا تھا۔

سکندر نے ان کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی، مگر آنکھوں میں ایک نرم سی تھکن بھی۔

وہ آہستہ سے بولا:

"سب کے پاس باپ جیسی دولت نہیں ہوتی، انکل... لیکن جن کے پاس ہوتی ہے، ان کو ایک ساتھ تو رہنا چاہیے۔"

یہ جملہ جیسے فضا میں ٹھہر گیا۔

رحمان شیخ چند لمحے خاموش رہے۔ پھر آہستہ سے نظریں جھکا لیں۔

"ہاں... تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم نے دیر کر دی"...

سکندر نے کچھ نہ کہا۔ بس شیشے کے پار آپریشن تھیٹر کے دروازے کو دیکھتا رہا، جہاں اندر ارمان زندگی اور موت کے درمیان کہیں تھا۔

رمشا نے سکندر کی طرف دیکھا، پھر رحمان شیخ کی طرف۔ اس کے چہرے پر بھی ایک ہلکی سی نرمی آ گئی۔

اور پھر وہی خاموشی دوبارہ سب کے درمیان پھیل گئی

مگر اب اس خاموشی میں بوجھ کم تھا... اور امید زیادہ۔

آپریشن تھیٹر کے اندر فضا مکمل طور پر بدل چکی تھی۔ باہر کھڑے لوگوں کے لیے یہ صرف ایک دروازہ تھا، مگر اندر یہ ایک ایسی دنیا تھی جہاں ہر سیکنڈ زندگی اور موت کے درمیان جھول رہا تھا۔

ڈاکٹرز کی ٹیم پوری تیاری سے کام کر رہی تھی۔ مانیٹرز کی مسلسل بیپ، آکسیجن کی ہلکی سی آواز، اور نرسوں کے تیز مگر محتاط قدم سب کچھ ایک خوفناک نظم میں بند تھا۔ ارمان بیہوش حالت میں لیٹا تھا، اس کے چہرے پر ماسک لگا ہوا تھا، اور سینے کی ہلکی سی حرکت ہی اس بات کا ثبوت تھی کہ ابھی زندگی باقی ہے۔

لیڈ سرجن نے ایک بار گہری نظر مریض پر ڈالی، پھر مختصر سی ہدایت دی:

"بلڈ پریشر ڈراپ ہو رہا ہے... اسٹیبلائز کرو اسے!"

نرس فوراً حرکت میں آئی۔

"سر... BP 80/50"

دوسرا ڈاکٹر تیزی سے مانیٹر دیکھتا ہوا بولا:

"ہارٹ ریٹ بھی نیچے جا رہا ہے!"

اس لمحے کمرے میں ایک لمحے کے لیے دباؤ اور بڑھ گیا۔

"سکشن تیار رکھو... ہم زیادہ وقت نہیں لے سکتے..." سرجن نے سخت آواز میں کہا۔

آہستہ آہستہ آپریشن شروع ہوا۔

ہر کٹ، ہر ٹانکے کے ساتھ مانیٹر کی بیپ یا تیز ہوتی یا کم۔

کبھی لگتا سب ٹھیک جا رہا ہے... اور اگلے ہی لمحے خطرہ دوبارہ سر اٹھا لیتا۔

"Bleeding control نہیں ہو رہا!" ایک نرس نے گھبراہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔

سرجن نے فوراً ہاتھ روکے بغیر جواب دیا:

"کلمپ دو وہاں... فوراً"!

لیکن اندر حالات آسان نہیں تھے۔

ارمان کا جسم کمزور تھا، اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کا ردعمل بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔

"سر، saturation 85 پر آ گئی ہے"...

کمرے میں ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔

پھر سرجن نے گہری سانس لی۔

"اسے واپس لانے کی کوشش کرو... ابھی نہیں چھوڑنا اسے"...

اسی لمحے باہر دروازے کے پار سب کی زندگیاں رک سی گئی تھیں، مگر اندر جنگ جاری تھی۔

کبھی دل کی دھڑکن مستحکم ہوتی، کبھی خطرناک حد تک نیچے چلی جاتی۔

"Come on... stay with us..." ڈاکٹر آہستہ سے بولا، جیسے وہ صرف مریض سے نہیں، زندگی سے بات کر رہا ہو۔

پسینہ ڈاکٹروں کے چہروں پر بھی تھا۔

یہ صرف ایک آپریشن نہیں تھا... یہ ایک مسلسل جدوجہد تھی۔

اور ہر گزرتے منٹ کے ساتھ باہر کھڑے لوگوں کی امید بھی ٹوٹتی اور جڑتی جا رہی تھی۔

اسی دوران مانیٹر کی بیپ اچانک ایک لمحے کے لیے غیر مستحکم ہوئی...

اور کمرے میں سب کی نظریں ایک ہی جگہ جم گئیں

جیسے اگلا سیکنڈ فیصلہ کرنے والا تھا کہ ارمان واپس آئے گا یا نہیں۔

مانیٹر کی بیپ اچانک غیر مستحکم ہوئی... اور پھر ایک لمبی، کھنچتی ہوئی آواز نے پورے آپریشن تھیٹر میں سناٹا بھر دیا۔

"Beep... beep... beep——"

سرجن کے ہاتھ لمحے بھر کے لیے رُک گئے۔

"BP گر رہا ہے!" نرس کی آواز پہلی بار واقعی گھبرا گئی۔

"Heart rate 40 پر آ گیا ہے!"

کمرے کا ماحول ایک دم بھاری ہو گیا۔

سرجن نے فوراً سخت لہجے میں کہا:

"Adrenaline تیار کرو... ابھی!"

ایک نرس تیزی سے سرنج تیار کرنے لگی، ہاتھ ہلکے کانپ رہے تھے۔

"سر، ہم اسے lose کر رہے ہیں..." ایک اور ڈاکٹر نے آہستہ کہا۔

"نہیں!" سرجن نے فوراً جواب دیا، "ابھی نہیں۔ ہم اسے چھوڑ نہیں سکتے!"

اس نے مریض کے سینے کی طرف دیکھا، پھر گہری سانس لی۔

“Charge it... 200 joules!”

ڈیفبریلیٹر تیار ہوا۔

ایک لمحہ...

“Clear!”

جھٹکا

پورا جسم ہلکا سا اچھلا۔

کمرے میں پھر خاموشی۔

مانیٹر

پہلے ایک سیکنڈ...

پھر دو سیکنڈ...

اور پھر—

“beep... beep...”

ایک کمزور مگر موجود دھڑکن واپس آئی۔

کمرے میں کسی نے سانس روکی ہوئی تھی، جیسے اب پہلی بار سانس لی ہو۔

“Rhythm واپس آرہا ہے...” نرس کی آواز کانپ رہی تھی مگر خوشی کے ساتھ۔

سرجن نے فوراً کہا:

“اسے stabilize کرو... ابھی وقت ہے، ہم اسے واپس لا سکتے ہیں”!

دوسری طرف باہر، دروازے کے پار کچھ نہیں سنا جا سکتا تھا۔

مگر اندر زندگی نے ایک بار پھر ہار ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

ہر ٹانکہ، ہر منٹ، ہر سانس اب پہلے سے زیادہ قیمتی ہو چکی تھی۔

اور سب کے دل میں ایک ہی بات تھی

یہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی۔

رحمان شیخ کچھ لمحے خاموش کھڑے رہے۔ ان کی آنکھوں میں وہ تھکن تھی جو برسوں کے فیصلوں، غلطیوں اور ندامتوں سے پیدا ہوتی ہے۔ آپریشن

تھیٹر کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر انہوں نے آہستہ سے کہا، جیسے ہر لفظ دل سے ٹوٹ کر نکل رہا ہو:

"میں نے ساری زندگی اپنی بیوی اور بچوں پر ظلم کیا... مجھے لگتا ہے اللہ مجھ سے ناراض ہو گیا ہے"...

ان کی آواز بھاری ہو گئی، اور ایک لمحے کو لگا جیسے وہ خود اپنے ہی الفاظ کے بوجھ تلے دب رہے ہوں۔

سکندر نے ان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سختی نہیں تھی، بس ایک خاموش سمجھ تھی۔ وہ آہستہ سے قریب آیا اور دھیمے مگر پختہ لہجے میں بولا:

"اللہ کسی سے ناراض نہیں ہوتا، انکل"...

رحمان شیخ نے سر اٹھایا، حیرت اور درد ایک ساتھ چہرے پر تھا۔

سکندر نے آگے کہا:

"وہ سب کو واپس آنے کا موقع دیتا ہے... ہم ہی ہیں جو خود اس سے دور ہو جاتے ہیں۔"

یہ جملہ فضا میں ٹھہر گیا۔

رحمان شیخ نے آہستہ سے نظریں جھکا لیں۔ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے، مگر اس بار وہ غصے یا طاقت سے نہیں، بلکہ احساس سے کانپ رہے تھے۔

سکندر نے نرمی سے کہا:

"آپ ابھی بھی وقت میں ہیں... انکل۔

آپ کا بیٹا اندر ہے... اور آپ باہر کھڑے ہیں۔ بس یہی فرق ہے جو آپ بدل سکتے ہیں۔"

رحمان شیخ نے گہری سانس لی۔ ان کی آنکھوں میں پہلی بار نمی صاف نظر آئی۔

"کیا میں واقعی... معاف ہو سکتا ہوں؟"

سکندر نے بغیر ہچکچاہٹ کے جواب دیا:

"معافی مانگنے والے کبھی اکیلے نہیں چھوڑے جاتے"...

اسی لمحے آپریشن تھیٹر کے اندر سے مانیٹر کی آواز ہلکی سی گونجی، اور سب کی نظریں دوبارہ دروازے کی طرف اٹھ گئیں

جیسے کہانی ابھی اپنے سب سے نازک موڑ پر کھڑی ہو۔

رحمان شیخ کی آواز اب پہلے جیسی سخت نہیں رہی تھی۔ اس میں ایک ٹوٹا ہوا سا انسان بول رہا تھا جو اپنی ہی غلطیوں کے وزن تلے دب چکا تھا۔

انہوں نے دھیرے سے کہا، جیسے خود سے سوال کر رہے ہوں:

"آخر معافی کس سے مانگوں میں...؟"

ان کی نظریں زمین پر ٹکی ہوئی تھیں، اور ہاتھ بے اختیار کانپ رہے تھے۔

سکندر نے ان کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر نہ سختی تھی نہ فیصلہ بس ایک خاموش فہم۔

وہ آہستہ سے بولا:

"سب سے پہلے اپنی بیوی سے، انکل"...

رحمان شیخ نے سر اٹھایا۔

سکندر نے نرمی سے مگر صاف لہجے میں کہا:

"آپ نے ان کو بہت درد دیا ہے... انہوں نے بہت کچھ برداشت کیا ہے۔ جو عورت سالوں تک خاموشی سے سب سہتی رہی ہو، اس کی خاموشی سب سے بڑی کہانی ہوتی ہے۔"

یہ سن کر رحمان شیخ کی آنکھیں بھر آئیں۔

ان کے ہونٹ ہلے، مگر آواز نہ نکلی۔

سکندر نے بات جاری رکھی:

"اور پھر اپنے بچوں سے... کیونکہ باپ کی سختی صرف مار نہیں ہوتی، بعض دفعہ خاموشی بھی زخم بن جاتی ہے۔"

رحمان شیخ نے آہستہ سے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"میں نے سب کھو دیا..." ان کی آواز ٹوٹ گئی۔

سکندر نے فوراً نرمی سے کہا:

"نہیں انکل... آپ ابھی بھی وقت میں ہیں۔

کھویا وہ جاتا ہے جو واپس نہ آئے... اور آپ کے پاس ابھی بہت کچھ واپس لانے کو ہے۔"

رحمان شیخ نے آہستہ سے ہاتھ چہرے سے ہٹایا۔

ان کی آنکھوں میں آنسو تھے، مگر اس بار ان میں شکست نہیں... قبولیت تھی۔

وہ دھیرے سے بولے:

"پھر میں کوشش کروں گا... آج ہی سے۔"

سکندر نے صرف سر ہلایا۔

اسی لمحے آپریشن تھیٹر کے دروازے کے اوپر روشنی ایک بار پھر جھلملا اٹھی اور سب کی نظریں دوبارہ اندر کی طرف چلی گئیں۔

رحمان شیخ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے ایمان نور کے پاس پہنچے۔ ان کے چہرے پر وہی تھکن تھی جو برسوں کے غلط فیصلوں کے بعد انسان کے اندر رہ جاتی ہے۔ وہ چند لمحے خاموش کھڑے رہے، جیسے الفاظ ڈھونڈ رہے ہوں جو دل کے بوجھ کو ہلکا کر سکیں۔

پھر انہوں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

"مجھے معاف کر دو... میں نے ساری زندگی تم پر ظلم کیا... تمہیں وہ سب نہیں دیا جس کی تم حق دار تھیں"...

ان کی آواز ٹوٹنے لگی۔

وہ رکے، پھر آہستہ سے نظر اٹھا کر نعمان کی طرف دیکھا جو تھوڑے فاصلے پر کھڑا سب سن رہا تھا۔

رحمان شیخ کی آنکھوں میں نمی گہری ہو گئی۔

"اس نے تو ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کبھی..." ان کی آواز بھاری ہو گئی،
"میں نے کبھی اسے دیکھا ہی نہیں... کبھی اپنے بیٹے کی طرف صحیح سے دیکھا ہی نہیں"...

وہ چند لمحے خاموش رہے، جیسے الفاظ گلے میں پھنس گئے ہوں۔

پھر ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولے:

"میرا بیٹا نعمان"...

نعمان نے یہ سنا تو اس کی نظریں فوراً نیچے جھک گئیں۔ اس کے چہرے پر درد اور خاموشی ایک ساتھ آ گئے۔

ایمان نور کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

رحمان شیخ نے آہستہ سے ہاتھ جوڑ لیے، جیسے پہلی بار وہ باپ نہیں، ایک عام انسان کی طرح معافی مانگ رہے ہوں۔

"میں نے سب کچھ ضائع کر دیا... مگر شاید ابھی وقت ہے... اگر تم سب مجھے ایک موقع دے سکو"...

وہ رُک گئے۔

آواز مکمل طور پر ٹوٹ چکی تھی۔

اسی لمحے نعمان آہستہ سے آگے بڑھا، مگر کچھ نہ بولا۔

صرف اپنے باپ کو دیکھتا رہا جیسے برسوں کی دوری ایک لمحے میں سمجھ آگئی ہو۔

اور ہسپتال کی اس خاموش صبح میں ایک خاندان، جو ٹوٹ کر بکھر چکا تھا، پہلی بار دوبارہ جڑنے کے قریب کھڑا تھا۔

ایمان نور چند لمحے خاموش کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، مگر آواز میں ایک عجیب سا سکون بھی تھا جیسے دل نے کسی پرانی تھکن کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

پھر وہ آہستہ سے بولی:

"ٹھیک ہے... میں نے آپ کو معاف کیا۔"

یہ جملہ سن کر رحمان شیخ کے کندھے جیسے ڈھیلے پڑ گئے۔ ان کی آنکھیں بند ہو گئیں، اور وہ پہلی بار واقعی سکون میں دکھائی دیے۔

ادھر سکندر کچھ فاصلے پر کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔

اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

جیسے کوئی اندر سے کہہ رہا ہو

شاید سب ٹھیک ہو رہا ہے۔

وہ آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہٹا اور گہری سانس لی۔

اسے محسوس ہوا جیسے اس کی وجہ سے ایک بکھرا ہوا خاندان دوبارہ اکٹھا ہو گیا ہے۔ نہ وہ اس کا مرکز تھا، نہ ہی اصل کردار... مگر کہیں نہ کہیں اس کی موجودگی نے سب کو ایک جگہ لا کھڑا کیا تھا۔

وہ خود سے دھیرے سے بولا:

"اگر ایک ٹوٹا ہوا رشتہ بھی جوڑ سکا ہوں... تو شاید یہ سب بے کار نہیں تھا۔"

رمشا نے اسے دیکھا اور ہلکی سی مسکراہٹ دی، جیسے وہ اس کے اندر کی کیفیت سمجھ رہی ہو۔

مگر اسی لمحے آپریشن تھیٹر کے دروازے کے اوپر لگی لائٹ نے سب کی توجہ دوبارہ اپنی طرف کھینچ لی

کیونکہ اصل امتحان ابھی ختم نہیں ہوا تھا... ابھی اندر زندگی کی جنگ جاری تھی۔

رمشا کا فون جیسے ہی بجا، اس کے چہرے پر ایک پل کے لیے وہی پرانی بے چینی لوٹ آئی جو پچھلے کئی گھنٹوں سے کسی نہ کسی شکل میں سب کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس نے جلدی سے کال اٹینڈ کی، مگر جیسے ہی دوسری طرف سے بات سنی، اس کی انگلیاں فون پر سخت ہو گئیں اور نگاہیں خود بخود نیچے جھک گئیں۔

ہسپتال کی لمبی راہداری میں شور نہیں تھا، مگر خاموشی بھی اب عام نہیں رہی تھی۔ ہر شخص کسی نہ کسی انتظار میں تھا۔ اسی انتظار کے بیچ رمشا کا چہرہ بدلتا دیکھ کر سکندر فوراً اس کے قریب آیا۔

"کون ہے؟" اس نے سیدھا سوال کیا، اس کی آواز میں تھکن بھی تھی اور بے چینی بھی۔

رمشا چند لمحے خاموش رہی، جیسے فیصلہ کر رہی ہو کہ یہ بات کہنی بھی چاہیے یا نہیں۔ پھر اس نے دھیرے سے، کچھ گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا:

"م... مومنہ"...

سکندر ایک لمحے کے لیے بالکل ساکت ہو گیا۔

اس نے پلک بھی نہیں جھپکائی، جیسے دماغ نے یہ نام سن کر خود کو روک لیا ہو۔

"کیا؟" اس کے منہ سے بس ایک ہی لفظ نکلا۔

رمشا نے دوبارہ کہا، اس بار آواز مزید دھیمی تھی:

"وہ ہسپتال کے باہر کھڑی ہے"...

یہ سنتے ہی سکندر کے چہرے پر حیرت واضح طور پر پھیل گئی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا، پھر دوبارہ آگے آیا، جیسے اس خبر کو جسمانی طور پر سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی آنکھیں فوراً راہداری کے آخر کی طرف اٹھ گئیں، جیسے وہ دیواروں کے پار دیکھنا چاہ رہا ہو۔

اس کے اندر ایک ساتھ کئی سوال اٹھنے لگے۔

وہ اب یہاں کیوں آئی ہے؟

اسی وقت کیوں؟

جب اس نے صاف انکار کیا تھا... تو اب کون سا فیصلہ اسے یہاں لے آیا ہے؟

اس کی نظر ایک لمحے کے لیے آپریشن تھیٹر کے بند دروازے پر گئی، جہاں اندر ارمان زندگی کے لیے لڑ رہا تھا، پھر دوبارہ رمشا پر۔

رمشا بھی الجھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر واضح تھا کہ وہ خود بھی نہیں سمجھ پا رہی کہ یہ وقت اور یہ آمد کیا معنی رکھتی ہے۔

سکندر نے آہستہ سے ایک قدم آگے بڑھایا، پھر رک گیا۔ جیسے اس کے اندر دو حصے آپس میں لڑ رہے ہوں — ایک جو دوڑ کر باہر جانا چاہتا تھا، اور ایک جو یہاں رک کر ہر چیز کو سمجھنا چاہتا تھا۔

ہسپتال کی فضا ایک بار پھر بدل گئی تھی۔

جہاں پہلے صرف آپریشن کا انتظار تھا، اب وہاں ایک نیا سوال آکر کھڑا ہو گیا تھا

اور وہ سوال سب کے دلوں میں گونج رہا تھا:

مومنہ اب کیوں آئی ہے؟

سکندر نے ایک لمحہ خاموشی میں گزارا۔ اس کی نظریں ابھی بھی کہیں دور، ہسپتال کے دروازے کی سمت جمی ہوئی تھیں، جیسے وہ خود یقین کرنا چاہ رہا ہو کہ مومنا واقعی باہر کھڑی ہے۔

پھر اس نے آہستہ سے رمشا کی طرف دیکھا۔ اس کی آواز میں نہ غصہ تھا، نہ الجھن بس ایک فیصلہ تھا۔

"جا کر لے آؤ اسے یہاں"...

رمشا چند لمحے سکندر کو دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ خود بھی نہیں جانتی کہ یہ ملاقات کیا رنگ لائے گی، مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ بس ہلکا سا سر ہلایا اور تیزی سے وارڈ کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

سکندر وہیں کھڑا رہا۔

اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ مٹھی میں بند ہو رہے تھے اور کھل رہے تھے، جیسے اندر کا اضطراب جسم سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے ایک نظر آپریشن تھیٹر کے بند دروازے پر ڈالی، پھر آہستہ سے نظریں ہٹا لیں۔

کچھ ہی لمحوں میں رمشا باہر نکلی۔

اور اس کے ساتھ...

مومنہ۔

وہ آہستہ قدموں سے اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر تھکن تھی، آنکھوں کے نیچے گہرا بوجھ، اور ایک عجیب سی خاموشی جو بہت کچھ کہہ رہی تھی مگر زبان کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔

سکندر کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی، وہ ساکت ہو گیا۔

کمرے کی ساری آوازیں جیسے پیچھے رہ گئیں۔

مومنہ بھی چند لمحے رک گئی۔

دونوں کے درمیان فاصلہ تھا... مگر وہ فاصلہ صرف جسمانی نہیں تھا۔

وہ فاصلہ اُن فیصلوں کا تھا جو وقت نے کیے تھے۔

رمشا خاموشی سے ایک طرف ہٹ گئی۔

اور ہسپتال کی اس لمبی راہداری میں ایک بار پھر وہی سوال زندہ ہو گیا

اب آگے کیا ہو گا؟

مومنہ نے اندر آتے ہی ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ اس کی نظریں سیدھا آپریشن تھیٹر کے دروازے پر جم گئیں، جیسے اس کے علاوہ دنیا میں کچھ باقی ہی نہ ہو۔

اس نے آہستہ سے رمشا کی طرف دیکھا اور دھیمے مگر واضح لہجے میں کہا:

"مجھے ارمان کو دیکھنا ہے"...

اس کی آواز میں ضد نہیں تھی، بس ایک ماں جیسی بے چینی تھی چاہے وہ رشتہ خون کا ہو یا دل کا۔

رمشا چند لمحے خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر حیرت بھی تھی اور الجھن بھی۔ وہ مومنہ کو دیکھ رہی تھی، جیسے اس کی آنکھوں میں سوال تلاش کر رہی ہو کہ وہ یہاں کیسے پہنچی، کس حال میں آئی، اور فلک شبیر سے کیسے نکلی...

مگر اس نے کچھ نہیں پوچھا۔

نہ ایک سوال۔

نہ ایک لفظ۔

بس ہلکا سا سر ہلایا۔

شاید وہ جانتی تھی کہ ابھی سوالوں کا وقت نہیں ہے۔

رمشا نے آگے بڑھ کر مومنا کا ہاتھ تھاما اور اسے آہستہ سے ساتھ لے گئی۔

دونوں جب ہسپتال کے اندرونی حصے کی طرف بڑھیں تو راہداری میں موجود ہر شخص کی نظریں ان پر ٹھہر گئیں۔

نرسیں ایک لمحے کو رک گئیں۔

ڈاکٹرز نے بھی نظر اٹھا کر دیکھا۔

مریضوں کے ساتھ بیٹھے لوگ بھی سرگوشیاں کرنے لگے۔

"یہ کون ہے؟"...

"اتنی خوبصورت لڑکی"...

"یہ یہاں کیوں آئی ہے؟"...

مومنہ اس سب سے بے نیاز تھی۔

اس کا چہرہ پر سکون تھا، مگر آنکھوں میں ایک طوفان چھپا ہوا تھا۔

لمبے سیاہ بال، سادہ سا لباس، اور وہ خاموشی جو ہر قدم کے ساتھ اور گہری ہوتی جا رہی تھی اسے ہسپتال کے اس سنسان ماحول میں ایک الگ ہی وجود دے رہی تھی۔

رمشا اسے ساتھ لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔

مگر مومنہ کا پورا دھیان صرف ایک ہی طرف تھا

آپریشن تھیٹر کے بند دروازے کی طرف۔

جہاں اندر ارمان زندگی کے لیے لڑ رہا تھا...

اور باہر، ایک کہانی پھر سے اپنے اگلے موڑ کے قریب پہنچ رہی تھی۔

مومنہ جیسے ہی اوپر آئی، ہسپتال کی فضا ایک لمحے کے لیے اور بھی بھاری ہو گئی۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اس جگہ پہنچی جہاں ایمان نور بیٹھی ہوئی تھی، ہاتھ اٹھائے ہوئے، آنکھوں میں وہی بے قرار دعا۔

ایمان نور نے جیسے ہی اسے دیکھا، چند لمحے ساکت رہ گئی۔ مومنہ کی موجودگی عام نہیں تھی اس کی خاموشی میں بھی ایک اثر تھا، اس کے چہرے میں بھی ایک کشش تھی، اور اس کی آنکھوں میں بھی ایک عجیب سی اداسی۔

مومنہ نے آہستہ سے آگے بڑھ کر ان کے قریب آکر کہا:

"میں ارمان کو دیکھنا چاہتی ہوں"...

اس کی آواز نرم تھی، مگر واضح۔

ایمان نور نے اسے غور سے دیکھا، جیسے اس کے الفاظ سے زیادہ اس کی حالت کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ پھر اچانک ان کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

وہ دھیرے سے بولیں:

"تم واقعی بہت خوبصورت ہو، بیٹا"...

یہ جملہ کسی تعریف کی طرح نہیں تھا، بلکہ ایک ماں کے دل سے نکلا ہوا اعتراف تھا جس میں حیرت بھی تھی، نرمی بھی، اور ایک انجانی سی تسلیم بھی۔

مومنہ چند لمحے خاموش کھڑی رہی۔

اس نے شاید ایسے الفاظ بہت کم سنے تھے... یا شاید کبھی ایسے وقت میں نہیں سنے تھے۔

اس کی نظریں ہلکی سی جھک گئیں، مگر چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

بس اتنا سا کہا:

"مجھے اندر لے چلیں"...

ایمان نور نے آہستہ سے سر ہلایا۔

رمشا ایک طرف کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی مومنہ کو دیکھ کر الجھن میں تھی، مگر کچھ بول نہیں سکی۔

مومنہ نے ایک نظر آپریشن تھیٹر کے بند دروازے کی طرف ڈالی۔

اور پھر آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگی،

جیسے ہر قدم اسے کسی فیصلے کے قریب لے جارہا ہو۔

سکندر نے بھی کوئی سوال نہ کیا۔ وہ بس خاموش کھڑا رہا، مگر اس کی آنکھوں میں حیرت واضح تھی۔ مومنا یہاں کیسے آگئی تھی یہ سوال اس کے ذہن میں بار بار گھوم رہا تھا، مگر اس نے الفاظ کو باہر نہیں آنے دیا۔

اس نے ایک نظر سب پر ڈالی، پھر دوبارہ آپریشن تھیٹر کے دروازے کی طرف دیکھنے لگا جہاں اندر آخری مرحلے مکمل ہو چکے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد دروازے کے اوپر لگی لائٹ بند ہو گئی۔

ایک لمحہ...

پھر دوسرا...

اور پھر دروازہ آہستہ سے کھلا۔

ایک نرس باہر آئی، ماسک اتارتے ہوئے اس کی آنکھوں میں تھکن تھی مگر ساتھ ہی ایک ہلکی سی اطمینان کی جھلک بھی۔

"آپریشن کامیاب ہو گیا ہے..." اس نے مختصر سا کہا۔

یہ سنتے ہی فضا میں جیسے سانسیں واپس آ گئیں۔

نعمان نے فوراً سر اٹھایا، رحمان شیخ کی آنکھیں بند ہو گئیں جیسے وہ اس خبر کو دل سے محسوس کر رہے ہوں، ایمان نور کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے، اور رمشا نے سکندر کی طرف دیکھا وہ اب بھی وہیں کھڑا تھا، مگر اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی راحت آچکی تھی۔

مگر ابھی ایک بات باقی تھی۔

"مریض ابھی ہوش میں نہیں آیا... اسے observation میں رکھا جائے گا..." نرس نے آگے کہا۔

یہ سنتے ہی خوشی کے ساتھ ایک نیا انتظار بھی شروع ہو گیا۔

سب کی نظریں دوبارہ ایک ہی سمت میں جم گئیں

اس بیڈ کی طرف جہاں ارمان اب بھی زندگی اور بے ہوشی کے درمیان کسی خاموش جنگ میں تھا۔

اور ہسپتال کی راہداری میں وہی خاموشی واپس آگئی...

مگر اب اس خاموشی میں امید زیادہ تھی۔

نرس کی آواز جیسے ہی ہال میں گونجی، سب کے چہروں پر ایک ہلکی سی حرکت آ گئی۔

"اب آپ لوگ اس سے مل سکتے ہیں"...

یہ جملہ تھا، مگر اس کے پیچھے گھنٹوں کا انتظار، دعا، خوف اور امید سب سمٹ آئے تھے۔

رحمان شیخ چند لمحے خاموش کھڑے رہے۔ پھر آہستہ سے مومنا کی طرف دیکھ کر بولے:

"جاؤ بیٹا... مومنہ، تم ملو ارمان سے"...

یہ الفاظ سادہ تھے، مگر ان کے اندر ایک باپ کی اجازت بھی تھی، اور ایک انجانی سی قبولیت بھی۔

مومنہ نے ایک لمحہ ان کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر نہ خوشی تھی نہ گھبراہٹ بس ایک سنجیدگی تھی، جیسے وہ کسی اہم موڑ کے قریب کھڑی ہو۔

اس نے ہلکا سا سر جھکایا۔

"ٹھیک ہے"...

رمشا نے آگے بڑھ کر اسے ساتھ لیا اور آہستہ سے وارڈ کے اندر لے جانے لگی۔

سکندر وہیں کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ نہ روکا، نہ پوچھا۔ بس خاموشی سے اس منظر کو اپنی آنکھوں میں اتارتا رہا۔

رحمان شیخ نے ایک گہرا سانس لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

ایمان نور نے دعا میں ہاتھ اور بلند کر دیے۔

اور نعمان چند قدم پیچھے کھڑا، اس لمحے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جو ابھی ابھی اس کی زندگی میں اترا تھا۔

مومنہ آہستہ آہستہ اندر داخل ہوئی...

اور دروازہ اس کے پیچھے بند ہو گیا۔

باہر سب وہیں رک گئے۔

اور اندر، ارمان پہلی بار خاموش زندگی کے قریب تھا۔

مومنہ آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی اس بیڈ کے قریب پہنچی جہاں ارمان بے ہوشی میں پڑا تھا۔ مشینوں کی مسلسل بیپ اس کمرے میں گونج رہی تھی، اور ہر آواز کے ساتھ اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ چند لمحے کھڑی رہی... جیسے خود کو سنبھال رہی ہو۔ پھر آہستہ سے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

وہ پورے تین سال بعد اس کے سامنے آئی تھی اور اس کی ایسی حالت دیکھ کر گھبرا رہی تھی

اس کی بھوری آنکھیں ارمان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ماسک، ٹیوبیں، اور مشینیں یہ سب دیکھ کر اس کے اندر کچھ ٹوٹنے لگا۔ اس نے پہلی بار اسے اس حالت میں دیکھا تھا، اور یہ منظر اس کے دل پر بہت بھاری تھا۔

اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ ایک آنسو اس کی آنکھ سے نکل کر گال پر بہہ گیا، پھر دوسرا۔

وہ جھکی، اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی:

"کیوں کرتے ہو مجھ سے اتنی محبت...؟"

اس کی آواز کمرے کی خاموشی میں بہت ہلکی تھی، مگر دل تک جا رہی تھی۔

"یہ محبت... تم کیوں کرتے ہو؟ میں تو اس کے قابل بھی نہیں ہوں"...

اس نے آہستہ سے ہاتھ بیڈ کے کنارے پر رکھا، مگر چھوا نہیں، جیسے ڈر رہی ہو کہ کہیں حقیقت ٹوٹ نہ جائے۔

"اپنی ماں کا خیال... اپنے بھائی کا... سب چھوڑ دیا تم نے"...

اس کی آواز ٹوٹنے لگی۔

"تمہیں کیا ملے گا یہ سب کر کے؟"...

وہ ایک لمحے کو رکی، سانس گہری لی، اور پھر جیسے اندر کا درد لفظوں میں بہہ نکلا:

"کیوں سزا دے رہے ہو سب کو؟... اور خود کو بھی"...

کمرہ خاموش تھا، صرف مشینوں کی آواز تھی۔

مومنہ کی آنکھوں سے آنسو مسلسل گر رہے تھے، اور اس کی نظریں اب بھی ارمان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جیسے وہ جواب کا انتظار کر رہی ہو، حالانکہ اسے معلوم تھا کہ جواب ابھی واپس نہیں آنے والا۔

سات سال پہلے آرمان کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر رحمان شیخ کو شک ہونے لگا تھا کہ معاملہ صرف جوانی کی ضد نہیں، کچھ اور ہے۔ ایک دن انہوں نے ایمان نور کو سخت لہجے میں بلایا اور پوچھا،

"یہ آرمان کے مزاج میں تبدیلی کیوں آرہی ہے؟ بات کیا ہے؟"

ہچکچاتے ہوئے ایمان نور نے مومنہ کا ذکر کر دیا۔

نام سنتے ہی رحمان شیخ کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔

پھر ایک دن انہوں نے آرمان کو اپنے کمرے میں بلایا۔ آواز میں باپ کی شفقت نہیں، حکم تھا۔

"آج کے بعد اُس لڑکی سے دور رہو۔"

آرمان نے پہلی بار نظریں اٹھا کر کہا،

"میں اُس سے محبت کرتا ہوں... میں اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ سنتے ہی رحمان شیخ کا غرور بھڑک اٹھا۔ وہ غصے سے کھڑے ہو گئے۔

"شادی؟ تم؟ اُس لڑکی سے؟"

ان کی آواز گونجی،

"اپنی اوقات دیکھی ہے؟ تم رحمان شیخ کے بیٹے ہو... کسی کے در پر محبت کی بھیک مانگنے والے نہیں"!

آرمان نے ہمت کر کے کہا،

"بابا، میں سنجیدہ ہوں"--

"خاموش!" رحمان شیخ نے ڈانٹ کر بات کاٹ دی۔

"جس لڑکی نے تمہیں پسند تک نہیں کیا، اُس کے لیے میرے سامنے زبان چلاتے ہو؟ شیخوں کے بیٹے ٹھکرائے نہیں جاتے... ٹھکراتے ہیں"!

آرمان کے لہجے میں ضد ابھری،

"میں مومنہ کے بغیر شادی نہیں کروں گا۔"

رحمان شیخ کی آنکھوں میں انا جلنے لگی۔

"تو سن لو، جب تک میں زندہ ہوں، وہ لڑکی اس گھر کی بہو نہیں بنے گی۔ محبت، عشق... یہ غریبوں کے شوق ہوتے ہیں۔ ہمارے فیصلے دل نہیں، خاندان کی عزت کرتی ہے۔"

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

اور اُس دن پہلی بار آرمان نے اپنے باپ کو صرف باپ نہیں... ایک غرور سے بھرا حاکم دیکھا۔

رحمان شیخ کے الفاظ ابھی فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ آرمان کا ضبط ٹوٹ گیا۔

"بابا!" اس کی آواز کانپ اٹھی۔

اگلے ہی لمحے اُس نے آگے بڑھ کر رحمان شیخ کا گریبان پکڑ لیا۔

کمرے کی فضا جیسے منجمد ہو گئ۔

رحمان شیخ نے حیرت اور غصے سے بیٹے کو دیکھا۔

"تمہاری یہ جرات؟ میرے گریبان پر ہاتھ؟"

آرمان کی آنکھیں سرخ تھیں۔

"آپ میری محبت کی توہین نہیں کر سکتے! آپ ہر چیز کو انا اور حیثیت سے کیوں تولتے ہیں؟"

رحمان شیخ نے اُس کا ہاتھ جھٹک کر دور کیا۔

"بد تمیز! باپ سے زبان لڑاتے ہو؟ ایک لڑکی کے لیے؟"

آرمان بھی پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا۔

"ہاں! اُس کے لیے... کیونکہ وہ میرا سب کچھ ہے"!

"وہ تمہیں چاہتی بھی نہیں!" رحمان شیخ گرجے،

"تم ایک ایسی لڑکی کے پیچھے اپنی عزت خاک میں ملا رہے ہو"!

"عزت محبت روندنے سے نہیں بچتی بابا"!

بات بحث سے جھگڑے میں بدل گئی۔

آوازیں بلند ہونے لگیں۔

"میں یہ رشتہ کبھی نہیں ہونے دوں گا"!

"اور میں مومنہ کے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گا"!

رحمان شیخ نے غصے میں ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اچانک درمیان میں ایمان نور آ گئیں۔

"بس!" ان کی چیخ نے دونوں کو روک دیا۔

وہ آرمان کے سامنے ڈھال بن کر کھڑی ہو گئیں۔

"باپ بیٹے ایک لڑکی کے نام پر دشمن بن رہے ہو؟ شرم کرو"!

آرمان کچھ بولنے لگا مگر ایمان نور نے تیز لہجے میں ٹوک دیا،

"ایک لفظ نہیں آرمان"!

پھر رحمان شیخ کی طرف مڑیں۔

"آپ بھی ضد چھوڑ دیں۔ محبت کو جنگ بنا دیں گے تو گھر جل جائے گا۔"

کمرے میں سانسوں کی آوازیں رہ گئی تھیں۔

آرمان مٹھی بھینچے کھڑا تھا، رحمان شیخ غصے سے کانپ رہے تھے...

اور درمیان میں ایمان نور ایک ٹوٹتے ہوئے گھر کو تھامے کھڑی تھیں۔

اُس جھگڑے کے بعد بہت کچھ بدل گیا تھا۔

اب ارمان نے رحمان شیخ کو کو "بابا" کہنا چھوڑ دیا تھا وہ انہیں نام لے کر یا خاموشی سے مخاطب کرتا، جیسے رشتے میں کوئی دراڑ مستقل ہو چکی ہو۔

مگر ایک بات وہ بار بار کہتا۔

"مومنہ کے گھر رشتہ لے کر جائیں"...

یہ اُس کی ضد بھی تھی، التجا بھی۔

مگر ہر بار رحمان شیخ کی انا جواب بن کر سامنے آتی۔

وہ حقارت سے کہتے،

"کس چیز کا رشتہ لے کر جاؤں؟ اُس لڑکی کے گھر... جو تمہیں پسند ہی نہیں کرتی؟"

آرمان کے جبڑے بھنچ جاتے۔

"پسند نہ سہی، نکاح کے بعد محبت ہو سکتی ہے۔۔۔"

رحمان شیخ طنزیہ ہنس پڑتے۔

"شیخوں کے بیٹے دروازوں پر جا کر انکار سننے نہیں جاتے۔ ہم رشتے مانگتے نہیں... چنے جاتے ہیں۔"

آرمان غصے میں کہتا،

"یہ غرور ایک دن آپ کو تنہا کر دے گا۔"

رحمان شیخ پلٹ کر گرجتے،

"اور تمہارا عشق تمہیں رسوا کرے گا"!

پھر کئی بار ایسا ہوا...

آرمان رات گئے ان کے کمرے میں جاتا، ایک ہی بات دہراتا،

"بس ایک بار مومنہ کے گھر چلیں"...

اور ہر بار جواب وہی ہوتا،

"جس لڑکی نے تمہیں چاہا ہی نہیں، اُس کے گھر میرا سر جھکانے کی امید مت رکھو۔"

یہ بات آرمان کے دل میں زہر بن کر اترتی رہی۔

ایک دن غصے سے اس نے کہا،

"آپ رشتہ نہیں لے جائیں گے... کیونکہ مسئلہ مومنہ نہیں، آپ کی انا ہے"!

رحمان شیخ کی آنکھوں میں آگ اتر آئی۔

"ہاں! اگر اسے انا کہتے ہو تو ہاں مجھے منظور نہیں کہ میرا بیٹا کسی ایسی لڑکی کے پیچھے ذلیل ہو جو اُسے چاہتی تک نہیں"!

اور اُس دن آرمان نے سرد لہجے میں کہا،

"پھر یاد رکھیے... آپ میری محبت کے راستے میں باپ نہیں، دیوار بن رہے ہیں۔"

مگر سات سال بعد جب رحمان شیخ نے اسپتال میں آرمان کے بستر کے پاس مومنہ کو بیٹھے دیکھا تو سب کچھ جیسے ایک لمحے میں بدل گیا۔

آرمان کمزور حالت میں بستر پر پڑا تھا۔ چہرے پر تھکن اور خاموشی تھی، مگر آنکھوں میں ایک عجیب سا سکون تھا، جیسے کسی اپنی موجودگی نے اس کی تکلیف کو ہلکا کر دیا ہو۔

مومنہ اس کے قریب بیٹھی تھی۔ نہ کوئی شور، نہ کوئی ڈرامہ... بس ایک خاموش موجودگی، جو الفاظ کے بغیر بھی سب کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ بار بار آرمان کی حالت دیکھ رہی تھی، اور اس کی خاموش فکر ہر حرکت سے جھلک رہی تھی۔

رحمان شیخ دروازے کے قریب کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

وہ وہی سخت مزاج، انا پرست انسان نہیں لگ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں پہلی بار ٹھہر گئی تھیں... مومنہ پر، پھر آرمان پر۔

پہلی بار انہیں محسوس ہوا کہ آرمان نے جس لڑکی کے لیے اتنی بڑی ضد کی تھی، وہ صرف خوبصورتی یا پسند کا معاملہ نہیں تھا۔

یہ لڑکی شور نہیں کرتی تھی، دعوے نہیں کرتی تھی، مگر موجودگی سے پورا کمرہ سنبھال لیتی تھی۔

رحمان شیخ کے ذہن میں برسوں پرانی باتیں گونجنے لگیں انکار، ضد، لڑائی، اور ان کا وہ جملہ کہ "وہ تمہیں پسند نہیں کرتی"...

مگر اب وہی لڑکی آرمان کے پاس خاموش بیٹھی تھی، اور اس کی خاموشی میں ایک واضح تعلق تھا۔

انہیں پہلی بار سمجھ آیا کہ آرمان کیوں اتنا ڈٹا رہا تھا... کیونکہ وہ محبت شور نہیں تھی، وہ ایک یقین تھا۔

اور اسی لمحے رحمان شیخ کی سوچ پہلی بار ٹوٹ کر حقیقت کے سامنے جھک گئی۔

مومنہ کی آواز اب پہلے سے زیادہ ٹوٹ چکی تھی، مگر اس میں ایک تلخ سچائی بھی تھی جو وہ خود سے بھی چھپانے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ وہ ارمان

کے قریب جھکی ہوئی تھی، اس کی آنکھوں میں آنسو مسلسل بہہ رہے تھے، اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔

وہ آہستہ سے بولی، جیسے ہر لفظ دل پر بوجھ بن کر گر رہا ہو:

"ہمارا رشتہ ختم ہوئے سات سال ہو گئے ہیں ارمان… سب لوگ اپنی زندگی میں آگے بڑھ گئے ہیں"…

وہ لمحہ بھر رکی، پھر اس کی آواز مزید بھاری ہو گئی۔

"لیکن تم… تم وہیں کیوں اٹکے ہو؟"

اس نے آہستہ سے سر جھکا لیا، جیسے خود اپنے سوال سے ڈر گئی ہو۔

"کیا تھا ان تیس دنوں میں…؟"

اس کی آواز اب ٹوٹنے لگی۔

"کیا تھا ایسا… جو تم اتنے سالوں میں بھی نہیں بھلا پا رہے؟"

کمرے میں صرف مشینوں کی بیپ سنائی دے رہی تھی۔

مومنہ نے ارمان کے چہرے کو دیکھا وہی خاموشی، وہی بے حسی، مگر اس کے لیے وہ خاموشی بھی سوال بن چکی تھی۔

وہ آہستہ سے بولی:

"کیا تم نے کبھی سوچا ہے... کہ جو تم نے پکڑ رکھا ہے، وہ شاید یاد نہیں... زنجیر ہے؟"

ایک آنسو اس کے ہاتھ پر گرا۔

"اور تم... خود کو ہی قید کیے بیٹھے ہو"...

وہ رکی، پھر بہت آہستہ، جیسے آخری بات کہہ رہی ہو:

"ارمان... واپس آ جاؤ"...

کمرے میں سناٹا اور گہرا ہو گیا۔

اور باہر، ہسپتال کی راہداری میں سب کی زندگیاں اب بھی اسی ایک کمرے کے فیصلے کا انتظار کر رہی تھیں۔

مومنا کی آواز آہستہ آہستہ ٹوٹ گئی۔ اس کی باتیں جیسے دل کے اندر دبے ہوئے برسوں کے درد کو باہر لا رہی تھیں، اور اب وہ خود بھی اس بوجھ کو سہہ نہیں پا رہی تھی۔

وہ ارمان کے قریب جھکی... اور اس کے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔

اس نے اپنا چہرہ ہاتھ سے چھپانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہی۔ اس کے کندھے ہلکے ہلکے کانپ رہے تھے۔

کمرے میں صرف مشینوں کی بیپ سنائی دے رہی تھی... جیسے وقت بھی رک گیا ہو۔

مومنہ نے آنسو بھری آنکھوں سے ارمان کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر وہی خاموشی تھی، وہی بے خبری... مگر مومنہ کے لیے وہ خاموشی اب صرف خاموشی نہیں رہی تھی، وہ ایک سوال تھی، ایک درد تھا۔

وہ آہستہ سے آگے بڑھی...

اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے اس نے ارمان کے ماتھے کو چھوا۔

پھر جھک کر بہت نرمی سے اس کا ماتھا چوم لیا۔

اس لمحے اس کے آنسو اس کے گالوں سے ہوتے ہوئے ارمان کے ہاتھ کے قریب گرنے لگے۔

اس کی آواز میں نہ شکایت تھی، نہ غصہ... بس ایک ٹوٹا ہوا سا پیار تھا، جو کہیں بہت دیر سے جمع ہو رہا تھا۔

کمرے کی فضا مزید بھاری ہو گئی۔

اور باہر کھڑے لوگ نہیں جانتے تھے کہ اندر یہ لمحہ کس کہانی کو بدل رہا ہے... یا شاید مکمل کر رہا ہے۔

مومنہ ارمان کے قریب بیٹھی رہی، اس کی آنکھوں سے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔ اس کا ہاتھ ابھی بھی ارمان کے ہاتھ کے قریب تھا، مگر اب اس میں وہ ہمت نہیں تھی کہ وہ دوبارہ اسے چھو سکے۔

اس کی آواز ٹوٹے ہوئے لفظوں میں نکلی، جیسے ہر جملہ دل سے زبردستی باہر آ رہا ہو:

"مجھے معاف کر دو ارمان"...

وہ رکی، سانس گہری لی، مگر آنکھوں سے آنسو اور تیز ہو گئے۔

"مجھے نہیں پتہ تھا... بات یہاں تک آ جائے گی"...

اس نے آہستہ سے سر جھکا لیا۔

"مجھے نہیں پتہ تھا تم اس حد تک"...

اس کی آواز بالکل مدھم ہو گئی، جیسے الفاظ ختم ہو رہے ہوں۔

"میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ تم"...

وہ جملہ مکمل نہ کر سکی۔ گلا بند ہو گیا۔

کمرے میں صرف مشینوں کی بیپ سنائی دے رہی تھی بیپ...بیپ... بیپ...

مومنہ نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیے، جیسے خود کو سنبھالنے کی آخری کوشش کر رہی ہو۔

پھر آہستہ سے، ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی:

"اگر میں وقت واپس کر سکتی... تو شاید سب کچھ مختلف ہوتا"...

وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر بہت آہستہ سر اٹھایا۔

اس کی بھوری آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔

وہ ارمان کو دیکھ کر بس اتنا ہی کہہ سکی:

"مجھے معاف کر دو"...

اور پھر خاموشی چھا گئی

ایسی خاموشی جس میں صرف دل کی دھڑکنیں سنائی دے رہی تھیں... اور ایک معلق سا سوال فضا میں رہ گیا تھا۔

مومنہ ارمان کے پاس بیٹھی تھی، سر جھکائے، آنکھوں سے آنسو مسلسل گر رہے تھے۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، اور اس کی پوری کیفیت ایک ٹوٹے ہوئے دل کی کہانی سنا رہی تھی۔

رمشا چند لمحے وہیں ساکت کھڑی رہی۔

اس نے شاید مومنا کو پہلے کبھی اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔

اس کی آنکھوں میں حیرت تھی... اور پھر آہستہ آہستہ وہ حیرت درد میں بدلنے لگی۔

رمشا کے گلے میں ایک گانٹھ سی بن گئی۔ اس نے ہونٹ کاٹے، مگر آنسو روک نہ سکی۔

اس کی آنکھوں سے خاموشی سے آنسو بہنے لگے۔

وہ آہستہ سے آگے بڑھی اور دیوار کے قریب رک گئی، جیسے اس منظر کو ٹوٹنے سے بچانا چاہتی ہو۔

مومنہ کی حالت، اس کا رونا، اور ارمان کی بے حسی یہ سب مل کر رمشا کے دل پر بہت بھاری ہو رہا تھا۔

اس نے کانپتی ہوئی آواز میں، بس دل ہی دل میں کہا:

"یہ سب... اتنا دور کیوں چلا گیا؟"

اس نے نظریں جھکا لیں، مگر آنسو پھر بھی بہتے رہے۔

کمرے میں تین لوگوں کی خاموشی تھی

ایک بے ہوش ارمان...

ایک ٹوٹتی ہوئی مومنہ...

اور ایک خاموشی سے روتی رمشا...

اور اس خاموشی میں جیسے سب کی کہانیاں ایک دوسرے میں گھل رہی تھیں۔

مومنہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھنے لگی۔ اس کے دل میں ایک عجیب سی بے چینی تھی، جیسے وہ وہاں ایک لمحہ بھی مزید ٹھہر نہیں سکتی تھی۔ آنکھوں میں ابھی بھی نمی تھی، اور سانسیں بے ترتیب سی تھیں۔ اس نے ایک بار ارمان کی طرف دیکھا، پھر نگاہیں جھکا کر پیچھے ہٹنے لگی۔

قدم آہستہ تھے، مگر ارادہ مضبوط... یا شاید وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

وہ ایک قدم پیچھے ہوئی، پھر دوسرا...

اور اسی لمحے کمرے کی خاموشی میں ایک کمزور سی آواز گونجی۔

"کِدھر جا رہی ہیں... مومنہ جی"...

مومنہ جیسے ساکت ہو گئی۔

اس کے قدم وہیں رک گئے۔

اس نے آہستہ سے پلٹ کر دیکھا۔

ارمان...

اس کی آنکھیں آدھی کھلی تھیں، چہرہ اب بھی کمزور تھا، مگر اس کی نظر زندہ تھی۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

اور پھر...

اس کا ہاتھ ہلکا سا آگے بڑھا۔

اس نے مومنہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ گرفت مضبوط نہیں تھی، مگر اس میں ایک ایسی بے بسی اور ایک ایسی ضد تھی جو صرف زندگی کے کنارے پر کھڑے انسان میں ہوتی ہے۔

"کِدھر جا رہی ہیں... مومنہ جی..." ارمان نے دوبارہ کہا۔

اس کی آواز ٹوٹی ہوئی تھی، جیسے ہر لفظ نکالنے میں اسے پوری طاقت لگ رہی ہو۔

مومنہ کی سانس رک گئی۔

اس کی آنکھیں پھیل گئیں، اور وہ وہیں جم کر کھڑی رہ گئی۔

"ارمان..." اس کے ہونٹ کانپے۔

ارمان نے مشکل سے سانس لیا، اور پھر دھیرے سے بولا:

"مت... جاؤ"...

مومنہ کے ہاتھ میں اب بھی اس کی انگلیوں کی کمزور گرفت موجود تھی۔

وہ نہ آگے بڑھ سکی، نہ پیچھے ہٹ سکی۔

بس وہیں کھڑی رہ گئی، جیسے وقت نے اسے بھی اس لمحے میں روک لیا ہو۔

کمرے میں مشینوں کی بیپ اب بھی چل رہی تھی...

مگر اب وہ بیپ صرف زندگی کی نہیں تھی

وہ ایک ادھوری کہانی کے دوبارہ جڑنے کی آواز بن چکی تھی۔

رمشا ایک لمحہ بھی وہاں نہیں رکی۔ جیسے ہی اس نے دیکھا کہ ارمان کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند کھل رہی ہیں اور مومنہ وہیں ساکت کھڑی ہے، وہ فوراً پیچھے مڑی اور تیزی سے دروازے کی طرف بھاگی۔

اس کے قدم ہسپتال کی ٹھنڈی راہداری میں گونج رہے تھے، اور اس کے دل کی دھڑکن اس سے بھی زیادہ تیز تھی۔ وہ بھاگتے ہوئے بس ایک ہی بات دہرا رہی تھی،

"ارمان... ارمان کو ہوش آگیا ہے"...

دروازہ زور سے کھل کر باہر آیا تو باہر کھڑے سب لوگ ایک لمحے کو ساکت ہو گئے۔

سکندر فوراً آگے بڑھا۔

"کیا ہوا؟"

رمشا ہانپ رہی تھی، آنکھوں میں آنسو تھے مگر چہرے پر ایک ناقابلِ یقین سی خوشی۔

"ارمان... اسے ہوش آگیا ہے"!

یہ سنتے ہی جیسے پورا ماحول بدل گیا۔

رحمان شیخ کی آنکھیں بھر آئیں، نعمان ایک لمحے کو بے یقین کھڑا رہا، ایمان نور نے ہاتھ منہ پر رکھ لیا، اور سکندر چند لمحے خاموش کھڑا رہ گیا پھر اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

"الحمدللہ..." وہ آہستہ سے بولا۔

رمشا نے ہانپتے ہوئے دوبارہ کہا:

"وہ مومنہ کو دیکھ رہا ہے... اس نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا ہے"...

یہ سن کر سب کے چہرے پر ایک نیا سکون اتر آیا... مگر ساتھ ہی ایک نئی بے چینی بھی جاگ اٹھی،

کیونکہ یہ صرف ہوش میں آنا نہیں تھا...

یہ کسی پرانی کہانی کا دوبارہ زندہ ہو جانا تھا۔

جیسے ہی رمشا کی آواز ہسپتال کی راہداری میں گونجی کہ ارمان کو ہوش آگیا ہے، باہر کھڑا پورا ماحول ایک دم بدل گیا۔ وہی لوگ جو چند لمحے پہلے تک

دعا، خوف اور انتظار کے درمیان جھول رہے تھے، اب ایک عجیب سی بے قابو خوشی اور بے یقینی میں ڈوب گئے۔ دروازے کی طرف ایک ہلچل سی مچ گئی، مگر اس ہلچل میں بھی احتیاط تھی، جیسے سب ڈر رہے ہوں کہ کہیں یہ خبر صرف ایک لمحاتی دھوکہ نہ نکلے۔

دروازہ کھلا تو سب ایک ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ کمرے کی فضا اب بھی وہی تھی مشینوں کی بیپ، مدھم روشنی، اور وہ مخصوص ہسپتال والی خاموشی مگر اس سب کے بیچ اب ایک نئی زندگی کی جھلک واضح تھی۔

ایمان نور سب سے آگے تھیں۔ ان کے چہرے پر آنسو مسلسل بہہ رہے تھے، مگر ان آنسوؤں میں اب درد نہیں تھا، بلکہ ایک گہرا سکون تھا۔ وہ سیدھا ارمان کے پاس آئیں، اور بغیر کچھ کہے آہستہ سے جھک کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ وہ لمحہ کسی لفظ کا محتاج نہیں تھا۔ اس ایک لمس میں برسوں کی دعا، راتوں کی بے چینی، اور ایک ماں کی بے قرار محبت سمٹ آئی تھی۔ انہوں نے کانپتی ہوئی آواز میں بس اتنا کہا:

"شکر ہے"...

نعمان بھی پیچھے نہیں رہا۔ وہ فوراً آگے بڑھا مگر اس کے قدم اب بھی کسی حد تک غیر یقینی تھے۔ جیسے وہ خود کو اس حقیقت کے مطابق ڈھال رہا ہو کہ اس کا بھائی واقعی واپس آ چکا ہے۔ وہ ارمان کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں، اور ہونٹ کچھ بولنے کی کوشش میں کانپ رہے تھے، مگر لفظ ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

"ارمان..." وہ آخر کار بس اتنا ہی کہہ سکا، اور پھر خاموش ہو گیا۔

ارمان ابھی بھی مکمل طور پر کمزور تھا، اس کا جسم تھکن اور مشینوں کے اثر میں تھا، مگر اس کی آنکھیں اب کھلی ہوئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ سب کو دیکھ رہا تھا ایمان نور، نعمان، رمشا، اور باقی چہرے جو اس کے گرد جمع تھے۔ ہر چہرہ اسے کسی نہ کسی پرانی یاد سے جوڑ رہا تھا، جیسے وہ وقت کے کسی ٹوٹے ہوئے حصے سے واپس آیا ہو۔

اسی لمحے رحمان شیخ باہر ہی کھڑے تھے۔ ان کے قدم اندر جانے سے ہچکچا رہے تھے۔ وہ دروازے کے فریم کے پاس ساکت کھڑے تھے، جیسے اندر جانے کی ہمت اور اپنے ہی ماضی کا سامنا کرنے کی طاقت ایک دوسرے سے

لڑ رہی ہوں۔ ان کی آنکھوں میں وہی بوجھ تھا جو سالوں کی غلطیوں نے چھوڑا تھا۔

سکندر نے ان کے کندھے کے قریب آ کر آہستہ سے کہا، اس کی آواز نرم مگر پختہ تھی:

"انکل... جایئے اندر۔ آپ کا بیٹا آپ کا انتظار کر رہا ہے"...

یہ جملہ جیسے ان کے اندر کسی بند دروازے کو ہلکا سا جھٹکا دے گیا۔ رحمان شیخ نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں، گہری سانس لی، اور پھر آہستہ آہستہ قدم آگے بڑھائے۔

ہر قدم بھاری تھا، جیسے زمین نہیں بلکہ ان کا اپنا ضمیر انہیں روک رہا ہو۔ مگر اس بار وہ رک نہیں رہے تھے۔ وہ اندر داخل ہوئے۔

جیسے ہی وہ کمرے میں آئے، ارمان کی نظر ان پر پڑی۔

اس لمحے کمرے کی ساری آوازیں جیسے دھندلا گئیں۔ مشینوں کی بیپ، لوگوں کی سانسیں، سب کچھ پیچھے رہ گیا۔

باپ اور بیٹے کے درمیان فاصلہ وہی تھا جو سالوں کی خاموشیوں نے بنایا تھا...

مگر اس لمحے میں وہ فاصلہ پہلی بار ٹوٹنے کے قریب تھا۔

رحمان شیخ ایک قدم آگے بڑھے، پھر رک گئے۔ ان کے ہونٹ کھلنے کی کوشش کرنے لگے، مگر آواز نہ نکل سکی۔

ارمان نے انہیں دیکھا... اور اس کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی پہچان، ایک کمزور سا سوال اور ایک ادھوری سی امید ایک ساتھ تیرنے لگی۔

کمرے میں موجود ہر شخص خاموش تھا۔

کیونکہ سب سمجھ گئے تھے

یہ صرف ایک ملاقات نہیں تھی...

یہ ایک پوری کہانی کے بکھرے ہوئے حصوں کا دوبارہ ایک جگہ آجانا تھا۔

اسی لمحے کمرے کا دروازہ ایک بار پھر کھلا اور نرس تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر وہی پروفیشنل سنجیدگی تھی، مگر آنکھوں میں ہلکی سی اطمینان کی جھلک بھی تھی۔

اس نے فوراً بیڈ کے قریب آکر ارمان کی طرف دیکھا۔ مشینوں کی بیپ پر ایک نظر ڈالی، پھر اس کی کلائی پکڑ کر نبض چیک کی، آنکھوں کی حرکت دیکھی اور آہستہ سے سر ہلایا۔

"الحمدللہ... وٹلز نارمل ہیں"...

اس کی آواز سنتے ہی کمرے میں جیسے ایک اور سکون اتر آیا۔

نرس نے مزید کچھ آلات پر نظر ڈالی، پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

"اب یہ ہوش میں ہیں اور آہستہ آہستہ ریکور کر رہے ہیں... لیکن زیادہ باتیں یا زور نہیں دینا، ابھی کمزوری ہے"

یہ کہتے ہوئے وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

مگر ارمان اب مکمل طور پر ہوش میں آچکا تھا۔

اس کی نظریں ایک ایک چہرے پر جا رہی تھیں — ایمان نور، نعمان، رحمان شیخ، سکندر، رمشا... اور پھر آخر میں وہ مومنا پر ٹھہر گئیں جو ابھی بھی بیڈ کے قریب کھڑی تھی۔

اس کے ہونٹ ہلکے سے ہلے۔

"سب... یہاں ہیں"...

اس کی آواز کمزور تھی مگر واضح تھی۔

نعمان فوراً آگے جھکا:

"ہاں ارمان... ہم سب یہیں ہیں"

ایمان نور نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا:

"تم ٹھیک ہو بیٹا... بس آرام کرو"

ارمان نے ہلکی سی سانس لی، جیسے وہ اس حقیقت کو محسوس کر رہا ہو کہ وہ واقعی واپس آچکا ہے۔

مگر اس کی نظر بار بار ایک ہی جگہ جارہی تھی— مومنا کی طرف۔

وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا، مگر الفاظ ابھی بھی کمزور تھے۔

کمرے میں ایک عجیب سا سکون تھا...

وہ سکون جو طوفان کے بعد آتا ہے، مگر اپنے ساتھ کئی نئے سوال بھی چھوڑ جاتا ہے۔

کمرے میں ایک لمحے کے لیے خاموشی چھاگئی۔ مشینوں کی بیپ اب بھی چل رہی تھی، مگر جیسے اس لمحے سب کی توجہ صرف انہی دو لوگوں پر آکر ٹھہر گئی ہو۔

ارمان نے کمزور سی سانس لی، اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی حیرت تھی، اور آنکھوں میں وہی پرانی چمک جو برسوں بعد بھی کہیں نہ کہیں زندہ رہ گئی تھی۔

"مومنہ جی... آپ کی تو شادی ہو گئی تھی نا؟" اس نے آہستہ سے کہا، آواز میں سوال بھی تھا اور ایک انجانی سی بے چینی بھی۔

مومنہ چند لمحے خاموش رہی۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں نیچے کیں، جیسے کسی پرانے بوجھ کو لفظوں میں بدل رہی ہو۔

"میں اسے چھوڑ آئی ہوں..." اس کی آواز صاف تھی، مگر بھری ہوئی۔

"میں اس سے خلع لوں گی... میں اس گندے انسان کے ساتھ نہیں رہ سکتی"...

کمرے میں موجود سب لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، مگر کوئی کچھ نہ بولا۔ یہ لمحہ ذاتی تھا... بہت ذاتی۔

ارمان نے اس کی طرف دیکھا، جیسے ہر لفظ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

ارمان نے تھوڑا سا جھک کر اس کی طرف دیکھا، اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا:

"پھر اب کیا ہو سکتا ہے؟"

وہ رکی، پھر جیسے جواب دیتی ہو، اس نے آہستہ سے کہا:

"آپ بتائیں نا"...

ارمان نے آنکھیں جھپکائیں۔ وہ ابھی بھی کمزور تھا، مگر اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی شرارت اور بے بسی ساتھ ساتھ آ گئی۔

مومنہ نے ایک اور قدم قریب آ کر، بالکل سادہ لہجے میں کہا:

"شادی کرو گے مجھ سے؟"

یہ جملہ سنتے ہی کمرے کی فضا بدل گئی۔

نعمان نے آنکھیں بڑی کر لیں، رمشا کے ہونٹوں پر ہاتھ آ گیا، ایمان نور کی آنکھوں میں آنسو اور مسکراہٹ ایک ساتھ آ گئے، اور رحمان شیخ ایک لمحے کو ساکت رہ گئے۔

ارمان نے کچھ لمحے اسے دیکھا، پھر آہستہ سے کہا، جیسے ہر لفظ سوچ کر بول رہا ہو:

"جھوٹا ہرگز نہیں کھاؤں گا"...

مومنہ کی آنکھوں میں ہلکی سی حیرت آئی، پھر فوراً اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

وہ فوراً بولی:

"وہ میں لازمی کھلاؤں گی"...

اور اس لمحے کمرے میں پہلی بار ایک ہلکی سی ہنسی گونجی

مشینوں کی بیپ کے بیچ... ایک نئی شروعات کی طرح۔

رحمان شیخ چند لمحے وہیں کھڑے رہے۔ کمرے کی فضا ابھی بھی اس ہلکی سی ہنسی کے بعد نرم تھی، مگر ان کے اندر کا بوجھ اب بھی اپنی جگہ موجود تھا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ ہر قدم جیسے ماضی کی طرف جا رہا تھا وہ ماضی جس میں فیصلے غلط بھی تھے اور خاموشیاں بھی بہت لمبی۔

ارمان کی طرف دیکھتے ہوئے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ آواز نکالنے سے پہلے ہی گلا بھاری ہو چکا تھا۔

"بیٹا... مجھے معاف کر دو"...

یہ جملہ کہتے ہی وہ رک گئے، جیسے الفاظ اب آگے نہیں جا رہے تھے۔

"میں نے تمہیں بہت درد دیا ہے... بہت غلطیاں کی ہیں..." ان کی آواز کانپنے لگی۔

ارمان خاموش تھا۔ اس کی آنکھیں اپنے باپ پر جمی ہوئی تھیں، مگر چہرے پر کوئی سختی نہیں تھی—بس تھکن اور سمجھ تھی۔

رحمان شیخ نے ایک لمحہ سانس لیا، پھر مزید ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولے:

"میں نے سمجھا تھا کہ میں سب کچھ ٹھیک کر رہا ہوں... مگر میں نے سب کچھ خراب کر دیا"...

وہ آہستہ سے سر جھکا گئے۔

"اگر تم مجھے کبھی بھی دل سے معاف کر سکو... تو یہ بوڑھا باپ سکون سے مر لے گا"...

کمرے میں خاموشی گہری ہو گئی۔

نعمان نے نظریں جھکا لیں، ایمان نور کے آنسو دوبارہ بہنے لگے، رمشا نے ہلکے سے ہونٹ کاٹے، اور سکندر ایک طرف کھڑا یہ سب خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

ارمان نے آہستہ سے ہاتھ حرکت دی۔ اس کی آواز اب بھی کمزور تھی، مگر اس میں غصہ نہیں تھا۔

"بابا"...

یہ لفظ سنتے ہی رحمان شیخ کی آنکھیں اور بھی بھر آئیں۔

ارمان نے دھیرے سے کہا:

"بس... اب رہنے دیں"...

وہ رکا، پھر آہستہ سے ایک گہری سانس لی۔

"ہم سب یہاں ہیں... یہی کافی ہے"...

یہ سنتے ہی رحمان شیخ کے چہرے پر ایک ٹوٹا ہوا سا سکون آگیا۔ وہ مزید کچھ نہ بول سکے، بس آہستہ سے سر ہلا دیا۔

اور اسی لمحے کمرے میں وہ بوجھ، جو سالوں سے سب کے دلوں پر تھا... پہلی بار کچھ ہلکا سا محسوس ہوا۔

سکندر کچھ لمحے وہیں کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔ ارمان کے ہوش میں آنے کی خوشی، مومنہ اور اس کی بات چیت، رحمان شیخ کی معافی۔ یہ سب اس کے سامنے ایک مکمل ہونے والی تصویر کی طرح تھا۔

کمرے میں سب کے چہروں پر ایک عجیب سا سکون تھا، جیسے برسوں بعد کسی بکھرے ہوئے گھر میں روشنی لوٹ آئی ہو۔ ایمان نور کی دعائیں، نعمان کی آنکھوں میں نمی، اور مومنہ و ارمان کے درمیان وہ نیا سا رشتہ... سب کچھ ایک نئی شروعات کی طرف جا رہا تھا۔

سکندر نے ایک گہری سانس لی۔

اس کے دل میں خوشی تھی... مگر وہ خوشی خاموش تھی، شور نہیں مچاتی تھی۔

وہ آہستہ سے پلٹا اور دروازے کی طرف چل دیا۔

کسی نے اسے روکا نہیں، کیونکہ سب اپنی اپنی دنیا میں مصروف تھے۔

وہ ہسپتال کی راہداری میں آ گیا۔ باہر کی ہوا جیسے اس کے سینے میں اتر گئی ہو۔

اس نے ایک لمحے کے لیے آسمان کی طرف دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں پہلی بار وہی سکون تھا جو طویل بے چینی کے بعد آتا ہے۔

وہ آہستہ سے خود سے بولا:

"واقعی... اللہ ہر چیز کا بہتر فیصلہ کرتا ہے"...

اس کے دل میں اب شک نہیں تھا، نہ ہی بوجھ۔

صرف ایک خاموش سا یقین تھا کہ جو کچھ بھی ہوا، وہ کسی نہ کسی بہتری کی طرف تھا۔

اور وہ آہستہ قدموں سے ہسپتال سے باہر کی طرف چل پڑا... ایک نئے سکون کے ساتھ۔

سکندر ابھی ہسپتال کے دروازے سے باہر نکلا ہی تھا کہ اس کی رفتار خود بخود سست ہو گئی۔ اندر کی ہلچل، دعائیں، اور خوشی کی آوازیں پیچھے رہ گئی تھیں، مگر باہر کی فضا ایک الگ ہی حقیقت لیے کھڑی تھی۔

اس نے چند قدم آگے بڑھ کر نظر اٹھائی... اور پھر اچانک رک گیا۔

سامنے ایک عورت کھڑی تھی، گود میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ وہ کسی کا انتظار کر رہی تھی یا شاید خود بھی کسی خاموش سوچ میں گم تھی۔

سکندر نے ذرا غور سے دیکھا۔

اور پھر اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے وقت جیسے جم گیا۔

وہ نادیہ تھی۔

سکندر کے اندر ایک جھٹکا سا لگا۔ سانس جیسے سینے میں ہی رک گئی ہو۔ اس نے ہلکی سی آہ بھری، اور نظریں ایک لمحے کے لیے جھک گئیں۔

اس کے ذہن میں پرانی یادیں ایک ساتھ ابھرنے لگیں وہ وقت، وہ فاصلے، وہ خاموشیاں جنہیں کبھی الفاظ نہیں ملے تھے۔

وہ ایک قدم آگے بڑھا، پھر رک گیا۔

اس کے چہرے پر ایک ساتھ دو احساس تھے... ایک ناقابلِ بیان خوشی اور ایک پرانا سا درد جو ابھی مکمل ختم نہیں ہوا تھا۔

اس نے آہستہ سے آسمان کی طرف دیکھا، جیسے دل ہی دل میں کسی سے بات کر رہا ہو۔

"الحمدللہ"...

اس کی آواز بہت ہلکی تھی، مگر اس میں شکر بھی تھا اور تسلیم بھی۔

نادیہ کو دیکھ کر اس کے اندر کچھ نرم ہو گیا تھا، مگر ساتھ ہی کچھ پرانا درد بھی جاگ گیا تھا۔

وہ لمحہ ایک عجیب سی کیفیت میں تھا نہ مکمل خوشی، نہ مکمل اداسی۔

بس ایک انسان تھا... جو اپنے ماضی کو سامنے دیکھ کر بھی، اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا۔

اور وہیں کھڑا رہ گیا، جیسے وقت نے اسے دوبارہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہو۔

ارمان کی زندگی اب آہستہ آہستہ سنورنے لگی تھی۔ وہی کمرہ جہاں کبھی خاموشی، مشینوں کی بیپ اور بے بسی چھائی ہوئی تھی، اب وہاں امید کی

روشنی واپس آچکی تھی۔ اس کے والد کی شفقت بھی لوٹ آئی تھی اور مومنہ کی موجودگی نے اس کی ٹوٹی ہوئی دنیا کو ایک نئی سمت دے دی تھی۔

ادھر مومنہ نے خاموشی سے اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کیا۔ اس نے فلک شبیر سے خلع کا کیس فائل کیا، اور وہ رشتہ جس میں وہ خود کو قید محسوس کرتی تھی، آخرکار ختم ہوگیا۔ یہ عمل آسان نہیں تھا اس میں صبر بھی تھا، تکلیف بھی، اور لمبی خاموشی بھی۔

اپنی عدت کے دن اس نے خاموشی سے گزارے۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ خود سے بھی بہت کچھ سیکھ رہی تھی، اپنے فیصلوں کو سمجھ رہی تھی، اور اپنی زندگی کو دوبارہ جوڑنے کی ہمت جمع کر رہی تھی۔

اور پھر جب وہ وقت مکمل ہوا...

ایک سادہ مگر پُراثر لمحہ آیا۔

ارمان اور مومنہ نے نکاح کر لیا۔

یہ کوئی شور شرابے والی خوشی نہیں تھی، نہ ہی کوئی بڑی نمائش۔ یہ ایک خاموش سا وعدہ تھا دو ٹوٹی ہوئی زندگیوں کا ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جانا۔

وہاں موجود ہر شخص کے دل میں ایک سکون تھا، جیسے سب کچھ اپنے اصل مقام پر آگیا ہو۔

ارمان نے پہلی بار واقعی محسوس کیا کہ جو چیز وہ برسوں سے کھوئے بیٹھا تھا، وہ شاید دوبارہ مل سکتی ہے اگر وقت، صبر اور اللہ کی رحمت ساتھ ہو۔

اور مومنہ... اس نے بھی پہلی بار محسوس کیا کہ محبت صرف دکھ نہیں ہوتی، کبھی کبھی وہ شفا بھی بن جاتی ہے۔

یوں ان دونوں کی کہانی ایک نئے باب میں داخل ہو گئی جہاں ماضی ختم نہیں ہوا تھا، مگر مستقبل نے اسے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

شادی کے کچھ عرصے بعد ارمان کی زندگی میں وہ لمحہ بھی آگیا جس نے اس کی پوری دنیا بدل دی۔

گھر میں خاموش سی بے چینی تھی، مگر اس خاموشی کے پیچھے ایک بڑی امید چھپی ہوئی تھی۔ مومنہ ہسپتال میں تھی، اور ارمان باہر مسلسل چکر لگا رہا تھا۔ کبھی دروازے کی طرف دیکھتا، کبھی آسمان کی طرف... جیسے ہر لمحہ دعا کر رہا ہو۔

وقت گزرتا رہا... اور پھر اچانک کمرے سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔

یہ آواز سنتے ہی ارمان کے قدم وہیں رک گئے۔

دروازہ کھلا...

نرس باہر آئی اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

"مبارک ہو... بیٹی ہوئی ہے"

یہ سنتے ہی ارمان جیسے ساکت ہو گیا۔ ایک لمحے کو اسے یقین ہی نہیں آیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر وہ مسکراہٹ آئی جو برسوں بعد مکمل دل سے نکلی تھی۔

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

وہ کانپتے قدموں سے اندر گیا...

مومنہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی، تھکی ہوئی مگر مسکرا رہی تھی۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا معصوم سا وجود تھا ان کی بیٹی۔

ارمان آہستہ سے قریب آیا۔ اس نے پہلی بار اپنی بیٹی کو دیکھا۔

وہ بہت چھوٹی تھی... نرم، خاموش، اور بالکل معصوم۔

ارمان نے لرزتے ہاتھوں سے اسے اٹھایا۔

اس کے چہرے پر آنسو تھے، مگر وہ مسکرا بھی رہا تھا۔

"یہ میری بیٹی ہے..." اس نے آہستہ سے کہا، جیسے خود سے یقین کر رہا ہو۔

مومنہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔

ارمان نے بیٹی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

اس لمحے اس کے اندر وہ ساری تکلیفیں، وہ سارا ماضی، وہ سب درد جیسے تھوڑا تھوڑا کم ہو گیا ہو۔

اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے، مگر اس بار وہ آنسو کمزوری کے نہیں تھے،

یہ شکر کے تھے۔

وہ آہستہ سے بولا:

"الحمدللہ"...

اور اس کی دنیا واقعی مکمل ہو گئی تھی۔

وقت نے اپنی رفتار میں سب کے لیے الگ الگ کہانیاں لکھ دی تھیں۔

ارمان اور مومنہ اپنی ننھی بیٹی کے ساتھ ایک پرسکون زندگی میں ڈھل چکے تھے، جہاں تکلیفیں ماضی کا حصہ بن کر صرف یادوں میں رہ گئی تھیں۔ مگر اسی بڑے گھر میں، ایک اور کہانی بھی آہستہ آہستہ اپنے مزے دار اور عجیب سے موڑ پر پہنچ رہی تھی رمشا اور سکندر کی۔

ان کی شادی کوئی فلمی ڈرامہ نہیں تھی، نہ ہی کوئی بڑے بڑے وعدوں کی نمائش۔ یہ ایک سادہ سا نکاح تھا، مگر اس سادگی کے اندر ایک ایسی انوکھی کیمسٹری چھپی ہوئی تھی جو ہر دن کو نیا بنا دیتی تھی۔ رمشا، جو اپنی بات منوانے میں ماہر تھی، اور سکندر، جو ہر چیز کو "سنجیدگی سے سمجھنے" کا عادی تھا دونوں ایک دوسرے کے لیے مکمل طور پر مختلف مگر کسی نہ کسی طرح مکمل جوڑی ثابت ہوئے۔

شادی کے بعد ان کا گھر کسی عام گھر کی طرح نہیں تھا۔ یہ زیادہ ایک "روزانہ کی چھوٹی چھوٹی لڑائیوں اور پھر فوری صلح" کا مرکز تھا۔

صبح کا آغاز اکثر رمشا کی آواز سے ہوتا:

"سکندر! یہ چائے کیوں اتنی سادہ ہے؟ تمہیں معلوم ہے مجھے ذرا سا ڈرامہ پسند ہے، چائے میں بھی"!

سکندر بغیر کسی رد عمل کے بس چائے کا کپ دوبارہ دیکھتا، جیسے وہ واقعی سوچ رہا ہو کہ چائے میں "ڈرامہ" کیسے شامل کیا جاتا ہے۔

"رمشا... چائے ہے، سیریل نہیں..." وہ آہستہ سے کہتا۔

اور یہ جملہ تقریباً روزانہ کا معمول بن گیا تھا۔

رمشا کا اگلا مشن ہمیشہ گھر کو "اپ گریڈ" کرنا ہوتا۔

"یہ پردے بدلنے چاہئیں" "یہ صوفہ اب بور ہو گیا ہے" "یہ لائٹس بہت sad mood دے رہی ہیں"

سکندر ہر بار ایک ہی حالت میں ہوتا خاموش، سوچ میں گم، اور دل ہی دل میں اللہ سے پوچھتا کہ "یہ لائٹس واقعی mood بدلتی ہیں یا صرف امتحان ہوتا ہے؟"

ایک دن رمشا نے فیصلہ کیا کہ گھر میں "couple fitness routine" شروع ہونا چاہیے۔

"ہم دونوں واک پر جائیں گے، روزانہ"!

سکندر نے پہلی بار واقعی سوال کیا:

"رمشا... ہم پہلے سے بھی تھکے ہوئے ہیں، یہ کس زمرے میں آتا ہے؟ زندگی یا punishment؟"

رمشا نے فوراً گھورا:

"یہ self-care ہے سکندر"!

اور یوں سکندر نے self-care کے نام پر روزانہ واک شروع کر دی، مگر حقیقت میں وہ رمشا کے سوالوں سے بھاگنے کا ایک نیا طریقہ تھا۔

لیکن ان سب کے درمیان ایک چیز واضح تھی جتنا زیادہ وہ لڑتے تھے، اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔ رمشا کی تیز باتوں میں فکر چھپی تھی، اور سکندر کی خاموشی میں حفاظت۔

ایک شام وہ دونوں چھت پر بیٹھے تھے۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی، اور شہر کی روشنیوں میں ایک خاموش سا سکون تھا۔ رمشا اچانک بولی:

"سکندر... تمہیں لگتا ہے ہم ٹھیک ہیں؟"

سکندر نے اس کی طرف دیکھا۔ کچھ لمحے خاموش رہا، پھر آہستہ سے کہا:

"ہم ٹھیک نہیں ہیں"...

رمشا نے فوراً آنکھیں چھوٹی کیں:

"کیا مطلب؟"!

سکندر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

"ہم بہتر ہیں... ٹھیک ہونا بہت بور ہوتا ہے"

یہ سن کر رمشا کو پہلے غصہ آیا، پھر ہنسی۔

"تم کبھی سیدھا جواب نہیں دے سکتے؟"

سکندر نے بہت سنجیدگی سے کہا:

"سیدھا جواب ہوتا تو تم اتنے سوال کیوں کرتی ہو؟"

اور اس بار دونوں ہنس پڑے، واقعی دل سے۔

اسی لمحے رمشا نے آہستہ سے کہا:

"چلو مان لیتے ہیں... ہم دونوں پاگل ہیں"

سکندر نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا:

"الحمدللہ... ایک ہی جیسے پاگل ہیں"

اور یہ "پاگل پن" ہی ان کی اصل محبت بن چکا تھا نہ بہت ڈرامائی، نہ بہت خاموش، بس روزمرہ کی ہنسی، لڑائی اور چھوٹی چھوٹی معافیاں۔

ان کی کہانی میں نہ کوئی بڑی ٹریجڈی تھی، نہ کوئی بڑا ہیروک لمحہ...

بس ایک ایسی زندگی تھی جو آہستہ آہستہ یہ سکھا رہی تھی کہ محبت ہمیشہ سنجیدہ نہیں ہوتی

کبھی کبھی وہ چائے میں ڈرامہ، واک میں شکایت، اور چھت پر بے وجہ کی ہنسی بھی ہوتی ہے۔

پھر ایک دن ایک دعوت میں دونوں دوست اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ماحول خوشگوار تھا، ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری تھا۔

ارمان کی بیٹی رحمت مسلسل مسکرا رہی تھی، اس کی ہنسی پورے ہال میں ایک معصوم سی خوشبو بکھیر رہی تھی۔

سکندر نے جب ارمان کو اس طرح مطمئن اور خوش دیکھا تو دل ہی دل میں ایک عجیب سی تسلی محسوس کی۔ وہ ہلکا سا مسکرایا اور نرمی سے بولا:

"تھینک یو بابا"...

یہ لفظ صرف شکریہ نہیں تھا، بلکہ دوستی، اعتماد اور ان لمحوں کی گہری سچائی کا اظہار تھا جنہوں نے دونوں کو وقت کے ساتھ مزید قریب کر دیا تھا۔

ارمان نے سکندر کی بات سن کر ہلکی سی حیرت سے اسے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا:

"کس کو تھینک یو بول رہے ہو؟"

سکندر نے فوراً نرمی سے جواب دیا، نظریں اسی خوشگوار ماحول پر جمائے ہوئے:

"کسی کو نہیں"...

پھر اس نے گہری سانس لی، جیسے دل کی بات لفظوں میں ڈھال رہا ہو:

"بس تمہیں ایسے خوش دیکھ کر دل نے خود ہی شکریہ کہہ دیا۔"

ارمان نے یہ سن کر زور سے قہقہہ لگایا، اور سر ہلاتے ہوئے بولا:

"پاگل ہے تو"...

اور دونوں دوستوں کے درمیان وہ ہلکی سی خاموشی پھر سے ایک خوبصورت سی مسکراہٹ میں بدل گئی۔

مومینہ نے ارمان کو دیکھا اور نرم لہجے میں کہا:

"اب آپ میرے محرم ہیں"...

وہ آہستہ سے اس کے قریب ہونے لگی، مگر اسی لمحے رحمت فوراً آگے بڑھی۔ اس نے ننھے سے ہاتھ پھیلا کر جیسے اپنے بابا کو بچایا ہو اور مومینہ اور ارمان کے درمیان آ کھڑی ہوئی۔

"نہیں! بابا میرے ہیں!" وہ معصوم مگر ضدی انداز میں بولی۔

مومینہ رک گئی، حیرت اور مسکراہٹ دونوں کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھنے لگی۔

رحمت اپنے بابا سے اس قدر جڑی ہوئی تھی کہ وہ کسی کو بھی ان کے قریب برداشت نہیں کرتی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر سکندر زور سے ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی پورے ماحول میں گونج گئی۔

رمشہ نے فوراً اس کی طرف گھورا اور غصے سے بولی:

"آپ بھی زیادہ نہ ہنسیں... اگلا نمبر آپ کا ہے"!

سکندر نے ہنسی روکتے ہوئے بھنویں اٹھائیں

"کیا مطلب ہے آپ کا سرکار؟"

تبھی رمشا شرارتی انداز میں بولی:

"ارے میاں جی... بات تو سنو! اب آپ بھی بابا جی بننے والے ہیں"!

یہ سنتے ہی ماحول میں ایک ہلکی سی ہنسی اور شرارت بھر گئی، اور سب کے چہروں پر وہی بے ساختہ خوشی پھیل گئی جو صرف اپنے لوگوں کے درمیان ہی آتی ہے۔

نکاح کے بعد ہر بار محبت جنم نہیں لیتی، اسی لیے رشتہ اُس سے جوڑو جس سے دل پہلے ہی جڑا ہو۔ کیونکہ جہاں مجبوری ہو، وہاں رشتے نہیں رہتے وہ صرف بوجھ بن جاتے ہیں، اور بوجھ کبھی رشتوں کو زندہ نہیں رکھ سکتا۔

ہر مسئلہ، ہر الجھن... ایک دوسرے کے سامنے رکھو، خاموشیوں میں نہیں۔ کسی تیسرے دروازے پر دستک دینے سے پہلے، اپنے ہی دروازے پر کھڑے ہو کر بات کرنا سیکھو۔

ہوسٹ نے احمد علی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا:

"یہ تو واقعی بہترین اینڈنگ ہے... آپ نے کتنا خوبصورت ناول لکھا ہے"!

جیسے ہی وہ جملہ مکمل ہوا، ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ہر طرف داد تھی، ہر چہرے پر ایک عجیب سی تسکین۔

مگر پھر ہوسٹ نے ہلکے سے سر جھکایا، جیسے کوئی راز جان گیا ہو، اور بولا:

"لیکن ہمیں یہ بھی پتا چلا ہے کہ آپ نے ایک اور اینڈنگ بھی لکھی تھی... جو آپ نے بعد میں کتاب سے نکال دی۔ ایسا کیا تھا اُس میں؟"

ہال میں ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ تالیوں کی آواز جیسے ہوا میں معلق رہ گئی ہو۔

احمد علی نے گہری سانس لی، پھر نظریں اٹھا کر آہستہ سے مسکرایا:

"وہ اینڈنگ... سچ تو یہ ہے کہ زیادہ حقیقت کے قریب تھی۔"

وہ رُکا، جیسے لفظ چن رہا ہو، پھر نرمی سے بولا:

ارمان اس دن کے بعد کبھی کوما سے باہر نہ آ سکا۔ مشینوں کی مسلسل بیپ، سفید دیواریں، اور وہ ٹھنڈی ہسپتال کی فضا... سب کچھ ایک ایسی خاموشی میں ڈوب گیا تھا جو چیخ سے بھی زیادہ بھاری تھی۔

دن گزرتے گئے، پھر ہفتے، پھر مہینے... مگر ارمان کی آنکھوں نے کبھی پلکیں کھولنے کی زحمت نہ کی۔ ڈاکٹرز نے امید کے الفاظ کہنا چھوڑ دیے تھے، اور نرسوں کی نظروں میں بھی وہی خاموش تسلیم بیٹھ چکی تھی جیسے انسان مجبوری کہتا ہے۔

مومنہ کبھی نہیں آئی۔

نہ ایک بار... نہ آخری بار۔

شاید وہ اپنی زندگی کے کسی اور موڑ پر کھڑی تھی، جہاں اس ہسپتال کا دروازہ اس کے لیے کبھی کھلا ہی نہیں۔ یا شاید وہ خود کو اس درد سے بچا رہی تھی جس کا سامنا کرنا آسان نہیں ہوتا۔

عورتیں واپس نہیں آتی اور جن کی شادی ہو جائے وہ تو بالکل بھی نہیں،

رحمان شیخ بھی کبھی ہسپتال نہ آئے، نہ ہی اپنے بیٹے کو کبھی دیکھا۔

وہ شخص جس کی موجودگی کبھی فیصلوں میں وزن رکھتی تھی، اس نے اس کمرے کی طرف دیکھنا بھی گوارانہ کیا جہاں ایک زندگی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ وقت سب ٹھیک کر دیتا ہے... یا شاید وہ بھی کسی اور دنیا میں قید تھا، جہاں ذمہ داریوں کا شور، احساسات کی آواز کو دبا دیتا ہے۔

لیکن سب سے زیادہ ٹوٹنے والا سکندر تھا۔

وہ روز ہسپتال آتا... لیکن اندر داخل نہیں ہوتا تھا۔

وہ باہر کھڑا رہتا، شیشے کے اُس پار ارمان کو دیکھتا، جیسے کوئی قید میں بند آخری امید کو دیکھ رہا ہو۔ اس کی آنکھیں ہر دن سرخ ہوتیں، مگر آنسو کبھی مکمل طور پر بہہ نہیں پاتے تھے۔

پہلے وہ خاموش تھا... پھر بے چین ہونے لگا... پھر ٹوٹنے لگا۔

اور پھر ایک دن، وہ آیا ہی نہیں۔

لوگوں نے کہا وہ کہیں گم ہو گیا ہے۔

لیکن سچ یہ تھا کہ سکندر اب خود میں نہیں رہا تھا۔

وہ ہنسنا بھول گیا تھا، بولنا کم ہو گیا تھا، اور آخر کار وہ اپنی ہی دنیا میں قید ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی وہ سڑک پر بیٹھا خود سے باتیں کرتا، کبھی ہسپتال کے راستے کی طرف دیکھ کر روتا، اور کبھی کسی نام کو پکارتا جس کا جواب اسے کبھی نہیں ملنا تھا۔

لوگ کہتے تھے وہ پاگل ہو گیا ہے...

لیکن شاید وہ پاگل نہیں ہوا تھا۔

شاید وہ صرف اس حقیقت کو برداشت نہیں کر سکا تھا کہ کچھ رشتے، کچھ محبتیں، اور کچھ کہانیاں... صرف صفحوں پر مکمل ہوتی ہیں، زندگی میں نہیں۔

اور ہسپتال کے اُس کمرے میں، ارمان آج بھی وہیں تھا

خاموش... بے حرکت... جیسے وقت نے اسے اپنے اندر کہیں روک لیا ہو۔

اس کی کہانی ختم نہیں ہوئی تھی...

بس باقی سب لوگ اپنی اپنی کہانیوں میں آگے بڑھ گئے تھے۔

ارمان کوما میں گیا تو پھر کبھی واپس نہ آسکا۔ دن،

آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب ڈاکٹروں نے خاموشی سے نظریں جھکا لیں۔

ارمان چلا گیا تھا... بغیر کسی شور کے، بغیر کسی آخری الوداع کے۔

موت کی خبر جب پھیلی تو ہر طرف ایک عجیب سا سکوت اتر آیا۔ کسی نے یقین کیا، کسی نے انکار کیا... مگر حقیقت اپنی جگہ اٹل تھی۔

مومنہ کبھی نہ آئی۔

رحمان شیخ نے بھی ایک بار پلٹ کر نہ دیکھا۔

اور سکندر... وہ اس خبر کے بعد جیسے مکمل ٹوٹ گیا۔

وہ شخص جو کبھی مضبوطی کی مثال سمجھا جاتا تھا، اب ہر روز خاموشی سے ارمان کی قبر پر جاتا۔ نہ کوئی ہجوم ہوتا، نہ کوئی شور... بس ایک ٹوٹی ہوئی خاموشی اور ایک شخص جو اپنے اندر بکھر چکا تھا۔

لوگ کہتے تھے وہ وہاں گھنٹوں بیٹھا رہتا، کبھی زمین کو دیکھتا، کبھی آسمان کو، اور کبھی ایسے باتیں کرتا جیسے ارمان اب بھی اس کے سامنے بیٹھا ہو۔

"یار... تو نے بھی چھوڑ دیا مجھے... سب مجھے چھوڑ جاتے ہیں بابا بھی چلے گئے خالہ بھی اور اب تو بھی"

اس کی آواز اکثر قبرستان کی خاموشی میں گم ہو جاتی۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ شخص جس نے اپنے والد کی موت پر کبھی آنسو نہیں بہائے تھے، اب ہر روز اپنے دوست کی قبر پر روتا تھا۔

لوگ حیران تھے... کیونکہ یہ وہ سکندر نہیں تھا جسے وہ جانتے تھے۔

یہ وہ سکندر تھا جو اندر سے کہیں بہت پہلے مر چکا تھا، بس جسم باقی رہ گیا تھا۔

اور یوں کہانی کا انجام یہ تھا

ارمان چلا گیا، مگر سکندر زندہ رہ کر بھی زندہ نہ رہا۔

ہوسٹ کی آنکھوں میں نمی صاف جھلک رہی تھی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا، پھر بھاری مگر نرم آواز میں بولا:

"یہ اینڈنگ... واقعی دل کو چھو لینے والی ہے۔"

اس نے احمد علی کی طرف دیکھا، جیسے الفاظ کم پڑ گئے ہوں۔

احمد علی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مائیک تھاما اور آہستہ سے کہا:

"یہ اینڈنگ کسی کو پسند نہیں آئی تھی... کیونکہ اس میں دکھ تھا، سچ تھا، اور بچھڑنے کی حقیقت تھی۔"

وہ رُکا، پھر نظریں ہال پر دوڑاتے ہوئے بولا:

"میرا ناول وہاں ختم ہوا تھا جہاں سب لوگ ایک میز پر بیٹھے تھے... مسکرا رہے تھے، ہنس رہے تھے، اور زندگی معمول کے مطابق چل رہی تھی۔"

ہال میں ایک خاموشی سی پھیل گئی، جیسے ہر کوئی اس منظر کو محسوس کر رہا ہو۔

احمد علی نے نرمی سے کہا:

"اور یہی میری اینڈنگ ہے۔ کیونکہ زندگی ہمیشہ درد پر نہیں رکتی... وہ آگے بڑھ جاتی ہے۔ کچھ لوگ ٹوٹ جاتے ہیں، کچھ سنبھل جاتے ہیں، مگر وقت کسی کے لیے نہیں رکتا۔"

ایک لمحہ ٹھہرا...

پھر اچانک ہال میں تالیاں بجنے لگیں۔

پہلے ہلکی، پھر تیز... پھر پورے ہال میں گونجتی ہوئی۔

ہوسٹ نے مسکراتے ہوئے اپنی آنکھیں صاف کیں اور سر ہلایا۔

احمد علی نے بس ایک بار ہلکے سے سر جھکایا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ کہانی ختم نہیں ہوئی... بس لفظ رک گئے ہیں۔

شو ختم ہونے کے بعد احمد علی سیدھا قبرستان چلا گیا۔ ہال کی تالیاں، روشنیوں کا شور، اور لوگوں کی تعریفیں... سب پیچھے رہ گئے تھے۔ سامنے بس ایک لمبی، سنسان راہ تھی جو خاموشی سے قبرستان کے اندر جا رہی تھی۔

ہوا میں ایک سرد سی نمی تھی۔ شام ڈھل چکی تھی، اور قبرستان کی فضا میں وہ خاموشی تھی جو صرف یادوں سے بھری ہوتی ہے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک سادہ سی قطار کے پاس رُکا۔

وہاں دو قبریں ساتھ ساتھ تھیں۔

ایک پر لکھا تھا:

ارمان رحمان

پیدائش: 15 مارچ 1988

وفات: 12 جولائی 2014

عمر: 26 سال

پتھر سادہ تھا... نہ کوئی بڑا سنگِ مرمر، نہ کوئی شان و شوکت۔ صرف ایک نام، ایک تاریخ، اور ایک عمر جیسے پوری زندگی کو تین سطروں میں سمیٹ دیا گیا ہو۔

قبر کے اوپر کچھ تازہ پھول رکھے تھے، جو شاید صبح کسی نے خاموشی سے رکھے تھے۔ ان کے رنگ اب بھی تھوڑے تازہ تھے، مگر ہوا نے ان میں بھی اداسی بھر دی تھی۔

پاس ہی دوسری قبر تھی رحمان شیخ کی۔

وہ نسبتاً بڑی اور سنبھلی ہوئی تھی، مگر اس پر بھی وہی خاموشی تھی۔ نہ زیادہ الفاظ، نہ کوئی وضاحت... بس ایک نام جو وقت کے ساتھ مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔

احمد علی کچھ دیر کھڑا رہا۔

اس نے ہاتھ قبر کے قریب رکھا، مگر چھوا نہیں۔

اس کی آنکھوں میں وہی ہلکی سی نمی تھی جو اس نے اسٹیج پر چھپانے کی کوشش کی تھی، مگر یہاں کوئی اس سے تالیاں بجانے والا نہیں تھا۔

وہ آہستہ سے بولا، جیسے خود سے بات کر رہا ہو:

"تو واقعی... سب کچھ یہیں ختم ہو جاتا ہے۔"

ہوا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

صرف قبرستان کی خاموشی نے اس کے لفظ واپس لوٹا دیے۔

اور وہ سمجھ گیا کہ کہانیاں چاہے جتنی بھی بڑی ہوں... آخر میں سب لوگ اسی خاموش مٹی میں آ جاتے ہیں، جہاں نام رہ جاتے ہیں، مگر آوازیں نہیں۔

احمد آہستہ قدموں سے چلتا ہوا قبر کے قریب رُکا۔ ہوا میں ایک اداس سی خنکی تھی، جیسے وقت بھی وہاں آ کر خاموش ہو جاتا ہو۔

وہ جھکا، قبر پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے بولا:

"تایا ابو اور دادا ابو... آپ دونوں کی یاد بابا اور دادی کو آج بھی آتی ہے"...

اس کی آواز بھاری ہو گئی۔ وہ لمحہ بھر خاموش رہا، پھر نظریں قبر پر جمائے مزید کہا:

"وہ آج بھی آپ کا ذکر کرتے ہیں... جیسے آپ گئے ہی نہیں، بس کہیں دور چلے گئے ہوں۔"

ہوا نے درختوں کے پتے ہلائے، مگر قبرستان ویسے ہی خاموش رہا۔

احمد نے آنکھیں صاف کیں اور آہستہ سے سر جھکا دیا، جیسے وہ کسی جواب کا انتظار کر رہا ہو جو کبھی آنے والا نہیں تھا۔

"مجھے آج بھی یوں لگتا ہے جیسے سکندر انکل خاموشی سے آتے ہوں... رات کے کسی اداس پہر میں، جب قبرستان میں صرف ہوا کی سرگوشی رہ جاتی ہے، وہ آپ کی قبر پر پھول رکھ کر چلے جاتے ہوں۔

مگر سچ یہ ہے کہ میں انہیں کبھی دیکھ نہ سکا... کبھی ان کے قدموں کی آہٹ بھی سن نہ پایا۔ شاید وہ اب بھی کہیں اسی ادھوری سی دنیا میں کھوئے ہوئے ہیں، جہاں یادیں انسان کو جیتے جی دفن کر دیتی ہیں"...

ہوا چلے تو مری بے بسی سنائی دے

ہر اک صدا میں تری خامشی سنائی دے

جو ٹوٹ کر بھی سنبھلنے کی ضد میں رہتا ہوں

مری نظر میں وہی زندگی سنائی دے

کوئی تو ہو جو مرے درد کو سمجھ پائے

یہ شہر بھر مجھے اک اجنبی سنائی دے

میں اپنے زخم چھپاؤں بھی کس طرح آخر

ہر اک ہنسی میں مری بے دلی سنائی دے

وہ جس کو چاہ کے بھی پا نہ سکا میں کبھی

ہر اک دعا میں اسی کی کمی سنائی دے

"یہ کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی تھی... یہ تو بس ایک نیا باب تھا۔ اصل آغاز تو اُس دن ہوا جب سکندر غائب ہوا، اور کسی کو آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں گیا۔

لوگ کہتے رہے... کچھ نے اسے دور کسی شہر میں دیکھا، کچھ نے اسے تنہائی سے باتیں کرتے سنا، مگر سچ کبھی سامنے نہ آیا۔

بس ایک سوال آج بھی باقی ہے

سکندر آخر گیا کہاں تھا؟"...

کیوں بے وجہ دی یہ سزا

کیوں خواب دے کے وہ لے گیا

جئیں جو ہم، لگے ستم

عذاب ایسے وہ دے گیا

ختم شد